

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

جلد
(۳)

افادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی دام مجید



خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

تیرھواں ایڈیشن

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۴۲ تا مکمل سورۃ) جلد ۳	نام کتاب
حضرت مولانا صوفی عبدالحمد سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ	مفادات
الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور	ترتیب
پانچ سو (۵۰۰)	تعداد طباعت
سید الخطاطین حضرت شاہ فیض الحسنی مدظلہ	سرورق
محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ	کتابت
مکتبہ دروس القرآن فاروق سنچ گوجرانوالہ	ناشر
۲۱۰ روپے دو سو دس روپے	قیمت
ذی القعدہ ۱۴۲۸ھ بمطابق نومبر ۲۰۰۷ء	تاریخ چودھواں ایڈیشن

ملنے کے پتے

- (۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق سنچ گوجرانوالہ (۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار اولپنڈی
- (۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور
- (۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور
- (۴) مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور
- (۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار اولپنڈی
- (۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
- (۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی
- (۸) اسلامیہ کتب خانہ ڈاگامی، ایبٹ آباد
- (۹) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
- (۱۰) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست عنوانات

مسلم العرفان فی دروس القرآن جلد نمبر ۳

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۲	امام رومی اور قبلہ	۳۱	درس نمبر ۵۵ آیات ۱۴۲ تا ۱۴۳
۵۳	کتمان حق	۳۲	آیات اور ترجمہ
۵۵	درس نمبر ۵۴ آیات ۱۴۸ تا ۱۵۰	۳۳	تحویل قبلہ
۵۶	آیات اور ترجمہ	۳۴	تحویل قبلہ پر پہلا اعتراض
۵۷	رابط آیات	۳۵	اس کا جواب
۵۸	ہرمت کے لیے جنت مقرر ہے	۳۶	مقام تحویل قبلہ
۵۹	جنت فروغی چیز ہے	۳۷	افضل امت اور اس کی گواہی
۶۰	بنیادی چیز نیکی ہے	۳۸	تقرر قبلہ کی غایت
۶۱	استقبال قبلہ کے سرگزار احکام	۳۹	تحویل قبلہ پر دوسرا اعتراض
۶۲	قبلہ تکمیل نعمت ہے	۴۰	درس نمبر ۵۶ آیت ۱۴۴ تا ۱۴۵
۶۳	قبلہ ذریعہ ہدایت ہے	۴۱	آیات اور ترجمہ
۶۴	درس نمبر ۵۷ آیات ۱۵۱ تا ۱۵۲	۴۲	رابط آیات
۶۵	آیات اور ترجمہ	۴۳	تحویل قبلہ کی دوسری وجہ
۶۶	رابط آیات	۴۴	تحویل قبلہ کا حکم
۶۷	اتمام نعمت	۴۵	جنت قبلہ
۶۸	بعثت رسول	۴۶	مخالفت برائے مخالفت
۶۹	تلاوت اور تزیینہ	۴۷	استقبال قبلہ اور شعائر اسلامی
۷۰	کتاب و حکمت کی تعلیم	۴۸	سرسوئی کا اعتراض
۷۱		۴۹	آریہ سلج اور تثلیث
۷۲		۵۰	استقبال قبلہ میں اختلاف
۷۳		۵۱	

۸۴	آیت اور ترجمہ	۶۴	ان جانی چیزوں کی تعلیم
"	صفا اور مردہ	۶۶	تہذیب الاخلاق کے پانچ اصول
۸۵	تہذیب الاخلاق کا پانچواں اصول [شعار اللہ کی تعلیم ہے]	"	پہلا اصول ذکر اللہ
۸۶	تفسیر عزیزی	۶۸	دوسرا اصول شکر اللہ
۸۷	طواف وحشی	۶۹	درس نمبر ۵۹ آیات ۱۵۳ تا ۱۵۴
۸۹	چاوہ زم زم	"	آیات اور ترجمہ
۹۰	صفا اور دعوتِ توحید	"	گزشتہ سے پیوستہ
۹۱	بیت اللہ شریف میں مشرک	"	برسر عروج قوم کی پانچ منازل
"	سعی قدیم سنت ہے۔	۷۰	تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر
۹۳	درس نمبر ۶۲ آیت ۱۵۹ تا ۱۶۳	۷۲	تہذیب الاخلاق کا چوتھا اصول نماز
"	آیات اور ترجمہ	۷۳	شہادت فی سبیل اللہ
۹۴	کتمانِ حق	۷۴	شور کا خدعان
"	کتمانِ حق کی سزا	۷۶	درس نمبر ۶۰ آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷
۹۵	مولانا عبید اللہ سندھی	"	آیات اور ترجمہ
۹۷	تعلیم کی اہمیت	"	گزشتہ سے پیوستہ
۹۸	بنیات اور ہدایت	۷۷	آزمائش مقتضائے ایمان ہے
۹۹	معانی کا پروانہ	"	ذرائع آزمائش - خوف
"	لعنت کے مستحقین	۷۸	بھوک
۱۰۰	مجمود صرف ایک ہے	۷۹	جان و مال کا نقصان
۱۰۲	درس نمبر ۶۳ آیت ۱۶۴	۸۰	ثمرات کی کمی
"	آیت اور ترجمہ	۸۱	صابروں کے لیے بشارت
"	گزشتہ سے پیوستہ	۸۳	حلقہ صبر
"		۸۴	درس نمبر ۶۱ آیت ۱۵۸

۱۲۱	گزشتہ سے پیوستہ	۱۰۲	کسب معاش
۱۲۲	قانون کی پابندی	۱۰۳	آسمانی کھڑے
۱۲۳	حلال و حرام کی تمیز	۱۰۴	زمین
۱۲۵	شیطان کا نقش قدم	۱۰۵	رات اور دن کا تغیر
۱۲۶	ابوابِ اجداد کا اتباع	۱۰۶	بحری جہاز
۱۲۸	صدقہ کا طریقہ	۱۰۷	پانی کا نزول
۱۲۹	کافروں کی مثال	"	جانوروں کی ذبحی
۱۳۰	درس نمبر ۶ آیات ۱ تا ۳	۱۰۸	ہموں کی گردش
"	آیت ۱ اور ترجمہ	۱۰۹	مسخر ہوا دل
"	اکل حلال	۱۱۰	نشانات قدرت
۱۳۱	شکر الہی	۱۱۱	درس نمبر ۶ آیات ۱ تا ۵
۱۳۲	محرماتِ اربعہ	"	آیات اور ترجمہ
"	مردار	۱۱۲	مقابل
۱۳۳	خون	"	محبت الہی
۱۳۵	خنزیر کا گوشت	۱۱۳	محبت کی اقسام
۱۳۸	درس نمبر ۶ آیت ۱ تا ۳	۱۱۴	محبت کی مختلف وجوہات
"	آیت اور ترجمہ	۱۱۵	محبت کی کسوٹی
"	گزشتہ سے پیوستہ	۱۱۶	غیر اللہ کی محبت
۱۳۹	مسئلہ انتقالِ خون	"	اہل ایمان کا طریقہ
۱۴۰	غیر اللہ کے نام پر	۱۱۸	اللہ قادر مطلق ہے
۱۴۲	اھل کا مفہوم	"	تابع اور متبع
۱۴۳	حالتِ اضطراب	۱۲۱	درس نمبر ۶ آیات ۱ تا ۸
۱۴۴	ایک شبہ اور اس کا ازالہ	"	آیات اور ترجمہ

۱۶۰	درس نمبر ۱ آیت ۱۷۸ تا ۱۷۹	۱۳۶	درس ۶۸ آیت ۱۷۴ تا ۱۷۵
"	آیات اور ترجمہ	"	آیات اور ترجمہ
"	اسلام کا فوجداری قانون	"	گزشتہ سے پیوستہ
۱۶۱	اسلامی قانون بمقابلہ قانون جاہلیت	۱۳۷	کھان حق پر حقیر مخاد
۱۶۲	قتل کی تین اقسام	۱۳۸	علم قرآن کی اشاعت
"	سزائے قتل	۱۳۹	اللہ تعالیٰ کی ناراضگی
۱۶۳	معافی کی صورت	۱۵۰	خوار سے کا سودا
"	دبت	۱۵۱	درس نمبر ۶۹ آیت ۱۷۷
۱۶۵	قصاص میں زندگی ہے	"	آیت اور ترجمہ
۱۶۷	درس نمبر ۱۷ آیت ۱۸۰ تا ۱۸۲	"	گزشتہ سے پیوستہ
"	آیات اور ترجمہ	۱۵۲	استقبال قبلہ فرضی مسئلہ ہے
"	حفاظتِ جان کا قانون	"	نیکی کیا ہے
۱۶۸	اسلام کا عذاب دہرائی	۱۵۳	ایمان باللہ
"	اسلامی قانونِ حکمت پر مبنی ہے	"	ایمان بالآخرت
۱۶۹	تحفظ نفس	"	ایمان بالملائکہ
۱۷۰	تحفظ مال	۱۵۵	ایمان بالکتاب
۱۷۱	قانونِ وصیت	"	ایمان بالانبیاء
۱۷۲	انبیاء کی وصیت	"	اتفاق فی سبیل اللہ
۱۷۳	وصیت کی اقسام	۱۵۷	نماز و زکوٰۃ
۱۷۵	وصیت میں تبدیلی گناہ ہے	۱۵۸	ایمانی عہد
۱۷۷	درس نمبر ۲۰ آیت ۱۸۳ تا ۱۸۴	"	صبر کی عظمت
"	آیات اور ترجمہ	۱۵۹	پچھے لرگ
"	گزشتہ سے پیوستہ	"	متقی لرگ

۱۹۵	آیت اور ترجمہ	۱۷۷	فرضیت روزہ
"	شانِ نزول	۱۷۸	روزہ کا مفہوم
"	رمضان اور دُعا	۱۷۹	سابقہ امتوں کے روزے
۱۹۷	آداب دُعا	"	روزہ باطنی عبادت ہے
۱۹۸	خانہاں شاہ ولی اللہؒ	۱۸۰	روزہ کے جہانی فوائد
۲۰۰	قربِ خداوندی	۱۸۱	روزہ اور قافلہ کی پابندی
۲۰۱	قبولیت دُعا	۱۸۲	مریض اور مسافر کا روزہ
۲۰۳	درس نمبر ۵، آیت ۱۸۷	۱۸۳	روزہ کے ہرے فہرے
"	آیت اور ترجمہ	۱۸۴	روزہ رکھنا ہی بہتر ہے
۲۰۵	گزشتہ سے پیوستہ	۱۸۶	درس نمبر ۳، آیت ۱۸۵
"	شانِ نزول	"	آیت اور ترجمہ
۲۰۶	فلسفہ لباس	"	گزشتہ سے پیوستہ
۲۰۷	سابقہ لغزش کی معافی	۱۸۷	ماہِ رمضان اور قرآن پاک
"	حصولِ اولاد	۱۸۸	مختلف میمنوں کی وجہ تسمیہ
۲۰۸	تکمیل روزہ	۱۸۹	مسئلہ خلقِ قرآن
"	سحری کی برکات	"	نزولِ قرآن
۲۰۹	صوم وصال	۱۹۰	تلاوت قرآن
"	اعتکاف فی المساجد	"	قرآنِ ذریعہ ہدایت ہے
۲۱۰	عورتوں کا اعتکاف	۱۹۲	واضح اور مفصلہ کن دلائل
"	حفاظت بر حد در شرعیہ	۱۹۳	روزہ لازم ہے
۲۱۲	درس نمبر ۶، آیت ۱۸۸	"	روزے کی قصار
"	آیت اور ترجمہ	۱۹۴	اللہ آسانی چاہتا ہے
"	گزشتہ سے پیوستہ	۱۹۵	درس نمبر ۴، آیت ۱۸۶

۲۲۵	حرمت طے مینے	۲۱۲	رابط آیات
"	اوقات کا تعین	۲۱۳	شیخ المنہ کا ترجمہ قرآن
۲۲۶	چاند کی تقدیم	"	مولانا سید عزیز گل
۲۲۷	حج کے لیے جلدی	۲۱۴	مولانا سید وحید احمد مدنی
۲۲۸	رسومات باطلہ	"	انگریز کی چال بازی
"	صراطِ مستقیم	۲۱۵	شیخ سعدی
۲۳۰	درس نمبر ۸، آیت ۱۹۰ تا ۱۹۳	۲۱۶	ترکِ سلطنت
"	آیات اور ترجمہ	۲۱۷	سپر پاورز
"	جہاد کی قسمیں	"	ہزارہ اور گلستان
۲۳۲	جہاد پر اعتراض	۲۱۸	زوال کے اسباب
"	اقدامی اور دفاعی جہاد	"	فرقہ بندی کی لعنت
۲۳۳	قتال کا حکم	۲۱۹	تخریک ریشمی رومال
"	کفار کی طرف سے پہل	"	تذکیر مال
۲۳۴	زیادتی کی ممانعت	۲۲۰	اکلِ حرام
۲۳۵	جہاد کا مقصد	"	رشوت
"	جہاد کے اصول	"	غاصبانہ قبضہ
۲۳۶	فتنہ و فساد کی بیخ کنی	۲۲۲	درس نمبر ۹، آیت ۱۸۹
۲۳۸	درس نمبر ۹، آیت ۱۹۴ تا ۱۹۵	"	آیت اور ترجمہ
"	آیات اور ترجمہ	"	رابط آیات
"	گزشتہ سے پیوستہ	"	شارحِ نزول
۲۳۹	حدِ بیہیہ کا واقعہ	۲۲۳	امام بیضاوی
"	جنگ کی اجازت	"	سوال و جواب میں اختلاف
۲۴۰	ادسے کا بدلہ	۲۲۴	چاند کی مختلف صورتیں

۲۵۶	۲۴۰ ربط آیات	خوب خدا
۲۵۷	۲۴۱ حج کے پینے	اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال
"	۲۴۳ احرام کی پابندیاں	فقہ حنفی
۲۵۸	۲۴۴ بے حجابی	قانونِ صلح و جنگ
"	۲۴۵ نافرمانی	اتفاق فی سبیل اللہ
۲۵۹	۲۴۵ لڑائی جھگڑا	فضول خرچی
"	۲۴۶ سخت تنبیہ	تبلیغ دین
"	۲۴۶ حج مبرور	احسان کرو
۲۶۱	۲۴۷ زاو راہ	درس نمبر ۸۰ آیت ۱۹۶
۲۶۲	۲۴۸ گناہ گری حرام ہے	آیت اور ترجمہ
۲۶۳	۲۴۸ تقویٰ بہترین زاو راہ ہے	گناہ شد سے پرستہ
"	۲۴۸ تجارت جائز ہے	حج اور عمرہ
۲۶۵	۲۴۹ درس نمبر ۸۲ بقیہ آیت ۱۹۸ تا ۱۹۹	اللہ کا مفہوم
"	۲۵۰ آیات اور ترجمہ	احصار کے مسائل
"	۲۵۱ ربط آیات	قربانی اور علق
"	۲۵۲ وقف عرفہ	احرام کی جنایات
۲۶۷	۲۵۲ عرفات کے معانی	حج کی اقسام
۲۶۸	۲۵۳ عرفات کی مصروفیات	تمتع اور قربانی
"	۲۵۴ عرفات سے واپسی	قربانی کا بدل
۲۶۹	۲۵۵ وقف مزدلفہ	تمتع کی شرط
۲۷۰	۲۵۵ ذکر الہی	احکام کی پابندی
۲۷۲	۲۵۶ قریش مکہ کا شخص	درس نمبر ۸۱ آیت ۱۹۸ تا ۱۹۹ تقریباً نصف
۲۷۳	۲۵۷ استغفار کا حکم	آیات اور ترجمہ

۲۸۹	سعودی عرب میں اجرائے حدود	۲۷۴	درس نمبر ۸۳ آیت ۲۰۰ تا ۲۰۳
"	جان نثارین اسلام	"	آیات اور ترجمہ
۲۹۲	درس نمبر ۸۵ آیت ۲۰۸ تا ۲۱۰	۲۷۵	منیٰ کی مصروفیات
"	آیات اور ترجمہ	۲۷۶	طلعت زیارت
"	مکمل اسلام	"	خانہانی تغاخر
۲۹۳	شیخ المنذ اور ترجمہ قرآن	۲۷۷	ذکر الہی
۲۹۴	بعثت کی تردید	۲۷۸	دنیا کی خواہش
۲۹۶	ظاہر و باطن میں یکجائی	"	دنیا اور آخرت
۲۹۸	اسلام انقلابی مذہب ہے	۲۸۰	ذخیرہ آخرت
۲۹۹	شیطان کے نقش قدم	"	ایمان لشریق
"	وعید خداوندی	۲۸۱	قیام منیٰ میں تخفیف
۳۰۰	اللہ تعالیٰ کا فیصلہ	"	قانون کی پابندی
۳۰۲	درس نمبر ۸۶ آیت ۲۱۱ تا ۲۱۲	۲۸۲	تقویٰ کیا ہے
"	آیات اور ترجمہ	۲۸۳	درس نمبر ۸۴ آیت ۲۰۴ تا ۲۰۷
"	واضح نشانیاں	"	آیات اور ترجمہ
۳۰۳	انبیاء نعمت الہی ہیں	"	ربط آیات
۳۰۴	انعامات کی ناقدری	۲۸۴	مخلص اور منافق
۳۰۶	حُب دنیا	۲۸۵	اصلاح قلب
۳۰۷	اہل ایمان سے ٹھٹھ	"	فاو فی الارض
"	اہل تقویٰ	۲۸۶	تولیٰ بمعنی حاکم
۳۰۸	رزق کی فراوانی	۲۸۷	جرائم کی سرپرستی
۳۰۹	مال کے تین مصرف	۲۸۸	تجربہ کارانہ
۳۱۱	درس نمبر ۸۷ آیت ۲۱۳	۲۸۹	مسلمان مگر منافق

۳۳۱	درس نمبر ۸۹ آیت ۲۱۸ تا ۲۱۸	۳۱۱	آیت اور ترجمہ
"	آیات اور ترجمہ	"	گزشتہ سے پیوستہ
۳۳۲	گزشتہ سے پیوستہ	۳۱۲	امتن واحدہ
۳۳۳	جہاد اور قتال میں فرق	۳۱۳	بعثت انبیاء
"	فرض عین اور فرض کفایہ	۳۱۵	کتاب مادیہ
۳۳۵	خیر و شر اللہ کے علم میں ہے	۳۱۶	وجہ اختلاف
"	غالب اور مغلوب	"	حق و باطل میں تمیز
۳۳۶	حرمیت والے مہینے	۳۱۸	صبر و استقامت
۳۳۷	شان نزول	"	ہدایت ربانی
۳۳۸	حرام فعل	۳۲۰	درس نمبر ۸۸ آیت ۲۱۳ تا ۲۱۵
۳۳۹	سرنہ اور اسکی سزا	"	آیات اور ترجمہ
۳۴۰	اہل ایمان کے لیے خوشخبری	"	گزشتہ سے پیوستہ
۳۴۱	درس نمبر ۹۰ آیت ۲۱۹ تا ۲۲۰	۳۲۱	مشکلات کا سامنا
"	آیات اور ترجمہ	۳۲۲	سابقین کی مثالیں
"	گزشتہ سے پیوستہ	۳۲۳	نصرت الہی
"	موضوع آیت	۳۲۴	اشاعت دین
۳۴۲	شراب نوشی	۳۲۵	جانی اور مالی جہاد
۳۴۳	قمار بازی	۳۲۶	مجاہدہ ضروری ہے
۳۴۴	حرمیت شراب کے مراحل	"	خرج کی مدت (۱) والدین
۳۴۶	حرمیت شراب پر تاملیں	۳۲۷	(۲) اقرباء
۳۴۸	حرام چیز کی تجارت بھی حرام ہے	۳۲۸	(۳) یتیم و مسکین
"	خرج کی مقدار	"	(۴) مبالغہ
۳۴۹	ذخیرہ اندوزی کی ممانعت	۳۲۹	اسلامی معاشرہ

۲۶۹	توبہ اور پاکیزگی	۳۵۰	غزوہ فیکہ کی دعوت
۲۷۰	عہدت بمنزلہ کھیتی	۳۵۱	درس نمبر ۹۱ آیت ۲۲۰ بقیہ
۲۷۱	نیک اولاد صدقہ جاریہ	"	آیت اور ترجمہ
۲۷۲	درس نمبر ۹۲ آیت ۲۲۱ تا ۲۲۴	"	گزشتہ سے پرستہ
"	آیات اور ترجمہ	۳۵۲	شان نزول
"	رابط آیات	۳۵۳	یتیم کی سرپرستی
۲۷۳	مسئلہ قسم	۳۵۵	مفسد اور مصلح
"	ناجائز قسم کی ممانعت	۳۵۷	درس نمبر ۹۲ آیت ۲۲۱
۲۷۴	قسم کی نین اقسیم	"	آیت اور ترجمہ
۲۷۵	قسم کا کفارہ	"	رابط آیات
۲۷۶	مسئلہ ایثار	۳۵۸	مشترکین سے نکاح کی ممانعت
۲۷۹	درس نمبر ۹۵ آیت ۲۳۸	۳۵۹	اردو زبان ناقض نکاح ہے
"	آیت اور ترجمہ	"	شرک کیا ہے
"	رابط آیات	۳۶۱	اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے
"	نکاح اور طلاق	۳۶۲	دوزخ اور جنت کی طرف دعوت
۲۸۰	دوسرے مذاہب کے تقابل	۳۶۴	درس نمبر ۹۳ آیت ۲۲۲ تا ۲۲۳
۲۸۱	اسلام میں نظریہ طلاق	"	آیات اور ترجمہ
"	عدت	"	رابط آیات
۲۸۳	حیض یا طہر	۳۶۵	عورتوں کے مختص خرم
"	کتمانِ حمل جائز نہیں	۳۶۶	مدت حیض
۲۸۴	طلاق رجعی	"	افراط و تفریط
۲۸۵	حقوق زوجین	۳۶۷	سوال و جواب
۲۸۶	مرد کی فضیلت	۳۶۸	حائضہ کے احکام

۴۱۱	نکاح ثانی میں رکاوٹ نہ ہو	۲۸۷	طلاق کا حق مرد کو ہے
۴۱۲	درس نمبر ۹۹ آیت ۲۳۳	۲۸۹	درس نمبر ۹۶ آیت ۲۲۹
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	مطلہ رضاعت	"	رابط آیات
۴۱۳	مدت رضاعت	۲۹۰	نکاح سنتِ انبیاء ہے
۴۱۵	رضاعت اور خرچہ کی ذمہ داری	"	شرائط نکاح
۴۱۷	یتیم بچے کی رضاعت	۲۹۲	طلاق کی تین قسمیں
۴۱۸	مدت رضاعت میں رعایت	"	رجعی طلاق میں دو ہیں
"	اجنبی عورتوں سے رضاعت	۲۹۳	علحدگی کا طریق کار
۴۲۰	درس نمبر ۱۰۰ آیت ۲۳۲ تا ۲۳۵	۲۹۴	خلع کا بیان
"	آیات اور ترجمہ	۲۹۵	طلاق باللاع
۴۲۱	رابط آیات	۲۹۶	حدود اللہ کا احترام
"	عدت کی مختلف اقسام	۲۹۷	درس نمبر ۹۷ آیت ۲۳۰
۴۲۲	بیوہ کی عدت	"	آیت اور ترجمہ
"	غیر ذہاب میں قبائیں	"	حلالہ
۴۲۳	نکاح کی اجازت	۲۹۹	طلاق کی مختلف صورتیں
"	عدت میں اشارے کنائے کی اجازت	۳۰۰	طلاق ثلثہ کی تحقیق
۴۲۴	درس نمبر ۱۰۱ آیت ۲۳۶ تا ۲۳۷	۳۰۱	مشروط نکاح
"	آیات اور ترجمہ	۳۰۲	درس نمبر ۹۸ آیت ۲۳۱ تا ۲۳۲
"	رابط آیات	"	آیات اور ترجمہ
۴۲۸	حق مہر لازمی ہے	۳۰۶	طلاق برائے ایذا رسانی
۴۲۹	خاندان شاہ ولی اللہ	۳۰۸	تذکیر باحرار اللہ
۴۳۰	اورنگ زیب عالمگیر	۳۰۹	نکاح میں عورت کی رضامندی
۴۳۱	حق مہر کا عدم تقرر	۳۱۰	مطلہ ولایت

۴۵۱	درس نمبر ۱۰۴ آیت ۲۴۶	۴۲۲	مہرِ شل
"	آیت اور ترجمہ	۴۲۳	نصف مہر
"	رابط آیات	"	معافی تقویٰ کی علامت ہے
۴۵۲	اسلام کا سیاسی نظام	۴۲۴	فضیلت کی پاسداری
"	بنی اسرائیل کا زوال	۴۲۵	درس نمبر ۱۰۲ آیت ۲۳۸۴ ۲۳۲۴
۴۵۳	حضرت یحییٰ علیہ السلام	"	آیات اور ترجمہ
"	آغاز واقعہ	۴۲۶	رابط آیات
"	لفظ ملک کی تشریح	"	صلوۃ دلی
۴۵۴	ملوکیت کا تصور	۴۲۸	نہز خوف
۴۵۶	جماعت کی اہمیت	۴۲۹	بیروں پر احسان
"	بنی اور قوم میں مکالمہ	۴۳۰	مطلقہ کے حقوق
۴۵۷	بنی اسرائیل کی رد گردانی	۴۳۲	درس نمبر ۱۰۲ آیت ۲۳۵۴ ۲۳۲۴
"	ظالم اور عادل	"	آیات اور ترجمہ
۴۵۹	درس نمبر ۱۰۵ آیت ۲۴۸۴ ۲۴۴۴	"	رابط آیات
"	آیات اور ترجمہ	۴۳۳	اسلوب خطاب
۴۶۰	رابط آیات	۴۳۴	جہاد سے فرار اور موت
"	طاہرت بطور بادشاہ	۴۳۵	دوبارہ زندگی
۴۶۱	امیر کی خصوصیات	۴۳۶	جہاد سے گریز حرام ہے
۴۶۲	خلیفہ کا انتخاب	۴۳۷	جہاد کا حکم
۴۶۳	مولانا عبید اللہ سندھی	۴۳۸	جہاد بالمال
۴۶۶	شرائط خلافت	"	جہاد کی اہمیت
۴۶۷	آبروت کی کمی	۴۳۹	قرض حسنہ
۴۶۹	درس نمبر ۱۰۶ آیت ۲۴۹	۴۵۰	قبض و لبط

۴۶۹	آیت اور ترجمہ	۴۶۹	انسان اپنے ارادہ کا خود ذمہ دار ہے
۴۶۲	رہبط آیات	۴۷۰	درس نمبر ۱۰۹ آیت ۲۵۴
"	شکر طاعت اور جاہلیت	۴۷۱	آیت اور ترجمہ
"	شکر کی آزمائشیں سپاہی کے اوصاف	۴۷۲	رہبط آیات
"	اکثریت کی ناکامی	۴۷۳	جان و مال کی قربانی
۴۶۳	تین گروہ	"	الفاق فی سبیل اللہ
۴۶۴	تاریخی واقعات	۴۷۴	خروج میں اعتدال کی راہ
۴۶۵	درس نمبر ۱۰ آیت ۲۵۰ تا ۲۵۱	۴۷۵	روز قیامت خرید و فروخت نہ ہوگی
"	آیات اور ترجمہ	"	دستی کام نہ آئیگی
۴۶۶	رہبط آیات	"	عام سفارش نہیں ہوگی
"	میدان جنگ میں دعا	۴۷۸	کفار ہی ظالم ہیں
۴۶۷	جاہلیت سے مقابلہ	۴۸۰	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۵۵
"	حضرت داؤد علیہ السلام کا کارنامہ	۴۸۱	آیت اور ترجمہ
"	مناقب حضرت داؤد علیہ السلام	۴۸۲	رہبط آیات
۴۶۹	فلسفہ جہاد	۴۸۳	آیت الکہف کی فضیلت
۵۰۲	درس نمبر ۱۰۸ آیت ۲۵۲ تا ۲۵۳	۴۸۵	ترجید باری تعالیٰ
۵۰۳	آیات اور ترجمہ	"	مثلہ شفاعت
۵۰۵	رہبط آیات	"	علم غیب خاصہ خداوندی ہے
۵۰۷	بعثت انبیاء کا مقصد	۴۸۶	عرش اور کرسی
۵۰۹	تصدیق رسالت	"	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۵۶ تا ۲۵۷
"	انبیاء کی ایک دوسرے پر فضیلت	۴۸۷	آیات اور ترجمہ
"	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات	۴۸۹	رہبط آیات
۵۱۰	روح القدس سے تائید	"	دین میں جبر نہیں

۵۲۲	گدھا کیسے زندہ ہوا	۵۱۲	شانِ نزول
۵۲۳	عالمِ برزخ	۵۱۳	مضبوط کپڑا
۵۲۴	اجسام کی حفاظت	۵۱۴	نور اور ظلمت
۵۲۵	یقین کے تین مدارج	۵۱۵	طاغوت کی دوستی
۵۲۶	درس نمبر ۱۱۴ آیت ۲۶۰	۵۱۶	درس نمبر ۱۱۲ آیت ۲۵۸
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	تفسیر	"	رابطِ آیات
۵۲۷	پس منظر	۵۱۸	ابراہیم علیہ السلام اور غرور میں مناظرہ
۵۲۸	انبیاء شک سے پاک ہیں	"	غرور کا شجرہ نسب
۵۲۹	چاہ پرندے	۵۱۹	مناظرہ کب ہوا
۵۳۰	پروردگار کی موت و حیات	۵۲۰	مناظرے کا پس منظر
۵۳۱	کمال قدرت کا مشاہدہ	۵۲۱	اصل مناظرہ
۵۳۲	معجزہ اور کرامت	۵۲۲	غیر اللہ کو سجدہ
۵۳۳	درس نمبر ۱۱۵ آیت ۲۶۱ تا ۲۶۵	"	ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ
"	آیات اور ترجمہ	۵۲۳	ظالم ہدایت سے محروم ہیں
"	رابطِ آیات اتفاق فی سبیل اللہ	۵۲۴	درس نمبر ۱۱۳ آیت ۲۵۹
۵۳۴	اجرو و ثواب کے درجات	"	آیت اور ترجمہ
۵۳۵	معیار قبولیت	"	رابطِ آیات
۵۳۶	سائل کے ساتھ نرم رویہ	۵۲۵	متعلقہ شخص کون تھا
۵۳۷	درس نمبر ۱۱۶ آیت ۲۶۶ تا ۲۶۸	۵۲۶	تاریخی پس منظر
"	آیات اور ترجمہ	"	واقعہ پر سطحی نظر
۵۳۸	ابطال صدقہ کی پہلی دو وجوہ	۵۲۷	تباہ شدہ بستی
"	تیسری وجہ ریاکاری	"	موت و حیات کا منظر

۵۵۳	چٹان کی مثال	۵۵۳	آیات اور ترجمہ	۵۵۳
"	کافر راہنمائی سے محروم ہیں	۵۵۴	ربط آیات	"
۵۵۴	رضا الہی کے لیے خرچ	"	ابدایا اخفا	"
۵۵۵	باغ کی مثال	۵۵۵		"
۵۵۶	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۶۷ تا ۲۶۸	۵۵۶	غیر مسلم کے لیے صدقہ	۵۵۶
۵۵۷	آیات اور ترجمہ	"	حبلی غیر مسلم محروم ہے	۵۵۷
"	ربط آیات	"	ہدایت دہندہ صرف اللہ ہے	"
۵۵۸	قبولیت کی چوتھی شرط - پاکیزگی مال	۵۵۸	پورہ پورا بدلہ	۵۵۸
۵۵۹	ذاتی کائی میں سے خرچ	"	درس نمبر ۱۲ آیت ۲۶۳	۵۵۹
۵۶۰	معدنیات میں سے خرچ	۵۶۰	آیت اور ترجمہ	"
"	خبث مال قابل قبول نہیں	۵۶۱	ربط آیت	"
۵۶۱	شیطان کا بہکاوا	۵۶۱	فقیر و مسکین	۵۶۱
۵۶۲	اللہ تعالیٰ کا وعدہ	"	محصور و فطرار	"
۵۶۳	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۶۹ تا ۲۷۰	۵۶۳	فقراء کی پہچان	۵۶۳
۵۶۴	آیات اور ترجمہ	"	گمراہی حرام ہے	۵۶۴
"	ربط آیات	"	دین کی خدمت	"
۵۶۵	حکمت کا مضموم	"	درس نمبر ۱۲ آیت ۲۷۱ تا ۲۷۲	۵۶۵
۵۶۶	الفاق پر حکمت کا اثر	۵۶۶	آیات اور ترجمہ	"
۵۶۷	حکمت منع خوات ہے	"	صدقہ بمقابلہ سود	۵۶۷
۵۶۸	ملکہ نذر	۵۶۸	صدقہ کے چار مواقع	"
۵۶۹	نذر معصیت	"	ایصال ثواب کے لیے تعین وقت	۵۶۹
۵۷۰	ظالم بے یار مددگار ثابت ہونگے	۵۷۰	سود خورد کی حالت زار	۵۷۰
۵۷۱	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۷۱ تا ۲۷۲	۵۷۱	جن کا سایہ	۵۷۱
۵۷۲		۵۷۲		"

۶۱۳	رابط آیات	۵۹۲	تجارت بمقابلہ سود
"	گواہی کی شرائط	۵۹۳	سابقہ سود کی معافی
۶۱۴	عورتوں کی گواہی	۵۹۵	حرمیت سود کی حکمت
۶۱۵	شہادت اور قسم	۵۹۶	اہل ایمان کے لیے بشارت
۶۱۶	گواہ کی ذمہ داری	۵۹۷	درس نمبر ۱۲۲ آیت ۲۷۸ تا ۲۸۰
"	حبصہ کی گواہی	"	آیات اور ترجمہ
۶۱۷	تحریر کب ضروری ہے	"	رابط آیات
۶۱۸	کاتب اور گواہ کا تحفظ	۵۹۸	شان نزول
۶۱۹	خوف خدا	۵۹۹	سود خوروں کے لیے تعزیر
۶۲۱	درس نمبر ۱۲۵ آیت ۲۸۳	۶۰۱	تنگہ ست مقرض کے لیے مصلحت
"	آیت اور ترجمہ	"	معاف کردہ یا بہتر ہے۔
"	رابط آیات	۶۰۲	حکومت وقت کی ذمہ داری
۶۲۲	رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں	۶۰۳	آخرت میں محاسبہ
۶۲۳	امانت کی پاسداری	۶۰۴	درس نمبر ۱۲۳ آیت ۲۸۱ نصف اول
۶۲۴	کتمان شہادت گناہ ہے	"	آیت اور ترجمہ
"	شہادت کا معاوضہ جائز نہیں	"	دستاویز کی اہمیت
۶۲۶	درس نمبر ۱۲۶ آیت ۲۸۴	۶۰۵	تحریر کے مسائل
"	آیت اور ترجمہ	۶۰۶	قرض اور دین میں فرق
"	اختتامی کلمات	۶۰۷	بیع سلم
۶۲۷	حاکمیت اعلیٰ	۶۰۹	ادائیگی قرض کا عجیب واقعہ
۶۲۸	محاسبہ کب ہوگا	۶۱۰	تحریر مدیون کا حق ہے
۶۳۰	شان نزول	۶۱۲	درس نمبر ۱۲۴ آیت ۲۸۲ نصف آخر
۶۳۱	اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے	"	آیت اور ترجمہ

۶۳۲	درس نمبر ۱۲۸ آیت ۲۸۶	۶۳۳	درس نمبر ۱۲۷ آیت ۲۸۵
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	دین آسان ہے	"	رابط آیات
۶۳۳	بھول اور خطا میں فرق	"	در مدح صحابہؓ
"	بھول اور خطا پر مواخذہ نہیں	۶۳۴	تصدیق بالقلب
۶۳۵	دعا کی کلمات	۶۳۵	صفات الہی پر ایمان ایمان بالظہر
۶۳۶	معافی کی درخواست	۶۳۶	فرشتوں پر ایمان
"	غلبہ اسلام	۶۳۸	کتابوں پر ایمان
۶۳۷	سورہ بقرہ کی خصوصیت	۶۳۹	رسولوں پر ایمان
۶۳۸	فضائل آیات آخر سورہ	۶۴۰	سجش کی طلب
		"	قیامت پر ایمان

احکامِ عمرہ

مذہبِ اہل بیت مکتہ المکرمہ و مکتہ النور

مُرتب
مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

قیمت
۱۵/-
ردیے

مکتبہ دوس القرآن فافق گنج گوہر الزوالہ

صفحات
۹۶

پیش لفظ

لَحْمَدُ لِلّٰهِ وَكَفَىٰ وَسَلَٰهُ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰی
اَمَّا بَعْدُ

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا وہ آخری کلام ہے، جسے خود اللہ جل شانہ نے احسن الحدیث کا لقب دیا ہے۔ اللہ تَعَالٰی اَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مَّتَشَابِهًا مَّثَانِي عَرَبِيٍّ كَالِاِيك مَقُولًا ہے "کلام الملوك ملوك الكلام" جو کلام خود ملک الملک کا ہے، اس سے بہتر کلام کس کا ہو سکتا ہے جس کلام کی نسبت خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ کی طرف سے اس کی ہمہری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ اور جس کے متعلق وہ خود اعلان فرمائے كَلِمَةً اللّٰهُ هِيَ الْكَلِمَاتُ اُس سے اعلیٰ وارفع کلام کس کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود چلیج کر دیا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيثًا اُس خداوند قدوس کی بات سے سچی بات کس کی ہو سکتی ہے فرمایا اگر ان حقائق کے متعلق کوئی شک ہے۔ فَاتَّوَلَّوْا بِسُوءَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ لَاس جِیسی ایک ہی سورۃ بنا کرے آؤ مگر یہ چلیج آج تک تشنہ قبولیت رہا ہے۔

آئیے ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور اُن سے پوچھیں کہ کیا ہم نے قرآن حکیم کو وہ مقام دیا ہے جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اپنے دلوں کی زمین کو پرکھنا ہو گا کہ وہ قرآن پاک کی برکات کو جذب کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالْكَثِیْرُ يَجْبُثُ لَا يَخْرِجُ اَلَا نَسْکِدُ اُ اچھی زمین اللہ کے حکم سے سبزیاں اگاتی ہے مگر خراب زمین سے فضول چیزیں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اپنے دلوں سے سوال کرنے سے پہلے آئیے قرآن پاک کے اولین مخاطبین کی طرف ایک نگاہ اٹھا کر دیکھ لیں کہ

اُن پاکیزہ دلوں نے اس احسن الکلام کی برکات کو کس طرح اپنے اندر سمیٹ لیا۔
 فاروق اعظمؓ کی شہ زوری کے قلم سے زبان زدِ عام تھے۔ آپ قلب و جسم اور ارادے
 کے مضبوط انسان تھے، دیگر مخالفین کی طرح اہل اسلام کو زک کرنے میں پیش پیش تھے۔
 ایک رات ناپاک ارادے سے نکلے ہیں۔ حضور علیہ السلام حرم شریف میں نماز ادا کر رہے
 ہیں، سورۃ الحاقۃ کی آیات زبان پر ہیں الْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَا
 أَذْلَكَ مَا الْحَاقَّةُ کان میں آواز پڑی تو اس کی جلالت و شہرت سے متاثر ہوئے
 بغیر نہ رہ سکے۔ مخالفت کی آگ ٹھنڈی ہو گئی، قرآن کے نظم اور اسلوب بیان پر غور کیا، تو
 خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ کسی شاعر کا کلام ہے۔ مگر اسی لمحہ حضور علیہ السلام کی زبان مبارک پر یہ
 آیت تھی اِنَّهُ كَقَوْلِ رَسُولٍ كَرِيْمٍ ۝ وَمَا هُوَ يَقُولُ شَاعِرٌ
 قَلِيْلًا ۝ مَا تَوْحِشُنَّ ۝ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ پھر خیال آیا شاید یہ کسی
 کاہن کا کلام ہو۔ مگر اس کا جواب تھا وَلَا يَقَعَلْ كَاهِنٌ ۝ یہ کسی کاہن کا کلام بھی
 نہیں۔ بلکہ كُنْزٍ لِّمَنْ رَّبُّ الْعَالَمِيْنَ ۝ یہ تو تمام جہانوں کے پروردگار
 کا نازل کردہ ہے۔ دل پر چوٹ لگ چکی تھی۔ قرآن پاک کی حقانیت سے مغلوب ہو
 ہو چکے تھے۔ مگر ابھی مخالفت برائے مخالفت کا اثر باقی تھا۔

پھر یہی عمر فاروقؓ ایک دینِ ہادی عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے
 نکلے ہیں کہ راستے میں بہن اور بیٹوں کے ایمان لانے کی خبر ملتی ہے۔ فوراً ادھر کا رخ
 کرتے ہیں۔ دونوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں مگر جو یہی سورۃ طہ کی آیات کان
 میں پڑتی ہیں طٰه ۝ مَا اَنْذَرْتُكَ الْقُرْآنَ لِيَسْتَقْبَلَ ۝ اِنَّ
 تَذِكْرًا لِّمَنْ يَخْشَى ۝ (اے رسولِ عظیم! ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نازل
 نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔ یہ تو ہر ڈرنے والے شخص کے لیے یاد دہانی ہے)۔
 فاروق اعظمؓ کی تمام مشق و تدبیر ہو چکی تھی۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے ہنحوں
 کا سیلاب اُمٹ آیا، قلب نور ایمان سے منور ہو گیا، چنانچہ در اقدس پر حاضر ہو کر کھڑے ہو گیا۔
 طفیلِ دروسی بہت بڑے شاعر و ادیب اور اپنے قبیلے کے معززین میں سے تھے۔

مکے آتے ہیں تو قریش نے ہر چند سمجھا یا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں نہ بچس جانا۔ پہلے تو کانوں میں ردی مٹھوس کر پھر کے بہے کہ کہیں حضور علیہ السلام کی آواز نہ کان میں نہ پڑ جائے، پھر خیال آیا کہ میں بھی شعر و ادب پر عبور رکھتا ہوں، کیوں نہ اس کلام کا بھی جائزہ لیا جائے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نماز میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ طفیل سنتا ہے اور سنتا ہی رہ جاتا ہے جب آپ کے غم ختم کی تو ساتھ ہی سو گیا۔ اور اپنے آپ کو اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ کا مصداق بنا دیا، خود کہا کرتے تھے ”خدا کی قسم آج تک اس سے بہتر کلام نہ میرے کانوں نے سنا اور نہ اس سے زیادہ عادلانہ مزہب کوئی دیکھا۔“

جبیر ابن مطعم نیک سیرت انسان تھے۔ مگر جاہلیت کی عصبیت قبول حق میں مانع تھی۔ جنگ بدر کے قیدی چھڑانے کے لیے دونوں مدینہ منورہ آئے، حضور بنی کریم نماز میں سورۃ طور کی تلاوت فرما رہے ہیں وَالطُّورُ ۝ وَكُنِيبٌ مُّسْتُورٌ ۝ فِي رَفِیٍّ مِّنْشُورٍ ۝ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ۝ جبیر کہتے ہیں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا قلب پھٹ جائیگا، پھر جب آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۚ نَّهًا لَّهُ مِنْ دَافِعٍ ۚ تو کبھی طاری ہو گئی۔ ایسا خوف یہ ہوا کہ کہیں اسی وقت اللہ کا عذاب نازل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ جلد ہی ایمان لے آئے۔

حضرت عثمان ابن مظعون کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ سادہ طبیعت اور نیک انسان تھے، سورۃ نمل کی آیت سنتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْقَدْرِ وَالْاِحْسَانِ وَابْتِئَاۤیْ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغِیِّ ۚ یُعْظِمْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ خود بیان کرتے ہیں کہ ”یہی وہ قوت ہے جب ایمان میرے دل میں جاگنیں ہوا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا۔ الغرض! خود قرآن پاک نے اپنے متعلق فرمایا۔ لَوْ اَسْرَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاٰیۡتَہُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشِیۡمَةِ اللّٰہِ ۚ اگر یہ قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ بھی خُوبِ الثَّیِّی سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ مگر ایک حضرت انسان

ہے، جو اسکی اثر انگیزی سے بیگانہ اور اس کی برکات سے محروم ہے۔ ہاں اس کا اثر وہ شخص قبل کرتا ہے۔ جس کے پاس سرچنے والا دماغ، سمجھنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھ ہے۔ جس کی آنکھ میں روشنی نہیں اس کے لیے آفتاب کی روشنی بھی بیکار ہے۔ قرآن پاک قلب و ذہن کی کایا لپٹ مینے والا کلام ہے۔ اس میں دلوں کو کھینچ لینے والی مقناطیسیت ہے۔ اس نغمہ میں وہ سرور ہے جس کو سن کر انسان تو کجا بھر و حجر بھی وجد میں آجاتے ہیں۔ یہ قلب کو گرما اور روح کو تڑپا مینے والا کلام ہے۔ اللہ نے اس کا نام ہدایت بھی رکھا ہے اور نور بھی۔ یہ بہرہ دان بھی ہے اور فرقان بھی۔ اس میں ہمت بھی ہے اور شفا بھی۔ کاش! ہم اس کی برکات کو اپنے دامن میں سمیٹ سکیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے سلسلہ دروس القرآن جاری ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اس کار خیر میں حصہ لینے والی پوری ٹیم اور اس کے ساتھ داتے، درے، سننے تعاون کرنے والے حضرات کی استقامت اور کامیابی کی دعا کریں۔

الحمد للہ سلسلہ دروس القرآن کی تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر — مختلف جلدوں کا مختصر تعارف ہر جلد کے ساتھ آچکا ہے۔ یہ جلد اس لحاظ سے اہم ہے۔ کہ اس کے ذریعے سورۃ بقرہ کی تکمیل ہو رہی ہے۔ قرآن حکیم کی طویل ترین سورۃ کو دو حصوں میں شائع کیا گیا پہلا حصہ پہلے پاسے پر مشتمل تھا، اب دوسرے حصے میں دوسرا مکمل پارہ اور تیسرا پارہ تا اختتام سورۃ شامل ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے اس کام کی توفیق بخشی۔ جیسا کہ گزشتہ جلد کی ابتداء میں عرض کیا جا چکا ہے۔ سورۃ الی عمران پر بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ جلد بھی جلد ہی زیرِ طباعت سے مزین ہو کر قارئین کے مطالعہ میں آجائے گی۔ انشاء اللہ

سورۃ بقرہ سے پہلے تیسویں پاسے پر مشتمل بیسویں جلد شائع ہوئی تھی۔ قارئین کو نام تیسویں پاسے اور سورۃ بقرہ کے مضامین میں واضح فرق محسوس کریں گے بیسویں جلد کی ۲۷ سورتوں میں سے ۳۴ مکی دور کی ہیں جب کہ صرف ۲ سورتیں مدنی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ تیرہ سالہ مکی دور میں قرآن پاک نے اپنے مخاطبین کو اسلام کی ابتدائی دعوت

دی چنانچہ مکی سورتوں میں کفر و شرک کا رد، ایمانیات اور معاد سے متعلق موضوعات ہیں۔
برخلاف اس کے مدنی سورتوں کے مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو سب سے پہلے یہودیوں سے واسطہ پڑا۔ یہ لوگ قوراث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں پڑھ کر اُن کی آمد کے منتظر تھے۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ اللہ کا آخری نبی بنی اسرائیل میں سے آئے گا، اور وہ اُسے فوراً تسلیم کر لیں گے، اُن کی توقع کے خلاف جب دعویٰ نبوت بنو اسماعیل کے ایک فرد نے کیا، تو یہودی حسد کی آگ میں جل گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کر لیا تو اُن کی ساری اجارہ داری اور دوسری اقوام پر تفوق ختم ہو جائے گا۔ لہذا انہوں نے آپ کی رسالت کا سسر سے انکار ہی کر دیا، اور پھر اس انکار پر اصرار کرتے ہوئے اہل اسلام کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ دوسری طرف کچھ یہودی ایسے بھی تھے، جو اسلام کا روشن مستقبل دیکھ کر بظاہر مسلمان ہو گئے، مگر ان کے دل یہودیوں کے ساتھ منسلک ہے۔ اور اس طرح یہ لوگ مسلمانوں کے اندر سے اُن پر شب خون مار کر اُن کی جمعیت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہے یہ لوگ منافق کہلائے چنانچہ سورۃ بقرہ کے بیشتر حصہ میں۔ اہل کتاب یہود اور منافقین کی سازشوں کا تذکرہ ہے۔

مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمان ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب انہیں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے لیے قانون کی ضرورت تھی چنانچہ اس طویل سورۃ میں ایمانیات کے علاوہ امانہ، روزہ، حج، قربانی، اتفاق فی سبیل اللہ وغیرہ سے متعلق کچھ تفصیلات آگئی ہیں۔ حلت و حرمت کے مسائل ہیں۔ ازدواجی زندگی اور اس سے متعلق مسائل نکاح، طلاق، خلع، عدت، حمران، نفقہ، رضاعت وغیرہ کی بعض تفصیلات ہیں، معاشرتی مسائل میں والدین، اقرباء، ھمایلوں اور یتیموں وغیرہ سے حسن سلوک کی تعلیق ہے۔ خیرات و صدقات کی بدکات، لین دین کے معاملات، مقرض کے ساتھ نرمی، شہادت اور امانت جیسے مسائل بھی آگئے ہیں صلح و جنگ کے قواعد، قصاص اور دیت کی بعض مبادیات بھی آگئی ہیں۔ اس سورۃ

میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں کے ساتھ مکالمہ اور ابلیس کا تذکرہ بھی مجلاً ہو گیا
 جب الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپؐ کی اولاد میں منصب امامت کے قیام اور
 پھر اسی ضمن میں بیت اللہ شریف کی تعمیر اور دیگر شعائر اللہ کا مختصر بیان بھی آگیا ہے۔
 ہمیں پورا پورا احساس ہے کہ اس جلد کی اشاعت میں اندازے سے زیادہ عرصہ
 لگ گیا ہے۔ کام کی رفتار بھی قدرے سست رہی، نیز اس عرصہ میں ادارہ کو حضرت
 مولانا صوفی عبدالحمید صاحب کی گمراہ قدرت الیقین، نماز مسنون کلاں کی طرف بھی توجہ مبذول
 کرنا پڑی۔ بلاشبہ نمائندہ کے موضوع پر اس ضخیم کتاب نے باقی کتب سے بے نیاز
 کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محترم صوفی صاحب کی ایک دیرینہ خواہش اور عوام کی اہم ضرورت
 کو پورا فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صوفی صاحب کو اجر عظیم عطا فرمائے اور آپ کو دین کی مزید
 خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ قارئین سے التماس ہے کہ آپ کی صحت اور درازی عمر
 کے لیے صدقِ دل سے دعا کریں۔

امید ہے کہ سلسلہ دروس القرآن کی آئندہ جلد کم از کم وقت میں شائع ہو جائے گی۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ

احق العباد

لعل دین

ایم اے (علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن لاہور

سخنہائے گھنٹی

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِهِ
الْكَرِيمِ خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَ
أَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ ۔ اَمَّا بَعْدُ

مستند جامع، قرآن، احادیث اور مسلک سلف کے مطابق تفسیر، سادہ، دلپسند،
پُر مغز اور تصنع سے پاک انداز بیان، مختصر، عام فہم اور اغلاق سے مبرا مضامین، اسلام کے
بنیادی عقائد کی توضیح و تبیین، کفر، شرک اور بدعات کا احسن طریقے سے رد، مخالفین
پر تنقید میں اعتدال، اور تلخی و رشتگی سے گریز۔

مسلمانوں کی بنیادی غامیوں کی نشاندہی اور اس میں راہ عمل، باطل نظامہائے حکومت
پر بے لاگ تبصرہ، قصص کا سلسلہ مربوط اور دلکش، حکمت دلی الہی، ضروری فقہی مسائل
سیاسی، اقتصادی، معاشی مسائل اور عصر حاضر میں ان کا حل اور اس طرح کی مفید بحثیں درمیان
کا خاص اہتمام ہے۔

دلی الہی فکر اور قرآن کریم کی انقلابی روح کو پوری طرح ان دروس میں سمونے کی کوشش
کی گئی ہے، رد و ال، دواں، سہل، مانوس، آسان اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔
مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی بد حالی کا پورا کھوج لگایا گیا ہے۔ اور قرآنی طریق کار کی
طرف ان کا رخ موڑنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ سائنسی اور جدید دور میں مشکل
حالات کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں قرآنی روشنی کی طرف راہنمائی
کی گئی ہے۔ لہو و لعب، عیاشی و فحاشی اور رفاہیت بالغہ کی پوری طرح حوصلہ شکنی
کی گئی ہے۔

مسلمانوں کی فکری گمراہی اور ذہنی غلامی کے فساد کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے۔

دروس القرآن صحیح معنوں میں اساتذہ و شیدوخ سے حاصل کردہ اور حضرت صوفی صاحب
دام مجدہم کی زندگی بھر کے مطالعہ سے حاصل ہونے والے علوم و فنون کا بخور طیب ہے۔
زیر نظر جلد پارہ ۱۷ کے شروع سے سورۃ بقرہ کے آخر تک کے حصہ پر مشتمل
ہے اس جلد میں دعوت الی التوحید والرسالت، فرائض خمسہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ
ایمانیات، خلافت کبریٰ کے تمام اہم اصولوں، نظام سلطنت، سیاست مدن
قانون خانہ داری، جہاد فی سبیل اللہ، صداقت قرآن، علم القصص اور بہت ہی مثالوں
اور دیگر بہت سے مضامین کا ذکر ہے۔

قرآن پاک کا منشاء سمجھنے اور افہام کو قرآن پاک کے قریب تر کرنے اور سلف صالحین
کی تفاسیر سے صحیح آگاہی کے لیے دروس القرآن کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔
آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب
دام مجدہم اور انجمن مجاہدان اشاعت قرآن کے جملہ اراکین اور خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب
ام اے علوم اسلامیہ اور اسکی اشاعت میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی فوز و فلاح اور
بخشش کا ذریعہ بنائے، ان کی اس سعی کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو
اس سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط

محمد اشرف

(فاضل مدرسہ نصرت العلوم و دفاق المدارس العربیہ)

(۲۴ ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۸۰ء)

پیش لفظ

طبع ششم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَّمَ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ :

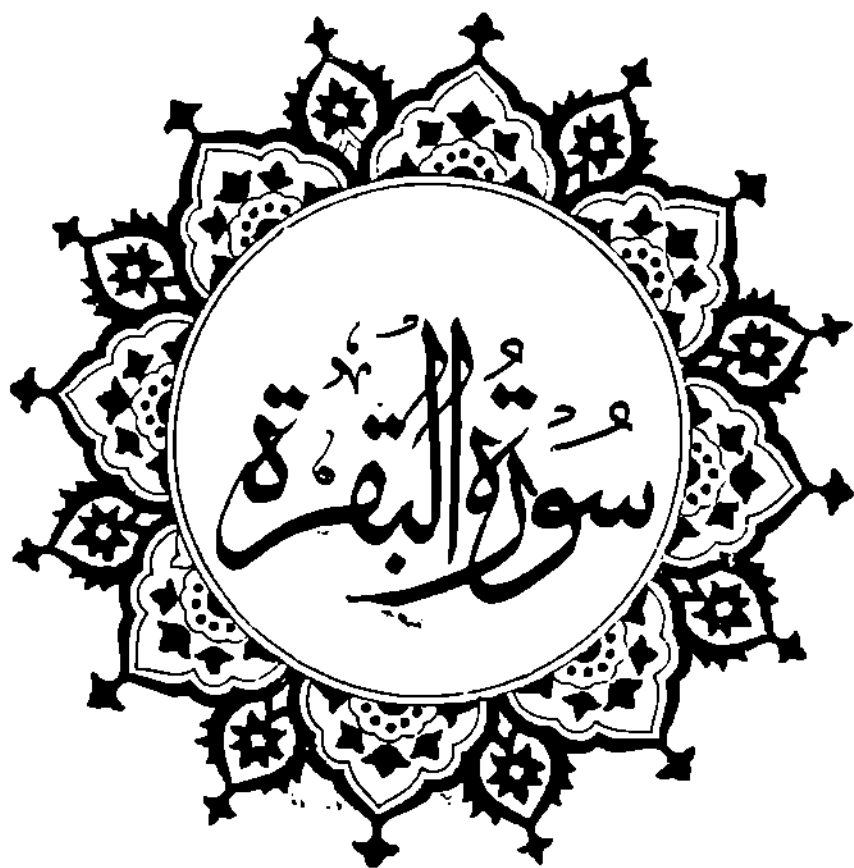
تفسیر عالم العرفان فی دروس القرآن کی تیسری جلد طبع ششم قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ رب العزت نے اس تفسیر کو اپنی خصوصی عنایات سے بے شمار شرف قبولیت سے نوازا ہے جس کا منہ بولنا ثبوت ایک قلیل عرصہ میں اسکے متعدد ایڈیشنوں کا طبع ہو کر چار دانگ عالم پھیل کر ذاتِ حسینِ معلّٰی کرنا، یہ تفسیر رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں بیس ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے کثیر خطوط اور ٹیلیفون کے ذریعہ عوام اٹا اس نے اس کے مکمل ہونے پر مبارکبادیں پیش کی ہیں اور اس بات کا برملا اقرار کیا ہے کہ اردو زبان میں اتنی سہل مفصل اور عام فہم تفسیر آج تک نہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ اہل سنت والجماعت جنہی دیوبندی مسلک کی صحیح ترجمانی اور اکابر علماء دیوبند کے جابجا مفید ذکر نے اس کی افادیت کو مزید اجاگر کیا ہے۔ اللہ رب العزت کے حضور دعا ہے کہ وہ اس تفسیر کو صاحبِ تفسیر کے لیے ابدی آرام و معافیت عطا فرمائے اور قارئین کے لیے نجات کا ذریعہ بنا دے اور دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لیے اور قرآن کریم سے تعلق قائم کرنے کا سبب بنائے۔ آمین۔

طبع ششم میں کتابت کی جو غلطی رہ گئی تھیں انہیں بھی کافی حد تک درست کر دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرمائے۔ آمین۔

احقر:

محمد فیاض خان سواتی

ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ بمطابق اگست ۱۹۹۹ء



سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس پنجاہ و پنج (۵۵)

آیت ۱۳۲ تا ۱۳۴

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ مِنْ قِبَلِهِمُ
الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي
مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۳۲﴾ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ
أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونََ
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۚ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ
الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ
يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى
الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ إِيْمَانَكُمْ

إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَءَوْفٍ رَحِيمٌ ﴿۱۳۳﴾

ترجمہ : غنغریب لوگوں میں سے یقوت لوگ کیسے گئے۔ کہ ان کو کس چیز نے ان کے
قبلہ سے پھیر دیا ہے، جس قبلہ پر رہتے۔ آپ کہتے تھے، اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق
اور مغرب۔ وہ جس کو چاہتا ہے۔ یہاں سے راستے کی راہنمائی کرتا ہے ﴿۱۳۲﴾ اور
اسی طریقہ سے ہم نے تمہیں ایک افضل امت بنایا ہے۔ تاکہ تم لوگوں پر گواہی
دینے والے بنو۔ اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہو۔ اور نہیں بنایا ہم نے اس قبلہ کو
جس پر آپ تھے مگر اس لیے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی تابعداری کرتا ہے
ان لوگوں میں سے جو اپنی ایڑیوں پر پھرتے ہیں۔ اور بیشک یہ بات بھاری ہے
مگر ان لوگوں پر کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمانوں کو ضائع نہ کرے
نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفقت اور نہایت ہی مہربان ہے ﴿۱۳۳﴾

تحویل قبلہ

اس سے پہلے قرنت ابراہیمی اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بیت اللہ شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کا قبلہ رہا۔ قیام مکہ کے دوران حضور علیہ السلام کا قبلہ بیت المقدس اور بیت اللہ دونوں ہی تھے بعض مفسرین کو رام فرماتے ہیں کہ آپ کو دوران نماز بیت اللہ شریف کی طرف اس طرح سُرخ کرتے تھے کہ یہ سُرخ بیت المقدس کی طرف بھی ہو جاتا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف سُرخ کیا۔ اور تمام ملکان اُسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے، اس میں بھی مصلحت تھی۔ بیت المقدس بھی سابقہ انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ اور اسی طرح بہت سے انبیاء کا قبلہ بیت اللہ شریف بھی رہا ہے، اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین علیہ السلام کے لیے خانہ کعبہ کو ہی قبلہ مقرر فرمایا، جو اُجھ قیام قیامت قائم رہے گا۔

ہجرت کے ابتدائی عرصہ میں بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کا ایک مقصد یہودیوں کی تالیف قلبی بھی تھا۔ تاکہ وہ مسلمانوں سے قریب تر ہو کر اسلام کی برکات سے فیضیاب ہوں۔ اور اس طرح دین حق کو مقبول کر لیں۔ مگر یہ لوگ انتہائی متعصب اور ضدی تھے، انہوں نے مسلمانوں کی رواداری سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہے۔ تاہم حضور علیہ السلام کی دلی خواہش یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ بیت اللہ شریف کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر فرمادیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو پذیرائی بخشی اور جیسا کہ اگلی آیات میں آئیگا، بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو قبلہ مقرر کرنے کا صریح حکم نازل فرمادیا۔

اہل کتاب جو کچھ ضدی، عنادی اور ہٹ دھرم تھے۔ اللہ رب العزت جانتے تھے کہ مسلمانوں کے قبلہ کی تبدیلی پر یہ لوگ اعتراض کریں گے اور مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کریں گے لہذا انہوں نے تحویل قبلہ کے حکم کے ساتھ ہی اہل اسلام کو خبردار کر دیا کہ یہ لوگ اس تبدیلی پر مسترض ہوں گے۔ لہذا تم ان کے

تحویل قبلہ پر
پہلا سفر

پراگئیڈ اسے متاثر ہو کر کسی قسم کے شک یا تردد میں مبتلا نہ ہونا۔ چنانچہ اہل کتاب کے پہلے اعتراض کا تذکرہ اس انداز میں بیان فرمایا سَقِفُوا الشُّقْفَا وَمِنَ النَّاسِ عَنِيبٌ اہل کتاب کے بیوقوف لوگوں میں سے بعض یوں کہیں گے مَا وَكَلَهُمْ عَن قِبَلَتِهِمُ الْحِجَابُ عَلَیْہَا سَلَامُ لوگوں کو ان کے قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے، جس قبلہ پر وہ پہلے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مسلمان ہجرت نبوی کے بعد مولد یا سترو ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اور اس کے بعد بیت اللہ کے قبلہ مقرر ہونے کا حکم نازل ہوا۔ تو یہودیوں نے اعتراض پیش کر دیا۔ کہ کیا اللہ تعالیٰ کو اس قبلہ کا پہلے علم نہ تھا۔ جواب نیا حکم دے دیا۔ پہلے قبلہ میں کیا خرابی تھی۔ وہ بھی سابقہ انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ اب اس کی تبدیلی کی کیا ضرورت پیش آئی۔ یہاں پر اہل کتاب کے لیے سَفَہاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو کہ سفیہ کی جمع

ہے۔ جس کا معنی بیوقوف ہے۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جو کوئی ملت ابراہیمی سے اعراض کرتا ہے، وہ بیوقوف ہے۔ وَمَنْ يَتَّخِذْ عَنْ قِبَلَةِ اٰیٰتِہِمْ اَلْمَنْ سَفِیۡہَ نَفْسِہٖ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم الفطرت آدمی ملت ابراہیمی سے انحراف نہیں کر سکتا۔ یہ یہود، نصاریٰ، اور مشرکین ہی ہیں، جو ایسا کرتے ہیں۔ لہذا یہ بیوقوفوں میں داخل ہیں۔ جو دین فطرت اور دین توحید اسلام کو قبول کر لے کے لیے تیار نہیں۔

اہل کتاب کے اس اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا قُلْ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اے پیغمبر علیہ السلام! آپ فرمادیں کہ یاد رکھو، مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے۔ یہ بات تو نہیں ہے کہ مشرق اللہ کا ہے اور مغرب کسی دوسرے کا۔ لہذا ہر جہت امی کی ہے تو پھر اُسی کی اطاعت لازم ہے۔ وہ جس طرف کو منہ کرنے کا حکم دے ماننا پڑے گا۔ اس میں کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرے گا، اُس کی خوشنودی کو پالے گا۔ اور جو اُس کے کسی حکم پر مسترض ہو گا، اُس کی تعمیل میں لیت و لعل کرے گا۔ وہ ملعون اور مردود و محط ہے گا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ عبادت کے لیے کسی قبلہ یا جہت کا مقرر کرنا انسان کے محض جہانی

تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے روح کی توجہ و جدتہ
تجلی الہی کی طرف رہتی ہے، اس کا بظاہر رُخ کسی طرف بھی ہو، اس سے کچھ فرق
نہیں پڑتا۔ بیت المقدس یا بیت الشریف کی جنت کا قعر تو مسلمانوں کے الخاق و الخا
کی ایک علامت ہے کہ تمام عبادت گزاروں کا رُخ ایک ہی جنت میں ہوتا ہے
وگر نہ جس طرف بھی منہ کر لو، عبادت اسی کی ہوگی۔ پہلے گزر چکا ہے فَائْتُمَا
تَوَلَّوْا فَنَشَقُّ وَجْهَ اللّٰهِ تم جہ صبر بھی رُخ کر دو گے، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی
اُدھر ہی پاؤ گے۔ اسی لیے یہ مسئلہ ہے کہ دوران سفر اگر قبلہ کا تعین نہ ہو سکے۔ تو
جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھو گے۔ اللہ تعالیٰ قبول کرے گا۔ قبلہ معلوم
ہو جانے کے بعد نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دونوں قبلوں میں صرف
اس قدر فرق ہے کہ بیت المقدس اس لحاظ سے قومی قبلہ ہے کہ یہ خاص خاص
پیغمبروں کا قبلہ رہا ہے۔ اور بیت اللہ شریف بین الاقوامی قبلہ ہے کہ یہ تمام
انبیاء بشمول حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ ہے۔

مقام تحویل قبلہ

آگے تفصیل سے ذکر آئے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم بنی سلمہ کی مسجد میں ظہر یا عصر کی نماز ادا فرماتے تھے کہ دوران نماز
ہی قبلہ کی تبدیل کا حکم نازل ہوا۔ آپ نے آدھی نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے
پڑھی اور بقیہ نصف بیت اللہ شریف کی جنت میں صحیح حدیث میں آتا ہے کہ
نزدیک حکم پر جب حضور علیہ السلام نے پلٹ کر رُخ پھیر لیا۔ تو تمام صحابہ کرام بھی پلٹ
گئے، کسی کو کچھ تردد نہیں ہوا۔

اگلے روز قبا کے لوگ اپنی مسجد میں فجر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ ان کا رُخ
حسب معمول بیت المقدس کی طرف تھا۔ اسی دوران میں کسی نے آکر خبر دی کہ قبلہ
کا حکم تو بدل چکا ہے۔ تم ابھی تک بیت المقدس کی طرف رُخ کیے ہوئے ہو۔ یہ
سننے ہی لوگوں نے نماز کی حالت میں اپنا رُخ بیت اللہ شریف کی طرف پھیر
لیا۔ کسی شخص نے حیل و حجت نہ کیا۔ یہ صرف اہل کتاب تھے۔ جو تحویل قبلہ پر اعتراض

کر رہے تھے۔ اُن کے یہ اعتراضات آگے دُر تک چلے گئے ہیں اَلْغَرَضُ
اِلَى السَّيِّدِ بْنِ خَرْجٍ مَنْ دِيَارِهِمْ تَمَكُّ يَسْلَمُ مَوْقِعٌ بِمَوْقِعٍ مَلَأَ بِهِ يَهُودُ
نَصَارَى كَايَ شَكُوهُ بَارِبَارٍ مُنْظَرِ عَامٍ بِرَأْسِهِ۔ حالانکہ اگر مسلمانوں کی طرح وہ بھی
لمتِ ابراہیمی پر قائم ہوتے تو اس قسم کے اعتراضات پیش کرنے کی بجائے
اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے تسلیم خم کر لیتے۔

فرمایا مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل ہونی چاہیے
مگر بات یہ ہے کہ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلَى صَوَابٍ مُسْتَوْتٍ وہ سب
چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ اہل کتاب اپنی ضد کی
وجہ سے اس ہدایت سے محروم ہے حالانکہ اُن کی اپنی کتابوں میں بیت اللہ شریف
کے افضل اور بین الاقوامی قبلہ ہونے کے احکام موجود تھے اور یہ پیش کرتے بھی پائی
جاتی تھی کہ بنی آخر الزماں کا قبلہ بیت اللہ شریف یعنی خانہ کعبہ ہوگا۔

افضل اللہ
اسکی گواہی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ افضل بنایا ہے۔ اسی طرح
ہم نے تمہیں (اے اہل اسلام) امت بھی افضل بنایا ہے۔ وَكَذَلِكَ
جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا دُوسط کے لفظی معنی درمیان کے ہیں۔ یعنی تمہیں
درمیانی امت بنایا۔ اور ظاہر ہے کہ درمیان والی چیز ہی عدل و انصاف پر
مبنی اور افراط و تفریط سے پاک ہوتی ہے۔ لہذا یہی چیز افضل ہوتی ہے۔ گویا اللہ
تعالیٰ نے امت محمدیہ کو وَسَطًا کا لقب دیکر اُسے افضلیت کے مقام پر فائز فرمایا
ہے اور اس امت کے افضل ہونے کی غرض و غایت یہ ہے لَتَكُونَ لَهَا شَهِيدًا
عَلَى النَّاسِ تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بن جاؤ وَكَيكونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ
شَهِيدًا اور رسول اکرم علیہ الخیرۃ والسلام تم پر گواہی دینے والے بن جائیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس دور ہری گواہی کا مظاہرہ قیامت والے
دن میدانِ محشر میں ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک اپنی کتاب الازہد
میں حدیث لائے ہیں جس سے مذکورہ گواہی کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے روز جب صوبہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوں گے۔ اور مقدمہ چلے گا۔ تو سب سے پہلے اللہ رب العزت اسرافیل سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے میری امانت ادا کر دی۔ اسرافیل علیہ السلام عرض کریں گے کہ ہاں باری تعالیٰ میں نے وہ امانت جبرائیل علیہ السلام کو پہنچا دی۔ پھر جبرائیل کو طلب کر کے پوچھا جائے گا۔ کہ کیا اسرافیل نے میری امانت تم تک پہنچا دی۔ وہ اقرار کریں گے کہ ہاں اسرافیل علیہ السلام نے وہ امانت مجھ تک پہنچا دی۔ چنانچہ اسرافیل کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اور جبرائیل سے مزید سوال ہو گا۔ کہ تم نے میری امانت کے ساتھ کیا کیا، وہ عرض کریں گے کہ اے باری تعالیٰ! میں نے تیری امانت تیرے رسولوں تک پہنچا دی۔ اب رسولوں کو طلب کر کے پوچھا جائے گا کیا جبرائیل نے میری امانت تک پہنچا دی۔ تو رسول بھی عرض کریں گے، ہاں مولا کریم! جبرائیل علیہ السلام نے تیری امانت ہم تک پہنچا دی۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم نے اس امانت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ رسول عرض کریں گے کہ ہم نے قیرا پیغام اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ پھر امتوں کو طلب کیا جائے گا۔ اور پوچھا جائے گا۔ کیا میرے نبیوں نے میری امانت تم تک پہنچائی۔ فَمِنْهُمْ الْمُصَدِّقُ وَمِنْهُمْ الْمُكَذِّبُ پھر ان میں سے بعض امتیں تصدیق کریں گی۔ کہ اے اللہ! تیرے نبیوں نے تیری امانت ہم تک پہنچائی۔ اور بعض امتیں انکار کریں گی۔ کہ ہم تک وہ امانت نہیں پہنچی۔ انکار کرنے والی امتوں کے نبیوں سے کہا جائے گا کہ وہ اس بات پر گواہ پیش کریں کہ واقعی انہوں نے امانت اپنی امتوں تک پہنچا دی۔ تو انہیں کریم اپنی گواہی کے لیے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا نام پیش کریں گے۔ امت محمدیہ کو طلب کر کے پوچھا جائے گا تو وہ لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انبیائے کریم نے اپنی امانت اپنی امتوں تک پہنچا دی۔ وہ امتیں اس گواہی کا انکار کریں گی کہ مولا کریم۔ یہ لوگ ہمارے زمانہ میں نہیں تھے، ہم ان کو بالکل نہیں پہچانتے لہذا یہ ہمارے خلاف کیے گواہی دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

فرمانبردار ہو جاؤ۔ تو انہوں نے کہا کہ میں رب العلمین کا فرمانبردار ہو گیا۔ جو ارشاد ہو اس کی تعمیل کے لیے بسر و چشم تیار ہوں۔ اس قسم کے اصول پر چلنے والے لوگوں کے لیے تحویل قبلہ جیسی چیز کیسے بھاری ہو سکتی ہے۔ نماز کے متعلق بھی پہلے پارہ میں گزر چکا ہے وَلَا تَهَيَّأُوا لِلْحَيَاةِ إِلَّا عَلَى الْخُشُوعِ۔ یہ نماز منافقین پر بڑی بھاری ہے مگر ان لوگوں پر نہیں، جن میں عاجزی اور خشیت الہی جیسی صفات موجود نہ ہوں ان کے لیے تو نماز راحت کا ذریعہ ہے کیونکہ اس سے تعلق بالشہید ہوتا ہے۔ تو یہاں پر بھی فرمایا کہ تحویل قبلہ کا حکم اہل کتاب کے لیے سخت گراں ہے مگر ان لوگوں کیلئے نہیں ہے جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی ہے۔

تحویل قبلہ پر
دوسرا اعتراض

تحویل قبلہ سے تعلق اہل کتاب کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جو لوگ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے سے پہلے فوت ہو گئے ہیں۔ انہیں تو اس طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ تو بیت المقدس کی طرف ہی منہ کرتے رہے۔ لہذا اس نئے حکم کی روشنی میں ایسے لوگوں کی نمازوں کی کیا حیثیت ہوگی۔ وہ مقبول ہوں گی یا نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں اللہ نے فرمایا وَكَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ أَعْيُنَكُمْ اللہ ایسے لوگوں کے ایمان ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ایمان سے مراد نماز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی نمازیں ضائع نہیں کریگا۔ جو لوگ تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَكَدُوفٌ دُرُجِصْمُ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔ سابقہ لوگوں نے جو نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ اپنے اپنے انبیاء کے حکم کے مطابق صحیح طریقے سے ادا کی ہیں۔ لہذا ان کی نمازیں مقبول ہیں، ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس قسم کا معاملہ شرابیوں کے متعلق سورۃ مائدہ میں آئے گا۔ کہ جن لوگوں نے حرم شراب سے پہلے شراب نوشی کی تھی اور وہ فوت ہو گئے، ان کا کیا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکی کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ جس

وقت ایک چیز حرام نہیں تھی، اس وقت اس کے استعمال سے گناہ لازم نہیں آتا۔ ہاں جو شخص حرام شراب کے حکم آجانے کے بعد ٹھسے پئے گا، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجائے گا۔ اس مقام پر بھی اعتراض کا جواب یہی دیا۔ کہ جن لوگوں نے تبدیلی قبلہ سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ ان کی نمازیں بالکل درست اور اللہ کے ہاں قابلِ قبول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے وہ بڑے شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس پنجاہ و شش (۵۶)

(آیت ۱۴۳ تا ۱۴۷)

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ
 قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
 وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ
 الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
 رَبِّهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۳﴾ وَلَئِنْ
 أَنْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَتَّبِعُوا
 قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ
 بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَ هَؤُلَاءِ
 فَبَدَّ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۴۴﴾
 الَّذِينَ اتَّبَعْتَهُمْ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ
 وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۴۵﴾
 الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۴۶﴾

ترجمہ: یا تحقیق ہم آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف (بدل بار) پلٹنا دیکھتے ہیں۔ پس ہم آپ کو الی بنا دیں گے اُس قبلے کا جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ پس اب پھر دیں آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف۔ پھر جاں بھی آپ ہوں، پس پھر دیں اپنے چہروں کو اُن کی طرف۔ اور بیشک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی۔ البرہہ جانتے ہیں۔ کہ یہ حق ہے، اُن کے رب کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے، جن کو یہ کرتے ہیں ﴿۱۴۳﴾ اور اگر آپ اُن لوگوں کے پاس جن کو کتاب دی گئی ہے، ہر قسم کی نشانی

بھی لائیں۔ تو وہ پھر بھی آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور آپ بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ ان میں سے بعض، بعض کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے ہیں۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کا اتباع کیا اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے، تو بے شک آپ اس وقت نا انصافوں میں سے ہوں گے (۱۳۵) وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی، وہ اس کو اس طرح جانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ اور بیشک ایک گروہ ان میں سے البتہ حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتے ہیں (۱۳۶) حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس آپ شک نہ کریں ان میں سے نہ ہوں (۱۳۷)

وہ آیات

بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی ایک وجہ بیان کی جا چکی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ امتحان لے کر ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ کہ کون اللہ کے رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون ہے جو تعصب اور غناد پر مٹھ رہا ہے۔ چنانچہ اہل کتاب اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ کیونکہ وہ لوگ قتل ابیہار، ضد اور غناد میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کو تبدیل کر دیا تھا اور برائیوں میں منہمک ہو چکے تھے۔ وہ اگرچہ اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسمعیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے تھے۔ مگر عملی طور پر ان میں نسبت کا شائبہ تک نہ تھا۔

تو قبلہ کی دوسرہ وجہ

بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی دوسری وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی **قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ** تحقیق ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھتے ہیں۔ ہجرت مدینہ کے بعد اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے۔ مگر آپ کی خواہش یہ تھی۔ کہ بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر ہو جائے۔ چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کے لیے وحی کا انتظار کرتے تھے۔ اور اپنا چہرہ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی عام عادت مبارکہ یہ تھی۔ **لَقَدْ رَأَىٰ إِلَى الْأَرْضِ الْكَرْمَ مِنْ ظَهْرِهِ إِلَى السَّمَاءِ** یعنی آپ کی نگاہ مبارک اکثر مشرق زمین کی طرف رہتی ہے

مگر انتظار وحی میں آپ اپنی نگاہ بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔
 سابقہ کتب میں اس بات کی پیشین گوئی موجود تھی۔ کہ نبی آخر الزمان کا قبلہ وہی
 ہوگا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا یعنی خانہ کعبہ۔ نیز یہی جذبہ آپ کے قلب
 مبارک میں بھی ڈال دیا گیا تھا۔ لہذا آپ کی خواہش تھی۔ کہ بیت اللہ شریف کی طرف
 منہ کرنے کا حکم نازل ہو جائے۔ اور آخری نبی کی آخری امت کا قبلہ قومی کی بجائے
 بین الاقوامی مقرر ہو جائے۔ مسلمانوں کو اسی قبلہ (بیت اللہ شریف) کی طرف منہ
 کرنے کا حکم ہو۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کیا تھا۔ لہذا آپ اسی شوق
 میں نگاہ مبارک بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔

آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو شرف قبولیت بخشا اور تحویل قبلہ کا حکم
 نازل فرمایا۔ فَلَنُؤْتِيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا اب ہم آپ کو اس قبلے کا
 والی بنا دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ لہذا حکم ہوا۔ قُولِ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ آپ اپنا چہرہ الود مسجد حرام کی طرف پھیریں۔ وَحَيْثُ
مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرَ اور آپ لوگ جہاں بھی ہوں۔
 اپنے چہرہ کو اسی کی طرف پھیریں۔

تحویل قبلہ
 کا حکم

ہر کئی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی سلمہ کے محلہ میں
 بشر ابن برد ابن معروض کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ سے چار میل
 کے فاصلہ پر ہے۔ نماز ظہر کا وقت ہوا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع دیگر صحابہ محلہ
 کی مسجد میں نماز کے لیے تشریف لے گئے آپ نماز ادا فرما رہے تھے۔ کہ اسی
 دوران میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی قُولِ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ آپ دو رکعت ادا فرما چکے تھے۔ نزول وحی پر فوراً آپ نے اپنا رخ مبارک
 بیت المقدس سے بیت اللہ شریف کی طرف پھیر لیا۔ آپ کی اقتداء میں
 مرد اور عورتیں نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ نے رخ تبدیل کیا۔ تو امت
 صحابہؓ نے بھی اپنی صفوں کو پلٹ دیا۔ اسی لیے بنی سلمہ کی اس مسجد کو مسجد قبلتین

یعنی دو قبلوں والی مسجد کہا جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں لفظ شطر تفصیل طلب ہے۔ اس میں ایک حکم تو یہ ہے کہ کہ جہت قبلہ
قَوْلٍ وَجْهَتِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف
کر لیں۔ دوسری بات یہ فرمائی وَخَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
شَطْرَهُ تا تم جہاں کیوں بھی ہو اس کی طرف منہ کرو۔ لفظ شطر مختلف معانی میں
استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنی

نصف ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آ ہے، اِنْ شِئْتَ اَرْجُوْا اَنْ تَكُوْنُوْا
شَطْرَ اَهْلِ الْجَنَّةِ یعنی مجھے امید ہے کہ جنت میں جا لے والے کل لوگوں
میں نصف تعداد تمھاری ہوگی۔

شطر کا دوسرا معنی اجز و بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اِنْ الْفَرَاخِضَ شَطْرَ الْعِلْمِ
یعنی فراخ اور دراشت علم کا جزو ہے۔ مگر اس آیت کریمہ میں شطر جہت
کے معنی میں آیا ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ نماز شروع
کرتے وقت جس شخص کو کعبہ شریف نظر آ رہا ہو۔ اُسے عین کعبہ کی طرف رُخ
کرنے کا حکم ہے۔ اور جس کو کعبہ نظر نہ آتا ہو۔ اُسے عین کعبہ کی بجائے اُس کی طرف
یا اُس کی جہت میں رُخ کرنے کا حکم ہے۔

اس آیت میں عین کعبہ کی بجائے مسجد الحرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا
گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا قدرے مشکل ہے۔
لہذا پوری مسجد حرام کو کہ جہت کو وسعت دے دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن
عکاش کی روایت میں آتا ہے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنے والوں کے لیے
عین کعبہ جہت ہوگی۔ جو لوگ حد و حرم کے اندر نہ پہنچے ہوں۔ ان کے لیے
مسجد الحرام جہت ہے۔ اور جو لوگ حد و حرم سے باہر دروازے پہنچے ہوں
ہیں۔ ان کیلئے پورا حرم جہت ہے۔ مقصد یہ کہ جو لوگ خانہ کعبہ سے دور
ہوئے جائیں گے ان کے لیے جہت میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔

ایک دوسری حدیث شریف میں آئے ہے۔ مَابَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
 قِبْلَةٌ یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ اور یہاں اس کو ہم یوں کہیں گے
 کہ شمال اور جنوب کے درمیان قبلہ ہے۔ بمقصد یہ کہ اگر عین کعبہ کی طرف رُخ کرنے
 کا حکم ہوتا تو یہ دشوار تھا۔ اور جہت عام ہے۔ حتیٰ کہ جب تک کعبہ کی طرف بالکل
 پشت نہ ہو جائے۔ نماز درست ہے۔ اس کے لیے زاویہ قائمہ ضروری نہیں
 ہے اگر زاویہ حادہ کے ساتھ رُخ کر کے بھی نماز پڑھی جائے گی، تو وہ درست
 ہوگی۔ البتہ اگر آسانی کے ساتھ جہت کا تعین ہو سکے، تو ضرور کرنا چاہیئے۔
 ایک زمانہ میں غنایت اللہ خاں مشرقی نے اپنی تحقیق کے مطابق عام
 مسجدوں کے رُخ غلط بتائے تھے۔ دو ایب ریاضی دان تھے۔ ان کے نزدیک
 صرف بادشاہی مسجد کا رُخ درست تھا، باقی سب غلط تھے ان کے بقول نمازیوں
 کا رُخ عین قبلہ کی طرف نہ ہونے کی وجہ سے ان کی نمازیں باطل تھیں۔ ان کا یہ نظریہ
 غلط تھا۔ کیونکہ قبلہ کا تعین اللہ تعالیٰ نے ریاضی کے اصولوں پر کرنے کا حکم
 نہیں دیا۔ بلکہ فطری اصول پر جہت کعبہ یا جہت مسجد حرام کا حکم ہے۔

اگر عین کعبہ یا عین مسجد حرام کی پابندی لازمی ہوتی تو واقعی یہ بڑا مشکل کام تھا
 بعض مقامات پر عجمہ اور عجمین کی نمازوں میں بڑی بڑی لمبی قطاریں بن جاتی ہیں
 ایسی صورت میں ہر نمازی کا رُخ عین کعبہ یا عین مسجد حرام کی طرف ہونا ممکن ہی نہیں
 رہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صرف جہت کا حکم دیا ہے۔

جس طرح بدن اکپڑ اور مکان کی طہارت نماز کی شرائط میں سے ہے۔ اسی
 طرح استقبال قبلہ بھی نماز کے لیے بمنزلہ شرط کے ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے
 کہ نماز شروع کرتے وقت جہت قبلہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ریل گاڑی یا جہاز
 پر بھی سفر کر رہا ہے۔ تو قبلہ کا تعین کر سکتا ہے۔ تاہم اگر دوران نماز سواری پر ہو گیا
 وجہ سے رُخ تبدیل بھی ہو جائے، تو کوئی حرج نہیں، نماز درست ہوگی۔ البتہ جہاں
 تعین قبلہ ممکن نہ ہو، وہاں تجوی کا حکم ہے۔ یعنی اپنی طرف سے استقبال قبلہ کی

پوری کوشش کرے۔ اور نماز شروع کر لے۔ اور پھر اس طرح سے متعین کیا ہو
 رُخ غلط بھی ہوگا، تو نماز درست ہوگی۔ کیونکہ یہ نمازی کے اختیار سے باہر تھا
 اس کے متعلق آیت گزر چکی ہے۔ **فَاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُتِبَ عَلَيْكُمُ الْمَسَاجِدُ بِمَا لَمْ يَلْبَسُوا فِيهَا مِنْ مِّثْقَلِ ذَرَّةٍ مِنْ زِينَةٍ**
 موقع پر رات کے وقت صحابہ کرامؓ سے یقین کے ساتھ تعین قبلہ نہ ہو سکا ہر ایک
 نے اپنی اپنی کوشش اور سمجھ کے مطابق قبلہ کا تعین کیا۔ اگرچہ ان کے استقبال
 قبلہ میں ایک دوسرے سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن سب کی
 نمازوں کو شرف قبولیت بخشا۔ اور اس آیت کے ذریعے نماز کی درستگی کی تصدیق فرمائی
 استقبال قبلہ کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی ہٹ دھرمی کا ذکر
 کیا ہے۔ کہ یہ لوگ اہل ایمان کی مخالفت محض مخالفت کی بنا پر کرتے ہیں۔ دیکھو
 ان پر حق تو واضح ہو چکا ہے۔ **وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ** اور وہ لوگ جن
 کو کتاب دی گئی ہے۔ **يَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ** وہ جانتے ہیں
 کہ یہ حق ہے اُن کے رب کی طرف سے، مگر دیدہ و دانستہ حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔
 انہیں علم ہے کہ ان کی اپنی کتابوں کے مطابق بیت اللہ شریف کی حجت بالکل
 درست ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ نبی آخر الزمان کا قبلہ یہی ہے۔ اس کے باوجود
 مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔

مخالفت
 بلکہ مخالفت

ام المؤمنین حضرت صفیہؓ یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ کا باپ
 اور چچا یہودی عالم تھے اور خیبر میں رہتے تھے۔ جب حضور علیہ السلام مکہ مکرمہ سے
 ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ تو یہ دونوں بھائی آپ کو ملنے کے لیے
 آئے۔ آپ سے بالمشافہ گفتگو ہوئی۔ ملاقات کے بعد جب واپس خیبر پہنچے تو
 دونوں بھائیوں نے حضور علیہ السلام کے متعلق آپس میں کچھ بات چیت کی
 جسے ام المؤمنینؓ نے بھی سن لیا۔ آپ کے چچا نے آپ کے باپ سے پوچھا،
 کہ سچ سچ بتاؤ کہ کیا یہ وہی نبی ہیں۔ جن کا ذکر ہماری کتابوں میں موجود ہے۔
 صفیہؓ کے باپ نے تصدیق کی کہ ہاں یہ وہی نبی آخر الزماں ہیں۔ جن کی نشانیاں ہمارے

پاس موجود ہیں۔ اس پر چیلنے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہمیں اُن پر ایمان لے آنا چاہیے۔ مگر باپ کہنے لگا کہ جب تک میری جان میں جان ہے۔ میں اسکی مخالفت کرتا رہوں گا۔ اور آپ کے پروگرام میں رکاوٹ بنا رہوں گا۔ مقصد یہ ہے کہ محض عناد کی وجہ سے حضور علیہ السلام اور اہل ایمان کے ساتھ مخالفت ان کا جزو ایمان بن چکی تھی۔ حضرت صفیہؓ کا باپ جنگ خیبر میں قتل ہوا۔ آپ کو بڑی کی حیثیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں۔ حضور علیہ السلام نے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر اُن سے نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ خود حضرت صفیہؓ نے سنایا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اُن کی ضد اور عناد کا تذکرہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ حق کو چھپانے کی جتنی بھی کوشش کریں مگر وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں بلکہ ان کی ایک ایک حرکت کو خوب جانتا ہے۔

فرمایا اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وَلَکِنّ اَتَيْنَ الَّذِیْنَ اٰوْتُوْا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیٰةٍ اَکْرَآءَ اَہْلِ کِتٰب کے پاس ہر قسم کی نشانی بھی ملے آئیں۔ اور دلائل کے ساتھ ثابت کر دیں کہ بیت اللہ شریف ہی صحیح قبلہ ہے۔ مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَکُمْ پھر بھی یہ لوگ آپ کے قبلہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔ حالانکہ یہ چیز انجیل میں بھی موجود ہے کہ جب مسیح علیہ السلام آسمان کی طرف اٹھائے جا رہے تھے۔ تو اس سے کچھ عرصہ پہلے آپ اُنے فرمایا تھا کہ بھائی! میں تمہاری طرف اپنے خداوند کی جانب سے اُس موجود کو بھیجتا ہوں جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مگر اے لوگو! جب تک تمہیں عالم بالا سے قوت حاصل نہ ہو جائے تم پر دشلم میں ہی بھڑتا یعنی تمہارا قبلہ یہی ہو گا، اور پھر جب تمہیں قوت حاصل ہو جائے گی، تو تمہارا قبلہ بھی تبدیل ہو جائیگا۔ اس کے باوجود یہودیوں نے بیت اللہ شریف کو قبلہ تسلیم نہ کیا۔

استاذِ جہان کے زمانے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ بہت بڑے عالم ہوئے

ہیں۔ انہوں نے بیضاوی پر حاشیہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سابقہ کُتُب کی پیش گوئیاں بعض صریح الفاظ میں ہیں۔ اور بعض کنایہ کی زبان میں ہیں۔ اس آیت میں کنایہ بنایا گیا ہے۔ کہ موجود سے مراد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے اور نبیل کے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو جائے۔ اور انہیں قوتِ یعنی مسیح اور غلبہ حاصل ہو جائے گا تو قبلیہ بھی تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ دشلم قبلہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ قبلہ ہونے کی وجہ سے یہ دشلم یعنی بیت المقدس اب بھی محترم اور معزز ہے۔ مگر وہ قبلہ نہیں رہا۔ اس طرف رُخ کر کے نماز ادا نہیں کر سکتے۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ نماز کی حالت میں نمازی کے سینے کا جہت قبلہ ہونا فرض ہے۔ اور چہرے کا اُس رُخ پر ہونا سنت ہے۔ چنانچہ اگر نماز کے دوران سینہ جہت قبلہ سے منحرف ہو گیا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ چہرے کے منحرف ہونے سے نماز باطل نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ محض مکروہ ہوگا۔ استقبال قبلہ سے متعلق ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا کہ قمت ابراہیمی کو ماننے والوں میں سے مَنْ صَلَّى صَلَاتِنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاصْطَلَّ ذَبِیحَتَنَا اِنَّ ذَٰلِكَ الْمُؤْمِنَ یعنی جس نے ہمارے جیسی نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کیا۔ اور ہمارا ذبیحہ کھایا، اور وہ مؤمن ہے۔ اگرچہ یہودی بھی بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ مگر یہاں پر ہمارا قبلہ کہہ کر ان کے قبلہ کی نفی کر دی۔ اسی طرح وہ ہماری طرح نماز نہیں پڑھتے اور مسلمانوں کا ذبیحہ بھی نہیں کھاتے لہذا وہ ملتِ اسلامیہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔

دیانند سرسوتی آریہ سماجی ہندوؤں کا مشہور لیڈر گزرا ہے۔ اُس نے مسلمانوں پر اعتراض کرنا شروع کیا تھا کہ یہ لوگ ہندوؤں کو توبت پرستی کا طعنہ دیتے ہیں۔ مگر خود ایک مکان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ جب پتھروں سے تعمیر کیا ہوا ہے۔ کیا یہ بت پرستی نہیں ہے؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دو حصوں پر مشتمل کتاب لکھی اس کے ایک حصہ میں سرسوتی کے اہل اسلام پر دستِ عام اعتراضات کے جوابات لکھے، اور دوسرے حصے میں صرف قبلہ پر اعتراضات کا جواب دیا۔ قبلہ ما نامی یہ کتاب

بڑی وسیع اور نہایت ہی عمدہ کتاب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عجیب اعتراض ہے۔ کہا ہمارا استقبال قبلہ اور کجا تہار ہی بہت پرستی۔ تم کو بتوں کو نافع اور ضار سمجھ کر اس کے سامنے سجدہ کرتے ہو، اُن کی پوجا کرتے ہو۔ مگر ہم تو خانہ کعبہ کا صرف استقبال کرتے ہیں۔ لفظ استقبال خود بتلا رہا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی طرف صرف توجہ کرتے ہیں۔ اس کی پوجا ہرگز نہیں کرتے۔ لہذا تہار ہی بہت پرستی اور ہمارے استقبال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بت تمہارے مقصود ہیں۔ مگر ہمارا صرف رُخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے مقصود تو ذاتِ خداوندی ہوتی ہے۔

پھر دیکھئے عبادت کے لیے نیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر عبادت قبول نہیں۔ مگر استقبال قبلہ کے لیے نیت ضروری نہیں ہے۔ محض اس طرف رُخ کر لینا ہی کافی ہے۔ مشرکین بتوں کی پوجا نیت اور ارادے سے کرتے ہیں لہذا محض استقبال قبلہ عبادت کے زمرے میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اول سے آخر تک نماز کے کسی لفظ سے بھی لعظیم کعبہ کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہاں تو ایک ایک لفظ سے اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثنا اور لعظیم بیان ہوتی ہے۔ لہذا کعبہ شریف کی عبادت کا سوا ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نہ اور آگے چلیے خانہ کعبہ کی دیواریں یا اس کے پتھر مسلمان کا مقصود و غنہ نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر کسی وقت کعبہ کی دیواریں مہندم بھی ہو جائیں۔ العیاذ باللہ تو پھر بھی مسلمان نہ ہٹتے تو اسی طرف رُخ کریں گے۔ گویا اُن کے نزدیک ایجنٹ لاء پتھروں کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ اُس جگہ کو مرکز تعجلیاتِ الہی سمجھ کر اُس طرف رُخ کیا جاتا ہے۔ عجل اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت اللہ شریف کی تعمیر نو کے سلسلے میں جب ساری دیواریں گرا کر اُس جگہ پر قافیں کھڑی کر دی گئیں تو نماز کے وقت رُخ اُسی طرف ہی کیا جاتا تھا۔ لہذا معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف صرف جہت ہے، وہ معبود نہیں ہے۔ برخلاف اس کے بت پرست ہر اس طرف کو رُخ کر کے عبادت کریں گے۔ جس طرف بت رکھے ہوں گے کیونکہ

بہت اُن کے معبود ہیں۔ اور بتوں کی منتقلی پر اُن کا رُخ بھی اُسی طرف منتقل ہو جائیگا۔
 لفظ بیت اللہ سے خود بخود واضح ہے کہ اس سے مراد اللہ کا گھر ہے، نہ کہ
 خود اللہ رب العزت۔ اور یہ مکان یا جگہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کا مرکز ہے،
 یہ بذاتِ خود معبود نہیں ہے۔ ایک اور بات بھی ہے۔ کہ جب کوئی کسی مکان کی طرف
 جاتا ہے۔ تو اس کا مقصود سیٹھ اور پتھر کا بنا ہوا مکان نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصود وہ
 مطلوب اُس مکان کا مکیں ہوتا ہے۔ لہذا استقبالِ قبلہ سے ہمارا مقصود اللہ تعالیٰ
 ہوتا ہے، نہ کہ خانہ کعبہ۔ اور یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ کہ ستمی عبادت وہ ذات
 ہو سکتی ہے۔ جو خود بخود ہو۔ اور جس چیز کا قیام و بقا دوسروں کا سرمایہ منبت ہو، وہ
 عبادت کے لائق کیسے ہو سکتی ہے۔ اس خانہ کعبہ کو تفرشتوں نے بنایا۔ آدم علیہ
 السلام نے تعمیر کیا، پھر ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچا، یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔
 مولانا نانوتویؒ نے آخری بات یہ فرمائی۔ کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی چیز کا عکس
 یا تجلی اُس چیز کا عین ہوتا ہے۔ اور یہ تصویر یا تجلی اُسی چیز کی کبھی جابجائی جس کی وہ فی الواقع
 ہے۔ تو بجائی ہم کعبہ کو معبود نہیں مانتے بلکہ تجلی کا وہ معبود مانتے ہیں۔ اور اس طرف
 رُخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ تو گویا عین معبود حقیقی یعنی خداوند تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔
 خانہ کعبہ کے مرکز تجلیات ہونے کو ایک دوسرے طریقے سے سمجھئے۔ اور وہ
 یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی مثال ایسی ہے، جیسے سورج کی تجلی جو پوری کائنات
 پر پڑھتی ہے۔ اور کائنات کیا ہے۔ یہ زمین ہے۔ اس کے اوپر کچھ فضا ہے
 اور پھر عدم ہے۔ یعنی آگے کچھ بھی نہیں۔ جب سورج کی تجلی عدم پر پڑتی ہے۔
 تو زمین کی طرف واپس پلٹتی ہے۔ اور زمین پر بیت اللہ شریف مثل آئینہ کے
 ہے آپ دیکھتے ہیں۔ کہ جب سورج کی شعائیں آئینہ پر پڑتی ہیں۔ اور اس میں سورج
 کی چمک نظر آتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی تجلیات خانہ کعبہ پر پڑتی ہیں۔ تو
 اس میں اگر ٹھیک جاتی ہیں۔ اور اسے مرکز تجلیات بنا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ
 اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے اس مرکز خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ

کی طرف رخ کرنے سے خشوع اور اخبات پیدا ہوتا ہے۔
 ذرا غور فرمائیے، جس طرح خداوند تعالیٰ جنت سے پاک ہے۔ اسی طرح
 روح جیسی لطیف چیز کو بھی جنت کی ضرورت نہیں۔ برخلاف اس کے جسم
 انسانی مادی چیز ہے۔ اور مادی چیز کا رخ جس چیز کی طرف متعین کیا جائے گا وہ
 مادی ہوگی۔ لہذا مادی چیز ہونے کی بنا پر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ کہ اس کے
 اندر ایک قسم کا جہاد اور استقرار ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ ہم اُس تجلی الہی کی طرف رخ کھینے
 ہیں۔ اور اُس مالک الملک کی عبادت کرتے ہیں، جس ذات کی تجلی خانہ کعبہ پر پڑ کر
 اُس کی صفت بنتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تجلی اسی مقام پر پڑ رہی ہے
 اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ پوری زمین کی ابتداء اسی مکہ مکرمہ کے مقام سے ہوئی
 تھی۔ یہ جگہ ساری زمین کی نائے ہے۔ سب سے پہلے اسی مقام سے پانی کا ایک پہلو
 اٹھا تھا جو پھیل کر زمین جیسی بڑی چیز میں تبدیل ہو گیا۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو مقسم
 بلاد بھی کہا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تجلیات اسی مقام پر پڑتی ہیں۔
 لہذا یہ ہمارا قبلہ ٹھہرایا گیا۔

مسلمانوں کے قبلہ سے متعلق اعتراضات کے جواب حضرت مولانا نالوتویؒ
 کے علاوہ بعض دیگر علمائے کرام نے بھی دیے ہیں۔ ان میں دہلی کے مولانا ابوالمنصورؒ
 ہیں۔ اور پھر مولانا رحمت اللہ کیرلویؒ ہیں۔ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ
 چلے گئے۔ وہاں انہوں نے مدرسہ صوفیہ کی بنیاد رکھی۔ جو گذشتہ ایک صدی سے دینی
 طلبہ کی آساری کے علاوہ حجاج کرام کی خدمات بھی سرانجام دے رہا ہے۔ آپ نے
 عیسائیت کے رد میں ایک مدلل کتاب لکھی۔ جس پر جبرہہ کرتے ہوئے لندن
 کے سنڈے ٹائمز اخبار نے لکھا تھا۔ کہ اگر دنیا میں اس کتاب کو پڑھا گیا۔ تو عرصہ تک
 عیسائیت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

آریہ سماج ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے۔ ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوتا سمجھے جاتے
 ہیں۔ یہ لوگ بت پرستی کے خلاف اعتراضات کا جواب نہ دے سکے اور گھبرا گئے ظاہر

آریہ سماج اور
 تبلیغ

ہے۔ کہ بت پرستی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ لوگ بحث مباحثے میں مار کا
 جاتے چنانچہ انہوں نے تمام بتوں کا انکار کر کے تثلیث کا ایک نیا عقیدہ وضع کیا۔
 اور کہا کہ بت وغیرہ کچھ نہیں، صرف تین چیزیں قدیم ہیں یعنی خدا، مادہ اور روح، حالانکہ
 حقیقت یہ ہے کہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔ مادہ اور روح حادث ہیں
 یہ بد بخت بت پرستی کو ترک کرنے کے باوجود بھی مشرک ہی ہے، جس طرح نصاریٰ
 باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث میں مبتلا ہوئے، اسی طرح آریہ سراج بھی خدا،
 مادہ اور روح کی تثلیث کے قائل ہوئے۔

استقبالِ قبلہ
 میں خلوت

الغرض! فرمایا اے نبی علیہ السلام، اگر آپ ان کے پاس ہر طرح کی نشانی بھی لے
 آئیں، تو اہل کتاب آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے، ان میں سے ہر ایک کا الگ
 الگ قبلہ ہے۔ اور یہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کو بھی تسلیم کرنے کے لیے
 تیار نہیں۔ یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس ہے اور نصاریٰ صغیرۃ پھر کی طرف رخ
 کرتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے قبلہ پر مگن ہے۔ یہ لوگ اس قدر تعصب میں مبتلا ہیں
 فرمایا جس طرح یہ لوگ آپ کے قبلہ کا اتباع کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔
 اسی طرح وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبَلَتِهِمْ آپ بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے
 والے نہیں ہیں۔ کیونکہ جب تک اللہ کا حکم تھا۔ آپ اُس طرف رخ کرتے رہے
 جب خداوند تعالیٰ کا دوسرا حکم آگیا۔ تو آپ نے اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا۔
 اور بیت اللہ شریف کی طرف رخ کر لیا۔ اور ان کا اپنا حال بھی یہی ہے۔ وَهُكَآ
بَعْضُهُمْ يَتَّبِعُ قِبَلَةَ بَعْضٍ طوہ بھی بعض بعض کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں
 گے وَلَكِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی
 کی مِنْ كَيْفِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی علم آچکا
 ہے۔ إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ تو پھر آپ ان انصافوں میں سے ہوں گے جو
 مقام پر مشرک کے متعلق فرمایا لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ
 یعنی فرض کرو اگر آپ کسی مشرک سے مل جائیں تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے آپ نقصان اٹھائیں گے اور لوگوں میں ہر جائز

اس مقام پر فرمایا کہ اگر آپ نے لوگوں کو راضی کرنے کے لیے انکی بات مان لی بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی حکم آچکا ہے۔ تو پھر آپ کے لیے یہ بڑی نا انصافی کی بات ہوگی۔

اس آیت کی روشنی میں کہ بعض لوگ بعض لوگوں کے قبلہ کی پیروی نہیں کرتے مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں قبلہ سے متعلق بڑے نکات پیدا کیے ہیں۔

اہم رموز
اور قبلہ

فرماتے ہیں اسے

بادشاہوں کا قبلہ تاج و تخت ہوتا ہے
وہ ہمیشہ اس فخر میں رہتے ہیں کہ
سنہری بیکا انیس کے پاس ہے اور
دنیا دار لوگوں کا قبلہ سونا چاندی یعنی
مال و دولت ہوتا ہے۔

قبلہ شامل برد تاج و کمر
قبلہ ارباب دنیا سیم و زر

سورج پرستوں کا قبلہ پانی اور مٹی کا
بنا ہوا پتلا ہوتا ہے اور وہ اُسی بت
پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ مگر معافی سے
واقف حال لوگوں کا قبلہ جان اور
دل ہے۔ وہ ہمیشہ جان، دل،
روح اور قبر کی صفائی کے لیے کوشاں
ہوتے ہیں

قبلہ صورت پرست اب گل
قبلہ سنی شناساں جان و دل

عابد و زاہد لوگوں کا قبلہ قبولیت کا
محراب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس فکر
میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی نیکیاں
قبول ہو جائیں اور بکر دار لوگ فضول کلمہ
میں منہمک ہیں۔ ان کا قبلہ وہی ہے

قبلہ زلمہ و محراب قبول
قبلہ بد سیرتاں کا ر فضول

قبلہ تین پروردگار خواب و خورش
 قبلہ انساں بالمش پرورش
 پیٹ کے بجا دیوں کا قبلہ کھانے پینے
 اور سولے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اسی فکر
 میں رہتے ہیں۔ مگر انسان بحیثیت انسان
 عقل و دانش کی کھوکھلی کرتے ہیں۔ وہ
 اسی تگمے دو میں رہتے ہیں۔

قبلہ عاشق وصال بے زوال
 قبلہ عارف جمالی ذوالجلال
 عاشق کا قبلہ وصل لازوال ہوتا ہے۔ یعنی وہ
 ایسی ملاقات کا خواہشمند ہوتا ہے
 جس کو کبھی زوال نہ آئے۔ اور عارف
 لوگوں کا منتہائے مقصود حق تعالیٰ
 کا دیدار ہے وہ ہمیشہ دہاں تکم کی
 رسائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔
 قبلہ اصحاب منصب مال و جاہ
 قبلہ اہل سلوک اسباب راہ
 منصب پر فائز لوگوں کا قبلہ مال و
 دولت اور عزت و عظمت ہوتا ہے
 جب کہ خدا تعالیٰ کے راستے پر چلنے
 والے لوگوں کا قبلہ اُس راستے کے
 اسباب ہوتے ہیں جن کے ذریعے
 وہ مطلوب منزل حاصل کرتے ہیں۔

قبلہ حرص و امل باشد ہوا
 قبلہ قانع توکل بر خدا
 حرص اور آرزو والے لوگوں کا قبلہ ان
 کی خواہش کی تکمیل ہوتا ہے اور قناعت
 کرنے والوں کا قبلہ اللہ تعالیٰ پر
 اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے۔

فَرِیَآ اَکْذِبْنَ اَنْتُنَّھُمْ اَلْکِتٰبَ جَن لُّوْکُوں کو ہم نے کتاب دی ہے
 یعنی یہود و نصاریٰ۔ یَعْرِضُ فَمَنْکُمْ کَمَا یَعْرِضُوْنَ اَبْتَآ اَھُمْ لہ وہ اس

کہ یونہی پیغمبر اسلام علیہ السلام یا قرآن پاک کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو
 جانتے ہیں۔ وَرَأَىٰ فِرْعَوْنُ مَنَّهُمْ لَا يَكَفُّهُمْ إِلَّا لَحْجًا اور بے شک اُن میں ایک
 گروہ حق کو چھپاتا ہے۔ وَهُمْ يَكْفُرُونَ حالانکہ وہ سب کچھ جانتے ہو جیسے ہیں
 شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور کلام پاک کو بیٹوں کی طرح
 جاننے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بیٹا گرو میں ہونے کی وجہ سے اُس پر شک
 نہیں گزرتا، اسی طرح اہل کتاب حضور علیہ السلام کو اپنی ہی کابلوں میں موجود نشانوں کے
 پہچانتے ہیں کہ یہ آخری نبی ہیں۔ مگر تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہؓ
 بن سلامؓ کا مقولہ ہے کہ مجھے اپنے بیٹے کے متعلق شک ہو سکتا ہے کہ شاید
 اس کی ماں نے خیانت کی ہو۔ مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے بارے میں تردد نہیں
 ہو سکتا۔ فَرَمَا الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ یہ حق آپ کے رب کی طرف سے ہے۔ فَلَا
تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشَكِّكِينَ آپ شک اور تردد کرنے والوں میں نہ ہوں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس پنجاہ و ہفت (۵۷)

آیت ۱۴۸ تا ۱۵۰

وَلِكُلِّ وُجْهَةٍ هُومُؤَلِّيٰهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ
 اِنَّ مَا تَكُوْنُوْنَ اَيَاتٍ بِكُمْ اللّٰهُ جَمِيعًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
 شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۴۸ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
 شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا
 اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۹ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ
 فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا
 كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
 حُجَّةٌ ۚ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ
 وَلَا تَمْرُقْنِيْ عَلَيْنَكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵۰

ترجمہ: اور ہر ایک کے لیے ایک جہت ہے، وہ اُس کی طرف اپنا رخ کرنے والا ہے۔ پس سبقت کرو نیکیوں کی طرف۔ تم جہاں بھی ہو گے، تم سب کو اللہ تعالیٰ اکٹھا کر کے لائے گا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (۱۴۸) اور جس جگہ بھی آپ کہیں نکلیں۔ پس اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ اور بیشک یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے، جو تم کرتے ہو (۱۴۹) اور جہاں بھی آپ نکلیں پس اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ اور جس جگہ بھی تم ہو (اے اہل ایمان) پس پھیر دینے چہروں کو اُس کی طرف، تاکہ نہ ہو لوگوں کو تمہارے بار پر الزام اور حجت، مگر وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا اُن میں سے۔ پس اُن سے نہ ڈرو، اور مجھ سے ڈرو، اور تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ (۱۵۰)

رابطايات

تحويل قبلہ کا حکم نازل کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ ہر وقت لوگ یعنی متعصب یہود و نصاریٰ یہ ضرور اعتراض کریں گے کہ تحويل قبلہ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ مگر اے نبی کریم آپ اہل کے اعتراضات کو خاطر نہیں نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ بیت المقدس کا استقبال عارضی حکم تھا۔ اور کسی خاص مصلحت کے تحت دیا گیا تھا۔ مستقل قبلہ تو بیت اللہ شریف ہے جس کا حکم حضور نبی کریم علیہ السلام کی دلی خواہش کے پیش نظر دیا گیا۔ یہ تقرر کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ سابقہ کتب ساویہ میں موجود تھا۔ کہ آخری دور اور آخری نبی کا قبلہ وہی خانہ کعبہ ہوگا، جو براہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ اور اس میں اہل کتاب کے لیے آزمائش کا سامان بھی تھا۔ کہ ان میں سے کون ہے۔ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کر کے براہیمی قبلہ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ لہذا حضور علیہ السلام کو تسلی بھی دی گئی کہ آپ ان کے یہودہ اعتراضات کی پڑھ نہ کریں۔ بلکہ آپ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔ اور اس سلسلہ میں آپ کو کسی قسم کا شک یا تردد نہیں ہونا چاہیئے۔

ہر امت کیلئے
جہت مقرر ہے

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ وَجْهَةٌ ۖ هُوَ مَوْجُودُهَا یعنی ہر امت کیلئے ایک جہت مقرر ہے جس کی طرف وہ رخ کرتے ہیں۔ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں ہوگی جس کی جہت مقرر نہ ہو۔ اب یہ جہت صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اور محرف بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم ہر امت کا قبلہ ضرور مقرر ہے۔ اور پھر آخری امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر فرمایا۔ جب یہ ایک اصول موجود ہے تو پھر اہل کتاب کو مسلمانوں کے قبلہ پر معترض نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسا کرنا سخت نا انصافی کے مترادف ہے۔

جہت فردی
چیز ہے

یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ استقبال قبلہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اور فرعی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ کوئی ایسا بنیادی مسئلہ نہیں ہے جس پر انسان بہت اصرار کرے لہذا اس قسم کی معمولی بات پر جھگڑنا

انصاف پسند لوگوں کا کام نہیں ہے۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر آئے گا کہ اصل مقصد تہ عبادت الہی ہے۔ جہت کا تعین تو محض توجہ کے لیے ہوتا ہے وگرنہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ جہت کی وجہ امت میں مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ عبادت کے لیے وسیلہ یا شرط ہے

فرمایا اصل اور بنیادی چیز نیکی ہے۔ فَاتَّبِعُوا الْخَيْرَاتِ۔ لہذا نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔ یعنی زیادہ سے زیادہ نیکیاں حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ أَتَيْنَاكُمْ كَوْمًا تَمَّ جِبَالٌ بھی ہو گئے، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا جَمِيعًا اللَّهُ تَعَالَى تم سب کو اکٹھا کرے گا اور پھر آخرت میں بھی سب کو اکٹھا کر کے سب کا عذاب کرے گا۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے سب کا رخ ادھر مقرر کر دیا۔ اور سب کو اس پر جمع کر دیا۔ فرمایا آگے چل کر نیکی ہی تمہارے کام آئے گی۔ لہذا نیکی میں سبقت حاصل کرو۔ حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ کو فرمایا۔ اے علی! تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو۔ “الصلوة إذا أنت” یعنی نماز کا وقت ہو جائے تو تاخیر نہ کرو۔ “والحجارة إذا حصرت” اور جب جنازہ تیار ہو جائے تو جلد پڑھو، تاخیر نہ کرو۔ “والأقرب إذا وجدت لها كفواً” اور جب بے نکاح (مرد یا عورت) کا ہمسرا مل جائے تو نکاح میں تاخیر نہ کرو۔ یہ سب نیکی میں سبقت کرنے والی باتیں ہیں۔

فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب کو ایک قبلہ پر اکٹھا کر دیا، اسی طرح آخرت میں بھی سب کو جمع کر دے گا۔ اور یہ اُس کے لیے قطعاً محال نہیں کیونکہ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اُس کے احاطہ اختیار سے کوئی چیز باہر نہیں۔

استقبال قبلہ کے نہ کرنے احکام

اگلی دو آیات میں استقبال قبلہ کا تین دفعہ حکم دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور آپ جس جگہ نکلیں، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔

فرمایا۔ فَلَا تَلْعَنُوا لِمَنْ دَخَلَ مِنْكُمْ الْبَيْتَ اور بیشک یہ آپ کے رب کی طرف سے عمنہ ہے
وَمَا اللَّهُ بِكَافٍ لِعَمَلِكُمْ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے
جو تم کرتے ہو۔ دوسری بار پھر ارشاد فرمایا وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور آپ جہاں کہیں بھی نکلیں، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف
پھیر لیں۔ اسی آیت میں پھر آگے فرمایا وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ حِينَ تَقُومُ اور آپ لوگ جس مقام
پر بھی ہوں فَتَوَلَّوْا وُجُوهَكُمْ شَطْرَ شَطْرِ اُنْہی کے چہروں کو اسی کی طرف پھیر لیں۔
ایک ہی مقام پر تین بار استقبال قبلہ کا حکم دینے کی مختلف توجہات ہیں۔
بعض فرماتے ہیں کہ استقبال قبلہ کا پہلا حکم ان لوگوں کے لیے ہے۔ جو حدود
حرم کے اندر رہتے ہیں۔ اور دوسرا حکم اُن کے لیے ہے جو ملک عرب میں اقامت
پذیر ہیں۔ مفسرین کو یہ فرماتے ہیں کہ تیسرا حکم عرب کے علاوہ باقی ساری دنیا کے
سُہنے والوں کے لیے نازل ہوا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کو یہ فرماتے ہیں کہ پہلا حکم اس لیے دیا گیا کہ حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی مرضی اور خواہش تھی۔ کہ قبلہ ابراہیمی ہی ہمارا قبلہ مقرر ہو۔ لہذا یہ حکم
دیا گیا۔ فرمایا دوسرا حکم اس واسطے دیا گیا کہ سابقہ حکم میں اسکی پیش گوئیاں موجود
تھیں۔ اور ان کی تصدیق کے لیے یہ دوسرا حکم نازل کیا گیا۔ پھر تیسری دفعہ استقبال
کا حکم اس لیے دیا کہ لوگوں کو الزام کا موقع نہ ملے۔ کہ دیکھو! مسلمان ہمارے قبلہ کی طرف
رُخ کرتے ہیں۔ لہذا ہمارا دین سچا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔ کہ یہ غباری اہل
کتاب اس قسم کے اعتراض کریں گے۔ لہذا ان کو رفع کر کے کے لیے فرمایا
لِيَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ تاکہ آپ پر لوگوں کا الزام یا کوئی حجت
باقی نہ رہے۔ کبھی یہ نہ کہنے لگیں کہ جب قبلہ ہمارا الیکم کرتے ہیں۔ تو ہمارا باقی دین
کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

فرمایا اس اتمام حجت کے باوجود بعض لوگ حجت بازی سے باز نہیں آئیں
گے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فِيْ اٰهْلِ اٰلِ

میں سے ظالم لوگ ہونگے جو اپنی بات پر اڑے رہیں گے اور تحویل قبلہ پر یہودہ قسم کے اعتراض کرنے میں جھجکا ہٹ محسوس نہیں کریں گے فرمایا کہ اہل کتاب تو صرف تحویل قبلہ پر ایک اعتراض کریں گے مگر مشرکین ہر دھور تو ان میں متفرق رہتے یعنی بیت المقدس کو قبلہ بچڑانے پر بھی اعتراض کریں گے اور اس کے بیت اللہ شریف کی طرف پلٹنے پر بھی متعرض رہیں گے۔

فرمایا اس قسم کے حجت بازوں کی آپ بالکل پرواہ نہ کریں۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ آپ ان سے خوفزدہ نہ ہوں وَإِخْشَوْنِي بلکہ آپ مجھ سے ہی خوف لھائیں۔ یہ لوگ محض تعصب کی وجہ سے حق کو چھپاتے ہیں۔ اور آپ پر طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں ان کے اعتراضات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا خوف جائز نہیں ہونا چاہیے۔ جب اللہ کا خوف پیدا ہو جائیگا تو باقی تمام خوف خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

قلب تکمیل
نعمت ہے

اللہ تعالیٰ نے قبلہ مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی وَلَا تَسْخَرُوا رَفَعْنَا عَلَىٰ عُرْسِكُمْ اور تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں گویا بیت اللہ کا تقرر نعمت خداوندی کی تکمیل ہے۔ وہی بیت اللہ شریف جو تمام قبلوں سے افضل ہے۔ تجلی گاہ خداوندی اور پوری دنیا کے لیے مرکز ہدایت ہے دہاں پر کیے جانے والے عمل کا اجر و ثواب لاکھ گنا زیادہ ہے۔ اسی لیے یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ اگلی آیتوں میں کتاب، نبی اور عبادت خانے کا ذکر بھی آئے گا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے۔ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بے مثال قبلہ مقرر کیا ہے۔ اسی طرح کتاب بھی بے مثال دی ہے۔ اور دین بھی جامع اور کامل عطا کیا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت اس آخری امت کے لیے اٹھا رکھی ہے۔ منجملہ ان کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خلافت بخشی ہے۔ یہ بھی بہت بڑا انعام ہے۔ جو اولاد آدم کے علاوہ کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ہوا

وَلَوْ قَالَ رَبُّكَ لِلْعَالَمِينَ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ فَلَا تَنَابُتِ الْاِثْمِ
 ہے۔ اس میں تقویٰ کا اظہار ضروری ہے۔ اور عدل و انصاف قائم کرنا بہت بڑی بات
 ہے۔ پھر یہ ہے کہ خلافت کے لیے قانون اور شریعت کی ضرورت ہوتی ہے جو
 اللہ تعالیٰ نے عطا کی۔ یہ خلافت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بھی عطا کی یَا ذُرِّيَّتَا
 جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ بِمَقْصَدِي ۖ هَلْ أَتَاكَ نَبَأُ يَوْمٍ إِذْ جَاءَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
 تاکہ تم پر تکمیل نعمت ہو جائے۔ بیشک اللہ نے خلافت جیسی نعمت عطا کی۔ یہ الگ
 بات ہے کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں نے بھی اپنی نالافتی کی وجہ سے
 خراب کر دیا۔ اور ملکیت میں مبتلا ہو کر برائیاں اختیار کر لیں۔ ظلم و زیادتی کے مرتکب
 ہو گئے۔ تاہم اللہ نے اپنی نعمت مکمل کر دی۔ یہاں اسی بات کی طرف اشارہ ہے
 اللہ تعالیٰ نے تھوڑے قبلہ کی ایک اور وجہ یہ بیان فرمائی وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

قبلہ ذریعہ
ہدایت ہے

اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے تمام ہی سامان مہیا کر دیے ہیں۔
 مہیا کہ دُعائیں درخواست کی جاتی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
 اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ اسی طرح ابتدائے
 سورۃ میں فرمایا ذَلِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۚ يَهْتَدُونَ
 کے لیے ہدایت ہے۔ گویا کتاب اللہ بھی ذریعہ ہدایت ہے۔ یہ کتاب تقویٰ اور
 عدل و انصاف اختیار کرنے والوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وَاللَّهُ
 لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ان کی رہنمائی
 راہِ راست کی طرف نہیں کرتا وہ اندھیروں میں ہی بھٹکتے رہتے ہیں۔

الغرض! جس طرح بعض دوسری چیزیں ذریعہ ہدایت ہیں۔ اسی طرح قبلہ کو
 بھی ذریعہ ہدایت فرمایا وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ اللہ تعالیٰ
 نے ہدایت کے یہ سارے سامان مہیا فرمادیے۔

البقرة
آیت ۱۵۱ تا ۱۵۲

سيفعل ۲
درس پنجاہ و شصت ۵۸

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا
وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمُ
مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُونِيْ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِيْ
وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

ترجمہ: جس طرح کہ ہم نے تم میں سے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا، جو تم پر ہماری
آیتیں پڑھتا ہے، اور تم کو پاک کرتا ہے۔ اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اور تمہیں وہ
سکھاتا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ پس مجھے یاد کرو، میں تم کو یاد رکھوں گا۔
اور میرا شکر یہ ادا کرو۔ اور تم ناشکر گزار نہ بنو ﴿۱۵۲﴾

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جنت قبلہ کے متعلق فرمایا کہ تم جہاں کیسے
ہو، اپنا رخ بوقت نماز بیت اللہ شریف کی طرف کر لو۔ مگر یہود و نصاریٰ جو ظالم لوگ
ہیں اور بات بات پر بے جا اعتراض کرتے ہیں، ان سے خوفزدہ نہ ہوں۔ ان کے طعن
و تشنیع اور اعتراضات کی پروا نہ کریں۔ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم منسوخ
ہو چکا ہے۔ لہذا آپ ہر قسم کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بیت اللہ شریف کو اپنا
قبلہ اپنالیں۔ فرمایا اس کی غایت یہ ہے کہ وَلَا تُكْفِرُوا بِنِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ تاکہ میں تم پر اپنی
نعمت پروری کر دوں۔ وَلَتَلْكُم مِّنْهَا مِن بَرٍّ اذْکُرْکُمْ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ مقصد یہ
کہ قبلہ کی طرف رخ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔
اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو زیادہ فضیلت والا قبلہ مقرر فرمایا ہے۔ جو کسی خاص
قوم اور علاقے کے لیے نہیں بلکہ اقوام عالم کے لیے بین الاقوامی فریضت کا قبلہ
ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ اکہبت بڑا احسان ہے کہ اس خطہ کو یہ شرافت بخشی ہے۔ کہ اس

جگہ عبادت اور ریاضت کا اجر و ثواب دوسرے کسی بھی مقام کی نسبت بہت زیادہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اور پھر اس انعام کے دو حصے ہیں یعنی مادی اور روحانی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک مادی انعام ہے اور قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا روحانی انعام ہے۔

اقام نعمت

اتمام نعمت کے متعلق حضرت علیؑ کی روایت میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ انسان کے لیے تمام نعمت یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مقام ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے تمام نعمت یہ ہے کہ انسان کا خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔ کیونکہ صحیح معنوں میں مومن وہی ہے جس کا خاتمہ بالا ایمان ہو۔ اسی لیے خود انبیائے کرام بھی یہی دعا کرتے ہیں۔ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ۔ یعنی اے مولاکریم مجھے اسلام اور ایمان کی حالت میں موت دینا اور میرا حشر صالح لوگوں کے ساتھ کرنا۔ اسی طرح خلافت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو عطا فرماتا ہے

بعثت رسول

فَرَمَّا كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ حَسْبُ طَرَحِ هَمِّ نَظْمِ
تمہاری طرف ایک رسول بھیجا۔ یہاں پر لفظ کما تشبیہ کے لیے آیا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے تم کو فضیلت بخشی اور اقامت نعمت کیا۔ اسی طرح ہم نے تمہاری طرف عظیم الشان رسول بھیج کر تم پر احسان کیا اور اپنی نعمت کو کامل بنایا۔ رسول کا بھیجا بھی اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے انعامات میں سے ہے دوسری جگہ قرآن پاک نے حضور علیہ السلام کے وجود مبارک کو نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ اَلَمْ نُرْسِلْكَ إِلَى الَّذِينَ سَبَّكَ لَوْ اَنَّكَ لَمِنَ الْكَافِرِينَ۔ یعنی کیا اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف رسول بھیجا تو ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف احسان کیا اور تمہاری طرف عظیم الشان رسول بھیج کر تم پر احسان کیا اور اپنی نعمت کو کامل بنایا۔ رسول کا بھیجا بھی اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے انعامات میں سے ہے۔ گویا نعمت کو کفر کے ساتھ تبدیل کیا۔ مراد یہ ہے کہ خود حضور علیہ السلام جن کا وجود پاک اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی ناقدری کا مقصد یہ کہ جس طرح ہم نے تمہاری طرف

تمہیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔

کھا کا یہ کاف علت کے لیے بھی ہو سکتا ہے اس لحاظ سے کھ سے مراد یہ ہوگا۔ تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور تاکہ تم ہدایت کے راستے پر قائم رہو۔ اور اس طرح یہ کاف تشبیہ کا نہیں بلکہ تعلیل کا ہوگا۔ اور معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک عظیم الشان رسول اس لیے بھیجا تاکہ اتمام نعمت ہو جائے اور ہدایت کا راستہ بھی واضح ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ کھا بالکل اسی طرح ہے۔ جب طرح حضور علیہ السلام نے دعائیں سکھایا **اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ كَمَا كَسَوْنِي** کہ جب لباس پہنو تو یوں کہو کہ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ کہ تو نے ہمیں لباس پہنایا۔ یہ لباس بھی تو نے ہی عطا کیا ہے گویا اس لحاظ سے یہ کاف تشبیہ کی بجائے تعلیل کے لیے ہے یعنی جو علت کا معنی دیتا ہے۔

یہاں پر بھی لفظ رسول بطور اسم مکرر آیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک عظیم الشان رسول بھیجا ہے۔ بڑا رسول بھیجا ہے۔ جو کہ **هَذَا كُوْنُ** تم میں سے ہی ہے۔ اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں بھی گزر چکا ہے **رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ** یعنی اے ہمارے رب ہماری اولاد میں سے امت مسلمہ برپا کر اور پھر ان کے اندر ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔

تلاوت
ترکیہ

فرمایا ایک ایسا رسول **يَشْكُلُوْا عَلَيْكُمْ اَلْيَتْنَا** جو تمہارے سامنے ہماری آیتیں پڑھتا ہے۔ لفظ آیت مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ اس سے مراد معجزہ، نشانی، حکم یا فرمان ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارا مبعوث کردہ رسول ہماری آیات یعنی ہمارا کلام جو ہر لمحہ وحی نازل ہوتا ہے وہ پڑھ کر سنا ہے۔

وَيُنْذِرُكُمْ اور تمہارا تذکرہ کرتا ہے یعنی پاک صاف کرتا ہے۔ روزِ ابد اور گندے اعتقادات سے بچا کر تمہارے اندر اچھے اخلاق اچھے اعمال اور اچھے عادات قائم کرتا ہے۔ یہ ابا عظیم الشان رسول ہے جو تلاوت و تذکرہ کے ساتھ ساتھ **وَهَيَّاكُمْ** کتاب و الحکمہ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس تعلیم کا ذکر حضرت

کتاب و حکمت
کی تعلیم

ابراہیم علیہ السلام کی دُعائیں بھی آچکا ہے وہاں بھی انہوں نے یہی دُعا کی تھی۔ کہ سائے
 ہمارے رب اس امت مسلمہ میں ایسا رسول بھیج جو انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے
 اور ان کا تزکیہ کرے۔ وہاں پر تزکیہ کا ذکر کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد کیا تھا۔
 مگر یہاں پر اس کا ذکر پہلے آیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس مقدمہ و تاخیر میں
 بھی نکتہ پنہاں ہے۔ وہاں پر دُعا کا مقام تھا۔ کہ مولا کریم! ایسا رسول مبعوث فرما جو ان
 کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کا تزکیہ ہو جائے وہ ظاہری اور
 باطنی طور پر ہر لحاظ سے پاک صاف ہو جائیں اور یہ مقام عمل کا مقام ہے۔ تعلیم کتاب
 و حکمت کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کا تزکیہ ہو جائے۔ اب جب کہ امت
 مسلمہ پیدا ہو چکی، عظیم الشان رسول مبعوث ہو چکا۔ تو اب کتاب و حکمت کی تعلیم کی اصل
 غرض و غایت یعنی تزکیہ کو پہلے بیان فرمایا کہ جس طرح ہم نے تم میں سے ایک رسول
 مبعوث فرمایا جو ہماری آیات پڑھتا ہے۔ تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب و حکمت
 کی تعلیم دیتا ہے۔

الغرض! ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا مقام تعلیم اور پیش گوئی کا مقام تھا۔ اور یہ
 عمل کا مقام ہے۔ لہذا کتاب و حکمت کی تعلیم کی غرض و غایت یعنی تزکیہ کو پہلے بیان
 فرمایا جب تک مقصد حاصل نہ ہو، عمل کا کچھ فائدہ نہیں۔ تعلیم اُسی وقت مفید ہوگی۔
 جب اس کا مقصد تزکیہ حاصل ہو جائے۔ تعلیم مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالآثار
 تزکیہ ہے۔ جس کا تذکرہ اس مقام پر پہلے کیا ہے۔

فرمایا کتاب و حکمت کی تعلیم کے علاوہ ہمارا رسول وَیُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ
 تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ تمہیں وہ چیزیں بھی سکھاتا ہے۔ جو تم نہیں جانتے تھے۔ مثلاً
 لوگ وضو اور طہارت کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں پیغمبر علیہ السلام کی تعلیم کے ذریعے سکھایا۔ لوگ غل جنابت
 کے طریقہ سے ناواقف تھے۔ انہیں تعداد رکعات معلوم نہ تھیں۔ نماز اور دیگر عبادات
 کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ حلال و حرام کی تمیز نہ تھی۔ یہ سب چیزیں اللہ نے نبی کے ذریعے

ان جانی
 چیزوں کی
 تعلیم

سکھائیں۔ اسی کو فرمایا کہ ہمارا رسول تمہیں وہ چیزیں سکھاتا ہے۔ جو تمہارے علم میں نہ تھیں۔

حضرت جعفرؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ جب کچھ مسلمان قریش مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور کفار نے وہاں بھی مسلمانوں کا پیچھا کیا تو حضرت جعفرؓ نے بنجاشی کے دربار میں جو تقریر کی اس کا لب لباب یہ تھا کہ اے بادشاہ! ہم بت پرستی کرتے تھے۔ ہمارے اندر ہر قسم کی برائیاں موجود تھیں۔ حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتے تھے۔ ظلم و جور کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ حق و انصاف کے تقاضوں سے نا آشنا تھے، اللہ تعالیٰ نے ہم میں نبی آخر الزماں مبعوث فرما کر سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ خدا کے ساتھ شکر نہ کرو، اہل بیت پرستی سے باز آ جاؤ۔ صرف اسی وعدہ لا شریک کی عبادت کرو۔ حلال و حرام میں تمیز پیدا کرو۔ کسی کو ظلم کا نشانہ نہ بناؤ۔ اللہ کے نبی نے ہمیں عبادت کا صحیح طریقہ سکھایا۔ تہذیب و تمدن کے اصول بتلائے اور معیشت کے نکات سمجھائے۔

آپ نے عقائد کی اصلاح کے اصول بتائے۔ اور پھر پیش آئے والے واقعات کو بیان فرمایا۔ مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ قبر کی زندگی، قیامت کو دوبارہ جی اٹھنا پلھڑا پر سے گزرنے اور آخر میں محاسبے کی منزل، امیزانِ عدل کا قیام اور پھر رب العزت کا آخری فیصلہ، یہ سب باتیں حضور علیہ السلام نے امت کو بتلادیں گویا انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوا دیا اے لوگو! آؤ میں تم کو بتلاؤں کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے کس کس چیز کو حلال اور کس کس کو حرام قرار دیا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ میں تمہیں وہ چیزیں بتلاؤں، جو تم نہیں جانتے۔

اسی طرح حضور علیہ السلام نے مظالم سے بچنے کا طریقہ بتلایا۔ مولانا علیہ رحمۃ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام یہ ہے کہ اس نے بہترین نظام حکومت قائم کرنے کے اصول بتلائے اور پھر اپنی اصولوں کے مطابق نظام خلافت قائم ہوا عرب

کے لوگ ہزاروں سال تک نظام حکومت سے نااہل رہے، حالانکہ دیگر اقوام مثلاً رومی اور ایرانی نظام حکومت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا۔ کہ اپنے پیغمبر کے ذریعے نظام حکومت کی تعلیم دی۔ جسکی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں پچھم اسلام آدھی دنیا پر امرانے لگا۔ یہ سب چیزیں دیکھ کر تم کو تامل کرو تو انہیں کہو کہ تم نے کمال حاصل کیا۔

ان انعامات کا تذکرہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ جب میں نے اتنے بڑے بڑے انعامات تم پر کیے ہیں۔ تو پھر تمہارا بھی فرض ہے کہ خدا کو کوئی مجھے یاد کرو۔ گویا یہاں سے تہذیب کا باب شروع ہوتا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی قباحتیں بیان کیں۔ پھر ملت ابراہیمی کی بنیاد کا ذکر کیا۔ خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت ہونے کا بیان ہوا۔ پیغمبر علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ کتاب کا بیان آیا اور اب یہاں سے تہذیب انسانیت یا تہذیب نفس کے احکام شروع ہوتے ہیں۔ جن کی بدولت انسان میں تہذیب اور شائستگی پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اس مقام پر دو اصول بیان ہوئے ہیں۔ اور باقی تین اصول آئندہ ذکر میں بیان ہوں گے۔

تہذیب اخلاق کے پانچ اصول ذکر، شکر، صبر، دعا، تعلیم شاعرانہ

تہذیب نفس کا پہلا اصول جو یہاں بیان ہوا، وہ ذکر الہی ہے۔ گویا ہمارا انصاف تعلیم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ذکر زبان، عمل، قلب اور روح کے ذریعے ہوتا ہے۔ ذکر کا عام فہم طریقہ زبان کے ذریعہ سے ہے۔ انسان زبان کے ساتھ خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرتا ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ تلاوت کلام پاک کرتا ہے۔ یہ سب ذکر کی زبانی صورتیں ہیں۔ ایک صحابی نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا، حضور! اَجْزَلُ مَا لَمْ يَخْلُقْ كُنَّا عَمَلِ الْفَضْلِ ہے۔ فرمایا لَا يَزَالُ لِسَانُكَ وَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ یعنی تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔ ایک دوسری روایت میں فرمایا افضل عمل ایمان باللہ ہے۔ کہیں فرمایا کہ نماز سب سے افضل عمل ہے اور کہیں جہاد فی سبیل اللہ کو افضل عمل قرار دیا، تاہم یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انسان کی زبان ہر وقت ذکر الہی سے تر رہنی چاہیے۔ ذکر الہی ایک

پہلا اصول ذکر الہی

ایسی عبادت ہے۔ جب کوئی حد نہیں، نماز، روزہ، جہاد وغیرہ سب محدود ہیں مگر ذکر الہی غیر محدود ہے اسی لیے فرمایا اَذْكُرْهُمُ اللّٰهُ ذِكْرًا كَثِيْرًا اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر کثرت سے یاد کرو، ذکر الہی میں اتنے محو رہو کہ لوگ دیوانہ بننے لگیں۔ اور پھر ذکر الہی کا صلہ یہ ملے گا کہ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُوْنَ تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ الغرض ذکر الہی کثرت سے کرو، کیونکہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں۔

اہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حکمت کے مطابق جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر اخلاص، نیک نیتی اور اچھی کیفیت کے ساتھ کرتا ہے۔ ترانس ٹرانسجی حقیقۃ القدس کی طرف ہوتا ہے۔ پھر اس کا تعلق روحِ اعظم کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جو کہ حقیقۃ القدس میں ایک بڑی روح ہے۔ بنی نوع انسان کی یہ چھٹی چھٹی روحیں بڑی روح کے اعضا و جوارح ہیں۔ اس طرح گویا ذکر الہی کرنے والے کا تعلق براہِ راست خدا تعالیٰ کی تجلیِ عظم کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ذکر کی انسانی کیفیت جب قدر روحِ عظم کے مطابق ہوگی اسی قدر اس کو قرب الہی حاصل ہوگا۔ لفظ ہر ہے۔ کہ اس سے انسان کے اندر شائستگی پیدا ہوگی جس کے بغیر دہل داخلہ ممکن نہیں۔ اگر جسمِ روح قلب یا نفس میں کسی قسم کی نجاست ہوگی تو قرب الہی نصیب نہیں ہو سکتا یہ ملک ابراہیمی کا اہم اصول ہے۔ جس سے انسان کو تہذیب نصیب ہوتی ہے۔

الغرض! فرمایا فَادْكُرْهُمُ اللّٰهُ اَذْكُرْهُمُ پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ یعنی میں تمہیں اس ذکر کی بدولت اجر و ثواب عطا کرتا رہوں گا، اقرب نصیب کرتا رہوں گا حدیث شریف میں آتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص مجھے اپنے جی میں یاد کریگا میں بھی اس کو اپنے جی میں یاد کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ شائستگی میں یاد کرے اس کی غلط فہمیت کس قدر قابلِ مذمت ہوگی پھر فرمایا جو مجھے کسی میں یاد کرے گا میں اس کا ذکر اس سے بہتر مجمع میں کروں گا۔ جو شخص میری طرف چل کر آئے گا میں اس کی طرف دوڑ کر آؤں گا۔ یہ سب ذکر الہی کی برکات ہیں حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا اے معاذ! جب بھی

مانا ہے جو تو اس کے بعد یوں کہ کرو اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰی ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ یعنی اے اللہ! مجھے اپنا ذکر کرنے، شکر کرنے اور اچھے طریقے سے عبادت کرنے کی توفیق عطا فرما۔

دودھ پل اہول
شکر الہی

تہذیب نفس کا دوسرا اصول یہاں پر یہ بیان فرمایا وَاشْكُرُوْا لِلّٰہِ اور میرا شکر ادا کرو وَلَا تَكْفُرُوْا اور میرے شکر گزار نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی مختلف صورتیں میں شکر یہ زبان سے بھی ادا ہوتا ہے اور عمل سے بھی ادا ہوتا ہے۔ مثلاً جب کوئی انسان کھانا کھاتا ہے۔ تو زبان سے الحمد للہ کہتا ہے۔ گویا اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے۔ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے اولاد دی ہے۔ تو انسان حقیقتہً کہہ کے اللہ کا شکر گزار بنتا ہے۔ اللہ کی نعمت کا شکر ادا کر رہا ہے۔ اگر انسان کچھ نصیب ہو، تو قربانی کر کے شکر یہ ادا کر رہا ہے۔ اگر انسان کو نیا لباس میسر آجائے تو اس کا شکر یہ ہے کہ پُرانا لباس فی سبیل اللہ دیدے۔ بھنور علیہ السلام کی عادت مبارک یہی تھی۔ جب نیا کپڑا پہنا، دھاک اور پرانا کپڑا کسی محتاج کو دے دیا اگر کسی کو اللہ نے دودھ پینے والا جانور دیا ہے۔ تو اس کا شکر یہ ہے۔ کہ اس کا دودھ کبھی کبھی محتاجوں کو بھی دے دیا کرے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ اگر جانور نے کسی دین دودھ نہیں دیا تو بیڑا دم کرانے کے لیے لے آتے ہیں۔ بھائی! تم لے اس کا دودھ محتاج کو دیکھ اس کا شکر یہ تو ادا ہی نہیں کیا۔ کرنے کا اصل کام تو وہ تھا۔ الغرض زبان، جوارح، مال اور عمل سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرتا تہذیب نفس کا دوسرا اصول ہے۔

فرمایا وَلَا تَكْفُرُوْا نا شکر گزار نہ بنو۔ ظاہر ہے کہ اگر حصولِ نعمت پر فکریہ ادا نہیں کیا تو گویا انسان نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی۔ ایسا شخص اتصالِ حظیرۃ القدس سے محروم رہ گیا۔ لہذا اگر کامیابی کی خواہش ہے تو ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ اور کسی صورت میں بھی ناشکر گزار نہ بنو۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس پنجاہ ونہ (۵۹)

آیت ۱۵۳ تا ۱۵۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ
مَعَ الصَّابِرِينَ ۱۵۳ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۱۵۴

ترجمہ: اے ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ مدد حاصل کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ

صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۱۵۳ اور نہ کہو ان لوگوں کے بارے میں مردہ

جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم شعور نہیں رکھتے ۱۵۴

بنی اسرائیل کا شکوہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام گذشتہ

اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر کیا۔ پھر حضور علیہ السلام کی رسالت کا تذکرہ فرمایا۔ ابراہیم علیہ السلام پیوستہ

کی دعا اور ”کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ“ اور ملت ابراہیمی کا ذکر فرمایا

اور اس کے بنیادی اصول بیان کیے۔ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے پر

یہودیوں کے اعتراضات کا تذکرہ ہوا۔ اس کا مزید بیان آگے بھی آئے گا۔

”فَاذْكُرُونِي اَ اذْكُرْتُمْ وَاَشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْا“ سے ایک

نیا باب شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اسے اپنی حکمت میں تہذیب الاخلاق

سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس باب میں تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے اصول بیان

ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت کے مطابق کوئی بھی قوم ترقی کی پانچ

منڈل طے کیے بغیر برسرِ عروج نہیں پہنچ سکتی۔ ترقی یافتہ قوم کی پہلی منزل تہذیب الاخلاق

ہے۔ اور دوسری تدبیر منزل۔ تدبیر منزل کے آگے چار قانون ہوتے ہیں۔ پہلا

قانون شادی بیاہ سے متعلق ہے۔ جس میں میاں بیوی کے حقوق و فرائض آتے

ہیں۔ دوسرے قانون دالین اور اولاد کی اصلاح سے متعلق ہے۔ تیسرا قانون مالک اور مملوک کے تعلقات پر مبنی ہونا ہے۔ اور چوتھے قانون میں اقربا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور ان کی اصلاح کی تدبیر ہوتی ہے۔

تہذیب الاخلاق اور تدبیر منزل کے بعد ترقی یافتہ قوم کی تیسری منزل تدبیر مذہب ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے شہرستی یا محلہ کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو تھی منزل اصلاح ملک سے متعلق ہوتی ہے۔ اور پانچویں منزل خلافت کبریٰ کی ہے جس کے ذریعے تمام جہاں کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو ارتفاق رباعی کے اصول کے مطابق مبعوث فرمایا۔ اور اس سے مراد میں الاتوامی یعنی تمام عالم کی اصلاح ہے۔ الغرض جو قوم ترقی کے باوجود پہنچتی ہے، اُسے بہر حال یہ پانچ منازل طے کرنا پڑتی ہیں۔ ترقی کے آخری زینہ پر پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اس قدر صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ حظیرہ القدس یا بہشت بریں کا ممبر بن جائے۔ یہ انسان کی انتہائی ترقی کا مقام ہے۔ اگر وہ حظیرہ القدس کی منزل تک نہیں پہنچ سکا تو وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

گذشتہ درس میں تہذیب الاخلاق کے پانچ اصولوں کا تذکرہ اجمالاً اچکا ہے۔ ان میں سے دو اصول ذکر الہی اور شکر کا بیان گذشتہ رکوع میں اچکا ہے ظاہر ہے کہ ان پانچ اصولوں پر عمل کیے بغیر کوئی شخص مذہب نہیں کلا سکتا موجود زمانے میں جس شخص کے لیے مذہب کا ہم معنی لفظ کلچرڈ (CULTURED) بولا جاتا ہے۔ وہ اسلام کے اصولوں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ بلکہ صحیح معنوں میں کلچرڈ یا مذہب اُسے کہیں گے جو اسلام کے قائم کردہ ان پانچ اصولوں پر پورا اتر گیا۔

تہذیب اخلاق کا آیت زیر درس میں تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر بیان کیا گیا ہے ارشاد تیسرا اصول صبر ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ اے ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ استعانت پکڑو۔ صبر ملت ابراہیمی کا ایک اہم اصول

ہے۔ کنز العمال میں یہ حدیث موجود ہے، جسے اہم غزالی نے اجیار العلوم میں اور
دوسرے علمائے نے بھی نقل کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مذکور ہے کہ صبر کا معنی
کسی چیز سے رُک جانا یا کسی شے کو برداشت کرنا ہے اور اس کے تین ماوے
ہیں، صبر علی المصیبت، صبر علی الطاعة اور صبر عن المعصية۔

صبر علی المصیبت یہ ہے کہ اہل ایمان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے۔ کوئی
حادثہ پیش آتا ہے۔ تو وہ اسے من جانب اللہ سمجھ کر اُس پر صبر کرتے ہیں اور
اس کے جواب میں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ کہتے ہیں، ایسے شخص کا
تعلق باللہ مضبوط ہوتا ہے۔ اسی لئے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔
وَمِنَ الْيَقِينِ مَا تَقْوُونَ بِهِ عَلَيْنَا مَصَاصِبَ الدُّنْيَا حضور علیہ السلام نے
امت کو یہ دُعا سکھائی۔ کہ اے اللہ یقین میں اس قدر درجہ عطا کر کہ دنیا کی مصیبتیں
ہلکی ہو جائیں۔ ایسا شخص ہر تکلیف پر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے۔
اسی کا ارادہ اور مشیت کام کر رہی ہے۔ وہ ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت
کرے گا، اُس پر جزع فزع نہیں کرے گا۔ نہ چیخے چلائے گا اور نہ کوئی دُعا
کرے گا۔ یہ اس کے تعلق باللہ کی نشانی ہے۔ اس کی مزید تشریح یوں بیان فرمائی
اَلصَّبْرُ عِنْدَ صَدْمَةِ الْاَوَّلٰی کسی مصیبت کی ابتداء میں صبر کرنا ہی صبر
کی علامت ہے۔ وگرنہ جب تکلیف کا سامنا کرتے ہوئے انسان تھک جاتا
ہے اور تمام وسائل سے مایوس ہو جاتا ہے، تو پھر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت پر صبر کرنا صبر علی الطاعة کہلاتا ہے ظاہر
ہے کہ کوئی کام بھی بغیر حوصلہ اور برداشت کے انجام نہیں پاسکتا۔ گرمی سردی
میں وضو کے لیے تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ بہت بڑی مشقت
کا کام ہے۔ حج و عمرہ میں تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ غرضیکہ اطاعت کا
کوئی بھی کام صبر کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

صبر عن المعصية یہ کہ جب نفسانی خواہشات سامنے آئیں تو

انسان اُن پر کنٹرول کرے۔ اور اپنے نفس کو معصیت سے روکے۔ جو شخص حرص و ہوا کا بندہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہر نفسانی خواہش کے آگے جھک جاتا ہے۔ اور اس طرح معصیت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ موقع ہے۔ جب انسان صبر عن المعصیت کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ اور کامیابی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّكَ اِلٰهُ فِی الصَّبْرِ وَ اَجْرُهُمْ یَبْعَثُ حِسَابٌ یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بغیر حساب اجر عطا کرے گا۔

طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ الصَّبْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ صبر نصف ایمان ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے الصَّبْرُ مِنْ الْاِيْمَانِ بِمَنْزِلَةِ الرَّاسِ مِنَ الْجَسَدِ صبر کا تعلق ایمان کے ساتھ ایسا ہے جیسا سر کا تعلق جسم کے ساتھ ہے جسم سے سر علیحدہ ہو جائے تو جسم بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح اگر صبر کا مادہ مفقود ہو جائے۔ تو ایمان کا کوئی فائدہ نہیں صبر ایمانی ہول ہے کہ اس کے متعلق فرمایا اِنَّ اِيْمَانَ لَمَنْ لَا صَبْرَ لَهٗ جِسْمِ صَبْرٌ كَالْاِيْمَانِ جھوٹا ایمان باقی نہیں رہتا۔ اس کا ایمان ڈالوں ڈول ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اے ایمان والو! صبر کے ساتھ مدد حاصل کرو یعنی اس پر کاربند ہو جاؤ۔ کوئی مشکل درپیش ہو، اطاعت کا محل ہو یا معصیت سے گنہگار موقع ہو، ہر حالت میں صبر کا دامن تھامے رکھو۔ تہذیب الاخلاق کا یہ تیسرا اصول ہے۔

فرمایا اے ایمان والو! استعانت حاصل کرو صبر اور نماز کے ساتھ ظاہر ہے کہ جس شخص میں نماز کی روح پیدا ہوگی اس میں توحید کا اعلیٰ مقام پیدا ہوگا۔ ایسے شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہو جائے گا۔ اُس کو بلند مقام حاصل ہوگا۔ نماز کے متعلق اللہ نے فرمایا اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ تیسری یاد آوری کے لیے نماز قائم کرو۔ اس سے اجابت حاصل ہوگا۔ فرمایا وَرَبُّكَ فَكُنْ اپنے رب کی بحیر بیان کرو وَرَبُّكَ فَكُنْ اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو طہارت قائم رکھنا فرشتوں سے شاہد بہت رکھتا ہے۔ اور یہ نماز کے لیے

تہذیب الاخلاق کا چوتھا اصول نماز

کے راستے میں جان میںے طلوں کو مڑے مت کہو بلکہ آجیاد کہو وہ زندہ ہیں اسیرِ شک نہیں کہ الکا ظاہری جسم تو مر جاتا ہے۔ اُس کی مادی حیات ختم ہو جاتی ہے۔ مگر شہید کو لگے جہاں میں اعلیٰ تر زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ انیس انبیاء (علیہم السلام) جیسی اعلیٰ زندگی نصیب ہوتی ہے۔ دنیا کی زندگی تو بہر حال ختم ہونے والی ہے۔ یہ تو مصائب و آلام کی زندگی ہے اس کے مقابلے شہید کو جو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ نہایت فائق اور اعلیٰ تر ہوتی ہے

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ انسانی جسم اگرچہ بالطبع فانی ہے۔ مگر بعض اوقات شہداء کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اور ان پر زمانے کے تغیر و تبدل اور مٹی کا اثر نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کے متعلق تو واضح طور پر موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو کھا جائے۔ مگر بعض اوقات شہداء کے جسم بھی اللہ کے حکم سے محفوظ رہتے ہیں۔ چند سال پہلے آٹالریوں کے علاقہ میں چھ سات سو سال پرانے شہداء کے جسم بالکل صحیح و سالم برآمد ہوئے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ چاہے تو شہداء کے اجسام کو بھی آج نہ آنے دے۔ تاہم یہ کلی اصول نہیں ہے۔ البتہ عالم ہند میں شہداء کو اعلیٰ درجے کی زندگی نصیب ہوتی ہے، ہندوؤں کی زندگی تو ہر نیک و بد اور مومن و کافر کو حاصل ہے۔ مگر شہداء کی زندگی نہایت اعلیٰ و ارفع ہے سورۃ آل عمران میں آتا ہے کہ شہداء کو عیش کے سامان نصیب ہوتے ہیں۔

اعلیٰ درجے کی خوراک حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں مردہ مت کہو۔ انہیں اعلیٰ درجہ کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ مادی زندگی کے اعتبار سے انہیں مردہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر اپنی اعلیٰ و ارفع اور دائمی زندگی کی بنا پر وہ زندہ جاوید ہیں۔

فرمایا وَلَکِنْ لَا تَشْعُرُونَ اے لوگو تم شہداء کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں جو دائمی زندگی حاصل ہوئی ہے وہ اس جہاں سے

الگ ایک دوسرا جہاں ہے جو تمہارے فہم و ادراک سے بالا ہے۔ آپ اس مادی جہاں کی چیزوں سے واقف ہیں۔ اس کی اشیاء آپ آنکھ سے دیکھ سکتے

شعور کا فقدان

ہیں کان سے سُن سکتے ہیں۔ عقل سے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اگلے جہان کی چیزوں کو نہ تم دیکھ سکتے ہو، نہ تمہارے کان اس کی سماعت کی تاب لاسکتے ہیں اور نہ تمہاری عقل انہیں سمجھنے کے قابل ہے اُس جہان کی چیزوں کو دلوں جا کہہ ہی دیکھا اور پرہکھا جاسکتا ہے۔

اہم غزالیؒ فرماتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں۔ عذاب قبر سمجھ میں نہیں آتا حالانکہ یہ آٹھ اس قابل نہیں ہے۔ کہ عالم ملکوت کی چیزوں کو دیکھ سکے۔ یہ تمام چیزیں اگلے جہان میں موجود ہیں، مگر ہمیں نظر نہیں آتیں۔ اِن کا ادراک دلوں پہنچ کر ہی ہوگا اب تو صرف آسمان نظر آتا ہے۔ مگر قیامت پڑے دن اوپر کی تمام اشیاء نظر آنے لگیں گی، اوپر کے تمام پرے کھول دیے جائیں گے، عرش الہی نظر آجائے گا۔ جن اور فرشتے بھی نظر آئیں گے۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہاری مادی نظریں اور دماغ اگلے جہان کی چیزوں کے ادراک کا شعور نہیں رکھتے۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت (۶۰)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِينَ
إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ
﴿١٥٦﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

ترجمہ: اور البتہ ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ خوف، بھوک، مالوں —
جانوں — اور — بھلوں کے گھٹائے سے۔ اور آپ صبر کرنا والوں
کو خوشخبری سنائیں ﴿۱۵۵﴾ وہ لوگ جب تکو کوئی مصیبت پہنچتی ہے۔ تو وہ کہتے ہیں
کہ بیشک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بیشک ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے
ہیں ﴿۱۵۶﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان پر عنایتیں ہیں — اُن کے رب کی
طرف سے اور مہربانی ہے۔ اور یہی لوگ ہیں — ہدایت پانے
والے ﴿۱۵۷﴾

ترقی کے لیے جن منزلوں کو طے کرنا پڑتا ہے، اس میں تہذیب اخلاق
اور اس کے اصولوں کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اللہ کے ذکر اور شکر کا ذکر
ہوا۔ اور پھر تیسرے بڑے اصول صبر کا بیان ہے، جو تھا اصول۔ دُعا ہے جس کا
ذکر اللہ والا آیت کہ جہنم میں اجمالی طور پر کیا گیا ہے دراصل غماور غار کا تعلق بھی اسی سلسلہ ہے
اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے صبر کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے

گزشتہ
سے
پیوستہ

صبر کی توت

اور اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ اس کے
بعد اللہ اور اس کے دین کی خاطر قتل ہونے والے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ

اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اس کا شور نہیں۔ یہ صبر کی عظمت ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں موت جیسی بڑی مصیبت کو بھی بخوبی برداشت کرنا ہے۔ تو یقین ہے کہ ایسے شخص کو حیاتِ جاوداں نصیب ہو جاتی ہے۔ اور یہ بڑی راحت والی زندگی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شہید کے لواحقین بھی یہ صدہ برداشت کرتے ہیں جس کے بدلے میں انہیں زندگی میں عزت حاصل ہوتی ہے اور وہ ترقی کے منازل طے کرتے ہیں۔ گویا تہذیب الاخلاق کے ضمن میں صبر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لہذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق موت جیسی بڑی مصیبت کو برداشت کیا وہ تہذیب الاخلاق کا مالک بن گیا۔

آزمائشِ مقصد ہے
ایمان ہے

موت جیسی بڑی مصیبت کے تذکرہ کے بعد زیرِ درس آیات میں اللہ تعالیٰ نے بعض چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کا ذکر فرمایا کہ ہم ان کے ذریعے بھی تمہیں آزمائیں گے **فَرَايَا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ** ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے اور یہ آزمائش مقصد ہے ایمان بخوانا، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے مومن لوگ یہ تصور کریں کہ وہ محض کلمہ پڑھ کر بغیر امتحان کے کامیابی حاصل کر لیں گے۔ بلکہ فرمایا ہم ضرور انہیں امتحان سے گذاریں گے۔ **حُضُرُ عَلَیْہِمُ السَّلَام** کا بھی ارشاد مبارک ہے۔ **يُثَبِّتُ لِي الرُّجُلَ بِقَدَرٍ دِينِهِ** آدمی کا امتحان اس کے دین کے مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جس قدر اس کا دین مضبوط ہوگا اُسی قدر اُس کی آزمائش بھی کڑی ہوگی۔ اور اگر دین کمزور ہے۔ تو آزمائش بھی کمزور ہوگی، مگر آزمائش سے خالی کوئی نہیں۔ بہر حال ایمان کا تقاضا ہے کہ آزمائش آئے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ کہ وہ کسی شخص کی آزمائش کس طریقہ سے کرے گا ہے۔ اس کے مختلف طریقے ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

ذرائعِ آزمائش

فَرَايَا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ ہم تمہیں کسی نہ کسی چیز سے ضرور آزمائیں گے۔ اور وہ کون سی چیزیں اور کون سے ذرائع ہیں جن سے آزمائش ہوتی ہے **فَرَايَا مِنَ الْخَوْفِ** بمثلہ اُن ذرائع کے ایک ذریعہ خوف ہے۔ یعنی تم پر خوف

خوف

طاری کر دیں گے۔ جس سے انسان مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ خوف بالعموم بیرونی اسباب سے ہوتا ہے مثلاً کسی بیرونی دشمن کا خوف مسلط کر دیں گے۔ جس سے زندگی کا لطف برباد ہو جائے گا۔ اہل مکہ کے متعلق سورۃ قریش میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قریش پر اتنا احسان فرمایا کہ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ یعنی انہیں بھوک سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ انہیں خوف سے بھی محفوظ رکھا۔ وہ لوگ نہایت امن و امان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بیت اللہ شریف کے متولی ہونے کی بنا پر نہایت باعزت مقام حاصل تھا۔ اور وہ ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ تھے۔

خوف ایک ایسی چیز ہے۔ جس کی موجودگی میں زندگی کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت ہر چیز خوف کی زد میں آ کر اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ جنگ کے موقع پر دیکھ لیں۔ دھیان ہر وقت اُسی طرف رہتا ہے۔ کہیں گولہ باری کا خطرہ ہے کہیں ہوائی حملہ ہو رہا ہے۔ سامان بچ بچے ہیں۔ لوگ پناہ گاہوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ عجیب افزا تفری کا عالم ہوتا ہے پوری زندگی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس سے ملکی معیشت تباہ ہو جاتی ہے زندگی کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ اور لوگ ہر آن نئی مصیبت کے منتظر رہتے ہیں۔ اسی کو فرمایا کہ ہم خوف کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے۔

وَلِكُلِّ جُوعٍ أَرْزَاقٌ کا دوسرا ذریعہ بھوک ہے۔ انسانی زندگی کا انحصار اس کی خوراک پر ہے۔ غذا کا حصول انسان کا طبعی اور فطری حق ہے۔ انسانوں کے علاوہ حیوانات، کیڑے مکوڑے، چرند، پرند، خشکی اور پانی کے تمام جانداروں کی زندگی خوراک سے وابستہ ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام جیسی مقدس ترین امتیوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَداً لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ یعنی ہم نے انبیاء کے جسم بھی ایسے نہیں بنائے جنہیں غذا کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ وہ بھی کھانا کھاتے ہیں۔ ان کو بھی بھوک کا احساس ہوتا ہے بھوک کی

بھوک

میں کمی آجائے گی تو انسانی معیشت کو نقصان پہنچے گا۔ لہذا یہ بھی آزمائش کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم جان و مال میں کمی کر کے بھی لوگوں کا امتحان لیتے ہیں۔ آفاتِ ارضی و سماوی مال و جان میں نقصان کا ذریعہ ہیں۔ بسا اوقات مہلک وبائی امراض مثلاً طاعون، ہیضہ، تپ محرقہ وغیرہ ان کی زندگی کے اوقات کا سبب بنتی ہیں۔ یا پھر زلزلہ، طوفان اور سیلاب وغیرہ کے ذریعہ جانی و مالی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

نمل کی کمی

آزمائش کا چوتھا ذریعہ فرمایا وَالْخُمْرَاتِ پھل ہیں۔ کہ بعض اوقات پھلوں میں کمی کے ذریعے بھی آزمائش آتی ہے۔ کسی سال فصلوں میں غلہ یا درختوں پر پھل زیادہ آتا ہے کسی سال کم آتا ہے۔ اور کسی سال بالکل نہیں آتا۔ غلہ اور پھلوں کی فراوانی یا کمی قبضہ قدرت میں ہے۔ لہذا یہ بھی آزمائش کا ایک ذریعہ ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ خوف سے مراد دشمن کا خوف ہے۔ بھوک سے مراد اختیاری بھوک یعنی عبادت، ریاضت اور روزہ کا حکم ہے۔ اور مال و جان کی کمی سے مراد راس المال کی کمی ہے۔ جس کے ذریعے انسان کام کاج کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ پھلوں میں کمی سے مراد ان کی اولاد میں کمی ہے۔ اولاد انسان کا ثمرہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات افزائش نسل ان کی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پھل سے مراد درختوں کا پھل بھی ہے اس میں بھی کمی بیٹھی ہوتی رہتی ہے۔ تاہم امام شافعی نے پیل تاویل کو اختیار کیا ہے یعنی ثمرات میں کمی سے مراد نسل انسانی میں کمی ہے۔ اور اس کی تصدیق حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے کہ جب کسی کا بیٹا فوت ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ قَبَضْتُ رُوحَ ابْنِ عَبْدِي کہ تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی ہے فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یا مولا کریم ہم نے تیرے حکم کے مطابق ایسا کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں أَخَذْتُ مَرَّةً قَلْبَهُ تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں۔ ہاں ہم نے لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر

پوچھتے ہیں کہ اب کرنے پر میرے بندے نے کیا کیا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ بندے نے حَسَدٌ وَاسْتَوْجَعَ تیری تعریف کی اور انا اللہ کہا۔ اس پر اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہوا کہ کہتا ہے۔ کہ اس کے لیے بہشت میں ایک خاص کوٹھی اور ایک جگہ بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ یہ اس بندہ مومن کا انعام ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرہ سے مراد اولاد بھی ہے

اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قسم کی آزمائشوں کا ذکر فرمایا اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ان آزمائشوں میں پورا اترنا یعنی ہر مصیبت پر صبر و شکر کا دامن تھامے رکھنا ہی انسانیت کی معراج ہے جو شخص تکلیف آنے پر اُسے برداشت کرے تب ہی عجز و فزع یا کوئی خلاف شرع حرکت نہیں کرتا، صبر کا پورا پورا حق ادا کرے تب ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَكَبِيرُ الصَّابِرِينَ ایسے صابر و شاکر لوگوں کو خوشخبری سنا دو کہ فلاح و کامیابی ان کے مقدر میں ہو چکی ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں جنہیں یہ بشارت دی جا رہی ہے۔ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا كَرَّمَ اللَّهُ وَلَانَا إِلَيْكَ وَاجْتَنَبْنَا ہم سب خدا کا مال ہیں۔ اور پھر لوٹ کر اُسی کے پاس جانا ہے مقصد یہ کہ ہم سب اللہ کی مخلوق ہیں ہماری جانیں اور مال اللہ ہی کا دیا ہوا ہے یہ سب اُسی کی طہرانی کامرہوں منت ہے اور نہ ہمارا تو کچھ بھی نہیں ہے دوسری جگہ فرمایا لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کی عطا کردہ ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی ہمارا تو صرف دھم و گمان ہی ہے۔ باقی ہر چیز اللہ کی ہے وہ مالک مختار ہے اپنی ملکیت میں جب اور جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ إِنَّ اللَّهَ مَا عَظٰى وَلَكِنْ مَا آخَذَ رُكُوءًا شے عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى سب کچھ اُسی کا ہے۔ جب چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے زندگی ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ وہ جب اور جتنی چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ جسم و جان اور موت و حیات کا مالک تو وہی ہے

صابرین کے لیے
بشارت

لہذا جب کسی مومن کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ کہہ کر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یہ مال و دولت اُسی کا عطا کردہ ہے، وہ جیب چاہے لے لے۔ لہذا وہ کسی قسم کے نقصان پر چیخ و پکار یا داویلا نہیں کرتا، بلکہ صبر سے کام لیتا ہے۔ اے ہی صابریں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بشارت دی ہے۔

مصیبت کے وقت رونا پیٹنا، نوحہ کرنا، بالوں کو زچنا یا گالیں پیٹنا ہرگز ایمان کا جزو نہیں ہے حضور علیہ السلام نے غور توں سے بیعت لیتے وقت وعدہ لیا تھا کہ رونا پیٹنا جائز ہے، نوحہ کرنا حرام ہے، ایسا ہرگز نہ کرنا، البتہ غم و اندوہ سے کسی کے آنسو بہ نکلیں تو یہ ایک فطری امر ہے اور درست ہے مگر چیخ و پکار کرنا خلاف طبع اور ناجائز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔

مصیبت کے وقت صبر کرنا اور اِنَّا لِلّٰہِ کہہ دینا گویا اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر رضا مندی کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے جو بھی پسند فرمایا ہے میں اس پر راضی ہوں۔ اگر اللہ ہم سے راضی ہو گیا، تو یہ اجر و ثواب کا باعث ہو گا۔ اور وہ ناراض ہو گیا۔ تو ہم یقیناً تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ کیونکہ لوٹ کر بھی اسی کے پاس جانا ہے اسی کی بارگاہ میں پیش ہو جائے اس کے علاوہ اور کوئی مقام نہیں چنانچہ صبر کا قانون بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں آسمان سے گر جاؤں، زمین پر ہلاک ہو جاؤں یہ بات میرے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ خدا تعالیٰ کے کسی فیصلہ کے متعلق میں یوں کہوں کہ یہ مجھے پسند نہیں۔ بلکہ اللہ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ جو خدا کے فیصلے پر راضی ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے راضی ہو گا۔ اور جو شخص خدا کے کسی فیصلہ پر ناراض ہو گا، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے ناراض ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص سے اللہ ناراض ہو گا، اُس کا حشر کیا ہو گا۔ امام ابو بکر جصاصؓ فرماتے ہیں کہ ان آیات سے واضح ہے کہ رضا بالقضا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے۔ اور صبر کا دامن نہیں

چھوڑنا چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ ان آیات سے احکام مترشح ہوتے ہیں یعنی فرض اور نفل۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا فرض حکم ہے اور ہر مصیبت پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ کتنا نفی حکم ہے۔ حضور علیہ السلام نے یہ دعا کھائی اَللّٰهُمَّ اَجِبْنِيْ فِيْ رُغِيْبَتِيْ وَاجْلِبْنِيْ خَيْرَ مَا فِيْهَا۔ یعنی اے اللہ! مصیبت میں مجھے اجر عطا فرما اور اس کا مجھے بہتر بدلہ عطا کر۔ یہ ایمان والوں کی نشانی ہے کہ وہ ہر مصیبت پر اس طرح کے کلمات کہہ کر راضی برضا ہو جاتے ہیں تکلیف خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اس پر صبر کرنا اور کلمات خیر کہنا ایمان کی نشانی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے یا کھڑکھڑ لگ جائے تو اس پر بھی اِنَّا لِلّٰهِ پڑھنا چاہیے تاکہ اللہ کی رضا پر راضی ہونے کی سند حاصل ہو جائے۔

فرمایا صبر کرنے والے اور اللہ کی رضا پر راضی ہونے والے لوگوں کا صلہ یہ ہے
 اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ اِلَيْهِمْ هِيَ لَوْكُ هِيَ لَوْكُ هِيَ لَوْكُ
 تعالیٰ کی عنایتیں اور مہربانی ہے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد خاص رحمت اور مہربانی ہے۔ اور رحمت سے مراد عام مہربانیاں ہیں۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ اللہ سے مراد وہ عنایتیں اور مہربانیاں ہیں جو انسانوں کو انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے پہنچتی ہیں۔ اور رحمت وہ مہربانی ہے جو انسانوں کو اللہ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کے مطابق صلوٰۃ جیسی بلند پایہ رحمت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندے کا اتصالِ حظیرۃ القدس جیسے بلند پایہ مقدس مقام سے ہو جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی محکمِ عظم پڑتی ہے۔ اس طرح گویا اس کا رابطہ خدا تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے اور اُسے بڑی بلندی اور ترقی نصیب ہوتی ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْتَخِرُونَ اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ انہیں یہ مقام اسی لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کے راہی ہوتے ہیں۔ اور اسی سیدھے راستے پر چل کر اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں۔

کو یہ نام دیے گئے۔

تہذیبِ اخلاق کا
پانچواں اصول
شعائرِ اہل کی
تعظیم ہے

بیال پر صفامردہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے قرآن کریم کے درجہ مقام پر شعائرِ اہل کی عظمت کے بیان میں فرمایا لَا تُحْلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ یعنی اللہ کے شعائر کی بے حرمتی ممت کرو۔ بلکہ ان کی تعظیم کرو۔ اس کو شعیرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کی علامت اور نشانی ہوتی ہے۔ اس کو دیکھ کر اللہ کی یاد آ رہی ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں اللہ کی یاد آوری کا ذریعہ ہیں ان کو بت پرستی یا شرک اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ہم ان چیزوں کی تعظیم ان کی ذات کی وجہ سے نہیں کہتے ہیں بلکہ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعظیم ہے۔ جن کو دیکھ کر اس کی عظمت اور یاد دل میں آتی ہے۔ شعائر اللہ میں مکان کے علاوہ کئی قسم کے افعال بھی داخل ہیں مثلاً اہم شاہ ولیؒ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مَنْ أَعْظَمَ شَعَائِرَ اللَّهِ چار چیزیں اللہ کے شعائر میں سب سے بڑی ہیں اور ان میں خانہ کعبہ حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ، نماز گاہ قرآن پاک شامل ہیں اسی طرح شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلویؒ تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ میں عرفات بھی داخل ہے۔ جہاں نود و نچھ کو لوگ جمع ہوتے ہیں۔ بیال کا وقوف ہی حج کا رکن اعلیٰ ہے۔ لوگ غروب آفتاب تک وہاں قیام کرتے ہیں۔ اور خوب گرد گڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگتے ہیں۔ اسی طرح مشاعر الحرام بے مزد لقمہ کہا جاتا ہے وہ بھی شعائر اللہ میں شامل ہے۔ منیٰ میں رمی جمار بھی شعائر اللہ میں داخل ہے۔ صفامردہ کا ذکر تو خود قرآن پاک نے فرمایا۔ علاوہ ازیں تمام مساجد رمضان کا مہینہ، اور اشہر الحرام (حرمات طائے مہینے) یعنی رجب، ذی قعدہ، ذوالحجہ اور محرم الحرام یہ سب شعائر اللہ ہیں۔ یہ سب واجب الاحترام مہینے ہیں۔ اور ان میں گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے۔ ان میں عبادت کا اجر و ثواب بھی بڑھ جاتا ہے اور گناہ کا وزن بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ، عید الفطر، جمعہ، ایام تشریق، اقامت، غنہ

نماز باجماعت، ارل، طواف، ہدی قربانی اور صغائر و کی سب شعائر اللہ میں داخل ہیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ يُعْظِمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْفُلُكُوبِ یعنی شعائر اللہ کی تعظیم دلوں کے تقویٰ کی بنا پر ہے جس کے دل میں خدا کا تقویٰ ہو گا، وہی شعائر اللہ کی تعظیم کرے گا۔

تفسیر عزیزی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مشہور تفسیر ہے جو کہ فارسی زبان میں لکھی گئی۔ آپ کے والد ماجد امام شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا نام مستح الرحمن رکھا۔

اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ کابل سے لے کر برہمک سارا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں تھا۔ سرکاری زبان فارسی تھی۔ ساتھ ساتھ عربی کو بھی اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ اس وقت اردو زبان اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور محدود تھی۔ البتہ مرہٹی اور تامل ناڈو زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں مروج تھیں۔ ہندی کا بھی عام چرچا تھا۔ تاہم ان دو بزرگوں نے فارسی زبان کو ذریعہ ابلاغ بنایا۔ امام شاہ ولی اللہ کی کتابیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کی مشہور عالم تصنیف اصول تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ازالۃ الخفاء بھی فارسی میں ہے موطا کی شرح ایک فارسی میں ہے اور ایک عربی میں بمقصد بہر حال ابلاغ دین تھا جس میں آپ کے خاندان کو کما حقہ کامیابی حاصل ہوئی۔

الغرض! آپ کے زمانہ میں رائج الوقت زبان فارسی تھی۔ دفتری خط و کتابت بھی اسی زبان میں ہوتی تھی جس طرح آج کل سکولوں، کالجوں، دفتروں اور بیرون ملک انگریزی زبان کا چرچا ہے۔ اسی طرح اُس زمانے میں فارسی مروج تھی۔ لہذا اپنے زیادہ فارسی کے ذریعے ہی دین کی اشاعت کا کام کیا۔

شاہ ولی اللہ کا خاندان برصغیر پاک و ہند میں بڑا نورانی خاندان گزرا ہے آپ تمام مسلمانوں کے پیرو مرشد اور مربی تھے۔ برصغیر میں دینی تعلیم کا بیڑا آپ نے ہی اٹھایا۔ آپ وقت کے فقیہ تھے۔ ان لوگوں نے تعلیم کے مراکز اور مدارس

قائم کیے۔ شاہ ولی اللہؒ اپنے والد ماجد کے مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آپ حج کے لیے حجاز مقدس گئے تو وہاں دو سال تک قیام کیا اور وہاں کے علماء سے علمی استفادہ کیا۔ واپس آکر پھر درس و تدریس کے سلسلہ میں متہمک ہو گئے:

شاہ عبدالعزیزؒ نے لمبی عمر پائی ہے۔ آپ ساری عمر تدریس کے کام میں مشغول رہے۔ فتویٰ بھی دیتے رہے۔ آپ نے سنتِ جہاد کو دوبارہ زندہ کیا اور بڑے بڑے مجاہد پیدا کئے۔ آپ کے زمانہ میں برصغیر میں انگریز کا عمل دخل ہو چکا تھا۔ اسی زلزلے میں آپ نے یہ تفسیر عزیزی لکھی۔ تفسیر عزیزی کے آخری دو پارے یعنی پارہ ۲۹ اور ۳۰ در مختلف جلدوں میں ہیں۔ ابتداء میں سورۃ بقرہ کی نصف تک تفسیر لکھی تھی۔ کہ زندگی نے ساتھ نہ دیا اور یہ کام وہیں رو گیا۔ یہ عظیم تفسیر حکمانہ فیکس کے ساتھ لکھی گئی ہے جس میں اسلام کے حقائق کو خوب اجاگر کیا گیا ہے۔ حضرت الزر شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر تفسیر عزیزی مکمل ہو جاتی تو یہ سمجھا جاتا کہ قرآن پاک کا حق ادا ہو گیا ہے۔ اس وقت اس تفسیر کی صرف تین جلدیں موجود ہیں۔ تاہم یہ کمال درجہ کی چیز ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔

اہم ابن جریرؒ نے مفسر قرآن حضرت قتادہؒ سے روایت نقل کی ہے۔ کہ صفاء اور مروہ کے درمیان دوڑنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے۔ حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے کہ صفاء مروہ کی سعی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کی میراث ہے۔ اُن سے یہ چیز بطور وراثت نقل ہوتی چلی آ رہی ہے حضرت ہاجرہؓ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے صفاء مروہ کے درمیان سعی کی ثم الثمنیں حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیت اللہ شریف کا طواف، صفاء مروہ کی سعی اور رمی جمار اللہ کے ذکر کے اقامت کے لیے ہے۔ طواف کو بجائے خود نماز کی مانند ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلَاةِ یعنی بیت اللہ شریف

کے گرد طواف کرنا نماز کی مثل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نماز کے دوران گفتگو کی قطعاً اجازت نہیں جبکہ طواف کے دوران حسب ضرورت بات چیت کی جا سکتی ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ کلام سے اجتناب کرے اور اللہ کے ذکر میں منہمک رہے۔ ذکر الہی کے لیے مختلف کلمات موجود ہیں۔ حضرت لاہوریؒ کے بڑے فرزند مولانا حبیب اللہ طواف کے سات پچھول میں پورا قرآن پاک ختم کر لیتے تھے۔ اللہ نے اس قدر توسیع بخشی تھی کہ آپ بڑے ہی عبارت گزار تھے۔ طواف میں دو تین گھنٹے صرف کرتے تھے۔ اور شدید گرمی میں بھی طواف کرتے رہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حج کے لیے آتے تو صفاد مردہ کے درمیان بیک پکاتے ہوئے دوڑتے اور اللہ کی طرف سے بھی بیک بعدی کی آواز سننے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے کہ تمہاری پکار پر میں بھی موجود ہوں۔ سعی کے دوران پڑھی جانے والی مشہور دُعا رَبِّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيْمُ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یعنی اے اللہ معاف فرما دے اور رحم فرما۔ تو عزت والا اور بڑے کرم والا ہے۔ اس کے علاوہ سعی کی اور بھی دعائیں منقول ہیں جن میں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے۔ اس کے علاوہ ایمان پر ثابت قدمی کی دُعا ہے۔ يٰ اَيُّهَا اللَّهُ اِنِّي اَسْأَلُكَ كَمَا هَدَيْتَنِي لِلْاِيْمَانِ اَنْ لَا تُفْنِي عَمِيَّتِي حَتّٰى تَوْفِيقِيْ عَلٰى ذٰلِكَ۔ اے اللہ! جس طرح تو نے مجھے ایمان اور اسلام کی طرف ہدایت فرمائی ہے۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تھے مجھ سے نہ چھیننا یہاں تک میری موت آجائے۔

صفاد مردہ کی سعی کی حیثیت کے متعلق مختلف آراء ہیں مشہور روایت یہ ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک سعی سنت ہے البتہ امام شافعیؒ اسے رکن کہتے ہیں۔ اگر حج میں سعی نہیں کی تو حج نہیں ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ اسے واجب کہتے ہیں

اگر سعی نہ ہو سکے تو دم دینا پڑے گا۔ جس سے اس کی تکلیف ہو جائے گی واجب بھی بہت بڑا درجہ ہے۔ فرض کے بعد اسی کا منبر ہے۔ حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ اَيُّهَا النَّاسُ اسْعَوْا لِي كَوِّرَا صَفَا وَمَرْدَه كَعِ دَرَمِيَانِ سَعِي كَرِد اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَیْكُمْ السَّعْيَ اللّٰهُ تَعَالٰی نے تم پر سعی کو ضروری قرار دیا ہے حضور علیہ السلام جب سعی کے لیے تشریف لاتے تو فرماتے اَبْدًا اُبْدًا اَللّٰهُ تَعَالٰی میں وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے ابتداء فرمائی ہے یعنی صفا سے۔ کیونکہ آیت زیر درس میں اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ فَرَمٰیَا گیارہ صفا سے ابتداء کی گئی ہے۔ الغرض! حضور علیہ السلام سعی صفا سے شروع کر کے مردہ پر ختم کرتے تھے یہ سنت مبارکہ آج تک جاری ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جسے محبوب سے محبت ہوتی ہے اسے اس کے متعلقہ بھی محبت ہوتی ہے حج کے تمام شعائر معنی، عرفات، قربانی وغیرہ محبوب کے تعلقات ہیں۔ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگنیں ہوتی ہے۔ تو پھر وہ اس کے شعائر سے ہی محبت کرے گا ان کی تعظیم کرے گا۔ صبر اور شکر ادا کرے گا، یہی چیزیں تہذیب نفس کے حصول کی علامتیں ہیں

چاہ زم زم کے اجر کا واقعہ مشہور ہے۔ ابراہیم علیہ السلام بے آب و گیاہ چاہ زم زم وادی میں حضرت ہاجرہؓ اور اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑ گئے۔ تھوڑی بہت کھجوریں اور چھچھال میں پانی تھا۔ جب پانی ختم ہو گیا تو مائے صاحبہؓ نے ادھر ادھر پانی کی تلاش شروع کر دی آپ کبھی صفا پر جائیں اور وہاں سے مایوس ہو کر مردہ پہاڑی پر پہنچ جائیں کچھ پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ جب آپ کی پریشانی انتہا کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت آمیز سے جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے اپنا پُر زمین پر مارا، تو وہاں سے پانی جاری ہو گیا۔ یہ بڑا متبرک پانی ہے فاسی نے تاریخ مکہ میں روایت بیان کی ہے کہ یہ پانی کوثر اور سبیل سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ پانی کے اس چشمہ کو کئی حوادث بھی آئے مگر بالآخر

لے کناں کی صورت حال ہو گئی۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ کئی دفعہ بند ہوا اور کھولا گیا اب اس کناں سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے۔ زائرین حرمِ خوب سیر ہو کر یہ پانی پیتے ہیں۔ اور جاتے وقت دنیا کے اکثراً اطراف میں یہ تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں۔ اُس وقت سے لے کر آج تک اسکی آبیاری جاری ہے۔ اور انشاء اللہ اقامتِ جاری رہے گی۔ اس کا ذائقہ بھی عام پانیوں سے مختلف ہے۔ یہ پانی بیک وقت دوا، شفا اور غذا کا قدرتی مجموعہ ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ انسانی جسم کے لیے اس سے بہتر کوئی پانی دنیا بھر میں موجود نہیں ہے۔

صفا اور
دعوتِ توحید

صفا کی یہ وہی تاریخی پہاڑی ہے۔ جس پر چڑھ کر حضور علیہ السلام نے قریش کو دعوتِ توحید دی۔ عربوں میں یہ طریقہ رائج تھا۔ کہ کسی سخت خطرے کے وقت بلند جگہ پر چڑھ کر قاصبا کاہ کا نعرہ لگاتے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ کہ دشمن اگیا ہے یا اور کوئی خطرہ ہے۔ لہذا سب لوگ اکٹھے ہو جائیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوتا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صفا پر چڑھ کر یہی نعرہ لگایا۔ قوم کے لوگ اکٹھے ہو گئے کہ کوئی خطرے کی بات ہوگی۔ جب سارے لوگ آگئے تو آپ نے فرمایا اگر میں تم سے یوں کہوں کہ صبح کے وقت اس پہاڑ کے قیچے سے تمہارا دشمن حملہ آور ہو رہا ہے تو کیا تم میری بات کو تسلیم کر لو گے۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا ہاں جَبْ بَنَّا عَلَيْكَ كَذِبًا ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ سچ فرماتے ہیں۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا اِنِّیْ تَنْذِیْرٌ لِّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں تم کو اس بات سے ڈرانے کے لیے آیا ہوں۔ کہ تم پر سخت عذاب آنے والا ہے۔ اگر اس سے بچنا چاہتے ہو تو میری بات مان لو فَوَقُّواْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کلمہ طیبہ کا اقرار کر لو فلاح پا جاؤ گے۔ ان لوگوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولسب بھی تھے۔ وہ اس بات سے بڑے سیخ پا ہوئے اور کہا تَبَّ لَکَ یَا مُحَمَّدُ اے محمد! آپ کے لیے ہلاکت ہو اَلْهٰذَا جَمَعْتُمْ کیا تو نے اس لیے ہمیں جمع کیا تھا ہم تو سمجھے تھے کہ کوئی خاص بات

ہوئی، مگر تو نے یہی ایسی بات بنادی۔

فتح مکہ کے روز بھی آپ اسی صفا پر کھڑے ہوئے اور فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِيْ اَنْجَزَ وَعَدَهُ وَفَضَّلَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَخَذَهُ
یعنی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی عزت منائی
اور اس وعدہ لاشریک نے لیکھے ہی ان سب کو شکست دی۔ یہاں پر اللہ کے
وعدے سے مراد وہی وعدہ ہے۔ جب مشرکین مکہ حضور علیہ السلام کو طرح طرح
کی تکالیف پہنچاتے تھے۔ اور آپ کو مکہ میں رہنے نہیں دیتے تھے۔ تو اللہ
نے وعدہ فرمایا کہ ایک دن فتح ہوگا اور یہ سب لوگ مغلوب ہو جائیں گے۔
بیت اللہ شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ وہی ابراہیم
علیہ السلام جنہوں نے بت خانے کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔
مگر انیس کے نام نہاد پیر و کاروں یعنی مشرکین مکہ نے اسی کعبہ شریف میں
جگہ جگہ بت رکھے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کے سامنے بت تھے۔ اس کی دیواروں
پر بت تھے۔ چارہ زم زم کے پاس بت رکھے تھے۔ صفا اور مردہ پر بت موجود تھے۔
عزیزیکہ مشرکین نے ہر چیز کو بگاڑ دیا تھا۔ اور اس طرح خود خانہ کعبہ میں شرک کے ترکیب
ہو گئے تھے۔

مشہور روایت کے مطابق صفا اور مردہ پر جو بت رکھے ہوئے تھے ان میں
سے آساف مرد کا بت تھا اور وہ صفا پیڑی پر تھا اور ناکہ عورت کا بت تھا اور وہ
مردہ پر رکھا ہوا تھا۔ یہ مرد و زن مشرک تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ میں برائی کا اور مکاب
کیا تھا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے پھر کی صورت میں مسخ کر دیا۔ لوگوں نے
ان پتھروں کو اٹھا کر باہر رکھ دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ برائی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے
وقت گزرنے کے ساتھ ان بتوں کی پوجا ہونے لگی اور یہ لوگوں کے معبود بن گئے پھر لوگوں
ان میں سے ایک کو صفا پر رکھ دیا اور دوسرے کو مردہ پر۔

جب اسلام کا دور آیا تو مسلمانوں کو صفا و مردہ کی سعی کرنے میں الجھا ہٹ
سعی قدر
سنت ہے۔

محسوس ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ سہی شاید ان بتوں کی وجہ سے ہو۔ اُس دور میں اس سے ملتی جلتی اور بھی مثالیں موجود تھیں۔ مثلاً اُس اور خمر ج قبیلہ کے لوگ جب حج کے لیے آتے تھے۔ تو منات نامی بہت کے نام پر احرامِ مدینہ سے باز دھتے تھے یہ بہت کسی بزرگ کے نام سے موسوم تھا۔ اور معذرت کے کلمے مشکل کے مقام پر پر رکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کا طواف کو کرتے تھے مگر صفا و مردہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کے نظریات اُس وقت موجود تھے۔

مسلمانوں کے اس شک کو دور کرنے کے لیے قرآن پاک نے فرمایا اِنَّ الْقَصَا وَالْمَسْرُوۃَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ صفا اور مردہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور یہ قدیم سلسلہ سے منسلک ہیں۔ ان کے درمیان دوڑنا ان بتوں کی تعظیم کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی رضا جوئی کے لیے ہے۔ چنانچہ ان بتوں کو دلوں سے ہٹا دیا گیا۔ غلط طرب کے تمام بتوں کو توڑ دیا گیا۔ بیت اللہ شریف کو ان کی سجاست سے پاک و صاف کر دیا گیا۔ اور اس طرح مرکز اسلام سے ایک دفعہ پھر توحید کی صدا بلند ہونے لگی۔

اسی لیے فرمایا کہ صفا و مردہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوْ اعْتَمَرَ پس جو کوئی حج یا عمرہ کرے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اس پر کوئی حرج نہیں ہے اَنْ يَّطُوفَ بِهِمَا کہ ان دونوں کا طواف کسے سعی احکام حج میں سے ہے اور قدیم سنت ہے۔

فَرِیَا وَمَنْ تَطْلُقْ خَیْرٌ اَجْسَ لَمْ غُشِیْ سَیْئَیْ کَا کَامَ کَیَا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاکِرٌ عَظِیْمٌ تو اللہ تعالیٰ قدر دان اور جاننے والا ہے۔ یاد رہے کہ شکر سے فاعل کا صیغہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا معنی قدر دانی ہوتا ہے یعنی اللہ بڑا قدر دان ہے۔ اگر معمولی سی چیز بھی غرض نیت سے کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی بڑے سے بڑا اجر عطا کرتا ہے اور عظیم سے کم دیتا ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں حتیٰ کہ وہ انسان کی نیت اور باطنی ارادہ کو بھی جانتا ہے۔

سَيَقُولُ

الْبَقَرَةُ ۲

درس شصت و دو (۶۲)

آیت ۱۵۹ تا ۱۶۳

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ
 بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۚ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ
 وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعِينُونَ ﴿٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّوْا
 فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٦٠﴾ إِنَّ
 الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ ۖ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ
 وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ
 عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٦٢﴾ وَاللَّهُ كُفَرًا ۖ وَلَٰئِذَا
 لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴿٦٣﴾

۱۵۹

تو جسے یہ تحقیق وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں جس کو ہم نے واضح باتوں اور
 ہدایت کے ساتھ انعام ہے۔ بعد اس کے کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کتاب میں بیان کر
 دیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے
 والے بھی لعنت کرتے ہیں ﴿۵۹﴾ مگر جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنے آپ کو سنبھالا۔
 اور انہوں نے بیان کیا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر میں رجوع کرتا ہوں۔ اور میں رجوع
 کرنے والا مہربان ہوں ﴿۶۰﴾ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے ایسی
 حالت میں کہ وہ کفر کرنے والے ہیں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ، فرشتوں اور
 لوگوں کی لعنت سب کی ﴿۶۱﴾ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے عذاب
 میں تخفیف نہیں کی جائیگی۔ اور نہ اُن کو مصلحت دی جائیگی ﴿۶۲﴾ اور تمہارا معبود
 بحق ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿۶۳﴾

کتمانِ حق

گزشتہ آیات میں تہذیبِ الاخلاق کے پانچ اصول بیان ہو چکے ہیں۔ سابعہ درس میں سجدہ ان کے تعظیم شعار اللہ کا ذکر تھا۔ تہذیبِ نفس کے جملہ مسائل جس بات پر متفرع ہوتے ہیں، وہ مسئلہ توحید ہے۔ اس درس میں اسی مسئلہ کو بیان فرمایا گیا ہے اور اس سے پہلے مسئلہ کتمانِ حق کا بیان ہے۔ جیسا کہ گذشتہ درس میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہودیوں میں کتمانِ حق کی بیماری بدرجہ اتم موجود تھی۔ پہلی آیات میں اچھا ہے **وَتَكْفُرُوا بِالْحَقِّ وَأَنْتُمْ قَاِلَمُونَ** یعنی اے اہل کتاب تم جان بوجھ کر حق کو چھپاتے ہو۔ اسی طرح تحویل قبلہ کے منعلق فرمایا **يَعْرِفُونَ كَمَا يَعْزِفُونَ** **آيَاتِ آوَاهُمْ** یعنی یہ لوگ اس حقیقت کو اسی طرح پھپھاتے ہیں جیسا کہ اپنی لولاد کر، مگر اس کے باوجود انکار کرتے ہیں۔ یان کے کتمانِ حق کی واضح مثالیں ہیں یہ ظالم لوگ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بائے پیش گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اس کی بھانک لوگوں کے سامنے غلط بائیں بیان کر رہے تھے تو رات میں رجم کا حکم موجود تھا۔ مگر یہودیوں نے ٹسے چھپایا۔ اس کی تفصیل سورۃ مائدہ میں موجود ہے۔ **اللَّهُ تَعَالَى** نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ **لَتُبَيِّنَنَّكَ لِلنَّاسِ وَأَنْتَ كَتَمْتُمْ كُنْهَ كَرَمِ لُكُلُوكِ** کے سامنے حقیقت حال کی پوری پوری وضاحت کر دے اور ٹسے چھپاؤ گے نہیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا **قَبْجَدُوهُ وَرَأَوْهُ ظُهُورِهِمْ** ان لوگوں نے حقائق کو پس پشت ڈال دیا۔ **كَاتَمْتُمْ لَا يَفْلَحُونَ** گویا کہ وہ بالکل نہیں جانتے۔

کتمانِ حق کی سزا

کتمانِ حق کی بیماری صرف یہودیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر عام قانون کے طور پر اعلان فرمایا **إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنْ آيَاتِنَا وَالْهُدَىٰ جَوَ لُوكِ بَهِی اللہ تعالیٰ کی واضح باتوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں مِنْ آيَاتِنَا مَا بَيَّنَّنَا لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ** بعد اس کے کہ ہم نے اُسے کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا۔ **أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ** **الْعَالَمُونَ** یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہے۔ اور دیگر لعنت کھنے

والوں کی بھی لعنت ہے۔ ظاہر ہے کہ اِنَّ الْاَذِيْنَ میں تمام لوگ شامل ہیں جو اس آیت کے مصداق ہیں خواہ وہ کسی سابقہ امت سے ہوں یا نبی آخر الزمان کی موجودہ امت سے متعلق ہوں۔ ہر وہ شخص اس آیت کریمہ کا نشانہ ہے۔ جو حق بات کو چھپاتا ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے مَنْ سَكَبَ عَلَيْنَا جَسْمًا فَهُوَ كَذِبٌ جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا ہے۔ مثلاً کسی عقیدہ سے متعلق سوال ہے یا حلال و حرام کی وضاحت طلب کی گئی ہے فَكَمَثَلُكَ تو صاحبِ علم شخص نے اُسے چھپا دیا۔ معاملہ کو ظاہر نہ کیا۔ یا اُس کی کما حقہ وضاحت نہ کی۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو اُسے کوئی نقصان کا خطرہ تھا یا اس کی مالی منفعت متاثر ہوئی تھی یا کوئی اور فائدہ مقصد کا فرما تھا جس کی وجہ سے اس نے حق کو چھپا دیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلْجَمْعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلُجَامٍ مِّنْ شَاوٍ۔ قیامت کے دن اُسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ چونکہ دنیا میں اُس شخص نے اپنی زبان سے حق کو ظاہر نہیں کیا تھا اس لیے قیامت کے دن اُس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائیگی۔ اتنی سخت سزا دی جائیگی کہ اُس نے حق کو چھپایا تھا۔

مولانا عبید اللہ ندویؒ

حضرت مولانا عبید اللہ ندویؒ ہمارے دور کے عظیم مفسرِ قرآن ہوئے ہیں آپ تعلیم یافتہ لوگوں کو چھ ماہ میں قرآن پاک سے کما حقہ واقف کرا دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا ملکہ عطا کیا تھا۔ حضرت مولانا لاہوریؒ، مولانا سلطان محمود کمٹیلےؒ نے حکیم فضل الرحمنؒ وغیرہم نے آپ ہی سے قرآن پاک پڑھا تھا۔ آپ شیخ السنہ حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور ان میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ انگریزوں سے بہت خوفزدہ تھا۔ ہندوستان میں آپ کا داخلہ بند کر دیا تھا بلکہ حکومت سزا رکھی تھی، لہذا آپ نے ۲۵ سال کا عرصہ جلا وطنی میں بسر کیا۔ آپ اپنے استاد محترم کا اشارہ پا کر کابل ہجرت کر گئے اور کابل کو انگریزوں کے پنجے سے آزاد کرایا۔ محترم انگریزوں نے وہاں بھی آپ کو جھینے نہیں دیا۔ اور آپ کو دس جاپاڑا۔ وہاں پر صرف ایک سال کا عرصہ گزارا۔ اس کے بعد آپ ترکہ چلے گئے اور چار سال وہاں

قیام کیا۔ آپنے ترکوں کو خواب غفلت سے جگا یا اور انہیں باور کرایا کہ تم بے دینی کی آغوش میں جا رہے ہو۔ قرآن پاک کی چند سورتوں کا مطلب سمجھ لو تو بے دینی سے بچ جاؤ گے۔ مگر اُن لوگوں نے آپ کی دعوت کا خاطر خواہ جواب نہ دیا، لہذا آپ ترکی سے حجاز مقدس چلے گئے۔ آپ بارہ سال تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ انگریز آپ کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دہاں بھی آپ کی جاسوسی کی جاتی تھی۔ ایک دفعہ طواف کے دوران آپ نے دیکھا کہ جاسوس آپ کے پیچھے پیچھے آرہا ہے آپنے اُسے پہچان لیا اور سخت ڈانٹ پلائی۔ فرمایا تمہیں شرم نہیں آتی، یہاں بھی میرا پیچھا کر رہے ہو۔

خدا کا خوف کرو، کم از کم حرم پاک کا ہی احترام کرو۔ آپ زبردست انقلابی ذہن کے مالک تھے اسی لیے کو انگریز آپ سے ڈرتا تھا۔ آپنے قیام پاکستان سے تین سال قبل وفات پائی۔ آپنے زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا کہ میں نے انگریز کی جڑوں کو ہندوستان سے اکھاڑ دیا ہے اگر یہ چند سال کے اندر اندر اس ملک سے نہ بھاگا تو میری قبر پر اکمرلات مارنا اور کہنا کہ عبید اللہ نے جھوٹ بولا۔ چنانچہ آپ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور انگریز تین سال کے اندر اندر ہندوستان کو خیر باد کہہ گیا۔

کسی زمانہ میں برطانیہ، برطانیہ عظمیٰ کہلاتا تھا۔ یہ اتنی بڑی سلطنت تھی کہ اس پر کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ مقصد یہ کہ اس سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ کسی نہ کسی حصے پر سورج موجود ہوتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ، روس، جرمنی وغیرہ سب کمزور تھے۔ مگر اس کے ظلم کی وجہ سے اللہ نے اتنی بڑی حکومت جھین لی اور اب یہ اپنے اصل ملک میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ تو یہی وہ انگریز تھا جس نے مولانا عبید اللہ سندھی کو جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا دینی طور پر محدث ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی تھے آپ خود فرماتے ہیں کہ قبول اسلام کے بعد ہم نے اٹھارہ سال تک شیخ الحدیث مولانا محمد امجد علی کی خدمت میں رہ کر سیاست بھی سیکھی ہے اور دین بھی حاصل کیا ہے۔ آپ

امام شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کے بڑے ماہر تھے۔ نہایت نیک سیرت انسان تھے۔
 دمسلم ہو کر اتنا مشہور حاصل کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی۔ جن کا کئی کا یہ عالم تھا۔ کہ
 آٹھ دس میل کا سفر پیدل طے کر کے نماز جمعہ کیلئے آتے تھے۔ جب کہ یہ نہیں ہوتا
 تھا پیدل ہی چل جیتے۔ ایک دفعہ طمان کے لیے سفر شروع کیا۔ مظفر گڑھ کے ریلوے
 سٹیشن پہنچے تو پاس صرف اتنے ہی پیسے تھے۔ جس سے طمان کے لیے ٹکٹ
 خرید لیا۔ اتنے میں ایک اور مسافر نے سوال کیا۔ کہ سخت لاچار ہوں، طمان جاننا ہے
 مگر ٹکٹ کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آپ نے خریدا ہوا ٹکٹ اس سائل کو دیدیا اور
 خود پیدل ہی طمان کے لیے چل دیے۔

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ آپ آخر میں اشتراک ہو گئے تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے
 البتہ آپ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے۔ آپ نے اپنی تفسیر میں اشتراکیت کے
 سخت خلاف لکھا ہے۔ کیونکہ اس دور میں اسلامی نظام سے ٹکر لینے والا اشتراک
 نظام ہی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا۔ کہ اشتراک نظام کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے۔
 ایک وقت ضرور آئے گا جب انہیں قرآنی پروگرام کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔
 اسلامی پروگرام سے بہتر کوئی پروگرام نہیں ملے گا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو بھی قوم قرآنی
 پروگرام سے اعراض کریگی وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتی۔ نہ دینی اعتبار سے کامیاب
 ہو سکتی ہے اور نہ ہی دنیوی لحاظ سے درجہ کمال حاصل کر سکتی ہے۔

یہی مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہیں۔ جنہوں نے آیات زیر درس کے متعلق
 فرمایا۔ کہ میں ان آیات سے یہ اصول اخذ کرتا ہوں کہ تعلیم جبری ہونی چاہیئے
 تاکہ تعلیم حاصل کر کے ترقی کی منازل طے کی جا سکیں، یورپی ممالک میں جہاں دینی
 تعلیم جبری تھی۔ وہاں مرد و زن کسی کو تعلیم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاتا۔ سب
 کو لازماً تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہ اقوام دنیوی اعتبار سے ترقی
 یافتہ ہیں۔ مگر کہلے ہاں تعلیم پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ دینی تعلیم
 تو ویسے ہی بالکل کمزور ہے۔ صرف ایک دو فیصد لوگ ہی دینی تعلیم حاصل

کرتے ہیں، دینی طور پر بھی ہمارے پاس فیصد لوگ گنتی تک نہیں جانتے۔ اُردو دیکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور نہ ہی حساب کچھ واقفیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مسلمان حصول تعلیم کے اصول پر عمل پیرا تھے، اور ترقی کی منازل بھی طے کرتے تھے۔ لہذا لازم ہے کہ کسی مرد اور عورت کو ضروریات دین کی تعلیم سے بے بہرہ نہیں رہنا چاہیے۔

اس مقام پر عثمان حق کے متعلق یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ دیکھو جس قوم کے پاس بام عروج تک پہنچانے والی تعلیم موجود ہو، وہ طے لوگوں کے سامنے ہمیشہ کرنے کی بجائے اُسے چھپائے تو ایسا شخص لعنت کا مستحق نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اس وقت دنیا جہنم کہہ رہی ہوئی ہے۔ جرائم کی بھرمار ہو رہی ہے۔ اور ہم خاموش بیٹھے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پاس وہ تعلیم اور وہ پروگرام موجود ہے۔ جس سے جرائم کی سطح کم ہو سکتی ہے۔

ذہنی ترقی ہو سکتی ہے اور جس سے تہذیب الاخلاق پیدا ہو سکتی ہے مگر ہم اس تعلیم کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے تیار نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے مطلق فرمایا کہ سخت ضرورت کے باوجود جب اس تعلیم کو عام نہیں کیا جائے گا تو اس کا وبال لعنت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اسی لیے مولانا جلیل اللہ سندھیؒ نے فرمایا تھا کہ ضروریات دین میں سے سب سے پہلا نمبر تعلیم کا ہے۔ اُسے جبری طور پر نافذ کرنا چاہیے۔

اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں یعنی بیانات اور ہدایت کا ذکر کر کے فرمایا کہ جو لوگ ان دو چیزوں کو چھپاتے ہیں، وہ اللہ اور لوگوں کی لعنت کے سزاوار ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بیانات سے مراد وہ واضح باتیں ہیں جو معمولی تجربہ سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی نعمتوں کا شکریہ اور صبر وغیرہ شامل ہیں اور ہدایت سے مراد ایسی باتیں ہیں جن کو سمجھنے کے لیے استاد کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی چیزیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں ان میں شعاۃ اللہ کی تعظیم بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان تمام

بیانات اور
ہدایت

چیزوں کو ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص انہیں چھپانے کی کوشش کرے گا، تو وہ لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔

کتمان حق کی بیماری مسلمانوں کے لیے بھی ویسی ہی خطرناک ہے جس طرح بیوہ و نصاریٰ کے لیے منک ہے۔ اہل کتاب نے کتاب اللہ سے اعراض کیا، اور دیگر خرافات میں لگ گئے لہذا ناکام ہوئے۔ زادھر بھی یہی حال ہے مسلمانوں نے قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور اُنہوں نے لوگوں، بدعات اور شرک پر گزارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا انجام بھی اہل کتاب سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

معانی کا پڑاؤ

فرمایا لعنت کی اس تعزیر سے وہی کچ سکیں گے اَلَّذِیْنَ تَاْبُوْا
جنہوں نے توبہ کر لی، وَاَصْلَحُوْا اپنے آپ کی اصلاح کر لی۔ یعنی خود کو سنوار
لیا۔ سابقہ فرائض و حقوق ادا کئے اور آئندہ کے لیے استعد ہونے کا عہد کیا
وَبَیَّنُوْا اور جس چیز کو چھپا ہے تھے اُسے واضح طور پر بیان کر دیا۔ منسرایا
فَاُولٰٓئِکَ اَلْوَبٰٓءُ عَلَیْہُمْ میں ایسے ہی لوگوں پر رجوع کرتا ہوں۔ وَاٰتٰنَا
الشَّوَابَ التَّحٰیْمَ۔ اور میں رجوع کرنے والا مہربان ہوں مطلب یہ کہ
جب کوئی شخص سابقہ کوتاہیوں اور غلطیوں سے تائب ہو کر راہِ راست پر آجائے
تو میں اس کی تمام سابقہ لغزشیں معاف کر دیتا ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر معاف کرنے
والا رحیم و کریم اور کوئی نہیں۔ حتیٰ کہ میں کفر و شرک جیسے اکبر الکبائر کو بھی معاف
کر دیتا ہوں۔

لعنت کے
مستحقین

فرمایا اس کے برخلاف اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا جنہوں نے حق کو تسلیم کرنے
کی بجائے اس کا انکار کر دیا۔ اور پھر اسی ماحول میں وَمَا تَوْاٰنُوْا اَنْ کُوْمَتْ اٰمِنٌ
وَهُمْ کُفَّارٌ اور وہ کافر ہی ہے۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْہُمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ
وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں
کی لعنت ہوگی۔ خُلِدُوْا فِیْہَا اس لعنت میں وہ ہمیشہ گرفتار رہیں گے
لَا یُخَفَّفُ عَنْہُمْ الْعَذَابُ اَنْ کے لیے تخفیف عذاب کا بھی کوئی

امکان نہیں وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ اور نہ ہی انہیں کوئی مصلحت ملے گی۔ مقصد یہ کہ جو لوگ کفر کی حالت میں ہی مر جائیں گے وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ نہ قرآن کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی اور نہ ہی اس عذاب کو کچھ دیر کے لیے مؤخر کر کے انہیں مصلحت دی جائے گی۔ لعنت کا عذاب اس قدر عنت ہو گا۔

مسئلہ لعنت کے متعلق مفسرین اور فہمے کرام فرماتے ہیں کہ کسی پر لعنت نہیں کرنی چاہیے سوائے اس کے کہ یہ ثابت ہو جائے۔ اُس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے۔ کسی کافر پر بھی اس کی زندگی میں لعنت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ موت کے پہلے تائب ہو جائے۔ ابلیس پر لعنت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اُس کا کفر معلوم ہے۔ اس کے علاوہ برائی پر لعنت درست ہے، جیسا کہ صحابہ کرام کو بُرا بھلا کئے والوں کے متعلق فرمایا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى شَرِّكُمْ مَثَلُ شَرِّهِ خُذَا کی لعنت یا مثلاً برکام کرنے والے پر لعنت ہے لَعْنَةُ اللَّهِ — السَّارِقُ یعنی چور پر اللہ کی لعنت ہو۔ یا لَعْنَةُ اللَّهِ — مَنْ سَبَّ وَالِدَيْهِ اپنے اہل باپ کو گالی دیتے والے پر خدا کی لعنت ہو۔ اسی طرح فرمایا لَعْنَةُ اللَّهِ مَنْ غَيَّرَ مَسَارَ الْأَرْضِ مَشْرُوكِ زَمِينِ کے نشانات مٹانے والے پر اللہ کی لعنت ہو۔ لَعْنَةُ اللَّهِ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللَّهِ غَيْرَ اللَّهِ کے تقریب کے لیے ذبح کر نیوالے پر اللہ کی لعنت ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَاللَّهُ كُفَرًا لَهُ الْإِجْدَانِ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ کوئی اور معبود حق نہیں ہے۔ لہذا عبادت صرف اُسی کی کر دو، کفر و شرک سے باز آ جاؤ۔ لفظ اللہ میں محبت کا معنوم بھی پایا جاتا ہے اور اس کا معنی فرشتہ ہونا بھی ہے۔ اس لیے اللہ کا معنی دلربا بھی کیا جاتا ہے۔ شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی نے اس کا ہندی ترجمہ سن موہن بھی کیا ہے۔ غرضیکہ لفظ اللہ میں محبت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور محبوب حقیقی خدا تعالیٰ ہے۔ لہذا اس کی وحدانیت پر ایمان لانا چاہیے اور خالص اسی کی عبادت کرنی چاہیے اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنانا

معبود صرف
ایک ہے

چاہیے۔ یہ تمام مسائل کی بنیاد ہے۔ اگر تہذیب اخلاق اس بنیاد پر قائم ہوگا، تو درست ہوگا، ورنہ نہیں۔ لہذا معبود وہ ہو سکتا ہے۔ جو مختار کل، قادر مطلق، علیم و خیر نافع اور ضار ہو، جو مشکل کشائی کرے تو لا الہ۔ ہمہ میں، ہمہ دان اور ہمہ توان ہو، وہ جو چاہے کرے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اور جن کے حکم کو کوئی ٹال نہ سکے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اور وہ الیا معبود ہے الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ جو رحمن اور رحیم ہے۔ رحمن جسے مراد بے حد مہربان ہے اس کا بڑا فیضان ہے اور رحیم سے مراد خصوصی رحمت کرنے والا ہے، اہل ایمان کے لیے خصوصی رحمت کا اظہار قیامت کے روز ہوگا۔

اہم شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ رحیم و رحیم کا تعلق تجلی عظیم سے ہے۔ جیسے الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی یعنی رحمن کی تجلی عرش پر پڑتی ہے۔ اور جس شخص کا تعلق اس تجلی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ کامیابی کی منزل پالیتا ہے۔ اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ تہذیب اخلاق یا تعظیم شعار اللہ کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسان کا تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جائے۔

یہ بڑی اہم آیت ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اِنْ دُوَا تَوَابًا مِّنْ اِسْمِ عَظَمِ هِ۔ یعنی طاعت اللہ اور اللہ جل جلالہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ اور اَللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ۔ اہم عظیم اللہ جل جلالہ کا وہ اسم پاک ہے۔ جس کی خاصیت یہ ہے کہ جب اس نام کے ساتھ اُسے پکارا جائے تو وہ بندے کی دعا کو مستجاب کرے اور اسے قبول کرتا ہے۔

سَبَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس شصت و سہ (۶۳)

آیت ۱۶۳

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۖ وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ
الْمُخْتَلِفِ ۚ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَتَّبِعُ لِقَوْمٍ يَظُنُّونَ ۖ (۱۶۳)

تو جس پر بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور دن کے
اختلاف میں، اور کشتیوں میں جو بیکر طبعی ہیں دریا میں لوگوں کے فائدہ کی چیزیں اور جہاں
اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف سے اتارا ہے جس کے ذریعے زمین کو خشک ہو جانے کے بعد
دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اور اس زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے ہیں۔ اور ہواؤں کے
پھیرنے میں، اور بادل جو آسمان و زمین کے درمیان سفر کیے ہوئے ہیں، ان سب چیزوں
میں مختلفہ لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں (۱۶۳)

پہلے خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت اور قبلہ ہونے کا بیان ہوا۔ اس کے بعد مکتب
اسلام کے اہم ترین اصول یعنی ذکر اللہ، شکر اللہ، صبر اور تعظیم شاعر اللہ کا ذکر ہوا۔ پھر
کتاب اللہ کی تعلیم اور اس کی ضرورت و اہمیت بیان کر کے ہوئے، ان لوگوں
پر وبال کا ذکر کیا۔ جو تعلیم کو چھپاتے ہیں۔ اور پھر آخر میں ان تمام چیزوں کی بنیاد
توحید اَللّٰهُمَّ اَللّٰهُ وَاحِدٌ کا بیان ہوا۔ اور پھر آگے توحید کے دلائل کے
طور پر دس چیزوں کا ذکر فرمایا ہے

گذشتہ سے
پہلو سے

تہذیب الاخلاق کے بعد سوسائٹی کا دوسرا اہم مسئلہ کسب معاش ہے۔
یہ ایک ایسا معاملہ ہے۔ کہ ہر شخص کو اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ گزر اوقات

کسب معاش

کے لیے معاش کا کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا ہی پڑا ہے، اس سے کوئی انسان لا تعلق نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں اپنا نائب مقرر کیا۔ اور تمہارے لیے معیشت کے مختلف سامان پیدا کیے۔ حضور علیہ السلام کی حدیث پاک میں بھی آیا ہے کہ رزق حلال کی طلب فیضانِ حق ہے۔ الفرائض اللہ کے مقدر کردہ فرائض کے بعد یہ بھی ایک فریضہ ہے اور چونکہ وسائل معاش اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ رزق حلال کی تلاش کے ساتھ ساتھ عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی کرے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے ”فَابْتَغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ“ روزی اللہ کے پاس تلاش کرو۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی رزاق ہے اور نہ کوئی معبود ہے۔ آیت زیر در کس میں اللہ تعالیٰ نے اُن انعامات کا ذکر کیا ہے جنہیں اللہ نے وسائل معاش بنایا ہے۔ اور انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ جب اللہ جل جلالہ نے تم پر اتنے بڑے بڑے انعامات کیے ہیں کہ جن کے بغیر تمہاری گذراوقات ہی ممکن نہیں، بلکہ زندگی کا دار و مدار ہی ان چیزوں پر ہے تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو کیسے معبود بناتے ہو۔ وسائل معاش کے ان انعامات میں تمہارے لیے توحید الہی کے واضح دلائل موجود ہیں۔

اس آیت میں بیان کر وہ دس احسانات میں سے اللہ تعالیٰ نے سب آسمانی کائناتوں سے پہلے تخلیق آسمان کا ذکر فرمایا ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ یعنی آسمانوں کو پیدا کرنے میں صاحبِ عقل لوگوں کے لیے واضح نشانات موجود ہیں۔ تخلیق آسمانی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے وہ تمام احسانات جلائے ہیں جو آسمان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں وہ تمام کمرے شامل ہیں جو آسمان کی فضاؤں میں موجود ہیں اور باقاعدہ گہودیں کر رہے ہیں۔ پورا نظام شمسی جس سے کہہ ارض والے مستفید ہو رہے ہیں۔ آسمانی نظام کا ایک حصہ ہے۔ آسمانی کمروں میں سورج، چاند اور زمین بڑے اہم کمرے ہیں۔ جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ پھر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

نہ صرف انہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ انہیں ایک خاص رفتار سے گردش میں لاکر نسل انسانی کی تمام ضروریات زندگی فراہم کر دی ہیں۔ نوح انسان کے لیے روشنی اور حرارت سورج کی مہربان منت ہے۔ اگر انسان کو یہ چیزیں میسر نہ ہوں۔ تو نہ کوئی کام ہو سکے اور نہ خود رک کے لیے غلہ، سبزیاں اور پھل پک سکیں۔ اور پھر یہ ہے کہ سورج ۲۶ دن میں ایک خاص رفتار سے اپنا چکر پورا کر لے گا۔ جس سے مومنوں کا تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان گدا، سرما، بیمار اور غمراں ہر موسم سے مستفید ہوتا ہے۔ پورے چوبیس گھنٹے کا چکر بھی دن اور رات کی تخلیق کا باعث ہے جسکی وجہ سے انسان کی روزمرہ زندگی میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ سورج اور چاند زمین کے گرد چکر نہیں لگاتے بلکہ زمین ان کے گرد چکر لگاتی ہے اور خود بھی اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ تاہم جس طریقہ سے بھی ہے آسمانی کمروں کا یہ نظام اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما کر انسان پر احسان عظیم کیا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا انحصار اس نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔

زمین کے بعد چاند اپنی منزل ۲۸ یا ۲۹ دن میں پوری کرتا ہے۔ بعض سیارے دو سال میں اپنا چکر پورا کرتے ہیں۔ ماہرین فلکیات کا کہنا ہے کہ ثابت یہ ہے ایلے میں جو اپنا چکر ۲۵ یا ۲۶ ہزار سال میں مکمل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کے متعلق خاص طور پر فرمایا کہ یہ ضیا ہے۔ اسی طرح چاند کی دھیمی دھیمی روشنی کے ذریعے اللہ تعالیٰ پھلوں میں رس پیدا فرماتے ہیں۔ اسی طرح سمندر کے مہ و حشر کا تعلق بھی چاند کے بڑھنے گھٹنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آسمانی کا ذکر کر کے اس سے وابستہ نظام اور اس سے انسانی مفاد بیان فرمایا ہے۔

إِنَّ فِي تَخْلِيقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْمَاءِ وَالْخَلْقِ فِيهَا لَآيَاتٍ لِّمَن يَعْقِلُ
 کا ذکر کیا ہے وہ تخلیق زمین ہے۔ زمین کے ساتھ انسانی زندگی کی بقا کس قدر وابستہ ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ انسانی ضرورت کی ہر چیز زمین سے پیدا

زمین

ہوتی ہے۔ غلہ، سبزی، پھل، نباتات، ہر چیز کا منبع زمین ہے۔ انسانی زندگی کی اہم ترین چیز پانی بھی زمین کے کھوٹے سے نکل آتا ہے۔ اس کے علاوہ معدنیات کے وسیع ذخائر مثلاً سونا، چاندی، کوئلہ، تانبہ، نمک، گندھک، تیل وغیرہ سب زمین کی پیداوار ہیں۔ لوسہ کا لور الٹر قلعے نے خاص طور پر قرآن پاک میں تذکرہ کیا ہے

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ لَهُمْ فِيهِ مَخْرُجٌ مِّنَ صَدْرِهِ ذُرُورٌ وَاللَّهُ يَبْدَأُ مَا يَشَاءُ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ

لوہ پیدا کیا۔ اس میں لوگوں کے لیے بڑے بڑے فائدے سکھے ہیں۔ اس زملے کو لور لوسہ کا زمانہ (ARON. AGED) بھی کہا جاتا ہے۔ دیکھیے لیجیے آج کی دنیا میں لوہا کتنا اہم عنصر ہے۔ ریل، موٹر، جہاز بحری ہو یا ہوائی، چھوٹے چھوٹے اوزار سے لے کر بڑی بڑی مشینیں تک تمام کے تمام لوسہ کے محض ہیں۔ اور پھر الٹر قلعے نے اس کے ذخائر بھی زمین ہی میں سکھے ہیں۔ اس کو کلام میں لانے کے لیے اسے نرم کرنیکی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے ایندھن بھی کٹنے کی صورت میں زمین ہی سے پیدا کیا ہے۔

قرآن پاک میں پہاڑوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ پہاڑوں کے ساتھ بھی انسانی زندگی کے بہت سے مفاد وابستہ ہیں۔ جن میں پتھر، چٹان، جڑی بوٹیاں اور معدنیات شامل ہیں۔ اور یہ پہاڑ بھی الٹر تعالیٰ نے زمین پر ہی پیدا کیے ہیں۔ کہیں منسرایا ”جَعَلَ فِيْهَا دُرًا سَبِيحًا“ زمین میں بوجھل پہاڑ جگہ جگہ رکھ دیے کہیں منسرایا۔ ”وَالْجِبَالِ اَكْشَادًا“ پہاڑوں کو زمین میں میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ الغرض پہاڑ بھی زمین ہی کا حصہ ہیں اور زمین ہی سے تمام ضروریات زندگی وابستہ ہیں اور بالآخر مرنے کے بعد زمین ہی اسے اپنی آغوش میں لیتی ہے۔

شب در روز کے تغیر و تبدل کے متعلق فرمایا۔ وَاسْتَخْلَفَ فِي الْيُسْرِ وَالْيُسْرَىٰ عَنِ دِينِ رَأْسِ الثَّغِيرِ یعنی دن رات کے تغیر میں بھی قدرت الہی کے واضح نشانات موجود ہیں۔ جتنے لوگ سمجھتے ہیں کہ دن رات کی تبدیلی میں الٹر قلعے نے انسان کے لیے کس قدر منفعت رکھی ہے۔ دن کے وقت انسان کام کاج کر کے اپنی

روزی پیدا کرتا ہے۔ اور پھر جب دن بھر کے کام سے تھک جاتا ہے تو آرام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے آرام کے لیے رات بنائی تاکہ وہ آرام و سکون حاصل کر کے اگلے دن کی مشقت کے لیے پھر سے کمر بستہ ہو جائے اگر ہمیشہ دن ہی رہتا یا ہمیشہ رات ہی چلتی رہتی تو گذراوقات میں کس قدر مشکلات آتیں۔ سورۃ قصص میں فرمایا: **وَمَا يَكْفُرُ سِوَايَ اَنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ اَلْیَلَّ سِرْمَہٗا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ مِّنَ اللّٰهِ عَتِیۡرًا لَّیۡسَ لَکُمْ بَصِیۡکَہٗ** اگر اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے دن ہی قائم رکھتا، تو تمہارے سکون و آرام کے لیے رات کو کون لایا کرتا۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات میں اختلاف پیدا کر کے انسان پر احسان عظیم کیا ہے

بحرہ جہاز

اس کے بعد فرمایا **وَالْفُلُکَ الَّتِیْ تُجِیۡی فِی الْبَحْرِ دِرَیۡا اُرِیۡمُنۡدِیۡنَ** چلنے والی کشتیاں اور جہاز جہاں **یَنْفَعُ النَّاسَ** جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں یہ بھی ایسی چیزیں ہیں جن میں نقل و ثقل رکھنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ دریائی اور سمندری سڑتے زمانہ قدیم سے نقل و حمل کے معروف سڑتے ہیں۔ جہول جہول دنیا نے ترقی کی ہے۔ ان ذرائع میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ بارہائی کشتیوں کی جگہ بڑے بڑے مال بردار جہاز معرض وجود میں آئے ہیں۔ جن کے ذریعے لاکھوں ٹن مال ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ خشکی اور ہوائی ذرائع کی نسبت بحری ذرائع سے نقل و حمل آج بھی سستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی ایک کونے میں پیدا ہونے والی چیز دنیا کے دوسرے کونے تک آسانی پہنچ رہی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کشتی نوح کا ذکر کر کے اُسے ہمیشہ کے لیے نمونہ بنا دیا ہے۔

لاکھوں ٹن وزنی بحری جہاز جدید ٹیکنالوجی اور علم یعنی کے مروجہ منت ہیں مگر ان فنون کی حقیقی ایجاد دراصل حضرت ادریس علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوئی انکو اخراج کہا گیا ہے تھیر مارک والے نے لکھا ہے کہ قلم کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام سے شروع ہوا کپڑے پینے کا ہنر اور مٹینری بھی ان کے ہاتھوں سے ایجاد ہوئی۔

ستاروں سے متعلق معلومات، علم حساب اور ناپ تول کے اوزان بھی انہوں نے رائج کیے مختلف مواقع پر استعمال کرنے والا اسلحہ بھی حضرت ادریس علیہ السلام کے ہاتھوں سے ظہور میں آیا۔

پانی کا نزول

نشانِ قدرت ہی کے بیان میں فرمایا وَمَا أُنْزِلَ اللَّهُ مِنْ السَّمَاءِ مِنْ نَّهَارٍ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نشانوں میں سے ہے کہ اس نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا جس کے ذریعے مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ انسان اور جانوروں کے لیے خوراک کی پیداوار کا انحصار پانی پر ہے۔ اگر پانی نہ ہو تو کوئی چیز پیدا نہ ہو۔ آسمان سے نزولِ آب سے مراد بارش ہے۔ قرآن پاک میں بار بار آتا ہے کہ دیکھو ہم کس طرح بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ چلاتے ہیں اور پھر اُن کے ذریعے خشک زمین پر بارش برساتے ہیں جس کے ذریعے ہم کھیتیاں اگاتے ہیں جو تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لیے خوراک بنتی ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ کھیتی باڑی کا کام جدید طرز پر ہونے لگا ہے۔ آلاتِ زراعت میں ترقی ہوئی ہے۔ ذرائع آبپاشی کی سہولتیں میسر آئی ہیں۔ نئی قسم کی کھادیں دریافت ہوئی ہیں جن سے پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسانی معیشت سے متعلق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ان میں عقل مند لوگوں کے لیے واضح نشانیاں ہیں۔

جانوروں کی نسل کشی

نزولِ آب کے بعد فرمایا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ یہ اللہ تعالیٰ کے واضح دلائل میں سے ہے کہ اُس نے زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلادیے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے کتنے جانور پیدا فرمائے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی زندگی کا جانوروں کے ساتھ گہرا تعلق ہے خصوصاً وہ مویشی جن کا گوشت، دودھ، کھال اور ٹہریاں لوگ استعمال کرتے ہیں انہیں انسانی معیشت میں بڑا عمل دخل ہے اعمق نہ گائے، بھینس، بھیر، بکریاں، نہ صرف دودھ میا کرتے ہیں بلکہ یہ انسانی خوراک کا بھی حصہ ہیں۔ اسی طرح گھوڑے، اونٹ اور گدھے وغیرہ بار بوزاری

اور ساری کے کام آتے ہیں۔ مرغ، بیڑ، اور مچھلی خوراک کا حصہ ہیں۔ مرغی کے لڑنے
انسانی خوراک کا اہم جزو ہیں۔ شکاری جانور بھی انسان کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں۔
اب تو حصید الحیوانات ایک مستقل سلسلہ اور پیشہ بن گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اسباب
محاشس میں داخل ہیں اور اللہ نے انہیں نشانات قدرت کے طور پر بیان فرمایا ہے
آگے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی اور نشانی ہوا کا ذکر ہے۔ فرمایا قَضَرْنٰ نٰفِثَ

ہوائوں کی گردش

الْقَلْبِ ہوائوں کی گردش بھی صاحبِ عقل لوگوں کے لیے نشانِ راہ ہے۔ ہر
ذی جان کے لیے ہوا اس قدر ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر انسان و حیوان چند منٹ
بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہوا ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہے کبھی مشرق سے مغرب
کی طرف اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف چلتی ہے کبھی اس کا رخ شمالاً جنوباً ہوتا
ہے۔ جو انسانوں اور جانوروں کے لیے سکون کا باعث ہوتا ہے۔ جب ہوا
کی گردش رُک جاتی ہے۔ تو لوگ گرمی میں تڑپ جاتے ہیں۔ پرانے زمانے
میں ہوا کے ذریعے بادبانی کشتیاں چلتی تھیں، اسی کے ذریعے لوگ بھوسے
سے غلہ علیحدہ کرتے تھے۔ ہوا ہی بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لہانے
کا باعث بنتی ہے اور دُور دُور تک بارش ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تسخیر ہوا کا قانون بھی انسان کو سکھایا۔ پانی سے بھاپ اُٹھتی
ہے جس سے ریل گاڑیاں چلتی ہیں اور مکوں میں بڑے بڑے کام لیے جاتے
ہیں۔ بڑی سے بڑی مشینری حرکت میں آتی ہے جس کے ذریعے انسانی مفاد کی
بے شمار چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ دغانی جہاز بھی بھاپ سے چلتے ہیں۔ یہ سب تسخیر
ہوا کے کوششے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے تیز ہوا یعنی آمدھی کے
وقت کے لیے دعا سکھائی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ خَیْرِهَا وَخَیْرِ
مَا فِیْہَا اے اللہ میں ہوا اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی خیر مانگتا
ہوں۔ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّہَا وَ شَرِّ مَا فِیْہَا اور میں تیری نیت

کیا تھا ہوا کے شر سے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ دوسری جگہ فرمایا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِّكَ رِيَّاحًا وَلَا تَجْعَلْ لِّكَ رِيَّاحًا اے اللہ! ہو کر ریاخ یعنی خوشگوار بنا اور اس کو ریح یعنی مذاب نہ بنا۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں لفظ ریح استعمال ہوا ہے تو دہاں ہوا کا ذکر ہے۔ جیسے فرمایا کہ ہم نے قوم عاد پر ہاتھ قسم کی ہوا بھی اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيْثَ۔ یہی ہوا بعض اوقات بڑی نرم اور خوشگوار ہوتی ہے۔ فرمایا نَصْرَتْ بِالصَّبَا سِرِّيْ شَرْقٍ سے چلنے والی خوشگوار ہوا سے مدد کی گئی ہے۔ اللہ نے مجھ پر صربانی فرمائی ہے۔ اسی تند و تیز ہوا نے غزوہ خندق کے موقع پر کفار کے خیمے اکھاڑ دیے، سلمان درہم برہم کر دیا اور انہیں دہاں سے بھاگنا پڑا۔ اسی طرح قوم عاد مغرب کی طرف سے چلنے والی گرم ہوا کا شکار ہوئی اور تباہ و برباد ہو گئی وَ اَمَّا عَادًا فَاهْلَكُوْا بِسُحُبٍ مَّحْنُومَةٍ تَزْبِطُ الْوُدُنَ اور تباہ و برباد ہوتی ہے اور غفلت لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔

فرمایا السَّحَابُ الْمَكْرُوبَيْنِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ زمین و آسمان کے درمیان تسخیر شدہ بادل بھی لَا اَنْتَ لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ صاحب عقل لوگوں کے لیے نشانات ہیں۔ بادلوں کی تسخیر کا مطلب یہ ہے کہ یہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ان سے کام لیتا ہے جس رخ پر چاہے انہیں موڑ دیتا ہے۔ اور جہاں انکی مثبتیت ہوتی ہے ان کے بارش برسا دیتا ہے۔ جس سے فصلوں میں بار آ جاتی ہے۔ کھیتیاں ہری بھری ہو جاتی ہیں مگر جب انہیں بادلوں سے وافر پانی بہا دیا جاتا ہے۔ تو بڑے بڑے طوفانوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور تباہی اور بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ جب اللہ کا حکم ہو گیا ہے۔ تو انہی سحابِ سحر سے اگلے برسنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اچنی پکائی فصلیں کوڑے کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ لہذا یہ بھی نشانات قدرت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ سفید، سیاہ اور سرخ بادلوں کے ذریعے

اپنی نشان کے مطابق مختلف قسم کے کام لیتا ہے

یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اسکی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ یہ تمام چیزیں ممکنات میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ اللہ کے سوا ان کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنے جسم، مفاد، اغراض اور بقائیں خود محتاج ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسباب معاش بھی سمجھائیے۔ یہ تمام چیزیں اس کی قدرت کے نشان ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو صاحب عقل ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہیں مگر جو لوگ غور و فکر کی اہلیت سے محروم ہیں۔ انہیں قدرت کے یہ بڑے بڑے نشان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا یَسْرُوْنَ عَلَیْہَا وَہُمْ عَنْہَا مُعْرِضُونَ کہ لوگ اللہ کی نشانیوں سے گزر جاتے ہیں مگر وہ اُن سے غافل رہتے ہیں۔ قدرت کی دلیلیں اُن پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے اَلْہٰکُمْ اللّٰہُ وَاجِدٌ پریاں دس دلائل بیان فرمائے ہیں اور ساتھ یہ بات بھی سمجھا دی کہ تہذیب اخلاق کے بعد دوسرا مسئلہ کسب معاش کا آتا ہے۔ اور معاش کے تمام اسباب خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں لہذا عبادت بھی صرف اُنکی کی کرنی چاہیے۔

سَبْعُونَ ۲

درس شصت و چار (۶۴)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۶۵ تا ۱۶۷

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ
 كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ
 ظَلَمُوا إِذْ يَرْوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ
 اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝ (۱۶۵) إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ
 اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ (۱۶۶)
 وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّا كُنَّا نَاكِرَةً فَنُتَبَرَّأُ مِنْهُمْ كَمَا
 تَبَرَّءُوا مِنْهُمْ كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ
 عَلَيْهِمْ ۝ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ (۱۶۷)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدا کا شریک بناتے
 ہیں۔ ان سے ایسے ہی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنی چاہیے اور جو
 ایمان دار ہیں وہ اللہ کے لیے محبت میں زیادہ شعیہ ہیں اور اگر دیکھیں وہ لوگ
 جہنم میں ظلم کیا جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ بیشک ساری قوت اللہ ہی
 کے لیے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے (۱۶۵) جب کہ بیزار ہو جائیں گے
 وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی اور وہ عذاب
 کو دیکھیں گے اور ان کے اسباب منقطع ہو جائیں گے (۱۶۶) اور وہ لوگ
 جنہوں نے پیروی کی کہیں گے کہ کاش اگر چاہے

یہ دنیا میں پٹن ممکن ہر تہم بھی انکے نیراکی کا اعلان کریں۔ جیسا کہ یہ آج ہم نے
 بیزار ہوئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ دکھلائے گا ان کو ان کے اعمال خسرت
 دلانے کے لیے اور وہ دوزخ کی آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے (۱۶۷)

گزشتہ آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو اسباب
معیشت کی صورت میں بنی نوع انسان پر کیے۔ اس احسان کا تقاضا یہ تھا کہ
لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانتے اور خالص اسی کی عبادت کرتے۔ مگر
ایسا نہیں ہوا بلکہ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا
بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو تدبیر یعنی برعکس بناتے ہیں۔
دوسرے لفظوں میں اللہ کا شریک ٹھہرتے ہیں۔ مذکورہ صفت میں پہلے بھی آچکا
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔
اللہ تعالیٰ کے برعکس اور شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ تم بخوبی جانتے ہو کہ خالق، مالک
اور رازق صرف وہی ہے۔ بسبب الاسباب بھی وہی ذات ہے۔ لہذا
دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔

فرمایا جب لوگ غیروں کو اللہ کا برعکس مقابل تسلیم کر لیتے ہیں۔ تو پھر کرتے
یہ ہیں کہ يُخْبِتُونَ لَهُمْ كَخِيبَتِ اللَّهِ ان سے اُس درجہ کی محبت کہتے
ہیں جس درجہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہیے۔ اور یہی غرالی کی جڑ ہے
یہیں سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب غیر اللہ کی محبت اللہ کی محبت سے
ستجاذز کر جاتی ہے۔ یا اُس کے برابر آ جاتی ہے تو پھر تمام وہ صفات غیر اللہ میں
بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور پھر غیر اللہ سے بھی
اُسی طرح حاجت روائی اور مشکل کشائی کا مطالبہ ہوتا ہے جو اللہ جل جلالہ سے
ہونا چاہیئے۔ اسی لیے فرمایا کہ بعض بد بخت ایسے بھی ہیں۔ جو اللہ کا شریک ٹھہراتے
ہیں۔ اور پھر اُن سے ایسی ہی محبت کہتے ہیں، جیسی محبت اللہ تعالیٰ کی ذات
پاک سے ہونی چاہیئے۔

فرمایا شرک کی اس سنجاست کے برخلاف وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ
حُبًّا لِلَّهِ اہل ایمان کا گردہ الیا بھی ہے۔ جن کے دل میں شدید ترین محبت صرف
اللہ ہی کی ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو برعکس ٹھہرا کر ان کو اللہ کی محبت

محبت الہی

میں برابر کا شریک نہیں بنتے۔
 قیامت تو ابھی دُور کی بات ہے۔ قرآن پاک شاہد ہے کہ مشرکین بعض اوقات
 دنیا میں ہی اپنے معبودوں کی محبت کو ترک کر دیتے ہیں، جب ان کی کشتی
 طوفان میں پھنس جاتی ہے، تو قرآن پاک کہتا ہے "دَعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ"
 تو حلی معبودوں کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے گئے ہیں۔ اور پھر آخرت میں
 تو بیزاری کا اعلان کر ہی دیں گے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے۔ اس کے برخلاف
 اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ انہیں خواہ
 تنگی ہو یا راحت، خوشحال ہوں یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوں، تندرست ہوں یا بیمار
 ان کی محبت اللہ کی حالت میں بھی زائل نہیں ہوتی۔ باقی رہی انبیاء، اولیاء اور بزرگانِ
 دین کی محبت تو ایسی محبت اللہ ہی کے حکم سے — ہوتی ہے، ان
 ہستیوں سے محبت بالذات نہیں ہوتی بلکہ محبت بالذات صرف خدا تعالیٰ
 سے ہی ہوتی ہے۔

محبت کی مختلف قسمیں ہیں جیسے طبعی محبت، عقلی محبت اور شرعی محبت وغیرہ محبت کا اقسام
 طبعی محبت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے عاشق اپنے معشوق کی محبت کرتا ہے
 یا غلام کو بیوی سے اور والدین کو اولاد اور دیگر اقرباء سے محبت ہوتی ہے۔
 عقلی اور شرعی محبت کی مثال حضور علیہ السلام کی دعا سے ملتی ہے اَللّٰهُمَّ
 اِنِّیْ اَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ یَّقْرِئُنِیْ بِاِلٰی حُبِّكَ
 یعنی اے اللہ! مجھے اپنی محبت عطا کر اور اس کی محبت عطا کر جو تجھ سے محبت کرتا
 ہے اور اے عمل کی محبت عطا کر جو مجھے تیری محبت قریب کرے۔ اور آخر میں یہ بھی
 آتا ہے وَلَجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَاهْلِیْ وَمَالِیْ —
 وَ مِنْ الْمَاءِ الْبَارِدِ اور اے اللہ! اپنی محبت کو میرے نفس میرے اہل،
 میرے مال — اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دے یہاں پر ٹھنڈے
 پانی کا بطور خاص ذکر فرمایا، ٹھنڈا پانی گرم تھا لہذا ایک حکیم عملاً، ہونے کے درپے انسانِ راحت

حاصل کرتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ جس شخص کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت باقی تمام چیزوں سے زیادہ ہوگئی، اُس کا ایمان کامل ہو گیا لیکن قرآن پاک نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اللہ اور رسول کی محبت کے مختلف طرح ہیں اللہ کی محبت اصالتاً اور بالذات ہے اور رسول کی محبت اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہے۔ نبی کے ساتھ مہتمی کی محبت کو نیکی کے ساتھ مشروط کر دیا۔

گیا ہے۔ سورۃ ممتحنہ میں جہاں عورتوں سے بیعت لینے کا ذکر آتا ہے۔ فرمایا: اُن سے عہد لیں کہ وہ مشرک نہیں کریں گی۔ چوری اور زنا کا ارتکاب نہیں کریں گی، اولاد کو قتل نہیں کریں گی، بہتان نہیں باندھیں گی وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْصِرَةٍ اَوْ نَكِي كَے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی اور بعض معامات پر مطلق رسول کی اطاعت کہ اللہ کی اطاعت قرار دے دیا جیسے هَنْ يَطِيعَ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللّٰهُ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی۔ دوسری جگہ فرمایا: اطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اہم اطاعت اور عبادت میں فرق ہے۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے۔ اور اطاعت رسول کی بھی اسی طرح فرض ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی فرض ہے۔

ترمذی شریف کی حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گراہی ہے اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَفْعَلُكُمْ مِنْ نَفْسِهِ لَوْ كَرِهَ اللّٰهُ سَعَتِ كَرِهَ اَمْسَ نَفْسِيں عطا کی ہیں۔ وہ منعم حقیقی ہے۔ تمہارا اپنا وجود اور اس کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں، سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں لہذا اُس سے محبت کرو۔ پھر فرمایا اَحِبُّوا نَفْسِيں اللہ خدا تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے میرے ساتھ بھی محبت کرو۔ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کا راستہ اور اس کا پیغام پہنچایا ہے۔ اس کا کلام اور اس کی شریعت تم کو دی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ میری وجہ سے میرے اہل بیت کے ساتھ بھی محبت کرو۔ کسی کے ساتھ محبت کر لے کی کئی ایک وجوہات ہیں مثلاً اگر کوئی مجال

محبت کی
مختلف وجوہات

کی جسبہ محبت کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جمیل بالذات ہے لہذا اصلی اور ذاتی محبت اُمی کے ساتھ ہونی چاہیے۔ حسن و جمال خود خدا کی صفات میں سے ہے۔ اس لیے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اہل محبت اُمی سے ہو۔ محبت کی ایک وجہ کمال بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کمال بالذات ہے۔ اور باقی چیزوں میں کمال اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ لہذا اس لحاظ سے بھی محبت کے لائق ذاتِ خداوندی ہی ہے اسی طرح محبت کی وجہ احسان بھی ہے۔ جس کے ساتھ احسان کرو، وہ محبت کرتا ہے اور سب سے بڑا محسن خود خدا تعالیٰ ہے۔ لہذا مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ محبت رکھے۔

بعض اوقات محبت کا حیار نفع اور نقصان ہوتا ہے کسی نے نفع پہنچایا ہے یا نفع کی توقع ہے تو اُس سے محبت پیدا ہوگئی۔ کبھی سے اس لیے بھی محبت کی جاتی ہے کہ اس کے بغیر نقصان کا خطرہ ہے۔ حقیقی نفع اور ضرر تو اللہ تعالیٰ ہے۔ لہذا اس وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونی چاہیے۔

محبت کا ایک اور معیار ضروریاتِ زندگی کی تکمیل بھی ہے۔ انسان کا مال و منل، گھر بار، زن و اولاد سب ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ لہذا ان سے بھی محبت کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ محبت بھی محبت بالذات نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ نے محض ذرائع پیدا کیے ہیں۔ امیر ہو یا حاکم، رسیق ہو یا دوست، برادری ہو یا کوئی ادارہ، یہ تو محض اسباب ہیں، ورنہ ضروریات کا حقیقی بہم پہنچانے والا اللہ تعالیٰ لاشریک ہے۔ لہذا محبت بالذات اُمی کو سزاوار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اختیار کی بے حد کو ایک سطح پر لے گئے گا۔ تو مشرک کامر تکب قرار پائے گا۔

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہی محبوب حقیقی ہے اس کے ساتھ محبت باقی تمام مخلوق کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیے۔ غیر اللہ کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی بھی درجہ نہیں دیا جاسکتا ورنہ یُحِبُّوْهُمُ کَحُبِّ اللّٰہِ

محبت کی
کسوٹی

کی زدیں آجائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ یعنی اللہ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کا دعویٰ کر ہو تو اس کی جانچ کے لیے کوئی کوئی ہے کہ اُس کا دعویٰ درست ثابت ہو جائے۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کسی کی محبت کی کوئی اطاعت ہے۔ جب اطاعت کا وقت آئے گا تو پتہ چلے گا۔ کہ محبت کا دعویٰ اپنے محبوب حقیقی کی اطاعت کرتا ہے یا کسی اور کی ظاہر ہے کہ جس شخصیت کی اطاعت کریگا، اُس کی محبوب ترین ہستی وہی ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک طرف خدا تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور دوسری طرف والدین، پیر یا استاد کا حکم ہے۔ تو ان میں سے وہ کس کو ترجیح دیتا ہے۔ اس مقام پر شرعی محبت کا تقاضا یہ ہے۔ وہ اپنے اللہ کی اطاعت کر کے اُس کے ساتھ شدید ترین محبت کے دعوے کو سچ کر دکھائے۔ اور اگر اُس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے حکم کو ترجیح دی۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کا محبوب حقیقی کے ساتھ محبت کا دعویٰ باطل قرار پائے گا۔ اور اس کی شدید ترین محبت اُنہی کے ساتھ ثابت ہوگی جس کی اُس نے اطاعت کی۔ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں جو کوئی بھی ملک، آباد، اجداد یا برادری کے رسم و رواج کی پیروی کرے گا۔ مشرک ہو جائے گا۔ بعض لوگ انبیاء، اولیاء، ملائکہ یا ارواح کی محبت کو خدا کی محبت کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اُن سے ایسی محبت کہتے ہیں جیسی خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اسی لیے نذر نیا ز اور قربانی پیش کرتے ہیں یا نیا ز مندی، بجا لاتے ہیں۔ یا اُن کی یادگار بناتے ہیں تو ایسے لوگ بھی مشرک ہیں طوٹ ہو جاتے ہیں۔ غیر اللہ کے ساتھ محبت کرنے کی اجازت ہے مگر ایسی محبت جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو اور اس کی محبت سے کم تر ملے پر ہو۔ محبت دراصل ایک میلان، تعلق اور خواہش کا نام ہے۔ طبعی محبت میں دنیاوی غرض کا فرما ہوا ہے، مگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ وہ عبادت، اطاعت اور اس کی رضا کے لیے ہو۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ محبت کا دعویٰ کریگا، وہ اُس کے محبوبوں کے ساتھ بھی محبت رکھے گا۔ اور اس کے دشمنوں سے نفرت کرے گا۔ محبت کی دوسری علامت یہ ہے کہ محبوب کو اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنے میں روح کا کامل نشاط حاصل ہوگا۔ وہ خوشی کے ساتھ عبادت الہی میں منہمک ہوگا اور معصیت سے گریز کرے گا۔ اسی طرح وہ خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر جان و مال کی بازی لگانے میں بھی دریغ نہیں کریگا۔ اب دیکھ لیجئے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ لوگ کس طرح غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ عیسائی مذہب نے اللہ تعالیٰ کی محبت کے مقابلے میں بزم خوش خدا کے بیٹے، کنواری ماں اور روح القدس کی محبت میں مبتلا ہیں۔ یہی مشرکانہ محبت ہے۔ ہندو مت والے بھی محبوب حقیقی کی بجائے جنہیں وہ پر مانتا یا میثور کہتے ہیں، درگا دیوی اور لکشمی مائا کی محبت میں مبتلا ہیں۔ سادھو اور شیو سے محبت کی بیٹگیں بڑھا رہے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز پیتے ہیں۔ اسی طرح کلمہ گر مسلمان بھی غیر اللہ کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ یا علی مدد اور یا غوث عظیم کے نعرے لگاتے جا رہے ہیں۔ کبھی پیر بابا کو مدد کے لیے پکارا جا رہا ہے اور کبھی خواجہ سمیع الدین کی جا رہی ہے یہ لوگ تو اللہ کے پیلے، محبوب اور صالح لوگ ہیں۔ ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ ان لوگوں نے غیروں کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی قرار دے لیا ہے اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے **فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ خَالِصَاتُ الدِّينِ** کو پکارو کہ وہی حاضر و ناظر مالک و مختار اور مدد کرنے والا ہے۔ مگر یہ لوگ غیر اللہ کو بھی اللہ ہی کے ہم پلہ بنا کر شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اللہ والوں کا یہ طریقہ قطعاً نہیں ہے۔

غیر اللہ کی
محبت

اہل ایمان کا طریقہ

اہل ایمان کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے **وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ** کہ انہیں سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتی ہے۔ وہ کسی غیر اللہ

کی محبت کو اللہ کی محبت کے برابر نہیں جانتے۔ جہاں تک نبی کی محبت کا تعلق ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے۔ خدا نے حکم دیا ہے نبی سے محبت کرو نبی کی محبت نبی کی اطاعت میں مضمر ہے اور اطاعت عبادت نہیں ہوتی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلْكَوْمُوْا اَخَاكُمْ بِطَنَةِ بَهَائِیْ کا احترام کرو۔ میں تمہارا بھائی ہوں، لہذا میرا احترام کرو۔ مگر عبادت صرف رب کی کرو وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ اَیْنَ لَوْگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی محبت کے دعویدار بھی ہیں مگر مافوق الاسباب غیر اللہ کو بھی مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ حالانکہ زبان سے اقرار کرتے ہیں اَیَّاكَ تَعْبُدُ وَلَا یَاكَ تَسْتَعِیْنُ مگر عمل اس کے خلاف ہے۔ انبیاء سمیت ساری کی ساری مخلوق محتاج اور عاجز ہے، قادر مطلق صرف اللہ کی ذات ہے۔ لہذا اہل ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں شدید ترین محبت محبوب حقیقی یعنی خداوند تعالیٰ کی ذات سے ہوتی ہے

اللہ ہی قادر
مطلق ہے

فرمایا وَلَوْ نَشِئْیَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اور اگر ظالم لوگ دیکھیں گے اِذْ یُرَوْنَ الْعَذَابَ جب کہ وہ عذاب کو دیکھ لیں گے۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ساری طاقت تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ وَ اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْقٌ الْعَذَابِ اور اللہ سخت گرفت کا بھی مالک ہے۔ مقصد یہ کہ غیروں کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے ہم پلہ گرداننے والوں پر یہ راز قیامت کے دن کھلے گا کہ وہ غلطی میں مبتلا تھے۔ جب یہ ظالم اپنی آنکھوں سے دوزخ کے عذاب کو دیکھ لیں گے کہ آج اللہ کے سوا کسی دوسرے کی محبت کام نہیں آسکتی۔ آج تو ساری طاقتیں اور تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، آج وہی قادر مطلق ہے، اسی کا حکم چلتا ہے۔ کاش کہ ہم نے دنیا میں اُسی کی محبت کو اولیت دی ہوتی اور غیروں کی محبت کو اس کے برابر نہ سمجھا ہوتا تو آج ہمیں شدید عذاب دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

تابع اور
متبوع

فرمایا اِذْ تَبٰی اَ الَّذِیْنَ اَتَّبَعُوْا اِنَّ الَّذِیْنَ اَتَّبَعُوْا قِیٰمَتِ کے اُس ہولناک وقت کو یاد کرو جب متبوع (جن کی پیروی کی گئی) اپنے پیروکاروں سے بیزار ہو جائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو دنیا میں مطلع مانے جاتے تھے۔ اُن کے

مطیع اُن کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر لیتے تھے، آج وہی پارسی، ریشی اور ہیر اپنے مریدوں کو صاف جواب دے دیکھے کہ ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ ہمیں اللہ کا شریک ٹھہراؤ۔ یہ یہودہ کام تو تم اپنی مرضی سے کہتے تھے۔ ہم نے تو نہیں کہا تھا کہ ہمیں اللہ کا بیٹا بنالو، اُس کا اوتا رہنا لو یا مشکل کشا اور حاجت روا بنالو۔ حتیٰ کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی سوال ہو گا کہ کیا آپ نے لوگوں سے کہا کہ مجھے اور میری ماں کو الہ بنالو۔ تو آپ جواب دیں گے۔ اے مولا کریم! یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ میں کوئی ایسی بات کہوں مَتَّالِیْسَ لَیْ بِحَقِّیْ شَیْءٌ کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ غرض کہ تمام مطلع اُس دن انکار کر دیں گے۔ وَمَرَأُوا لَعْنَتَ عَذَابٍ سَلَمَ نَظَرَ آتَیْ لَکُمْ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ السُّبَابُ اور تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُتْبِعُوا اور ہیر و کار کہیں گے، افسوس کا اظہار کریں گے۔ لَوْ اَنَّ لَنَا کُذَّةً اگر ہمیں ایک دفعہ پھر دنیا میں پلٹنے کی اجازت مل جائے فَنَتَّبِعُکُمْ مِنْهُمْ تو ہم بھی ان رہنماؤں سے اسی طرح ہیزار ہو جائیں۔ کَمَا تَبَعُوا وَاَصْحَابِیَا کہ یہ آج ہم سے ہیزار ہو گئے ہیں یعنی اب ہمیں حقیقت حال کا علم ہو گیا ہے اب اگر یہ ہمیں دنیا میں مل جائیں تو ہم ہرگز انکی تابعداری نہیں کریں گے۔ ایسے ہی لوگوں کے تعلق سورہ احزاب میں آتا ہے کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا ذَیْنَ اَخْبَاثٍ سادات و کبار غنائم نے چلنے سے پیچھے رہ کر اور بھلائی فاضلانی اللہ تعالیٰ انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا ہمیں یہ سب سے بھٹکا دیا۔ کاش کہ ہم نے تیرے رسولوں کا اتباع کیا ہوتا ہم نے تو اپنے بزرگوں کی بات مانی اے مولا کریم وَبَنَّا اِنَّهُمْ ضَعِیْفِیْنَ مِنَ الْعَذَابِ آج ان کو دو گنا عذاب دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ حضرت ابو ایہم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا کہ تم نے دنیوی اغراض کے لیے معبود بنا رکھے ہیں، قیامت کے دن یہ سارا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ اور آج کے تمام درست اُس دن دشمن بن جائیں گے۔ پیار محبت اور الفت صرف وہی کام آئے گی، جو اللہ کی رضا کی خاطر کی گئی۔ اس کے علاوہ تمام ذرائع کٹ جائیں گے فرمایا کہ ذَٰلَکَ یُسِرُّہُمُ اللّٰہُ اَعْمَا لَہُمْ حَسْرَتٍ عَلٰیہُمْ اس طرح اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال اُن کو حسرت بنا کر دکھائے گا دلوں پر

ان کا بیزاری کا اعلان کچھ کام نہ آئے گا۔ بلکہ اُن کے غذا میں اضافہ ہی ہو گا و مَّا
 هُوَ بِخَيْرٍ جِنَّةٍ مِّنَ النَّارِ اِنَّ كَسَلِيَةَ جَهَنَّمَ سَعَىٰ لَهَا لَيُّوْنَ كِي كُوْنِيْ صُوْرَتِ
 ہوگی، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔ وجہ بیان یہ ہے کہ انہوں نے غیر اللہ
 کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے برابر قرار دیا، شرک میں مبتلا ہوئے اور باطل
 پرست لوگوں کا اتباع کیا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس شصت و پنج (۶۵)

آیت ۱۶۸ تا ۱۷۱

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ①۶۸
 إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ①۶۹
 وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ①۷۰
 كَفَرُوا كَمَا مَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۖ صُمُّوا بَكُمْ عُمْى فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ①۷۱

ترجمہ: اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں ان میں سے کھاؤ اور شیطاں کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارے لیے صریح اور کھلا دشمن ہے ①۶۸
 بے شک شیطان تم کو برائی اور بے حیائی کی باتوں کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ چیزیں کہو جو تم نہیں جانتے ①۶۹ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اس چیز کی پیروی کرو جس کو اللہ نے اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ بلکہ ہم اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کسی چیز کو سمجھتے ہیں اور نہ وہ سیدھی راہ پر ہوں ①۷۰ اور ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا اس شخص کی سی ہے جو آواز دیتا ہے۔ اس کو کہ نہیں سنا مگر بلانا

اور پکارنا یہ برے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے ①۷۱

گزشتہ پیر پر

گزشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل اور شرک کا رد تھا اور یہ

بتلایا گیا تھا کہ جو لوگ دوسروں کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ کرنے کی چاہیے، وہ لوگ کفر اور شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی سزا اور عذاب کے مستحق بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بُرے انجام سے خبردار کیا ہے اور بتلایا ہے کہ ان کے اعمال ان کے لیے حسرت کا باعث بنیں گے۔ قیامت کے دن ایسے لوگ افسوس کا اظہار کریں گے۔ مگر وہ افسوس ان کے لیے کچھ مفید نہیں ہوگا اور نہ وہ کبھی دوزخ کی آگ سے باہر نکل سکیں گے۔

قانون کی
پابندی

قرآن پاک کا یہ اسلوب بیان ہے کہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی خطاب عام ہوتا ہے۔ جیسے "يَا أَيُّهَا النَّاسُ" یعنی اے لوگو! اے بنی نوع انسان۔ اور کبھی خطاب خاص ہوتا ہے۔ جیسے "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" یا اے کُتُب وغیرہ وغیرہ۔ آیت زیر درس میں خطاب عام ہے۔ اور تمام بنی نوع انسان کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔ "يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا" اے لوگو! زمین کی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ اور شیطان کے نقش قدم پرست چلو، اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

در اصل یہاں پر حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو قانون کی پابندی کا درس دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں صرف انہیں استعمال کرو اور حرام خوری سے بچ جاؤ اگر تم اللہ کے قائم کردہ اس قانون کی پابندی نہیں کرو گے، تو اصل بُرائی سے بہک کر شیطان کے نقش قدم پر چلنے لگو گے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ترقی کے مقامِ حظیرۃ القدوس میں پہنچنے کی بجائے ظلمت کی اتھاہ گمراہیوں میں پہنچ جاؤ گے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر بابِ باندھ کر بات سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان مکلف ہے۔ اور مکلف سے مراد قانون کی پابندی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت میں ملکیت

اور بہیمیت دونوں ماحے رکھے ہیں اور ان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ان قانون کی پابندی کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کریگا، تو اس کے حصے میں ناکامی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

نسل انسانی تمدن نسل ہے۔ اور یہ دیات، اقصیوں اور شہروں میں مل کر رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کسی قانون کی پابندی اُس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ اجتماعی صورت میں نہ ہو۔ قانون پر عمل نہ کر بھی اُسی حالت میں ممکن ہے جب کہ لوگوں کو قانون سے واقفیت ہو۔ اور اس کے لیے قانون کی تعلیم کا عام ہونا ضروری ہے۔ تاکہ معاشرے کا کوئی فرد قانون کے جاننے سے بے بہرہ نہ رہ جائے۔ جب یہ تہمت پوری ہو جائے گی تو پھر قانون شکنی کرنے والے کے خلاف کارروائی بھی لازم ہو جائیگی، تاکہ معاشرہ اس قسم کے فساد سے محفوظ رہ سکے۔ قانون شکن کوئی فرد واحد ہو یا جماعت وہ قانون کی مقرر کردہ تعزیر کی زد میں ضرور آئے گا۔ اور اگر کوئی دوسری باہر کی جماعت قانون کے نفاذ میں کاؤ ڈالنے کی کوشش کریگی، تو اس کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہوگا، تاکہ فتنہ و فساد اور رواجہ فرواں بند کیا جاسکے۔

حلال چیز وہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے شرعاً حلال قرار دیا ہے۔ اور پاکیزہ وہ چیز ہے جو بذاتہ لذیذ بھی ہو۔ کیونکہ —
بلو در چیز کو کوئی شخص کھانا پسند نہیں کرے گا خواہ شریعت کے نزدیک وہ حلال ہو۔ کسی چیز کی پاکیزگی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے ساتھ کسی کا حق متعلق نہ ہو۔ اگلی آیات میں حلال و حرام کی حکمت اور ان اشیاء کی تفصیل آ رہی ہے۔ مثلاً بکری حلال ہے۔ مگر خنزیر حرام ہے۔ اسی طرح اونٹ حلال ہے مگر شیر حرام ہے۔ بکری اور اونٹ وغیرہ کی حلت کے باوجود اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ شرعی طریقے سے مذکور ہو۔ ورنہ ایسے جانور کا گوشت استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں حکم موجود ہے "وَلَا تَأْكُلُوا"

ہمّا لَعْنَةُ ذِكْرِ سُمِّ اللّٰهِ عَلَیْہِ یعنی جیسا اللہ کا نام نہ لیا گیا ہے اُسے موت کھاؤ، وہ حرام ہے۔ اس طرح جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ سردار بھی حرام ہے۔ ایسی چیزوں کا استعمال جہانی یا روحانی صحت کے لیے مضر ہوگا کیونکہ جن چیزوں کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، اُن میں کوئی نہ کوئی حشرابی ضرور ہوگی۔

اُحِلَّ لَکُمْ سِرِّ اللّٰہِ کی حکمت اگلی آیتوں میں آرہی ہے۔ جو چیز غیر اللہ کے نام پر پڑی جاتی ہے، خواہ وہ مٹھائی ہو یا فروٹ، چاول ہو یا گوشت، اُن میں بظاہر تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر اس میں روحانی نجاست پائی جاتی ہے، جو روح کو پیدا کر دیتی ہے۔ لہذا ایسی چیز روحانی طور پر مضر ہوگی، ترمذی شریف میں ہے کہ طافی یعنی ایسی مچھلی جو خود مکر کھالی کے اوپر تیرنے لگتی ہے۔ وہ مکروہ ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ جہانی صحت کے لیے مضر ہے۔ جو کوئی کھائے گا بیمار ہو جائے گا۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ ایک شخص نے ایسی مچھلی کا گوشت کھایا اور اور چوبیس گھنٹے کے اندر ہلاک ہو گیا۔ یہ گوشت اتنا زہر آلود تھا کہ اُس کا سارا خون پیپ میں تبدیل ہو گیا۔ ایسے ہی حوادث سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا، وہ کسی نہ کسی طور انسانی جسم کے لیے مضر ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

حرمت کی ایک اور صورت دوسرے کی حق تلفی بھی بیان ہوئی ہے۔ ایک شخص چوری کی بکری لاکھ ذبح کر تا ہے۔ وہ حلال حالور ہے۔ اُس پر اللہ کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر چوری کے فعل نے اس میں خباثت کو جنم دے دیا ہے۔ کہ وہ کسی دوسرے شخص کا حق تھا۔ جو ضائع ہو گیا۔ اس لیے اس کا کھانا حرام ٹھہرا۔ رشوت اور سود کا مال بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ کہ ایسا مال طیب نہیں رہتا بلکہ خبیث ہو جاتا ہے۔ اس لیے حرام ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی نوریع النان کو اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ قانن

کی پابندی کرنا چاہیے۔ جن چیزوں کو اللہ نے حلال اور پاکیزہ کہا ہے انہیں کھانا چاہیے اور حرام چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنائے یعنی اللہ میری ہر دعا کو قبول فرمائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے سعید! اَطْبَ مَطْعَمَكَ اپنی خوراک کو پاک بنا لو۔ یعنی طیب غذا استعمال کرو تَنْكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعَوَاتِ مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ فرمایا اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کوئی شخص حرام کا ایک لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے۔ تو چالیس دن تک اس کی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کے قانون کی پابندی لازمی ہے اس کے برخلاف کرنا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

حضرت مسروقؓ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کے رشتہ دار اور شاگرد ہیں۔ آپ تابعین میں سے ہیں، کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ اگر کسی نے بچے کو ذبح کر نیکی منت مانی ہو، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے فرمایا بچے کی بجائے بھڑک کر دے تو اس کی نذر پوری ہو جائیگی کیونکہ بچے کو ذبح کرنا شیطان کے نقش قدم پر چلنے والی بات ہے اور شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک اور قیامت تک اپنی دشمنی کا اظہار کرتا رہے گا۔ اس کا عزم واضح ہیں اَلْاَعْمَابُ مَحْجُوۃٌ حَزْبُهُ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحَابِ السَّعِيْرِ وہ اپنے لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اُس کے گروہ میں شامل ہو کر جہنم میں داخل ہو جائیں۔ ابلیس کا انسانوں کے متعلق گمان تھا کہ یہ اندر سے کھوکھلے ہیں، میں ان کو ہر طریقے سے اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابلیس نے اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ لوگوں کی اکثریت اس کے تابع ہو گئی اَلَا فُلَيْدًا سَوَّاهُ اے ایک چھوٹی جماعت کے جنہوں نے شیطان کا اتباع نہ کیا۔ بلکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے قانون کی پابندی کی۔ وہ شیطان کے فریب سے محفوظ رہے۔

شیطان کا
نقش قدم

فرمایا شیطان کا کام یہ ہے کہ اِنکایا مُرُکُم بِالْمُسْوٰۃِ وَالْفَحْشَۃِ وہ تمہیں بُدی باتوں اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ بُدی باتوں سے مُراد فسق و فجور اور گناہ کے کام ہیں اور فحش سے مُراد شہوتِ رانی کی باتیں ہیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ اس قسم کی لغویات میں پڑے رہیں۔ اور خدائے عزوجل کے قانون کی طرف نہ آسکیں وہ یہ بھی چاہتا ہے۔ **وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** کہ تم خدا تعالیٰ کے متعلق ایسی باتیں کہو جو تم نہیں جانتے۔ یعنی بغیر جاننے کے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی باتیں منسوب کر دی جائیں جو اس کی شان کے شایان نہیں۔ چنانچہ کچھ لیجئے یہ مشرک اور بدعتی لوگ اپنی تمام خرافات اللہ تعالیٰ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ کہ یہ افعال اس کے حکم سے کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر افترا باندھنا ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا کہ لوگ بیت اللہ شریف کا طواف بالکل بے ہنہ حالت میں کرتے تھے۔ اُن کی توجیہ بھی یہی تھی **وَاللّٰهُ اَمْرًا دَہٰکَ** یعنی اللہ نے ہمیں اب احکم دیا ہے حالانکہ **اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَۃِ** اللہ تعالیٰ بے حیائی کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ شیطان نے اُن کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ جن کپڑوں کے ساتھ ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، اُن کے ساتھ طواف نہیں کرنا چاہیے۔ لہذا انہوں نے ماورِ زاد ننگے طواف شروع کر دیا۔ سورۃ اعراف میں بھی آتا ہے۔ **اَلْقُوْلُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** کیا تم اللہ کے ساتھ ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جو اس کا تمہیں علم ہی نہیں۔

انہی لوگوں کے متعلق فرمایا **وَ اِنَّا قٰیْلٌ لَّہُمْ اَتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ** اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کی اتباع کرو یعنی اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قانون پر طوقاً تو اَبَل تَتَّبِعُ مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْہِمْ اَبَآؤُہُمْ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تو اُمّی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کہہ سکتے تھے ہم تو اپنے بڑوں کے راستے کو نہیں چھوڑیں گے، ہم اُن کے عقیدے اور رسم و رواج کی پابندی کریں گے،

آبادِ اعجاز
کا اتباع

وہ بھی تو آخر عقل و شعور رکھتے تھے، کوئی بیوقوف تو نہ تھے اگر ان لوگوں کے آباؤ اجداد واقعی سمجھ لو جسد کے مالک ہوتے تو ان کے راستہ پر چلنا نیکی کی بات تھی بھرت یوسف علیہ السلام نے بھی تو کہا تھا۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي مِمَّنْ خَلَقْتُ اس کے برخلاف اگر آباؤ اجداد علط راستے پر چل رہے ہوں تو پھر ان کی پیروی کرنا کس قدر حماقت اور بیوقوفی کی بات ہوگی۔ اسی لیے فرمایا اَوْ كُوكَانَ اَبَاءَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ کہ اگر ان کے آباؤ اجداد نہ تو عقلمند ہوں اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کے راستے پر چلیں گے مقصد یہ کہ معروف میں تو کسی کی پیروی کی جا سکتی ہے، مگر منکرات میں ایسا کرنا کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔

بعض چیزیں ہماری سوسائٹی کو مٹنے میں ملی ہیں مگر یہ خدا کے قانون اور غیر علیہ السلام کے طریقے کے خلاف ہیں، محرم کے مینے میں بعض لوگ بان نہیں کھاتے۔ مگر خلیج اباس نہیں پہنتے، کالا لباس پہننا ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ اظہار ہو، یہ سب شیطانی طریقہ اور آباؤ اجداد کے راستے پر چلنے والی بات ہے بعض لوگ حضرت فاطمہؑ کے نام کی نیاز دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کوئی مرد اس سے نہ کھائے۔ اسی طرح ۲۲ رجب المرجب کو حضرت ام جعفر صادقؑ کے نام کی نیاز دیتے ہیں جسے کوڑے کا نام دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نیاز کا کھانا گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے، اور یہ سوچ طلوع ہونے سے پہلے کھالینا چاہیے اس قسم کے تمام مفروضات پر عمل درآمد آباؤ اجداد کی پیروی کے مترادف ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح شاہ عبدالحقؒ کا ترشہ حلوا ہوتا ہے مگر حقہ پینے والا یہ ترشہ نہیں کھا سکتا۔ اسپر پابندی ہے۔ بوعلی قلندرؒ کی نیاز میں سویاں پکائی جاتی ہیں۔ عید کے موقع پر لوگ اس کی بھی پابندی کرتے اصحاب کہف کی نیاز گزشتہ ربی کی صورت میں دی جاتی ہے۔ اس کے بغیر

نیا زاد اہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نیاز کے لیے گیارہویں تاریخ کی پابندی کی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ غلط عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ پر گیارہویں نہ دی تو مال میں نقصان ہو جاتا ہے یا بھینس کا دودھ کم ہو جاتا ہے اس قسم کی تمام چیزیں اَنْ تَقُولُوا عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی زد میں آتی ہیں۔ مَکَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْہِ تَوْحِیْمٌ یہ ہے کہ اموات کے لیے دعا کرو، اَللّٰہ کے لیے ایصالِ ثواب کرو، یہ طاقتِ ابراہیمی کا اصول ہے۔ ان کے لیے صدقہ اور استغفار کرو، اس میں کوئی پابندی نہیں، جب چاہو اجازت ہے۔ مگر ہمارے ہاں ایسی چیزوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگا کر اسے بدعائیں شامل کر دیا ہمارے ہاں صدقہ کے بہت سے خود ساختہ طریقے رائج ہو چکے ہیں۔ کئی ایک پابندیاں عائد ہو چکی ہیں۔ کہتے ہیں کہ صدقہ کے لیے کالے جانور کی بھری ہوئی چلبھینچے۔ اس کے بغیر صدقہ ادا نہیں ہوتا۔ حضور علیہ السلام کا تو واضح ارشاد ہے تَصَدَّقْ بِدَسْ هَمَلٍ بَدِیْنَارٍ جس کے پاس درم ہے وہ درم دے دے اور جس کے پاس دینار کی گنجائش ہے، وہ دینار صدقہ کر دے بمقصد یہ کہ جو چیز بھی میسر ہے اس میں صدقہ دیا جاسکتا ہے مثلاً غنہ اجناس، اکھجوریں، اکپڑا کتاب وغیرہ ہر چیز صدقہ میں دی جاسکتی ہے۔ گوشت اور سری کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ تو شیطانی شریعت ہے۔

حضرت ابو طلحہؓ حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضور! میرا یہ بہترین بارغ ہے، میں چھ صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تیرے قریب ترین دوستوں میں جو غریب لوگ ہیں انہیں تقسیم کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح آپ نے حضرت سعدؓ کو صدقہ میں کنواں لگوانے کا حکم دیا۔ آج بھی صدقہ کے طور پر نلکے یا ٹوب دے دیے گئے یا جاسکتے ہیں۔ مسجد کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ دین کی تبلیغ پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔ نادار طالب علموں کی تعلیم کے

صدقہ کا طریقہ

لیے صدقہ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔ پریشان حال مسافر کی مدد کی جاسکتی ہے۔ ایسی ہی بہت سی حالت ہیں جن پر صدقہ کا مال خرچ ہو سکتا ہے۔ مگر لوگوں نے کالے جانور کی کالی برہی کو ہی صدقہ سمجھ لیا ہے۔ اس خول سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ اس لئے فرمایا کہ جو شریعت اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ اس کا اتباع کرو، باپ دادا کے غلط اقدام کی اتباع مت کرو۔ کتنی بیوقوفی کی بات ہے۔ کہ بے عقل اور بہت کم آباء اجداد کے نقش قدم کو اصل دین سمجھ لیا گیا ہے

کنفول کی مثال

آگے اللہ تعالیٰ نے شیطان کے نقش قدم پر چلنے والے کفار کی مثال بیان فرمائی ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الْغَنِيِّ يَنْعِقُ بِنَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً کافروں کی مثال اس چر داسے کی ہے۔ جو اپنے جانوروں کو آواز دیتا ہے۔ جو اس کی چیخ اور پکار کو سننے تو نہیں مگر سمجھ نہیں سکتے۔ اسی طرح کافر بھی اللہ کے نبی کی آواز تو سننے ہیں مگر جانوروں کی طرح انکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ فرمایا مَثَلُكُمْ غَنًى فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، یہ لوگ عقل و شعور سے بھی عاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین بڑی نعمتیں عطا کی ہیں یعنی قوت سماعت، قوت گریانی اور قوت بھروسے مگر لوگ ہیں کہ ان قوتی کو استعمال نہیں کرتے اور گونگے، ابرے اور اندھے بنے ہوئے ہیں یہ لوگ اللہ کی ان نعمتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے نہ تو حقیقتات سننے کی تاب لاسکتے ہیں نہ حقیقت کو دیکھ کر پرکھتے ہیں۔ اور نہ حق کی بات پوچھنے کے لیے بولتے ہیں۔ یہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔

سَبْقُور ۲

الْبَقَرَة ۲

درس شصت و شش (۶۶)

آیت ۱۴۲ تا ۱۴۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ
اشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۴۲﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ
عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أَهْلَ بِهِ
لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ
عَلَيْهِ ط إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! رو پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو روزی دی ہیں۔ اور
اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرنے والے ہو ﴿۱۴۲﴾ بیشک اللہ
تمہارے تم پر حرام قرار دیا ہے، مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ
کے سوا کسی دوسرے کا نام بکھا گیا ہو۔ پس جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی
کرنے والا نہیں ہے اور نہ زیادتی کرنے والا ہے، پس اس پر کچھ گناہ نہیں

ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنش کرنے والا مہربان ہے ﴿۱۴۳﴾

گذشتہ آیات میں یَا أَيُّهَا النَّاسُ کہہ کر پوری نبرع انسانی کو خطاب کیا گیا تھا

اکل حلال

اب ان آیات میں خاص طور پر مومنوں کے خطاب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ اے ایمان والو۔
پاک چیزیں کھاؤ، جو ہم نے تمہیں روزی دی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے
کہ اکل حلال کا یہ دہی حکم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو دیا ہے، جو اس نے اپنے
نبیوں اور رسولوں کو دیا ہے۔ یعنی یَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِن الطَّيِّبَاتِ
وَأَعْمَلُوا صَالِحًا یعنی اے رسولوں کی جماعت پاک چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال
کرو۔ غرضیکہ تمام انبیاء اور اہل ایمان کو پاک چیزوں کے کھانے سے منع فرمایا

ہے۔ کیونکہ ایسی چیزیں کھانے سے انسان میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ پاک اشیاء کا کھانا اور ناپاک چیزوں سے پرہیز ایک ایسا عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ وہ ایسا رسول ہے کہ ”يُحِلُّ لَكُمْ لَهْمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَذِّرُكُمْ عَنْ لَهْمِ الْخَبَائِثِ لَكُمْ اَنْ تَكُونُوا كَالَّذِينَ هُمْ يَكُونُونَ“۔ اہل حلال اور نجسیت اور ناپاک چیزوں کو حرام مفسر کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو نجسیت قرار دیا ہے۔ اُن کے استعمال سے یا تو جسمانی طور پر خرابی پیدا ہوگی یا روحانی طور پر۔ پاک چیز وہ ہے جس میں کوئی خباثت نہ ہو، خباثت ظاہری بھی ہوتی ہے اور باطنی بھی ہوتی ہے۔ ظاہری خباثت تو یہ ہے کہ کوئی چیز ظاہری طور پر گندی ہو اور باطنی گندگی میں مالِ حرام از قسم چوری اور خیانت وغیرہ آتا ہے۔ اسی طرح روحانی گندگی یہ ہے کہ اس میں کسی غیر کا حق شامل ہو۔ علامہ اقبال مرحوم نے بھی کہا ہے کہ اکل حلال اور صدق مقال دین کی گمرہ اور راز ہے۔ مسلم شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی لمبا سفر کرتا ہے۔ جسم اور لباس گروا کر دے، بڑی تکلیف پاتا ہے وہ دعا کرتا ہے یا رَبِّ يَارَبِّ اے مولاکریم! میری دعا مستبول کرے مگر حضور فرماتے ہیں فَاَنْتَ يَسْتَجَابُ لَكَ اَس کی دعا کیسے مستبول ہوگی جب کہ مَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَ مَشْرَبُهُ حَرَامٌ جب کہ اس کا کھانا پینا حرام ہے۔ وَ عَزْذِي بِحَرَامِ حَرَامِ خَدَاتِ پرورش پاتا ہے۔ مقصد کہ دعا کی قبولیت کے لیے اکل حلال بمنزلہ شرط ہے۔ اسی طرح عبادت کی قبولیت کے لیے بھی لازم ہے کہ مابعد حلال اور طیبہ چیزیں استعمال کرے

فرمایا اللہ کی عطا کردہ روزی میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَ اشْكُرُوا لِلّٰہِ اور شکر الہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر دو، اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَشْكُرُونَ۔ اگر تم خالص اسی کے عبادت گزار ہو شکر ادا کرنے کے کسی طریقے میں مثلاً زبان سے شکر ادا کرنا یہ ہے کہ اللہ کی حمد و ثناء بیان کرے۔ اَعْدَا كَا شُكْرٍ یہ ہے کہ ایسے اعمال انجام دیے جائیں جن سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا اظہار ہو۔ اور دل سے شکر ادا کرنا یہ ہے

کہ دل میں یہ اعتقاد رکھئے کہ مستحق تعظیم صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی شریک نہیں ہے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنوں اور انسانوں کی ایک حالت یہ بھی ہے کہ اَخْلَقُوا وَيُحِبُّونَ غَيْرِي پیدا میں کرتا ہوں اور عبادت و دوسروں کی کرتے ہیں۔ ان کے نام کی مذرو نیاز میتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا اَرْزُقُوا وَيَشْكُرُونَ غَيْرِي رزق میں دیتا ہوں اور دنی میں پنہانا ہوں مگر شکریہ دوسروں کا ادا کرتے ہیں۔ اس مضمون کو امام رازیؒ اور بعض دیگر مفسرین نے بھی نقل کیا ہے۔

محرمات

اکل حلال کا قانون بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر محرمات رابعہ یعنی چار حرم چیزوں کا تذکرہ کیا۔ جن کا استعمال انسان کے لیے قطعاً جائز نہیں فرمایا الْمَحْذَرُ عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَلَحْمُ الْخَنَازِيرِ وَمَا أَهْلَ بَيْدٍ لِّغَيْرِ اللَّهِ بیشک تم پر حرام ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی غیر کا نام پکارا گیا ہو،

مردار

محرمات میں پہلا نمبر مردار کا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد ہے جو حلال ہو لہذا ذبح کرنے کے قابل ہو، مگر بغیر ذبح کیے مر جائے۔ ایسا جانور حرام کی فہرست میں آجائے گا، اس کا کھانا قطعاً ناجائز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ دلائل پر بھی مذکورہ بالا چار محرمات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ محرمات میں مردار کی یہ صورتیں بھی شامل ہیں وَالْمُتَخَفِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّدَةُ وَالنَّطِيجَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُكِّيَتْ عَلَى النَّصِيبِ وَلَنْ تَنَفَّسُ مِنْهُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ یعنی وہ حلال جانور جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بھندے سے گر کر یا کھڑکھا کر مر ہو یا جسے کسی درندے نے بھڑا ہو۔ سوائے اس کے کہ جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ یا جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو، یا یہ کہ پانسوں کے ذیلے اپنی قسمت معلوم کر دے۔ ایسی چیزوں کا کھانا مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے۔ مردار کے حرام ہونے میں حجت یہ ہے

کہ اس کے گوشت کھانے سے انسان میں سستی اور کاہلی پیدا ہو جاتی ہے کسی عبادت اور نیکی کے کام میں نشاط حاصل نہیں ہوتا۔

یہاں پر جس خون کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ وہ بہتا ہوا خون ہے۔ جہرگوں میں خون چلتا ہے اور ذبح کرتے وقت بہ جاتا ہے۔ سورۃ النعام میں اے دُعا مُنْفُحًا یعنی بلیا ہوا خون کہا گیا ہے۔ یہ قطعی حرام ہے۔ اور اس کا استعمال جائز نہیں۔ البتہ رگوں کا خون بہ جانے کے بعد جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے، وہ حرام نہیں ہے اگر گوشت بغیر دھوئے بھی پکا کر کھالیا جائے تو وہ پاک ہے۔ تاہم نظافت کا تقاضا ہے کہ اُسے دھویا جائے مگر اس کی علت میں کوئی شبہ نہیں۔ البتہ جس جانور کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنا ممکن نہ ہو، اُس کو ذبح کرنا شرط نہیں ہے۔ بلکہ اُسے التہر کا نام لے کر زخمی کر دینا ہی کافی ہے۔ بھاگ جانے والے جانور کو اگر تیر چلتے وقت یا نیزہ بھالا وغیرہ مارتے وقت اللہ کا نام لے لیا جائے تو وہ جانور حلال ہوگا، خواہ اُسے زخم جسم کے کسی بھی حصہ پر آیا ہو۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ لکھتے ہیں۔ کہ مردار وہ جانور ہے جو خود بخود مر جائے، یعنی جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ سورۃ النعام میں موجود ہے وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يَذْكُرْ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اس کو مست کھاؤ۔ اُن جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے گا، وہ اُس نام کی برکت سے پاک ہو جائے گا۔ اور جس جانور کو شرعی طریقہ کے خلاف شکار یا ذبح کیا جائے وہ بھی مردار تصور ہوگا۔ مثلاً کسی جانور کو ذبح کرنے کی بجائے اُس کا گلا گھونٹ دیا جائے یا زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے، تو ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ مَا أَبْيَنَ مِنَ الْحَيِّ فَهُوَ مَيِّتٌ زندہ جانور کا کوئی حصہ علیحدہ کر دیا جائے تو وہ مردار ہی تصور ہوگا۔ اسی طرح لکڑی، غیل یا بندوق سے مارا جائے اور ذبح نہ کیا جائے۔ تو وہ مردار ہوگا ایک موقع پر مولانا مودودی صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ بندوق کا شکار بغیر ذبح

کیے ہوئے جائز ہے، حالانکہ تمام فقہائے کرام اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں، تاہم بعد میں انہوں نے رجوع کر لیا صحیحین اور نسائی شریف کی روایت کے مطابق صرف وہ جانور بغیر ذبح کے حلال ہے۔ جو تیر کے نوکڑہ سے زخمی ہوا ہو۔ اگر ویسے ہی تیر کی چوٹ سے مر جائے تو ایسا جانور موقوفہ شمار ہوگا اور حلال نہیں ہوگا۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے کوئی عام چوٹ از قسم کڑی پتھر وغیرہ کے لگنے سے موت واقع ہو جائے۔ بندوق کی گولی بھی عھوس ہوتی ہے۔ نوکڑہ چیز نہیں ہوتی، اس لیے بندوق کے ساتھ شکار کیا ہوا جانور بغیر ذبح کیے حلال نہیں ہوتا۔

لَعْنَةُ ذِكْرِ اسْمِ اللّٰهِ عَلَيْهِ میں وہ جانور آئے گا۔ جس پر بوقت ذبح قصداً اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ ہاں اگر ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنا بھول جائے۔ تو وہ مردار نہیں ہوگا، اس کا کھانا جائز ہوگا۔ اگر قصداً تجکیر کو ترک کیا ہے۔ تو ایسا جانور مردار تصور ہوگا۔ البتہ حدیث شریف کے مطابق دو جانور اس حرمت سے مستثنیٰ ہیں اور ان کا کھانا جائز ہے۔ فرمایا اَحَلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ هُمَا يَلِيَانِ دَرْمَارِ حَلَالٍ فِي السَّحَابِ وَالْجُرَادُ عَيْنِ مَهْلِي اُرْطُي۔ ان کا شکار کر کے بغیر ذبح کیے کھایا جاسکتا ہے۔ حضور نے انہیں جائز قرار دیا ہے۔

خون کی ایک قسم لبتہ یعنی جما ہوا خون ہے۔ اسے شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ فرمایا اَحَلَّتْ لَنَا دِمَاسَانِ هُمَا يَلِيَانِ دَرْمَارِ حَلَالٍ فِي السَّحَابِ وَالْجُرَادُ عَيْنِ مَهْلِي۔ یہ دونوں اعضاء منجندہ خون ہیں مگر حلال ہیں۔ دم مسفوح یعنی رگوں سے نکلنے والے خون کی حرمت کی حکمت یہ ہے۔ کہ سڑے استعمال کرنے والے آدمی میں درندگی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شیر، بکھر وغیرہ جو شکار کا خون پی جاتے ہیں۔

— اس لیے ان میں درندگی کی صفات پائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان بھی ایسا ہی خون استعمال کرے گا۔ تو اس میں بھی ایسی خصلتیں پیدا ہو جائیں گی۔ لہذا دم مسفوح کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ہر چیز کا خاتمہ ہوتا ہے جو شخص سورج نکلنے تک

کہ کھاتے ہے۔

امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ خنزیرہ کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس جانور میں ایسی خصلتیں پائی جاتی ہیں جو انسانی فطرت کے خلاف ہیں۔ اولاً یہ گندگی کھانے والا جانور ہے اور حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جلالہ جانور یعنی گندگی کھانے والا جانور کا کھانا مکروہ تحریمی ہے۔ حتیٰ کہ اگر حلال جانور مثلاً گائے بھینس اونٹ، بکری وغیرہ بھی گندگی کھانے لگ جائے تو اسے ہاندہ کہہ کر دس دن تک گھاس کھلاؤ ورنہ اس کا دودھ اور گوشت مکروہ ہوگا۔ بعض اوقات گندگی کھانے کی وجہ سے جانور میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے جانور کا ذوق بھی بگڑ جاتا ہے۔ چونکہ خنزیرہ گندگی کھاتی ہے۔ لہذا اس کا اثر اس کے گوشت بلکہ ہر عضو میں سرایت کر جاتا ہے اس واسطے اس کا کھانا قطعی حرام ہے۔

خنزیرہ میں ایک اور قبیح خصلت بھی پائی جاتی ہے۔ جو کسی اور جانور میں نہیں ملتی یہ اس قدر بے غیرت جانور ہے کہ اس کے مقعد و نر بیک وقت ایک مادہ سے ملے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور جانور نہیں ہے۔ جو دو سکرنہ کی موجودگی میں بارہ سے جیتی کرے۔ اگر کوئی دوسرا موجود ہوگا تو جب تک اُسے بگا نہیں دے گا، نفاتی خواہش پوری نہیں کرے گا۔ مگر خنزیرہ ہی ایک ایسا جانور ہے۔ جس کو دو سکرنہ جانور کی موجودگی تکھا نا گوار نہیں گذرتی اور یہ بے غیرتی کی انتہا ہے۔ چنانچہ اس جانور کا گوشت کھانے والی اقوام میں بھی اس خصلت کو بایا ہوا ناجائز امر ہے۔ انگریز اور سکھ خنزیرہ کا گوشت کھاتے ہیں، دیکھ لیجئے دونوں قومیں اس قسم کی بے غیرتی کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خنزیرہ کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔

اگرچہ خنزیرہ کی ہر چیز حرام ہے۔ تاہم اس مقام پر صرف گوشت کی حرمت و وجوہ کی بنا پر بیان کی گئی ہے۔ پہلی وجہ کریہ ہے۔ چونکہ بیاں پر ذکر کھانے کا ہوا ہے۔ کہ اے مومنو! حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ، تم کھانے کی مناسبت سے گوشت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس جانور کی باقی اشیاء یعنی ہڈیاں۔ چمڑا۔ چربی

لے مرغی قین دن بکری چار دن اونٹ گائے دس دن (درمختہ ص ۵۲۸) (فیاض)

وغیرہ حرام تو ہیں مگر کھانے کے کام نہیں آتیں بلکہ بعض دوسرے طریقوں سے انسانی استعمال میں آتی ہیں۔ گوشت کے ذکر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا گوشت ہر حالت میں حرام ہے۔ خواہ وہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ حلال جانور کی حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ وہ خود مر گیا ہو یا شرعی طریقہ سے ذبح نہ کیا گیا ہو مگر خنزیر کی حرمت ہر صورت میں قائم رہے گی خواہ اسے شرعی طریقہ پر ہی کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو۔ جس طرح باقاعدہ ذبح کرنے سے کتے کا گوشت جائز نہیں ہو جاتا، اسی طرح خنزیر کا گوشت بھی حلال نہیں خواہ اسے شرعی طریقہ سے ہی کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو۔ اس کا گوشت ہر صورت میں حرام ہی ہے گا۔ اسی لیے اسے نجس العین کہتے ہیں۔

اہم ابو حنیفہؒ کا فتویٰ ہے کہ ہر جانور کی کھال رنگ دینے کے بعد پاک ہو جاتی ہے خواہ وہ جانور حلال مگر مردار ہو یا جانور ہی سرے سے حرام ہو، سوائے خنزیر کی کھال کے کہ یہ دباغت سے بھی پاک نہیں ہوتی۔ رہی انسان کی کھال، تو وہ احتراماً استعمال میں نہیں لائی جاتی مگر دباغت سے وہ بھی پاک ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ خنزیر یا جانور ہے۔ جس کی کوئی چیز بھی کسی حالت میں بھی قابل استعمال نہیں ہوتی۔ انسانی اخلاق پر اس کی غذا کا گرا اثر ہوتا ہے۔ انسان جس قسم کی غذا استعمال کرے گا، اس کے اخلاق کی تعمیر اس کے مطابق ہوگی۔ اگر کوئی شخص خنزیر یا کوئی دوسری حرام چیز استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا اثر اس کے اخلاقیات یعنی طہارت، اجابت، اساحت اور عدالت پر پڑے گا اور وہ شخص اپنے مقام کو قائم نہیں رکھ سکیگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ملت و حرمت کا قانون نافذ کر کے انسانی اخلاقیات کی تعمیر کی ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَّةُ ۲

درس شصت ہفت (۶۷)

آیت ۱۴۲، ۱۴۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ
 اشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَهُ تَعْبُدُونَهُ ۝ إِنَّمَا حَرَّمَ
 عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالِدَهُ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ
 لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ
 إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ، جو ہم نے تمہیں روزی دی ہیں اور اللہ کا
 شکر ادا کرو اگر تم خاص اُنہی کی عبادت کرنے والے ہو (۱۴۲) بے شک اللہ تعالیٰ نے
 تم پر حرام کیا ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا
 گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی کرنے والا نہیں ہے اور نہ زیادتی
 کرنے والا پس اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (۱۴۳)

گذشتہ
پیر

گذشتہ درس میں حلال و حرام کی بحث اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو
 حلال قرار دیا ہے اور انہیں کھانے کی اجازت دی ہے۔ اور حرام چیزوں سے منع فرمایا۔
 حلال اشیا کی تفصیل قرآن میں بیان ہو چکی ہے۔ اسی سلسلے میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے
 أَطْيَبُ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَيْبٍ پاکیزہ چیز وہ ہے۔ جو انسان اپنے ہاتھ
 سے کھا کر کھاتا ہے۔ یعنی جو چیز محنت کر کے حاصل کی جائے۔ وہ پاکیزہ ہے۔
 انسان کی اولاد کے متعلق فرمایا وَلَا تَهْنُ مِنْ كَيْبٍ یعنی اولاد بھی انسان کی کمائی کا ایک
 حصہ ہے۔ لہذا ماں باپ کے لیے اولاد کی کمائی سے کھانا باکل درست اور جائز ہے
 حرام اشیا میں سے مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کا ذکر ہو چکا ہے اور ان
 کی وضاحت بھی گذشتہ درس میں ہو چکی ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے

دریافت کیا گیا، حضور! سمندری سفر کے دوران ہمارے پاس سیٹھ پانی کا ذخیرہ نہیں ہوتا۔ اگر ہم ذخیرہ سیٹھ پانی سے کریں تو پینے کے لیے پانی کی مقدار بہت کم رہ جاتی ہے ان حالات میں کیا ہم سمندر کے کڑوے پانی سے دھو کر سکتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مرداحلال ہے۔ اہم عظیم نے اس مردار سے مراد ہر قسم کی مچھلی لی ہے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی یا سانپ کی مانند ہو۔ اہم صاحب کے نزدیک مچھلی کے علاوہ دیگر سمندری جانور حلال نہیں ہیں۔ تاہم دیگر ائمہ کرام باقی سمندری جانوروں کو بھی حلال قرار دیتے ہیں۔

خون کے متعلق بھی سابقہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ اس سے مراد دم مسفوح یعنی بسا ہوا خون ہے، جو بوقت ذبح جانوروں کی رگوں سے نکلتا ہے۔ اس کے علاوہ دو بسترہ خون یعنی جگر اور تلی حلال ہیں۔ انسانی جسم میں جگر خون تیار کرنے والی فیکٹری ہے اور تلی خون ذخیرہ کرنے کا ایک آلہ ہے۔ اس میں بیک وقت سات سو مکعب ملی میٹر خون جمع رہتا ہے جب کبھی کسی حادثہ میں انسانی جسم سے خون ضائع ہو جاتا ہے تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تلی کا محفوظ خون حرکت میں آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم میں اس قسم کا خود کار انتظام پیدا کر دیا ہے۔ کہ خون کی کمی تلی کے اس ذخیرہ سے پوری ہو جاتی ہے۔

مذہب مخالفین

موجودہ زمانے میں انتقال خون (BLOOD TRANSFUSION) یعنی جب کسی شخص کا خون بہت زیادہ مقدار میں بہ جائے تو اس کے جسم میں دوسرے شخص کا خون داخل کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ دراصل واضح مسئلہ یہ ہے کہ کسی انسان کے کسی بھی عضو کو کسی دوسری جگہ استعمال کرنا احترام انسانیت کے خلاف ہے۔ لہذا کسی فوت شدہ آدمی کی آنکھ یا کوئی اور عضو عظیم میں دینا اور پھر اُسے دوسرے انسانی جسم کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ایک عورت کے بال بھی دوسری عورت اپنی زیب و زینت کے لیے استعمال نہیں کر سکتی۔ عورتیں، سوتی، ادنیٰ، ریشمی یا نالٹون کے بالوں کو پرانہ وغیرہ کے طور پر استعمال کر سکتی ہیں مگر کسی دوسرے انسان کے بال استعمال کرنا حرام ہے۔ قرآن پاک کا حکم ہے وَلَقَدْ كَسَبْنَا بَنِي آدَمَ جَمْعًا فَقَالُوا اقْرَبُوا بِرَبِّكُمْ يَوْمَ الْاِخْتِلَافِ يَوْمَ اَنْتُمْ كَانْتُمْ وَلَقَدْ كَسَبْنَا بَنِي آدَمَ جَمْعًا فَقَالُوا اقْرَبُوا بِرَبِّكُمْ يَوْمَ الْاِخْتِلَافِ يَوْمَ اَنْتُمْ كَانْتُمْ وَلَقَدْ كَسَبْنَا بَنِي آدَمَ جَمْعًا فَقَالُوا اقْرَبُوا بِرَبِّكُمْ يَوْمَ الْاِخْتِلَافِ يَوْمَ اَنْتُمْ كَانْتُمْ وَلَقَدْ كَسَبْنَا بَنِي آدَمَ جَمْعًا فَقَالُوا اقْرَبُوا بِرَبِّكُمْ يَوْمَ الْاِخْتِلَافِ يَوْمَ اَنْتُمْ كَانْتُمْ

انسان کے کسی عضو کو دوائی کے طور پر بھی استعمال کرنا درست نہیں ہے۔
 انسان کا خون اگرچہ اعضا کی مانند تو نہیں ہے، مگر اعضا کی طرح محترم ضرور ہے
 لہذا اس کا استعمال بھی دوسرے اعضا کے استعمال کی طرح ناجائز ہے۔ اور عام حالات
 میں ایک شخص کا خون دوسرے کے جسم میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ ہاں ایک خصوصی
 حالت ایسی ہے۔ جس میں وقتی طور پر حرام چیز بھی جائز ہو جاتی ہے۔ اس کا ذکر آیت
 کے اگلے حصے میں آ رہا ہے۔ چونکہ انسانی اور حیوانی جسم و روح کا تعلق خون کے واسطے
 سے قائم رہتا ہے۔ اس لیے جب جسم میں خون کی مقدار اس قدر کم ہو جائے کہ
 جان بچانا مشکل نظر آئے تو ایسی مجبوری کی حالت میں انتقال خون کی اجازت ہوگی۔
 اور وہ بھی اس مقدار تک کہ اس سے کم پر جان کو خطرہ ہو۔ بلاوجہ کئی کئی بوتل خون لگائے
 جانا جائز نہیں ہوگا۔ لہذا اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ انتقال خون
 دوائی سے بڑھ کر خوراک کی مد میں داخل نہیں ہوتا چاہیے۔

خنزیر کی حرمت کا بیان بھی گذشتہ درس میں آچکا ہے۔ یہ جانور پہلی صدی
 امتوں میں حرام رہا ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ عیسائیوں نے اسے
 بھی طہر بھری کی طرح استعمال کیا حالانکہ تورات کے سفر الاحبار میں صاف موجود
 ہے۔ کہ خنزیر نہ تو جگالی کرتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا پاؤں پھٹا ہوا ہے لہذا یہ قطعی
 حرام ہے۔ بغیر استثناء میں بھی خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

محرمات اربعہ میں سے پہلے تین کا بیان گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ اب یہاں
 پر چوتھے حرام کا بیان آئے گا۔ اور وہ ہے وَمَا اٰهَلٌ بِہِمْ لَعْنُ اللّٰہِ یعنی
 تمہارے لیے وہ چیز بھی حرام ہے جس پر اللہ کے سوا غیر کا نام پکارا جائے۔ یعنی
 ایسا جانور یا کوئی دوسری چیز جسے غیر اللہ کے تقرب اور اس کی خوشنودی حاصل
 کرنے کے لیے نامزد کیا جائے ایسی چیز میں مردار سے بھی زیادہ خباثت سرایت
 کر جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ فقہائے کرام فرماتے
 ہیں کہ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ لَوْ قَصَدَ

غیر اللہ کے
نام پر

بَذَّيْهَا التَّعَسُّبَ إِلَى غَيْرِ اللَّهِ جَوْشَنُ غَيْرِ اللَّهِ کے تقرب اور خوشنودی کے لیے جانور ذبح کرے صَارَ مُتَدَّادًا وہ مرند ہو جائے گا۔ اور اس کا مذبح بھی مردار کی طرح حرام ہوگا مثلاً کسی بُتِ لات، عزیزی کے نام پر ذبح کیا ہے یا فرشتوں جنوں، انبیاء، بزرگ، پیر، فقیر کے نام پر ذبح کیا ہے، سب حرام ہوگا۔ اس میں مجوی بھی شامل ہیں کیونکہ وہ بھی آگ کے نام پر تقرب حاصل کرتے ہیں۔

ذبح کے بارے میں مسلم شریف کی روایت موجود ہے۔ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ ذَبَحَ لِعَنِيِّ اللَّهِ جو اللہ کے سوا کسی غیر کے نام پر ذبح کرنا ہے۔ اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ فقہائے کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص حاکم کی آمد پر اُس کی عظیم کے طور پر جانور ذبح کرے گا، تَوَدَّ مَا أَهْلُ بِلَدِهِ لَعْنُوا لَكَ بِمِ اللَّهِ میں داخل ہو کر حرام ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں اگر بوقت ذبح بِسْمِ اللَّهِ اللہ اکبر بھی کر دیا، تو وہ حلال نہیں ہوگا، بلکہ مردار ہی ہے گا، وجہ یہی ہے کہ اُس نے ایک جاندار کی جان حاکم کے تقرب اور اُس کی خوشنودی کے لیے لی ہے۔ حالانکہ جان کا لینا صرف اللہ ہی کے نام پر ہو سکتا ہے۔ اور اگر جانور ذبح کرنے سے مقصود مہمان کی ضیافت کرنا ہو، تو پھر یہ جائز ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ تقرب اور ضیافت میں تفریق کرنا آسان ہے۔ کسی شخص سے کھا جائے کہ بھائی یہ جانور منت ذبح کرو بلکہ اس کی بجائے اتنی ہی مقدار میں گوشت لے کر پکالو اور مہمان کی مہمان نوازی کر لو۔ اور اگر وہ شخص مان جائے تو یہ ضیافت ہوگی۔ اور اگر وہ کئے کہ میں تو جانور ہی ذبح کر دوں گا تو اس کی نیت ضیافت کی نہ ہوگی بلکہ تقرب کی ہوگی اور یہی چیز حرام ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ذبح کرتے وقت جو بسم اللہ اللہ اکبر کہا جاتا ہے اس میں اللہ اکبر کی بالکل دہی حیثیت ہے، جو نماز شروع کرتے وقت اللہ اکبر کی ہے اگر نماز میں ریاکاری کا مادہ ہوگا، تو وہ نماز حرام ہوگی، اسی طرح بوقت ذبح اگر نیت تقرب غیر اللہ کی ہوگی، تو وہ ذبح بھی مردار کی طرح حرام ہوگا۔ ہاں اگر نفلی نماز تقرب الی اللہ کے لیے ادا کرے اور اس کا ثواب کرے کہ ۱۰

کرے تو جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ذبح تقرب الی اللہ کے لیے کرے اور اس کا ثواب کسی دوسرے کو پہنچائے، تو اس کی ممانعت نہیں۔

مَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ كالمسک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مولانا زکریا نے اس کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے اس سلسلہ میں مولانا زکریاؒ کا ایک مکتوب بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذبح کے حلال ہونے کی علت وہ نیت ہے، جو خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہو، اور اس کے حرام ہونے کی علت وہ نیت ہے، جو غیر اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ زمانہ جاہلیت کے مشرک نیت سے بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے اور ذبح کرتے وقت نام بھی غیر اللہ کا لیتے تھے۔ مومنوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ نیت سے بھی تقرب الہی چاہتے ہیں اور بوقت ذبح بھی اللہ اکبر کہتے ہیں۔ البتہ اس دور میں مبتدعین کا ایک تیسرا گروہ پیدا ہوا ہے۔ جو ذبح کرتے وقت تو اللہ ہی کا نام لیتے ہیں مگر نیت غیر اللہ کی خوشنودی کی ہوتی ہے۔ یہ شرک اور نفاق ہے۔ دام صاحب کی نیاز کے طور پر ذبح کیے گئے جانور پر اگر اللہ اکبر بھی کہ دیا جائے گا، تو وہ حلال نہیں ہوگا کیونکہ یہاں پر نیت میں فسور ہے یہ تو بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص خنزیر کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے یا یہی عمل کتے پر دہرائے، تو وہ حرام ہی رہے گا۔ ہاں کوئی شخص غیر اللہ کی نیاز سے توبہ کرے، اور پھر اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، تو جانور حلال ہوگا۔ کیونکہ عمل کا دار مدار نیت پر ہوتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اہل غیر اللہ کا مطلب یہ ہے کہ بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے، تو وہ چیز حرام ہو جاتی ہے اور اگر بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے تو ذبح حلال ہے۔ یہ غلطی ہے۔ اہلال کا معنی آواز کو بلند کرنا یا شہرت دینا ہے اسی لیے چاند نظر آجانے کو اہلال کہتے ہیں۔

اب اگر کسی جانور یا چیز کے متعلق شہرت دی جائے کہ یہ چیز پیران پیر یا فرشتوں یا پیغمبر کی نیاز ہے۔ تو یہ اہل غیر اللہ میں داخل ہو کر شرک کا ارتکاب ہوا اور چیز حرام ہو گئی۔

تابعین کے زمانہ میں ایک مسئلہ پیدا ہوا تھا، جسے اہم قرطبیؒ نے نقل کیا ہے
مسئلہ یہ تھا کہ بچوں نے کھیل کھیل میں گڑیا اور گڈے کی شادی طے کی اور اس خوشی میں
اونٹ ذبح کیا، تو اس اونٹ کا کیا حکم ہے، وہ جائز ہو گا یا ناجائز۔ امام حسن بصریؒ فرماتے
ہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ اونٹ گڑیا گڈے کے مجسمے کے نام پر ذبح کیا گیا ہے
جو بت کی مثال ہے۔ ہاں اگر یہی ذبح کسی مرد و عورت کے اصل نکاح کے لیے
ہو تا تو درست تھا۔

اسی طرح حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے دور میں طعم متبایین کا مسئلہ پیدا ہوا۔
دوسرا دروں میں اس بات پر مقابلہ ہو گیا۔ کہ اُن میں سے کون مہمان نواز ہے۔ ایک
سردار نے مہمانوں کے لیے دس اونٹ ذبح کیے تو دوسرے نے بیس کر دیے۔ پہلے
نے سو اونٹ ذبح کیے تو دوسرے نے چار سو ذبح کر دیے۔ اسی طرح ایک سردار
نے مہمان نوازی کے لیے دس من آٹا گوندھا تو دوسرے نے بیس من گوندھ دیا۔ پھر پہلے
نے حوض بھر آٹا گوندھا تو دوسرے نے اتنی زیادہ مقدار میں آٹا گوندھا کہ جب اُس میں
گھوڑا دوڑا گیا تو وہ پھنس گیا۔ حضرت علیؓ کی خدمت میں مسئلہ پیش ہوا کہ آیا اس قسم کا
کھانا جائز ہے یا نہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سب کچھ ریا کاری کی بنا پر ہوا ہے۔ لہذا
ایسا کھانا حرام ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا تقرب مطلوب نہیں بلکہ غیر اللہ کی خوشنودی
مقصود ہے۔

بعض لوگ مکان بناتے وقت اس کی بنیادوں میں جانور کا خون ڈالتے ہیں اس
ذبح سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جنات کے شر سے محفوظ رہیں۔ یہ بھی شرک ہے۔ ہاں
اگر اللہ تعالیٰ کی نیابت کے طور پر جانور ذبح کر کے فقرا کو کھلایا جائے تو درست ہے۔

حالتِ اضطرار

چار محرمات کو بیان فرمایا کہ یہ سب النان کے لیے حرام میں البتہ۔ ایک
صورت ایسی بھی ہے کہ یہ حرام مباح ہو جاتے ہیں فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ
وَلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ مَا جَوَّزَ اضْطِرَارِيَّ حَالَتِ مِثْلُ اَبْجُورِكَ
مرد ہا ہے اور صرف محرمات میں سے کوئی چیز میسر ہے۔ تو ایسی صورت میں جان

بچانے کی خاطر ان اشیاء کا کھانا درست ہوگا۔ فرمایا یہ اس حد تک ہی جائز ہے۔ کہ نہ تو بغاوت پر اکتفا کیجئے اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے والا ہے۔ اہم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ باغ سے مراد یہ ہے کہ اضطرابی حالت میں مباح چیز سے نہ لذت طلب کرے اور نہ اس کو حلال سمجھے۔ اور تعدی سے مراد یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز کم از کم مقدار میں استعمال کرے جس سے اس کی ٹھوکر دُور ہو سکتی ہو۔ اور ضرورت سے زیادہ کھائے گا، تو عادی میں داخل ہو جائے گا۔ بعض دوسرے آئمہ فرماتے ہیں کہ باغ سے مراد بغاوت کرنے والا ہے اور عادی سے مراد معصیت کرنے والا ہے مثلاً ایک شخص چوری کی نیت سے جا رہا ہے اور اس پر اضطرابی حالت وارد ہو گئی تو ایسے شخص کے لیے مباح نہیں ہوگا۔ وہ گناہ میں مبتلا ہے۔ اور ایسی حالت میں اگر اس کی موت بھی واقع ہو جائے تو کوئی پرہیز نہیں۔ بہر حال فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ اضطرابی حالتوں میں ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی حالت وارد ہو جائے، تو حرام کا کھانا مباح ہو جائیگا اور جان بچانے کی حد تک جائز ہوگا۔ شدید بھوک لگ رہی ہو یا سخت بیماری ہو اور حرام کردہ چیز استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور صورت باقی نہ ہو۔ تیسری حالت اضطراب یہ ہے کہ کوئی غالب مغلوب کو ایسی چیز کھانے پر مجبور کر دے، اور عدم تعمیل کی صورت میں جان کا خطرہ ہو، تو ایسی حالت میں بھی حرام چیز مباح ہوگی۔ فرمایا مجبوری کی حالت میں حرام کو استعمال کرنے پر کوئی مواخذہ نہیں اِنَّ اللہَ غَفُورٌ رَّحِیْمٌ۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے وہ کسی مخلوق پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

اس آیت میں صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یعنی مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر نامزد کی ہوئی چیز، حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے جائزہ مثلاً کتا، بلی، رینگھ، بندر، سنکڑا، گدھا، کوا، چھپکلی، کیر، لے، مکوڑے وغیرہ حرام ہیں۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ صرف چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان چار کے علاوہ باقی تمام چیزیں حلال ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ یہاں

ایک شے بار اور
اس کا ازالہ

صرف اُن چیزوں کا نام لیا گیا ہے، جو عام طور پر استعمال میں آتی ہیں۔ اور مقصود یہ ہے کہ ان چیزوں کو کبھی حلال نہ جاننا، یہ قطعی حرام ہیں۔ البتہ اس کے علاوہ بہت سی دوسری چیزیں بھی حرام ہیں جن کا ذکر قرآن پاک کے دو سکے مقامات پر آتا ہے۔ حدیث پاک میں بھی بعض اشیاء کی حرمت بیان ہوئی ہے۔ لہذا ان چار کے علاوہ باقی سب چیزوں کو حلال سمجھنا درست نہیں۔

صرف چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ مشرک لوگ چار حلال چیزوں کو حرام سمجھتے تھے۔ ان کا ذکر سورہ مائدہ میں موجود ہے۔ کہ وہ لوگ بکھرہ، سائبہ، وحیدہ اور عام کو حرام سمجھتے تھے مگر اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن چیزوں کو حرام نہیں کیا، تم نے ان کی حرمت کس شریعت سے نکالی ہے۔ ان چار حلال چیزوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ چار چیزیں قطعی حرام ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس شصت و ہشت (۶۸)

آیت ۱۶۲ تا ۱۶۹

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتُرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۶۲﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۶۳﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ طَوَّلَ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۱۶۴﴾

الْبَقَرَةِ ۲

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو اٹھ چیز کو چھپاتے ہیں، جس کو اللہ نے کتاب میں نازل کیا ہے، اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت خریدتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نہیں کھاتے (بھرتے) اپنے پیٹوں میں مگر آگ۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا۔ اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا ﴿۱۶۲﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے عذاب کو خریدا ہے۔ یہ لوگ دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں ﴿۱۶۳﴾ یہ اس وجہ سے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا، البتہ وہ صدمہ میں درج ہوا پڑے ہیں۔ ﴿۱۶۴﴾

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے طبیات اور محرمات کا قانون بیان کیا ہے مشرکین کا رد کیا ہے۔ اور توحید کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کردہ قانون کی پابندی کا حکم دیا ہے اس سے پہلے

گذشتہ پیریز

حکمت ابراہیمی کے اہم اصول ذکر، صبر، نماز، کوحید پر یقین اور شعار اللہ کی تعظیم کا بیان بھی آچکا ہے۔ ذرائع معاش کا بھی تذکرہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین و آسمان کے درمیان مختلف ذرائع معاش پیدا فرمائے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ نے توحید پر بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اور گزشتہ دو دروس میں حلال و حرام پر بھی کافی گفتگو ہو چکی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا لَكَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ
لَا يَكُونُوا مِنَ الْمُسْلِمِينَ

کتمان حق پر
حقیر مفاد

آیات زیر در حق میں کتمان حق کا دوبارہ بیان آ رہا ہے۔ اور پھر اس سے ماہل ہونے والے حقیر مفاد کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ الْکِتَابِ بَیِّنًا لِّکُمْ وَیَسْتَرْزِقُوْهُ مِنْ دُوْنِ مَا یَاکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ لَا یَسْأَلُوْا سِوَاکَ مِنْ شَیْءٍ لِّیَسْأَلُوْا فَاُولٰٓئِکَ لَیْسَ لَهُمْ شَرَفٌ فِیْ حَیٰتِهِمْ وَلَا فِیْ اٰیٰتِنَا یَوْمَ اَنۡزَلْنَا السَّحَابَ وَفِیْہِ زَبْرٌ ثَمَرٌ اَلَا یَعْلَمُوْنَ

یہود و نصاریٰ کی طرف سے کتمان حق کے متعلق پہلے پارہ میں بھی بیان ہو چکا ہے وہ دنیا کے حقیر مفاد کی خاطر خدا تعالیٰ کے احکام کو چھپاتے ہیں۔ کتمان حق ایک ایسا سنگین جرم ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ بیکار بیان فرماتے ہیں۔ اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے۔ کہ یہ بیماری اہل کتاب تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یہی بیماری مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکی ہے۔ معمولی دنیوی نفع کی خاطر عاقبت کو برباد کر لینے میں اب مسلمان بھی شریک ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں عقائد حقہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْکِتَابَ تَبٰیۡۤاۡنًا لِّکُلِّ شَیْءٍ عٰیۡنٍ ہم نے ایسی کتاب نازل فرمائی ہے۔ جو ہر چیز کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ اہم باتیں ہیں۔ جن کی اکثر ضرورت رہتی ہے۔ اور پھر ان باتوں کی تفصیل اور تشریح اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام

کے سپرد فرمائی۔ لَبَّيْكَ يَا لَنَا نَس مَا خُزِّلَ لَهُ النَّهْمُ میں یہ حکم موجود ہے۔
 شاہ رفیع الدین اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ پہلے پائے میں کتھان حق
 کا جو بیان ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب حضور نبی علیہ السلام کی لعنت کیے
 متعلق جو پیش گوئیاں موجود تھیں انہیں چھپاتے تھے۔ اور اس مقام پر کتھان حق کا مطلب
 یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام بابت حلال و حرام وغیرہ کو چھپاتے تھے۔
 کتھان حق بلاشبہ کفر ہے۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان
 مرد و زن کے لیے تعلیم جبری ہونی چاہیے، تاکہ وہ حقوق و فرائض اور حلال و حرام
 کو پہچان سکیں۔ اسی لیے افغانی نے کرام نے فرمایا ہے کہ ضروریات دین کا یکھنا
 فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کو پورا نہیں کریں گے، تو جہالت کی
 بنا پر کتھان کے مرتکب سمجھے جائیں گے۔

علم قرآن کی
 اشاعت

حضرت مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا علم ہونے کے باوجود دوسرے
 لوگوں تک نہ پہنچانا ایسا ہے۔ جیسے کسی جنگل بیابان میں پانی کا چشمہ یا کنواں ہو، اور کوئی
 شخص اس پر نہ بدستی قابض ہو جائے۔ لوگ پیاس بھگتے کے لیے چشمے پر جاتے
 ہیں مگر وہ قابض شخص انہیں پانی نہیں پینے دیتا۔ جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو جاتے
 ہیں، تو ایسی صورت میں کتنا بڑا مجرم سمجھا جائے گا۔ اسی طرح قرآن پاک کا عالم کو دوسرے
 لوگوں کی آبیاری نہیں کرتا، تو وہ غاصب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ ہم
 غلاں بستی میں گئے، وہاں پر پانی موجود تھا، مگر ان لوگوں نے ہمیں پینے کے لیے
 پانی نہ دیا، جس کی وجہ سے ہمیں بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ تو حضور علیہ السلام کے صحابی
 نے فرمایا هَلَّا وَضَعْتُمْ فِيهِمُ السِّيفَ تم نے میانوں سے تلواریں کیوں
 نہ نکال لیں۔ یہ تو بڑا جرم ہے۔ کہ لوگ پانی کے بغیر مر رہے ہیں اور کوئی شخص پانی
 سے روکتا ہے۔

الغرضیکہ! قرآن پاک کا علم دوسروں تک نہ پہنچانا بہت بڑا حرم ہے۔

آج دنیا قرآنی تعلیم کے بغیر ہلاک ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے علماء اسے عام کرنے کی بجائے اسے چھپا رہے ہیں اور اس کے بدلے میں بدعتا جاری کر رہے ہیں۔ سائل سے پیسے لے کر غلط طوطے جاری کر رہے ہیں، کہیں نذرانہ اور شکرانہ وصول کیا جا رہا ہے کہیں رسومات باطلہ کو رواج دیا جا رہا ہے۔ مردوں کو تختوں کی فیس وصول کی جاتی ہے۔ تبرکات کے نام پر لوٹا جا رہا ہے۔ کہیں شتی دروازہ بنا دیا ہے کہ یہاں سے گزرنے والا سیدھا جنت میں جائیگا۔ کہیں فسور پرستی ہو رہی ہے۔ چمڑے چمڑے چمڑے جاتے اور وصول کیے جاتے ہیں۔ کہیں گیارہویں منائی جا رہی ہے، کہیں عرس ہو رہا ہے اور کہیں میلاد منایا جا رہا ہے۔ کہیں تیسرے اور دسویں کا ختم اور کہیں چالیسویں کا ختم ہے۔ لوٹنے کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو جاری ہے دین کے ابتدائی اصول کہاں کھو گئے۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا درس کون دیگا، مقام رسالت کو کون بیان کرے گی، احلال و حریم کی تمیز کون بتائے گا، علماء نے ان بنیادی چیزوں کو چھپا لیا ہے اور خرافات کی تعلیم ہو رہی ہے۔ یہ کمان حق نہیں لہ اور کیا ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کو چھپاتے ہیں۔ اور اس سے حقیر مفاد حاصل کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ مَا يَأْكُلُونَ فِيهِ طُعْمًا فَإِنَّهٗ لَآلَآئِمٌ مَّا وَه لُوْكَ اِمْسِيْهُمۡ بِطُؤۡنٍ مِّنۡ اَآگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ جو شخص سونے چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے۔ وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ ڈال رہا ہے۔ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔ انہما یجوز فی جہنم نار جہنم۔ اسی طرح یتیموں کا مال ناحق کھانے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ بھی اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ ڈال رہے ہیں۔ لہذا باطل رسوم کے ذریعہ لوگوں کا مال کھانا، شرک اور بدعت کا اجر یا سب پیٹ میں آگ بھرنے والی بات ہے۔

فرمایا ایسے لوگوں پر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہونگے اللہ تعالیٰ

ان کی طرف مہربانی کے ساتھ توجہ کرنا تو درکنار وَلَمْ يُكَلِّمَهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کلام کرنا بھی پسند نہیں کریں گے، بلکہ ان کی طرف غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وَلَمْ يُزَكِّهِمْ اللَّهُ اَنْ کاترکیہ بھی نہیں کریں گے۔ اہم ترمذی فرماتے ہیں کہ ان الموحدین لا یجوز فیہما خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھنے والے دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ گنہگار ہونے کی صورت میں دوزخ میں جائیں گے مگر تکریم کے لیے۔ جب اپنے گناہوں کی سزا بھگت لیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ اُن کو پاک کر دیں گے اور وہ دوزخ سے نکال لیے جائیں گے مگر یہاں پر کہتاں حتیٰ کر لے والوں کے متعلق تسریا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کبھی پاک نہیں کرے گا، بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ اور وہاں ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔

خدا کا رُخ

فرمایا اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ اَسْتَوُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی وَالْعَذَابِ بِالْمَغْفِرَةِ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت کے بدلے عذاب خرید لیا ہے۔ اگر یہ لوگ حق کو چھپانے کی بجائے اُسے ظاہر کرتے۔ خود بھی حق پر عمل کرتے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی عمل پیرا ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی، ان کو گناہوں کی معافی ملتی اور یہ قیامت کے دن سرخرو ہوتے۔ مگر یہ لوگ تو خود دوزخ کو اختیار کر رہے ہیں۔ فَمَا اَصْبَحْتُمْ عَلٰی الشَّکْرِ یہ دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کر لے رہے ہیں۔ ان کا بڑا حوصلہ ہے جو دوزخ میں داخل ہوں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے مگر ان لوگوں نے اُسے چھپا لیا ہے۔ حتیٰ کہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وَانَّ الَّذِیْنَ اَخْتَبَعُوْا فِی الْكِتٰبِ۔ اور جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا۔ یعنی اپنی مرضی کا مطلب بیان کیا، جیسا کہ یہودیوں کا شیوہ ہے۔ کہ وہ مطلب بھی غلط بیان کرتے ہیں اور تشریح بھی غلط کرتے

ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَفِي مَشَقَاتٍ اَبْعَيْدٍ وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں
 ایسے لوگوں کے راہِ راست پر آنے کی کوئی توقع باقی نہیں رہی، وہ سزا کے
 مستحق ہیں۔ یہ حکم تاکیداً دوبارہ فرمایا۔ اس کے قوانین آگے بھی آئیں گے۔

سَيَقُولُ ۲

درس شخصیت و نہ (۶۹)

الْبُقْعَةِ ۲

آیت ۱۷۷

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ
وَالنَّبِيِّينَ وَآلَى الْمَالِ عَلَى حُبِّهِ ذَوَى الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ
الصَّلَاةَ وَآلَى الزَّكَاةَ وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا
وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ: جو نیکو نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو۔
بلکہ نیکو تو اس شخص کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر اللہ کے
فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں پر۔ اور دیا اُس نے مال
اُس کی محبت پر قربت دلوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، اور مسافروں کو اور محتاجوں کو
اور گدازوں کے چھڑانے میں۔ اور اس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کرنا ملے۔ اور اپنے
وعدوں کو پورا کرنے لگے ہیں جب کہ عہد کرتے ہیں۔ اور سختی اور تکلیف میں صبر کرتے
وہ اسے ہیں اور لڑائی کے وقت بھی یہی لوگ کچھ ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں ﴿۱۷۷﴾

بنی اسرائیل کی خرابیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم
علیہ السلام کا ذکر کیا تھا۔ اور ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر کا بیان کیا تھا۔ اور اس کو قبلہ مقرر کیے جانے
کی وجہ بیان فرمائی تھی۔ اس پر اہل کتاب کے اعتراض کا بھی ذکر ہوا۔ اس کے
بعد اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمی کے اہم ترین اصول بیان فرمائے جن پر ہر شخص کا
کاربند ہونا ضروری ہے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، شکر، صبر اور تعظیم شعار اللہ

گذشتہ
پرکشتہ

شامل ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے توحید کا ذکر فرمایا، اور مشرکین کا رد فرمایا، حلال و حرام کا قانون بیان فرمایا۔ پہلے پوری نسل انسانی کو مکلفین فرمائی، اس کے بعد اہل ایمان کو خصوصی طور پر حلال و حرام کے قوانین اور محرمات کی تفصیل بیان فرمائی۔ اور پھر اللہ جل جلالہ نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا، کہ اہل کتاب نے تحویل قبلہ کی سخت مخالفت کی تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس سے بیت اللہ شریف کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعے بتلا دیں۔

استقبال قبلہ
فردعی مسئلہ ہے

اہل کتاب نے تحویل قبلہ کے خلاف سخت پراپیگنڈا کیا۔ وہ کہتے تھے کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنا ہی اصل نیک ہے۔ اور اگر اس طرف رخ نہ کیا جائے تو کوئی نیک اللہ کے مل قبول نہیں ہوگی۔ ان کے مطابق جب مسلمانوں نے قبلہ تبدیل کر لیا تو ان کی ساری نیکیاں غائب ہو گئیں۔ اہل کتاب نے قبلہ کو اس قدر اہمیت دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اہل کتاب کے اس زعم کی تردید فرمائی ہے۔ اور واضح کیا ہے کہ استقبال قبلہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک فردعی مسئلہ ہے۔

جسے اہل کتاب ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا تھا، اُدھر کرتے رہے۔ اور جب اُس نے پسند فرمایا تو رخ بیت اللہ شریف کی طرف ہو گیا۔ اس میں ایسی اچھلے کی گمان کی بات ہے۔ اس آیت پاک میں اسی چیز کو واضح کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ لَئِنْ لَمْ يَنْزِلْ

نکاح کیا ہے

اَنْ تَوَلَّوْا وُجُوْهُكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ نَحْيٌ صَرَفَ يٰہُنِیْ کَرْمَشْرِقِ
یٰ مغرب کی طرف رخ کر لیا جائے وَلَٰكِنْ الْيَتُّ مِنْ اٰھَنَ بَلْکَ اصل نیک اُسی کی ہے
جو ایمان لایا اللہ پر قیامت پر فرشتوں پر اکابروں پر اور نبیوں پر، اور آگے نیک کی
دوسری باتیں بھی بیان کی ہیں۔ مفسر قرآن امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ آیت قرآن
پاک کی جامع ترین آیت ہے۔ کیونکہ اس ایک آیت میں کئی ایک مسائل آگئے
ہیں۔ دینی مسائل کا زیادہ تر تعلق اصلاحِ عہدہ، اخلاق یا تہذیب نفس سے ہے
اور یہ سارے مسائل اس آیت میں موجود ہیں۔ گویا یہ آیت تمام دینی مسائل کا خلاصہ ہے۔

ان میں سب سے اہم مسئلہ ایمانیات کا ہے۔ جب تک عقیدہ درست نہیں ہوگا، کوئی عمل مقبول نہیں۔ یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرکین صحیح اعتقاد سے محروم ہیں اُن کا عقیدہ مشرکانہ ہونے کی بنا پر باطل ہے۔ لہذا یہ سب نیکی سے محروم ہیں مگر قبلہ کے مسئلہ پر جھگڑا کرتے ہیں۔

ایمان باللہ تو فرمایا نیکی یہ ہے۔ کہ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اُس کی ذات اور اُس کی صفات پر ایمان لانا نیکی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان ضروری ہے اسی طرح اُس کی صفات کو ماننا بھی لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار بھی اُسی طرح کفر ہے جس طرح اُس کی ذات کا انکار دہریت ہے۔ مثلاً مقدر کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہذا تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہوا۔ اس کے بغیر انسان مومن نہیں ہو سکتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ کوئی شخص اعدیہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں سونا خرچ کرے مگر تقدیر پر ایمان نہیں لانا تو اس کی اتنی بڑی خستہ بھی مقبول نہیں۔

ایمان بالآخر ایمان باللہ کے بعد فرمایا نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لایا وَالْيَوْمِ الْآخِرِ آخرت کے دن پر۔ قیامت کے دن پر ایمان لانا جزو ایمان ہے۔ اس کے بغیر انسان دہریہ یا کافر ہوگا۔ اہم بیضا دینی فرائض ہیں۔ کہ ایمان بالآخرت میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں، جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ یا جنہیں حضور نبی کریم رُفُوفُ الرَّحِيمِ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنا، احباب کتاب کا معاف ہونا، نیکی بے بی کا اقدار، پھر اس سے گزرنا، دوزخ، جنت وغیرہ یہ سب چیزیں ایمان بالآخرت میں داخل ہیں۔ لہذا نیکی اُس شخص کی ہے جو ان سب چیزوں پر ایمان لایا۔

ایمان بالملائکہ یعنی فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ وَالْعَلَوِیْنَ یہ اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہے جسے اللہ جل شانہ نے زمین و آسمان اور اس کائنات کی تخلیق سے لاکھوں سال پہلے پیدا فرمایا۔ اور یہ بھی نوحِ انانی کی مصلحت کی خاطر اہم فرمایا فرشتوں کی آگے دو تیس ہیں۔

پہلی قسم ملا اعلیٰ والے فرشتوں کی ہے، جو خطیرۃ القدس میں ہیں۔ اور دوسرے ملا سفل والے ہیں، جو ملا اعلیٰ والوں کے معاون ہیں یہ تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانے پر مستعد ہوتے ہیں اور کائنات تک فیضانِ سنبھالنے کا ذریعہ ہوتے ہیں چنانچہ ایمان بالملائک بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

ایمان بالکتاب

ایمان کے چوتھے جزو کے طور پر فرمایا وَالْكِتَابَ یعنی کتاب پر ایمان لانا بھی مکمل ایمان کا ایک حصہ ہے۔ یہاں کتاب سے مراد منیٰ کتاب ہے اور مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی کتابیں نازل فرمائی ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے أَهْنَتْ بَعَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے نوح انسانی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے جو کتاب بھی اتاری ہے، اس پر میرا ایمان ہے۔ کہ وہ برحق ہے۔ اور پھر کُتُبِ سماویہ کے سلسلہ کی آخری کتاب قرآن حکیم پر تفصیل ایمان لانا ضروری ہے۔ پہلی کتابوں پر صرف ایمان لانا ضروری ہے، ان پر عمل کرنا ضروری نہیں کیونکہ ان میں سے بعض احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ البتہ آخری کتاب قرآن پاک پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے احکام قیامت تک کے لیے نافذ العمل ہیں۔ وَالْبَيِّنَاتِ اور اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالانبیاء

دیگر اجزائے ایمان کی طرح انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا بھی ضروری ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی رسولِ ادنیٰ مبعوث ہوئے ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے اس لحاظ سے لَا تُفْسِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِمْ ہم کسی رسول میں فرق نہیں کرتے۔

الغرض ایمان کی تمام جزئیات کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا لازم ہے۔ ان میں سے کسی چیز کا انکار یا کسی چیز میں شک کرنا گمراہی کے مترادف ہے اس کے بعد نیکی کے باقی اجزاء کا بیان ہے، جن کا تعلق تہذیب نفس سے ہے یا مال کے ساتھ ہے یا انسان کے بدن سے ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

فرمایا مال کے لحاظ سے نیکی یہ ہے کہ وَالَّذِي الْمَالُ عَلَى حَبْلٍ کوئی شخص

مال کے ساتھ محبت ہونے کے باوجود اسے خرچ کرے۔ انسان کی مال کے ساتھ محبت ایک فطری امر ہے۔ دوسرے مقام پر خود قرآن پاک نے بیان کیا اِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ انسان مال کی محبت میں سخت ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اگر مال صرف کرنا ہے۔ تو یہ نیکی کا کام ہے۔ اس سے النالی ہمدردی اور اجتماعیت کا سبق ملتا ہے علیٰ محبتہ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی بنا پر اس کی رضا کے لیے مال خرچ کرنا ہے۔ تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مال کو کس جگہ خرچ کرنا ہے۔ تو فرمایا ذَوِی الْقُرْبٰی اپنے قرابت داروں پر خرچ کرنا ہے۔ اِنْفَاقٌ فِیْ سَبِيلِ اللّٰهِ کی راہ میں دے، اپنے عزیزوں پر خرچ کرنے پر دوسرا اجر ملتا ہے۔ ایک اجر صلہ رحمی کا حاصل ہوتا ہے اور دوسرا صدقہ کا۔ قرابت دار اگرچہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ مستحق ہے۔ تو اس پر خرچ کرنا باعث اجر و ثواب ہے۔

خرچ کی دوسری مد کے متعلق فرمایا وَلِیْلِیْ خُجْرٍ وَالْمَسْكِیْنِ یتیموں اور مسکینوں کی حاجت براری بھی نیکی ہے۔ ناالغی کی حالت میں ہو اور باپ فوت ہو گیا ہے۔ کمانے والا کوئی نہیں رہا۔ یتیم ہو گیا ہے، اس کی سرپرستی ضروری ہے۔ اس پر مال خرچ کرنا چاہیے اور مسکین وہ ہے جو محنت مزدوری کرتا ہے۔ مگر کوشش کے باوجود اس کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، وہ بھی سختی سے ایسے شخص کی مالی اعانت یقیناً نیکی کا کام ہے۔ فرمایا وَابْنُ السَّبِيلِ اور وہ مسافر بھی امداد کے مستحق ہیں۔ جو دوران سفر محتاج ہو جائیں، زاد رو ختم ہو گیا ہے۔ یا چوری ہو گئی ہے یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے۔ تو ایسے شخص پر خرچ کرنا بھی نیکی ہے۔ خرچ کرنے والا ثواب کا مستحق ہو گا۔ فرمایا وَالسَّائِلِیْنَ محتاج بھی اعانت کے مستحق ہیں۔ اُن پر مال خرچ کرنا بھی نیکی کا کام ہے۔ سائل کے لفظی معنی مانگنے والے کے ہیں۔ مگر مراد محتاج ہیں۔ کیونکہ سوال بولنے سوال درست نہیں ہے۔ جب تک کہ سائل

واقعی مستحق نہ ہو۔ بل ضرورت سوال کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اور پیشہ وارانہ گزگری کو حرام مٹھرایا گیا ہے۔ شرعی سائل وہ ہے جو ہر لحاظ سے محتاج ہو۔ اور اس کیلئے سوال کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہ ہے۔ ایسے شخص کو سوال کرنا جائز ہوگا، اور اس سوال کو پورا کرنا نیکی کا کام ہوگا۔

انفاق کی ایک اور مدنی الترقاب یعنی گردنوں کا آزاد کرنا ہے اس کا عمومی مضمون غلاموں کی آزادی ہے۔ غلام خرید کر آزاد کر دیا جائے یا کسی مکان میں کما کر رکھا جائے اور اگر کے لئے آزادی دلائی جائے اس کی ایک اور صورت پر بھی ہے۔ کہ کسی مقروض کا قرض معاف کر کے یا اس کا قرض ادا کر کے اس کی گردن چھڑائی جائے۔ اس آیت پاک کے مطابق ایسا کرنا بھی نیکی ہے اور باعث اجر و ثواب ہے۔ فرمایا نیکی

صرف مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لیا ہی نہیں بلکہ اصل نیکی ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ ہے پھر فرمایا کہ نیکی اس شخص کی ہے جس نے وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ نماز کے فیلئے انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہوتا ہے۔ اور اس کی توجہ خطیرۃ القدس کی طرف ہو جاتی ہے۔ گویا فوز و فلاح کا اہم ترین ذریعہ نماز ہے، جو کہ بدنی عبادت ہے۔ اور بہت بڑی نیکی کی بات ہے۔

زکوٰۃ مالی عبادت ہے، اور یہ فیضان میں شامل ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے اِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سَوَى الزَّكَاةِ یعنی مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ صرف زکوٰۃ کے ادا کرینے سے مال کا مکمل حق ادا نہیں ہو جاتا، یہ تو فرض ہے اور صاحب نصاب ہر سال ادا کرتا ہے جب کوئی شخص نصاب کو نہیں پہنچ پاتا تو زکوٰۃ فرض نہیں رہتی۔ البتہ سال کے دیگر حقوق باقی رہتے ہیں جیسے فرمایا۔ وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّابِلِ وَالْمَحْضُوْرِ یعنی اس میں سائل اور محتاج کا بھی حق ہے۔ اس میں اہل و عیال اور قربت داروں کا حق ہے۔

والدین کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو اکٹھا بیان فرمایا ہے۔ ایک بدنی عبادت ہے اور دوسری مالی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں تیس آیتیں اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ کا اکٹھا ذکر فرمایا ہے۔ یہ اتنے اہم فرائض ہیں جس کے ذریعے ایک طرف اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف مخلوق خدا کے ساتھ روابط بڑھتے ہیں۔ لہذا ان دونوں امور کو نیکی میں شامل فرمایا۔ کہ نیکی اس شخص کی ہے جو نماز پڑھتا ہے اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔

ایمانی عہد

نیکی کی ایک اور قسم ہے وَالْمُؤْمِنُ بَعْدَ إِيمَانِهِ ذَا عَهْدٍ ؕ یعنی نیکی ان لوگوں کی ہے کہ جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں۔ ایمانی عہد حسن اخلاق اور حسن معاشرت کا ایک بنیادی اصول ہے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا۔ اَوْفُوا بِالْعُقُودِ اپنے عہد کو پورا کیا کرو۔ نیز تمہیں عہد کے انداز میں فرمایا اَوْفُوا بِالْعَهْدِ لَكُمْ! اپنے وعدہ کا پاس کیا کرو۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا قیامت کے دن اس کی بازپرس ہوگی۔ وعدہ خواہ اللہ تعالیٰ سے ہو یا اُس کی مخلوق سے، اس کی وفلازم ہے۔ جب کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھتا ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَوَلَّى تَوَلَّى سے وعدہ کرتا ہے۔ کہ تیرے احکام کی تعمیل کروں گا۔ مگر پھر جب اس وعدے کو پورا نہیں کرتا تو اس میں نفاق کی علامت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی مخلوق سے وعدہ خلافی بھی نفاق کی علامت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکی ان لوگوں کی ہے جو اپنے وعدہ دل کو پورا کرتے ہیں۔

میر کی غفلت

اس کے بعد فرمایا نیکی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرِّ وَالْجُوعِ جو سختی اور تکلیف میں صبر کرتے ہیں۔ بَأْسَاءِ اس تکلیف کو کہتے ہیں جو انسان پر بابر سے وارد ہو مثلاً کوئی مالی یا جانی نقصان ہو جائے۔ زلزلہ طوفان آجائے اور ضرر وہ تکلیف ہے جو انسانی جسم کے اندر پیدا ہو جیسے بیمار ہو گیا، بھڑکا نکلا جسم کے کسی حصے میں درد ہونے لگا، وغیرہ وغیرہ۔ الغرض فرمایا کہ نیکی ان لوگوں کی ہے

جو اندرونی یا بیرونی پریشانی میں مبتلا ہو کر صبر کرتے ہیں وَحَبِیْنُ الْبَیِّنِیْنِ اور وہ لوگ بھی نیکی لائے ہیں کہ میدانِ جہاد میں پہنچنے والی تکلیف کو خوشی برداشت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان تک کی بازی لگاتے ہیں مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے صبر کی یہ تین مختلف صورتیں یہاں بیان کی ہیں۔ اور صبر علیہ بھی ہمارے دین کا بنیادی اصول ہے۔ پہلے گزر چکا ہے۔ اَسْتَعِیْزُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ یعنی صبر اور نماز کے ساتھ امداد حاصل کرو۔ تو یہاں پر صبر کا بیان بھی آگیا۔

فَرَمٰی جَن لُّوْگُوں میں مذکورہ اوصاف پائے جائیں، نیکی الی لوگوں کی ہے۔ - پچے رگ
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَحَّ قَوْلُیْ سِچے لوگ ہیں۔ وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔
 راہِ مذامیں خرچ کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔
 الیفائے عہد ان کا شیوہ ہے اور صبر کا دامن نہیں چھوڑتے۔ فرمایا اصل نیکی کے کام تو یہ ہیں۔ مگر سود و نصاریٰ نے قبلہ کے مسئلہ کو جھگڑے کا سبب بنا رکھا ہے اصل نیکی کے کام کر لے لئے ہی فائز المرام ہوں گے۔ ان کی نیکی کی وجہ سے ان کے بیگانے بھی اپنے بن جائیں گے۔ اور اگر ان کا عقیدہ درست نہیں ہے۔ مال کی محبت میں مبتلا ہیں۔ حلال و حرام کی تمیز سے عاری ہیں تو وہ سچے یکے ہو سکتے ہیں۔ ثروت اور سود خوار کیسے سچا ہو سکتا ہے۔ وہ تو ذرائع آمدن میں حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا۔ قربتِ دروں، محتاجوں اور غریبوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ وہ نیکی کے راستے پر گامزن نہیں ہے۔

وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ جو کفر اور شرک سے پاک ہیں۔ معاصی سے بچتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں گزر چکا ہے۔ کہ یہ کتاب هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ یعنی تقویٰ پکڑنے والوں کے لیے ہدایت ہے اور متقین وہی لوگ ہیں جو مذکورہ صفات کے حامل ہیں اور لمبے چوڑے دعویٰ کے جھکے جھوٹی باتوں پر جھگڑائیں شروع کر دیتے۔ جن لوگوں کا مذاق اچھا ہے اور وہ تہذیب نفس کے حامل ہیں مال کی محبت میں حصے بڑھے محسوس نہیں انکا تعلق باللہ عز و جل نہیں ہے حقوق و فرائض ادا نہیں کھتے وہ متقی کیسے بن سکتے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس ہفتاد (۷۰)

آیت ۱۷۸، ۱۷۹

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۚ الْحَرُّ
بِالْحَرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ
مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَأَتْبَاعُ الْوَعْدِ وَالْعُرُوفِ وَأَدَّىٰ إِلَيْهِ بِالْحَسَنِ
ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ
ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ
يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے اوپر قصاص فرض قرار دیا گیا ہے مقتولوں میں آزاد
کے بدلے میں آزاد آدمی، غلام کے بدلے میں غلام، عورت کے بدلے میں عورت
پس جس کو معاف کیا گیا اس کے بھائی کی طرف سے کچھ، پس دستور کے مطابق پیچھے
لگنا ہے، اور اس کی طرف سے نیکی کے ساتھ ادا کرنا ہے۔

یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف ہے اور مہربانی ہے
پس جس شخص نے اس کے بعد تعدی کی، اس کے لیے عذاب الیم ہے ۝ اور تمہارے

لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اے عقل مندو! اگر تم متقی بن جاؤ۔ ۝ (۱۷۹)

گہرے آیت میں نیکی کی تعریف بیان کی گئی تھی۔ کہ نیکی کیا ہے۔ اور کیا نہیں ہے
نیکی دینے والوں کے متعلق کہا گیا تھا کہ یہی لوگ سچے اور متقی ہیں۔ اب ان آیات میں
بعض تقویٰ والی باتوں کا ذکر ہے۔ اور ان میں سے ایک مقتولوں کے معاملہ میں
مساوات ہے اور دوسرا مال کا قانون ہے۔ اور پھر اس کے بعد رجزہ کا قانون بھی
بیان ہو گا۔ ان سب کا تعلق تقویٰ سے ہے آیات زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے
اسلام کا فوجداری قانون بیان فرمایا ہے۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ انسانی جان

اسلام کا
فوجداری قانون

ایک محترم چیز ہے اور اس کی حفاظت ضروری ہے اور اگر نہ انخواستہ کوئی جان تلف ہو جائے تو اس کے لیے قصاص کا قانون بتلایا گیا ہے۔ جس کا اجراء اور پھر اس کی پابندی لازم ہے۔ اگر قصاص نہ ہو سکے، تو پھر خون بہا کا مسئلہ آئیگا جسے دیت کہا جاتا ہے۔ اس مالی معاوضہ کی لڑائی بھی ضروری ہے۔

اسلام کا قانون
بمطابق قانون جاہلیت

زمانہ جاہلیت میں قصاص کے معاملہ میں عدم مساوات اور نا انصافی پائی جاتی تھی۔ ادنیٰ اور اعلیٰ خاندان کے مقتول کا قصاص بھی مختلف تھا۔ اگر کوئی کمزور اور ادنیٰ خاندان کا آدمی اعلیٰ خاندان کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تو مقتول کے ورثاء دوسرا قصاص طلب کرتے ایک مقتول کے بدلے میں دو افراد قتل کراتے یا عورت کے بدلے میں مرد کا قصاص لیتے یا غلام کے بدلے آزاد کو قتل کراتے حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے اس مقام پر پڑی بھی تقریر کی ہے فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب کا دستور تھا کہ عورت کے بدلے میں مرد کو، غلام کے بدلے میں آزاد کو اور ایک آزاد کے قصاص میں دو کو قتل کیا جاتا، یہ زیادتی اور ظلم تھا۔ جو زبردست زیروستوں پر روا لکھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اس نے اونچ، نیچ، شریف اور رذیل، غلام اور آزاد اور عورت اور مرد کو قصاص کے معاملہ میں برابر قرار دیا۔ اسلام نے امیر اور غریب کے درمیان حائل دہلیز کو گرا دیا اور قصاص کے معاملہ میں مساوات کا درس دیا، اسلام نے عالم اور جاہل، بے حق و جان اور بوجہ تندرست اور بیمار، صحیح الاعضاء اور لنگھٹے، پانچ اور اہل حق کے امتیاز کو یکسر ختم کر دیا اور سب میں مساوات قائم کر دی۔ اسلام نے انہیں بتلایا کہ قصاص کا معنی ہی برابر ہی ہے۔ لہذا قصاص کے معاملہ میں کسی انسان سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہو گا۔ یہ قانون قانون قصاص کہلاتا ہے

ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ اے اہل ایمان! تمہارے اوپر مقتولوں کے معاملہ میں قصاص یعنی برابر ہی کو فرض کیا گیا ہے۔ قصاص کا معنی ہی برابر ہی ہے اور قتلی مقتول کی جمع ہے مطلب یہ کہ ایک آزاد مقتول کے بدلے میں ایک ہی آزاد کو قتل کیا جائے گا۔

ایک کے بدلے میں دو کو تخریہ مشق نہیں بنایا جائے گا۔ اسی طرح غلام کے عوض میں غلام کو، عورت کے بدلے میں عورت کو مرد کے بدلے میں مرد ہی قتل ہوگا۔ قصاص کے معاملہ میں کسی قسم کی عدم مساوات روا نہیں رکھی جائے گی۔ قرآن پاک کے الفاظ میں الْحَرِّ بِالْحَرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَلَا نَفْسٌ بِالنَّفْسِ فرمایا گیا ہے۔

حدیث اور فقہ کی کتب میں قتل کی تفصیلات موجود ہیں۔ قتل کی تین قسمیں ہیں، یعنی قتل عمد، شربہ عمد، قتل خطا۔ قتل عمد ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو قتل کیا تھا اراداً مارے۔ مثلاً بندوق یا پستول سے فائر کرے، چھرا یا نیزہ مارے یا کوئی اور ایسا آلہ استعمال کرے جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ قتل کی یہ واحد صورت ہے جس میں قصاص ہے۔ باقی دو صورتوں یعنی قتل شربہ عمد اور قتل خطا میں خون بہا ہے قصاص نہیں۔ پھر قصاص میں بھی بعض استثناء ہیں، مثلاً باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو قتل کرے تو قصاص نہیں یا جائے گا۔ بلکہ معاوضہ اور تعزیر ہوگی۔ جس میں سزائے قید بھی ہو سکتی ہے اسی طرح اگر ماں اپنے بیٹے یا بیٹی کو یا پوتے یا پوتی کو یا لڑکے کو یا لڑکی کو ہلاک کرے تو بھی قصاص نہیں ہوگا۔ برعکس اس کے اگر بیٹا باپ کو قتل کرے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

قتل شربہ عمد یہ ہے کہ کوئی شخص قتل تو اراداً کر رہا ہے مگر ایسے آسے کے ساتھ جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً لاشٹھی، پتھر یا کوئی اور ایسی چیز ماری جس سے قتل واقع ہو گیا۔ تو ایسی صورت میں قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اس کے عوض خون بہایا دیتا ہوگی۔

قتل کی تیسری صورت قتل خطا ہے جس میں ارادہ قتل نہیں ہوتا بلکہ قاتل کی سہو سے کوئی شخص قتل ہو جاتا ہے۔ مثلاً شکاری نے شکار کو نشانہ بنایا مگر وہ کسی آدمی کو لگ گیا اور اس سے قتل واقع ہو گیا۔ یہ قتل خطا ہے اور اس کا مفصل بیان آگے قرآن پاک میں آئے گا۔

قتل کی تین اقسام میں سے پہلی قسم یعنی قتل عمد میں قصاص یعنی جان کا بدلہ جان ہے

سزائے قتل

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کرے گا، تو اس کے بدلے میں وہ بھی قتل کیا جائے گا۔
 باقی دو صورتوں یعنی قتل شہ عہد اور قتل خطا میں دیت ہے قصاص نہیں۔ اب قصاص
 لینے میں بھی بعض پابندیاں ہیں۔ مثال کے طور پر مقتول کے چار وارث ہیں۔ اور قصاص
 لینا ان کا حق ہے نہ کہ حکومت کا۔ حکومت کا کام تو صرف حق دلانا ہے۔ اس کے
 لیے انتظام کرنا ہے۔ اصل حق تو روثا کا حق ہے۔ جو کہ حکومت دلائیگی۔ فسرمایا
 فَقَدْ جَعَلْنَا الْوَلَايَةَ سُلْطَانًا هُمْ نَفْسُهُمْ قَتَلُوا قَاتِلَ الْوَلَايَةِ قَاتِلَ الْوَلَايَةِ
 برخلاف اس کے انگریزی قانون میں مستغنیٹ حکومت ہوتی ہے۔ اور پھر جرمانہ کی رقم
 بھی اپنے خزانہ میں داخل کرتی ہے۔ اسلامی قانون میں معاوضہ حاصل کرنے کا حق صرف
 وارثوں کو پہنچتا ہے۔

اسلامی قانون قتل میں یہ ایک اہم شق ہے۔ کہ قصاص صرف اسی صورت میں
 لیا جائے گا، جب کہ تمام وارثان مقتول اس پر رضا مند ہوں۔ چار بیٹوں میں سے اگر ایک
 نے بھی قصاص سے دست برداری اختیار کی، تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور قاتل کو دیت
 ادا کرنا ہوگی۔ اور اگر مقتول کے وارث نہ قصاص لیں اور نہ دیت طلب کریں بلکہ
 بالکل ہی معاف کر دیں تو بات ختم ہوگی۔ اس کی جزا انہیں آخرت میں ملے گی۔ اور اگر
 وارثان قصاص کی بجائے خون بہالینا چاہیں۔ تو قتل عہد کی صورت میں قاتل کو پورا معاوضہ
 ادا کرنا ہوگا۔ اس کی برادری پر کوئی مادان نہیں ہوگا۔ البتہ قتل شہ عہد اور قتل خطا میں جب
 دیت ادا کرنا ہوگی، تو قاتل کی ساری برادری اور اس کی ذمہ دار ہوگی۔ اگر کسی سرکاری
 ملازم سے ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے۔ تو اس کے معاوضہ کی ادائیگی اس کے دفتر والے
 یا محکمہ والے کریں گے۔ اسے دیت علی العاقلہ کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا
 کہ دیت عاقلہ پر ہوتی ہے اور یہ تین سال کے اندر اندر قسطوں میں واجب الادا ہوتی
 ہے۔ اس میں ملے متعلقین شریک ہوتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے حصے کی قسط ادا کرنا
 پابند ہوتا ہے۔ قاتل کی برادری کو مادان ڈالنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین
 کی تربیت اس طرح کریں۔ کہ اس طرح کے ناخوشگوار واقعات پیدا ہونے کی نوبت نہ آئے۔

فرمایا قصاص کا قانون تو یہی ہے البتہ فَمَنْ عَفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ جَرَّ كُرْسِيَّ بَنَانٍ کی طرف کچھ معاف کر دیا گیا۔ مقتول کے دربار خیال کریں کہ قاتل بھی ہمارا دینی بھائی ہے۔ اس کی وجہ سے قتل تو ہو گیا۔ مگر بلا درازہ تعلقات ختم نہیں ہونے چاہئیں۔ البتہ اگر درمیان سے کسی ایک نے بھی معاف کر دیا تو مقتول پر قصاص ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کے بدلے میں کیا ہو گا فَاتَّبَعَ بِالْمَعْسُوفِ پھر مالی معاوضہ ہے دستور کے مطابق کہ لاد بھائی معاوضہ ادا کرو وَاذْكُرُوا الْيَوْمَ بِالْحَسَنِ اور قاتل کو نیکی کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ معاوضہ ادا کرنا ہی ہے۔ تو اگر جھگڑا کر نہیں سکتے نیکی اور بھلائی کے ساتھ دستور کے مطابق ادا کرنا چاہیئے۔ اور اس کا بچھا کرنا چاہیئے۔ کہ صحیح طریقے سے ادا ہو جائے۔ اس میں کوئی مزید ضرر الی پیدا نہ ہونے پائے۔ اس طریقہ سے شریعت نے جانوں کی حفاظت کا قانون مقرر فرمایا ہے۔

فرمایا ذَلِكْ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ یعنی اس میں تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ مطلب یہ کہ پہلی امتوں میں قتل کا بدلہ صرف قتل تھا دیت کا قانون موجود نہیں تھا۔ مگر نبی آخر الزمان علیہ السلام کی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی فرمائی۔ اور قاتل کی سزا میں تخفیف کر کے قصاص کے ساتھ ساتھ دیت کا قانون بھی نازل فرمایا۔ چنانچہ شریعت محمدیہ میں تین صورتیں مقرر کی گئی ہیں مقتول کے دربار قصاص طلب کر لیں یا مالی معاوضہ مستبول کر لیں یا بالکل ہی معاف کر دیں، یہ اُن کی صوابدید پر منحصر ہے۔ بہر حال یہ تخفیف اور اللہ کی مہربانی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی مقدار ایک سواونٹ مقرر فرمائی ہے اگر ادٹوں کا تبادلہ نہ ہو سکے تو پھر دس ہزار درہم جو چاندی کا سکہ ہے یا ایک ہزار دینار جو سونے کا سکہ ہے اس کا بدلہ ہو گا۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر فریقین اجناس یا کپڑے کے لین دین پر رضامند ہو جائیں تو مقررہ مقدار سے زیادہ بھی لے سکتے ہیں۔ یہ خون بہا کا قانون ہے اور اس کے بعد فَصْنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكْ جو کوئی زیادتی کا مرتکب ہو یعنی مالی معاوضہ

دیت

ٹلے کہہ کے وہ بھی لے لیا۔ اور پھر بعد میں قتل بھی کر دیا، تو ایسی صورت میں قُلُّہٗ عَذَابُ
 اَلْیَمِّنِ تو ایسا کرنے والا دردناک عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس سے مراد قرآنِ آخرت کا
 عذاب ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اس قسم کی زیادتی کمنے والے کے لیے
 کوئی معافی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے قصاص ہی لیا جائے گا اس دُنیا میں بھی اُسے سزا
 ملے گی اور اگلے جہان میں بھی وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔

قصاص میں
 زندگی ہے

یاں پر اللہ تعالیٰ نے قصاص کا فلسفہ بھی بیان فرمایا وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ
 حَیَوةٌ کَثِیْرَةٌ وَلِیَ الْاَنْبِیَآءِ۔ یعنی اے صاحب عقل و خرد قصاص میں تمہارے لیے
 زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ایک آدمی قتل ہو گیا اور جب قصاص
 میں قاتل کو بھی قتل کر دیا گیا، تو ایک اور جان ضائع ہو گئی حالانکہ اللہ تعالیٰ اسے زندگی
 سے تعبیر فرماتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قصاص کی عدم موجودگی میں لوگ
 بلا خوف و خطر قتل کے مرتکب ہوں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ چھوٹی موٹی سزا
 بھگت لیں گے، جان تو بچ ہی جائے گی۔ برخلاف اس کے جب قصاص کا قانون
 موجود ہوگا۔ اور لوگوں کو علم ہوگا کہ قتل کے بدلے میں قاتل بھی قتل کیا جائے گا، تو وہ
 قتل جیسا بڑا جبرم کہنے والے وقت سو دفعہ سوچے گا۔ اولیٰیے افتدّم سے
 باز آ جائے گا۔ انگریز کے بنائے ہوئے قانون میں یہی خامی ہے۔ ہر روز کتنے
 قتل ہو رہے ہیں۔ مگر چونکہ قاتل کو قراردادِ سزائیں ملتی، ایک قتل کے بعد
 اُسے مزید شہ ملتی ہے۔ اور وہ بلا خوف و خطر وارداتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ چورنی کا بھی
 یہی حال ہے اگر لوگوں کو حد جاری ہونے کا یقین ہو تو پھر چوری کرنا اتنا آسان نہ
 ہو۔ سعودی عرب میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہاں حدود اللہ
 جاری ہیں۔ قاتل اور چور بلا دھڑک جرم نہیں کر سکتے جب سے خاندان ابن سعود نے
 حدود نافذ کیں ہیں، چورنی کی کتنی سزائیں ہوئی ہیں۔ گزشتہ پچاس سال میں ایک
 سو لوگوں کے ہاتھ بھی نہیں کٹے ہوں گے۔ سزا کی دہشت ہی ایسی ہے کہ سرعام
 سونا پڑا ہوا ریا ل کی بوری رکھی ہو، کوئی ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ اسلامی قانون

پر عمل درآمد کی برکت ہے۔ اسی طرح اگر زنا کی حد سنگساری ہوگی اور مجرم کو سر عام سزا دی جائیگی، وہاں یہ جرم کیسے ہوگا۔ برخلاف اس کے جہاں ایسی عبرتناک سزائیں نہیں ہیں۔ وہاں جرائم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ چند ایک کو قصاص میں قتل کرنے سے عام لوگوں کی جانیں بچ جائیں گی۔

عربی ادب کی کتاب حماسہ میں صحابہ کرام کے زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ کوئی شخص قتل ہو گیا قاتل با اثر آدمی تھا۔ اس کے بہت سے سفارشی تھے حضرت سید بن العاص بھی ان میں شامل تھے لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح قاتل کا بیٹا قصاص کی بجائے دیت لینے پر راضی ہو جائے کہ سات گنا دیت تک کی پیش کش کی گئی۔ مگر بیٹا یہی کہتا رہا کہ میں تو قصاص لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ ظاہر ہے کہ جب قصاص کا قانون جاری ہو گا تو پھر اس جرم کا ارتکاب کوئی اٹاؤ ڈٹاؤ نہ کرے گا۔ اکثر لوگوں کی جان محفوظ ہو جائے گی۔ اسی لیے قصاص کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا یہ قانون اس لیے جاری کیا گیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم متقی بن جاؤ اور ایسے گناہ نہ کرو جو جرم کا ارتکاب نہ کرو گویا اس قانون کا اجرا اصول تقویٰ کا ایک ذریعہ ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفت دیک (۱)

الْبُقْعَةِ ۳

آیت ۱۸۰ تا ۱۸۲

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ لِيُتْرَكَ خَيْرًا عَلَى
الْوَصِيَّةِ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ أَبْذَلَ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا أَثْمُمَةٌ
عَلَى الَّذِينَ يَبْذُلُونَ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ
خَافَ مِنْ مَوْصٍ جَنَفًا أَوْ أَثْمًا فَاصْلَحْ بَيْنَهُمْ فَلَا
إِثْمَ عَلَيْهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

ترجمہ: جب فرض کی گئی ہے تہلے اور جس وقت کہ آئے تم میں سے کسی کے
پاس موت اگر اُس نے مال چھوڑا ہے، تو وصیت والدین کے حق میں اور قرابت داروں
کے حق میں دستور کے مطابق۔ یہ لازم ہے پر ہیز کاروں پر ﴿۱۸۰﴾ پس جس
شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اُسے سننے کے بعد، بیشک اس کا گناہ
ان لوگوں پر ہے جو اس کو تبدیل کرتے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے
والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۱۸۱﴾ پس جس نے خوف محسوس کیا۔ وصیت
کھنسنے والے کی طرف سے ایک طرف مائل ہونے کا یا گناہ کا، پس اُس نے ان کے
درمیان صلح کرادی، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ
بخشنے والا اور مہربان ہے ﴿۱۸۲﴾

حفظ جان
کات لائن

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ قصاص کا قانون تقویٰ کا ایک
جزوہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون جاری فرما کر انسانی جانوں کی عظمت
فرائی ہے۔ اس کے بغیر انسانی جان کا ضیاع ایک معمولی چیز تھی مگر اللہ تعالیٰ
نے یہ قانون نافذ کر دیا کہ اگر عدل و انصاف کا دامن تھامے رکھو گے، تو جانیں

محفوظ ہو جائیں گی اور تم کو صحیح زندگی نصیب ہوگی۔ اس کے ساتھ قانون دیت بھی حفاظتِ جان ہی کا ایک حصہ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کی حفاظت کے لیے قوانین نافذ کیے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قتل ناحق اکبر الکبائر میں سے ہے۔ یعنی سب سے بڑے گناہوں میں سے پہلا نمبر شرک کا ہے اور دوسرا قتل ناحق کا ہے۔ قَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَدَّمَ اللَّهُ حضرت عثمانؓ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک لڑکا جو جہاد میں جان کا اہل ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ صرف تین صورتوں میں جان کو تلف کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان تین صورتوں کے علاوہ کسی کی جان لے گا، تو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ پہلی صورت قصاص کی ہے۔ کسی شخص کو قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے، تو وہ جائز ہوگا۔ دوسرا قتل اُس مرد یا عورت کا جائز ہے۔ جسے زمانے کے جرم میں سنگسار کیا گیا ہو۔ اور تیسرا قتل اس شخص کا جائز ہے۔ جو دین اسلام چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔ الغرض گذشتہ درس میں حفاظتِ جان کا قانون بیان کیا گیا تھا۔

اسلام کا ضابطہ
دیوانی

ضابطہ فوجداری کی طرح اسلام نے ضابطہ دیوانی یعنی مال کا قانون بھی عطا کیا ہے جسکی تفصیلات قراک و سنت میں موجود ہیں اس سے پہلے قصاص یعنی فوجداری قانون کا بیان آچکا ہے۔ دیوانی قانون کی بنیاد کے متعلق قرآن پاک میں جگہ جگہ آیا ہے۔ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ خبردار کسی حرام یا شکوک ذریعے سے مال مت حاصل کرو۔ اگر ایسا کرو گے، تو کمال سے محروم ہو جاؤ گے اور جب مال جائز طریقے سے حاصل کرو، تو اس کو غلط اور ناجائز امور پر خرچ نہ کرو۔ اگر بجا تصرف کرو گے تو ظالم اور گنہگار بن جاؤ گے۔ الغرض مالی امور کے متعلق بھی اسلام نے پورا ضابطہ عطا کیا ہے فوجداری قانون میں انسانی جان کے تحفظ کی ضمانت تھی، اس دیوانی قانون میں مال کے تحفظ کے اصول بتلائے ہیں۔ اور دونوں قوانین کا تعلق تقویٰ سے ہے۔ اہم شاطی کا تعلق اندس سے ہے۔ آپ مالکی مسلک کے بہت بڑے

اسلامی قانون
حکمت پر مبنی ہے

اہم گزرتے ہیں۔ آپ نے "مراعات" نامی کتاب بھی لکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اسلام کا سارا قانون حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی کوئی شق حکمت سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں بڑی بڑی باریکیاں اور حکیمانہ مصلحتیں رکھی ہیں، بھرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت میں اس قدر حکمتیں، مصلحتیں اور باریکیاں موجود ہیں کہ دنیا کے تمام انسان مل کر سوچیں، تو اس کے برابر نہیں سوچ سکتے۔ آپ فیوض الحرمینؐ میں لکھتے ہیں کہ بعض اوقات جب میں بعض آیات پر غور کرتا ہوں تو ان کی تہ میں مجھ پر کج بیکراں جیسے وسیع انکشافات ہوتے ہیں۔ جو عام انسانوں کی سوچ و بچار سے باہر ہوتے ہیں۔

تخلف نفس

اسلام نے جہاں دیگر تحفظات لیے ہیں، وہاں تحفظ نفس کی بھی ضمانت دی ہے۔ نسب بالکل محفوظ ہونا چاہیے۔ اس میں — غلط طعنے نہیں ہونا چاہیے۔ برحالا اس کے غیر اقوام میں تحفظ نسب کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ڈاکٹر اسپنسر گزشتہ صدی کا بہت بڑا فلاسفر ہوا ہے۔ اب تو یورپ کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اس وقت صرف چالیس پینتالیس لاکھ تھی وہ کہتا ہے کہ یورپی قانون پر لعنت ہو کہ پنتالیس لاکھ میں سے یقین کے ساتھ پنتالیس آدمی بھی حلال کے نہیں نکالے جاسکتے، یہاں کا قانون ایسا گنہگار حکمران اسلام نسب کی حفاظت کرتا ہے قرآن و سنت میں اس کے متعلق بہت قانون موجود ہیں اسی طرح دین کی حفاظت کا قانون بھی اسلام میں موجود ہے۔ اگلی آیات آرمی میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ دین کی حفاظت کے ہی قوانین تو ہیں۔ اہم شاطیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کے تحفظ کا قانون بھی عطا کیا۔ شراب جیسی قبیح چیز کو حرام قرار دیکر اسلام نے عقل کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ شراب الیٰی نشہ آور چیز سے عقل و خرد کیسے قائم رہ سکتی ہے۔

الغرض! اسلام نے تو بہترین حکیمانہ قوانین عطا کیے ہیں۔ مگر یہ خود ہماری نالائقی ہے کہ ہم ان سے استفادہ نہیں ہونا چاہتے۔ ان سنہری اصولوں کو چھوڑ کر ہم غیر ذل کے گندے قوانین تلاش کر رہے ہیں۔ کبھی امریکہ کی طرف جاتے ہیں، کبھی یورپ

کی طرف دیکھتے ہیں، کبھی ایشیا کا رخ کرتے ہیں۔ کہ کیوں سے اچھا دستور مل جائے
کوئی اچھا فوجی نظام حاصل ہو جائے یا کوئی اقتصادی نظام ہی میسر آجائے۔ مگر وہاں
پر لعنت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ قرآن و سنت جیسے اعلیٰ و ارفع قوانین کیوں سے
نہیں ملیں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس دور میں اسلامی تحریک کے خلاف
سب سے بڑھ کر روسی ذہن کام کر رہا ہے۔ اس وقت اسلام کی مخالفت میں سب سے
زیادہ اشتراکی نظام کا رخ فرما رہا ہے۔ مگر ایک وقت آئے گا جب یہ نظام بھی مجبور ہو کر
قرآنی قوانین کے سامنے ہتھیار ڈال دیگا۔ اُن کے پاس محض دعوئے ہے، عملی طور
پر کچھ نہیں اٹھائے۔ بالآخر انہیں اسلام کے سامنے ٹھٹھکنے پڑیں گے۔

تختِ مال

اسلام نے مال کا مکمل تحفظ عطا کیا ہے۔ اگر کسی جگہ کوئی خرابی موجود ہے
تو طے درست کرنے کا قانون بھی موجود ہے۔ اسلام نے مال کو ضائع کرنے
سے منع فرمایا ہے۔ البتہ طے احسن طریقے سے خرچ کرنے کے اصول بتلائے ہیں
اس کے متعلق مختلف قوانین گزر چکے ہیں۔ "وَلَا تَالُوا مَالَكُمْ عَلَىٰ حِبْتٍ" یعنی مال کی محبت
کے باوجود طے خرچ کرو۔ زکوٰۃ کا مکمل قانون موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی ذِمَّہً
كَذَٰلِكَ مَعَكُمْ يَنْفِقُونَ۔ ہمارے لیے ہوئے مال سے خرچ کرو۔ اس سلسلے
میں مکاتب غلاموں کی آزادی کا قانون دیا ہے۔ سورۃ نور میں آتا ہے "وَاتَّقُوا مِمَّنْ
مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِي اَتَاكُم بِهٖ مَالُ اللّٰهِ كَادِبًا" ہوا ہے اس لیے ذرائع پیدا
کر دیے ہیں۔ کہ تمہیں مال پہنچا رہا ہے۔ محنت کوئی کر رہا ہے۔ مگر تمہیں وراثت
میں سے نیٹھے بٹھکے مل جاتا ہے۔ اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ ہر انسان
فطری طور پر آزاد ہے طے غلامی کے پھندے سے چھڑاؤ۔ ان پر اللہ کے لیے
ہوئے مال میں سے خرچ کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ اس مال کے حقیقی مالک تم ہو۔ اصلی
مالک تو اللہ تعالیٰ ہے۔ جس نے تم پر مہربانی کی اور ایسے وسائل تمہارے سپرد
کیے۔ جن کے ذریعے مال تم تک پہنچا ہے۔ پھر اس میں تصرف بھی وہ کرو جس کی

اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اگر اس کی مرضی کے خلاف خرچ کر دو گے، تو جہنم رسید ہو گے۔

قانون وصیت

ان آیات میں وصیت کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْضَرَا أَحَدٌ كُمُ الْمَوْتُ أَنْ تَعْلَمُوا خَيْرًا لِّوَصِيَّتِهِ لِلْمَوْلَدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ یعنی جب کسی کی موت کا وقت قریب ہو اور وہ مال چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ تو اس پر لازم ہے کہ وہ والدین اور قرابت داروں کے حق میں وصیت کر جائے۔ اور یہ وصیت ہو بھی بالمعروف یعنی دستور کے موافق۔ فرمایا ایا کرنا حقاً علی المتقین یعنی متقیوں کے لیے ضروری ہے۔

وصیت کا مکمل قانون قرآن پاک کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ یہ آیات اس قانون کی ابتدائی آیات ہیں، جنہیں سورۃ نساء کی آیات نے منسوخ کر دیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے در ثاء کے حصے مقرر نہیں کیے تھے، آیات زیر درس کے ذریعے وارثوں کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا۔ تاکہ انہیں بھی میرت کے ترکہ میں سے حصہ مل سکے۔ مگر سورۃ نساء کی آیات نازل ہوئے سے در ثاء کے حصے مقرر ہو گئے اس لیے ان کے لیے وصیت کا قانون منسوخ ہو گیا۔ اب در ثاء کے لیے وصیت نہیں ہے۔ البتہ خیر و در ثاء کے لیے ایک تنائی مال تک وصیت کر سکتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے در ثاء یعنی مال باپ، بیوی، خاوند، اولاد وغیرہ کے متعلق فرمایا۔ إِنَّ اللَّهَ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق عطا کر دیا ہے۔ اب لاء وصیت لواءِ پٹ کسی وارث کے لیے وصیت روا نہیں ہے۔ انہیں وراثت سے مقرر حصہ خود بخود مل جائے گا۔ بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ در ثاء کے لیے وصیت والی یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ والدین کے لیے وصیت کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

مولانا عبد الشکیر سندھی فرماتے ہیں۔ کہ خود ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا کہ انیس ماں کے حق میں وصیت کر لے کا خیال پیدا ہوا۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ واقعی آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات وراثہ کے لیے بھی وصیت ضروری ہو جاتی ہے آپ خود نو مسلم تھے۔ آپ کی والدہ آخر تک اپنے مذہب پر قائم رہی۔ فرماتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ میں بیجا رہ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ موت کی صورت میں میری ماں کو میرے ترکہ سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ وہ غیر مسلم تھی اور مومن اور کافر کے درمیان وراثت نہیں چلتی۔ تو اس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ماں کے حق میں وصیت کر دوں بہر حال یہ اُسی صورت میں ہوگا جب کہ ماں غیر مسلم ہونے کی وجہ سے وراثت کی حقدار نہ تھی۔ کیونکہ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ نہ کافر مسلمان کا وارث ہے۔ اور نہ مسلمان کافر کا وارث ہے۔ ایسی صورت میں وصیت ہی کے ذریعے ترکہ تقسیم ہو سکتا ہے۔

انبیاء کی وصیت

قرآن پاک میں وصیت کا قانون کنی جگہ بیان ہوا ہے۔ جہاں بھی وراثہ کے حصص کا بیان آتا ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے۔ کہ فَلَإِنْ نَفَلْنَا لَكُمْ مِنْهُ حَقًّا لَكُمْ مِنْهُ حَقًّا لَكُمْ مِنْهُ حَقًّا۔ مگر مقرر کیا گیا ہے۔ مگر مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّتِهِ تَوْصِيَّتُهُ لَكُمْ مِنْهُ حَقًّا۔ یہ ترکہ وصیت شدہ مال اور قرضہ نکال کر باقی تقسیم ہوگا۔ منجملہ وصیت کی دیگر اقسام کے انبیاء علیہم السلام کی بھی وصیت ہوتی ہے۔ مگر وہ مال کے متعلق نہیں ہوتی۔ پوچھنے والے صحابہ کرام سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ کیا حضور علیہ السلام نے کوئی وصیت کی ہے۔ صحابی جواب دیتے ہیں کہ آپ نے مال سے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی کیونکہ آپ کا ارشاد ہے مَا تَرَكْنَا صَدَقَةً یعنی نبی جو چیز چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے متعلق وصیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اُن کا ترکہ صدقہ ہو رہا ہے۔ اُسے وراثت میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔

فرمایا البتہ نبی علیہ السلام نے وصیت ضرور فرمائی ہے۔ اور وہ قرآن پاک پر عمل کرنے کی۔ غلاموں کے متعلق حسن سلوک کی وصیت کی ہے۔ نماز پر مداومت اور

شرک سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى
یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انہوں نے انبیاء کی مستبور کو کعبہ گاہ بنالیا
آپ نے امت کو تعلیم دی کہ تم میری قبر کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا جو یہود و نصاریٰ
نے اپنے انبیاء کی مستبور کے ساتھ کیا۔ مگر آج کل قبروں کے ساتھ جو کچھ معاملہ
ہم رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے، بیرون ملک سے آنے والا ہر سربراہ مملکت
سب سے پہلے جناح صاحب کی قبر پر چادر چڑھاتا ہے۔ حضرت علی جویریؓ کی قبر
کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ کوئی ریشمی چادر چڑھا رہا ہے، کوئی پھولوں کی
چادر لے کر آیا ہے۔ کوئی پچی پچائی دیگ پیش کر رہا ہے۔ کوئی بکرا، چھتراندر
کر رہا ہے۔ کوئی سجدہ کر رہا ہے، کوئی حاجت روائی کا طالب ہے، کوئی مشکل
کٹائی کے لیے دعائیں کر رہا ہے۔ یہ سب شرکیہ امور ہیں جنہوں نے اللہ علیہ وسلم
نے امت کو ڈرایا مَحْذَرُهُمْ صُنْعُوا لِي كَمَا مِمْت كَرْنَا، مگر ہم اٹھ جیل
ہے ہیں۔

وصیت کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ منجملہ اُن کے مباح یا مستحب وصیت
کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں۔ حضور نے
فرمایا کہ جس شخص کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہو
تو اسے چاہیے کہ وہ دو راتیں بھی نہ گزرے مگر وصیت اس کے سر ہانے کے نیچے
لکھی ہوئی موجود ہونی چاہیے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب تک میں نے حضور علیہ السلام
کی زبان مبارک سے یہ بات سنی ہے۔ اس وقت سے میں نے وصیت لکھ
کر سر ہانے کے نیچے رکھ لی ہے۔ وصیت کی یہ مستحب قسم ہے۔

بعض اوقات وصیت فرض ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو یقین ہے کہ اُسکی
زندگی کے آخری ایام آ پہنچے ہیں اور اب اس کے بچنے کے کوئی آثار دکھائی
نہیں دیتے۔ نیز اُس کے ذمے ایک دو سال کی زکوٰۃ واجب الادا ہے۔ تو ایسی
صورت میں اس کے لیے وصیت کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے مال سے

زکوٰۃ کی ادائیگی کی وصیت کر جائے۔ وگرنہ عدم ادائیگی کی صورت میں فرض کا آثار ہو کر گنہگاروں کی صف میں کھڑا ہو گا۔ اسی طرح کسی کی امانت موجود ہے۔ یا کسی کا قرض ادا کرنا ہے۔ تو اس کے لیے لازم ہے۔ کہ مرنے سے پہلے وصیت کرے جیسے کہ فلاں فلاں چیز کی ادائیگی کر دینا اگر ایسا نہیں کرے گا۔ تو اس کا مال تو درنا ہضم کر جائیگا، اور وہ خود دوسروں کا مقروض رہ جائے گا۔ اسی لیے اسلام نے مرنے والے کے متعلق یہ قانون وضع کر دیا کہ سب سے پہلے مرنے والے کے مال میں سے اس کے کفن و دفن کا انتظام کیا جائے۔ یہ بنیادی ضروریات میں داخل ہے اس کے بعد اگر مرنے والے کے ذمہ قرضہ ہے۔ تو وہ ادا کیا جائے۔ پھر اگر کوئی وصیت ہے۔ تو کل مال کے ایک تہائی تک اسے پورا کیا جائے۔ اس کے بعد بقیہ مال ورثہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ لوگ ان ضروری امور کی طرف تو توجہ نہیں کرتے۔ اس کی بجائے مرنے کے قفل، تیجہ، ساتل، دواں اور چاہیوں کے چکر میں پڑ کر مرنے والے کا مال ضائع کرتے ہیں۔ جو کہ بالکل ناجائز ہے۔ اور اگر مرنے والے کے مال کی بجائے لاشیں اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں۔ تو بھی محض رسومات کی خاطر ایسا کرنا فضول ہو گا کیونکہ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اگر خدا کا حکم ایسی رسومات پر یتموں کا مال صرف ہو رہا ہے تو یہ قطعاً حرام ہے۔ کھانے والے حرام کھا رہے ہیں۔ اس سے بچنا چاہیے۔ اور جن چیزوں کا شریعت نے حکم دیا ہے انہیں پورا کرنا چاہیے۔

وصیت کی ایک قسم ناجائز بھی ہے۔ اگر مرنے والا کسی ناجائز کام کی وصیت کرے تو ایسی وصیت ناجائز ہی کہلائیگی مثلاً کوئی شخص وصیت کر جائے کہ میرے مال میں فلاں قبر پر چادر چڑھا دینا یا فلاں مزار پر بجرا چڑھا دینا وغیرہ وغیرہ ناجائز وصیت ہوگی۔ اور ایسی وصیت پر عمل کرنا روا نہیں ہے۔

بہر حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ کار خیر کے لیے ایک تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت ہے۔ تاکہ مرنے والے کو آخرت میں

اس کا حصہ ملتا ہے مثلاً مسجد تعمیر کرانے اور سب بنوانے، غیر وارث، ارثہ داروں اور مستحقین میں تقسیم کرنیکی وصیت کر جانے تو یہ جائز اور درست ہے اور اگر کوئی شخص ایک تائی مال سے زیادہ کی وصیت کر جائے تو یہ وراثہ کی اجازت پر موقوف ہوگا اگر وہ سب ماضی ہو جائیں تو وصیت پر عمل ہوگا ورنہ صرف ایک تائی پر عمل کرنا ہوگا اگر چہ اس کے لیے بھی **وَالثَّلَاثُ كَيْفَ شِئْتُمْ** کے الفاظ آتے ہیں مگر اس حد تک جائز ہے، حضرت سعدؓ نے عرض کیا تھا کہ میرے پاس بہت مال ہے اور حق دار صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ حضور! اگر اجازت دیں تو میں سارا مال صدقہ کر جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ پھر عرض کیا اُدھا مال سے دوں، فرمایا نہیں انہوں نے تیسری دفعہ پوچھا کیا دو تائی مال کی وصیت کر دوں آپؐ نے پھر بھی اجازت نہ دی جب آپؐ نے ایک تائی مال کی اجازت طلب کی تو آپؐ نے فرمایا کہ اگرچہ یہ بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی اجازت ہے۔ مقصد یہ کہ وارثوں کو ترکہ سے زیادہ سے زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔

وصیت میں
تبدیلی کا گناہ؟

فرمایا **فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ** جس شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اُسے سُننے کے بعد **فَاَتَمَّ اَثْمُهُ عَلَى الَّذِي يُبَدِّلُهَا** تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے۔ جو اس کو تبدیل کرتے ہیں بطلب یہ کہ اگر کوئی شخص وصیت کر کے فوت ہو جائے اور اس وصیت کو سُننے والے یا جاننے والے اس پر عمل درآمد کرنے کی بجائے اسے تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو اس کا وبال وصیت میں تحریف کرنے والوں پر ہوگا۔ کیونکہ وصیت کرنے والا تو اپنا فرض ادا کر گیا۔ اب اس پر عمل درآمد کے وقت بھی بیشی کرنے والے گنہگار ہوں گے۔ **اِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيْمٌ** بیشک اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

وصیت میں تبدیلی کی کئی ایک صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مرنے والا کسی ایسے شخص کو کوئی حصہ دے گیا، جسے وارث پسند نہیں کرتے۔ یا کسی کے کم حصے کو زیادہ یا زیادہ کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی طرف سے رد و بدل کرتے

ہیں۔ تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔ کیونکہ جائز وصیت پر عمل نہیں کیا، وارثان کے حصص کی تقسیم وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک نے بار بار تصریح کی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی وصیت کرنے والا وصیت صحیح طریقے سے نہیں کرتا۔ کسی کو حق سے زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو پورا حق بھی نہیں دیتا اور اس طرح پسانہ لگا بین تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اس نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصِيٍّ جُنَافًا أَوْ قَسْطًا جَوْشَعُ ڈر گیا۔ وصیت کرنے والے کے ایک طرف جھک جانے سے یا کسی گناہ کے ارتکاب سے فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ پس اس شخص نے فریقین میں صلح کرادی فَلَا رَافِعَ عَلَيْهِ تو ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں بعض اوقات کوئی بیٹا نافرمان ہوتا ہے اور وصیت کرنے والا اسے جائیداد سے محروم کرتا ہے۔ تو یہ بات غلط ہے۔ اور کبیرہ گناہ ہے۔ وارث بننا ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ اور جو حصہ اللہ نے ورثا کو دیا ہے۔ وہ نیکی بدی یا نافرمانی اور نافرمانی پر موقوف نہیں ہے۔ اس کا اچھا یا بُرا صلہ کسی اور طریقے سے دیا جاسکتا ہے۔ مگر وارثت سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ حق اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ایسی ہی صورت میں فرمایا کہ اگر کوئی شخص درمیان میں آکر صلح کرادے۔ تو یہ اچھی بات ہے۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوگا۔ وارثان کو ان کا جائز حصہ مل جائیگا اور وصیت کرنے والا بھی سرخرو ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہوگئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔ كَيْفَ تَعْلَمُونَ اللَّهَ عَفْوُهُمْ تَرْحِمُهُمْ۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقْعَةِ ۲

درس ہفتاد و دو (۷۲)

آیت ۱۸۳ تا ۱۸۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
 الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ
 فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ
 أُخَرٍ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ
 فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ
 إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

ترجمہ : اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ ان لوگوں پر فرض
 کیے گئے تھے، جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ تاکہ تم پر سیز گلہ بن جائے ﴿۱۸۳﴾ جن دنوں
 ہوئے دن ہیں۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو پس وہ سب دنوں میں
 گنتی پوری کرنا ہے۔ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں ایک مسکین کا طعام فدیہ ہے
 پس جو شخص خوشی سے نیکی کرے گا، وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزے
 رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ سکتے ہو ﴿۱۸۴﴾

گدشتہ پیوستہ

اس سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے نفس الہی کی حفاظت کا قانون بیان فرمایا۔ پھر
 مال کی حفاظت کا قانون بتلایا۔ اور مال کے بیجا تصرف سے منع فرمایا۔ حق تعالیٰ کو
 ناجائز قرار دیا اور بتایا کہ یہ بات تقویٰ کے خلاف ہے۔ ایمانیات کے ذکر کے
 بعد اللہ تعالیٰ نے اسلام کا قانون فرمایا، اور قصاص اور دیت کا تذکرہ
 کیا اور فرمایا یہ اصول بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس پر عمل پیرا ہو کہ تقویٰ
 حاصل کرو۔

آیات زیر در کس میں ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن روزہ کو بیان کیا ہے فرضیتِ روزہ

اور نفسانی خواہشات سے باز رہنا اس نیت کے ساتھ کہ میرا روزہ ہے یہی صوم ہے اور اسلام کے ارکان میں سے قیامِ رکن ہے۔ ارکانِ اسلام میں توحید و رسالت پر عقیدہ کے بعد نماز، پھر زکوٰۃ اور پھر روزہ کا نمبر ہے۔ چوتھا نمبر حج کا ہے اسی ترتیب سے پانچواں رکن جہاد ہے۔ اور اس کا ذکر بھی بعد میں آ رہا ہے ان تمام ارکان کا تذکرہ سورۃ بقرہ میں اسی ترتیب سے آ رہا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے عَلَيْنَا بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَا عِدْلَ لَهُ رُزْهُ كَالْإِزْمِ كَالْإِزْمِ كَالْإِزْمِ كَالْإِزْمِ روزہ جیسی کوئی اور عبادت نہیں۔

الغرض! فرمایا اے ایمان والو! یہ روزے صرف تم پر ہی نہیں فرض کیے گئے بلکہ تم سے پہلے گذرے والے لوگوں پر بھی اسی طرح فرض تھے۔ البتہ ان روزوں کی مقدار اور تعدد مختلف امتوں کے لیے مختلف رہی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ایامِ بیض یعنی ہر ماہ کی تیرہ چودہ پندرہ تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ اور یہ روزے امتِ محمدیہ کے لیے مستحب کا درجہ رکھتے ہیں حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرض تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی امت کے لوگ بڑے سخت مزاج اور اکھڑے تھے، ان میں بہیمیت کا عنصر زیادہ تھا اور یہ پایا جاتا تھا۔ اسے کم کرنے کے لیے اس امت کو سارا سال روزے رکھنے کا حکم تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دوسرے دن افطار کرتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو دن روزہ رکھتے تھے۔ اور تیسرے دن افطار کرتے تھے اس امتِ آخر الزمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض کیے۔ ان کے متعلق فرمایا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ یہ گنتی کے چند دن ہیں۔ یعنی تین سو ساٹھ دن ہیں بے اتیس یا تیس دن کے روزے فرض قرار دیے گئے ہیں۔

اہم طحاویؒ اپنی کتاب مشکل الآثار میں فرماتے ہیں ہر عبادت میں دنیا کا امکان ہے۔ صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں دنیا کا کوئی مسئلہ

نہیں۔ یہ باطنی عبادت ہے۔ اور اس کا تعلق ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور دوسری طرف بندہ کے ساتھ۔ نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ ایسی عبادات ہیں۔ جنہیں دوسرے لوگ دیکھ سکتے ہیں، انہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ اور زکوٰۃ کے مستفید بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر روزہ کے ساتھ ایسا معاملہ پیش نہیں آ سکتا۔ اس کا تعلق صرف روزہ دار کی ذات سے ہوتا ہے۔ دوسرا شخص نہ اسے دیکھ سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص عام لوگوں کے سامنے تو نہیں کھا پیتا مگر درپردہ ایسا کر لیتا ہے۔ تو اس کا روزہ کہاں ہو گا؟ وہ لاکھ اعلان کرتا پھرے کہ میں روزہ دار ہوں مگر اس کی حقیقت کو وہ خود جانتا ہے۔ یا اللہ رب العزت جانتا ہے کہ وہ روزے دار ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر عبادت کا بدلہ دیا جائیگا۔ مگر روزہ ایک ایسی عبادت ہے۔ جسکی جزا میں قاص طور پر خود عطا کروں گا۔ حدیث قدسی کے الفاظ ہیں۔

الصَّوْمُ لِيْ وَ اَنَا اَجْزِيْ بِهٖ رَوْزَهٗ خَاصٌ مِّرْسِيْہٖ ہے اور میں ہی اسکی جزا دوں گا۔

روزہ کے
جسمانی فوائد

روزہ کے روحانی فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے جسمانی فوائد بھی ہیں۔

صُومُوْا تَصِحُّوْا روزہ رکھو تاکہ تمہیں صحت نصیب ہو۔ یارب کے بہت سے نامور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اسلام نے فاقہ کا جو طریقہ روزہ کی صورت میں مقرر کیا ہے، اس سے بہتر حفظانِ صحت کا کوئی اصول نہیں مختلف بیماریوں کے حملہ کی صورت میں بھی روزہ صحت مندی کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص طبعی مادہ کی زیادتی کا مریض ہو تو روزہ رکھنے سے بالکل تندرست ہو جائے گا۔ فاقہ کر لے سے طبعی اور کئی دوسری دلوہیں خشک ہو جاتی ہیں اور آدمی صحت یاب ہو جاتا ہے اسی لیے فرمایا کہ روزہ رکھو، صحت نصیب ہوگی اور سفر کرو غنیمت حاصل ہوگی۔ بسا اوقات اقامت میں آدمی کامیاب نہیں ہوتا مگر سفر کرنے سے اللہ تعالیٰ نے اسے رسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ جو اس کی کامیابی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اور انسان تنگی سے نکل کر فراخی میں داخل ہو جاتا ہے۔

روزہ اور قانون
کی پابندی

فرضیت روزہ کے لیے خطاب اہل ایمان سے ہوا ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** گو یا روزہ ایمان کا تقاضا بھی ہے جو شخص ایمان نہ رکھنے کا دعویٰ کرے۔ اُسے روزے کی فرضیت پر ایمان لانا ہوگا۔ روزہ وہ اہل ایمان ہونے کا تقاضا پرانسیں کرتا۔ علمائے کرام فرماتے ہیں روزہ کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ یہ قانون کی پابندی کھاتا ہے روزہ کے ذریعے انسان ایک مقررہ وقت کے لیے حلال اکل و شرب سے بھی رُک جاتا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ انسان قانون کا پابند ہو جائے۔ جب وہ قانون کی پابندی کے ذریعے حلال چیزوں سے رُک سکتا ہے۔ تو وہ حرام چیزوں سے بھی رُک جائے گا۔ کھانے پینے اور فحشانی خواہش کی تکمیل سے انسان کا نفس مزید پھلتا پھولتا ہے۔ اسے کمزور کرنے کے لیے اسلام نے روزہ کا قانون نافذ کیا۔ تاکہ نفس انسانی کو فاقہ کے ذریعے کمزور کیا جاسکے۔ **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** کا یہی مطلب ہے کہ انسان میں تقویٰ جیسی اچھی خصلت پیدا ہو جائے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ روزے کے ذریعے جب نفس کو مروت سے روکنے کی عادت پڑ جائیگی۔ تو پھر اسے شرعاً حرام چیزوں سے روکنا آسان ہو جائے گا۔ جب روزہ کی وجہ سے قوت نفس اور شہوت میں ضعف آئیگا، تو تم متقی بن جاؤ گے۔ روزہ میں یہ بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ کہ اس سے سرکش نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور شریعت کے احکام پر پابندی ہونے لگتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تو چالیس روزے رکھنے کا ذکر آتا ہے۔ اور نصاریٰ پر ایک ماہ کے روزے فرض تھے۔ مگر انہوں نے اس حکم میں تبدیلی پیدا کر لی۔ طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ عیسائیوں کا کوئی بادشاہ بیمار ہو گیا۔ گرجی کے روزے تھے۔ اس نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تندرستی دی، تو ہم بیس کی بجائے چالیس روزے رکھیں گے۔ اسی طرح ایک اور بادشاہ بیمار ہوا تو اس نے کہا کہ تندرست ہو کر مزید ستائیس رکھوں گا۔ اس طرح انہوں نے روزوں کی تعداد سینتالیس تک پہنچا دی۔ اس کے بعد عیسائی علماء کا اجماع ہوا۔ اور انہوں نے

فیصلہ کیا کہ سینتالیس کی بجائے پورے پچاس روزے مقرر کر دینے چاہئیں۔ البتہ موسم گرما کی بجائے موسم بہار میں رکھ لیا کریں گے۔ تو اس طرح انہوں نے اپنی مرضی سے روزوں کی تعداد اور موسم میں تغیر و تبدل کر دیا۔

مولانا شیخ النذہ فرماتے ہیں۔ کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ روزوں میں تبدیلی نہ کرنا بلکہ ہر سال ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھنا خواہ وہ گرمی میں آئیں یا سردی میں۔ بہار میں آئیں یا خزاں میں۔ چنانچہ قمری سال کے مطابق رمضان المبارک مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے۔ متقی بننے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی نفس اس کے تابع ہو جائے اور احکام شریعت پر عمل آسان ہو جائے۔ فرمایا آیاتاً مَعْدُودَاتٍ تا یہ گنتی کے دن ہیں یعنی پورے سال میں انیس یا تیس دن کے روزے ہیں۔ ان کو احکام الہی جانتے ہوئے خوشی خوشی سے پورا کرو اور اپنے اندر تقویٰ جیسی عظیم خصلت پیدا کرو۔

مریض اور مسافر
کا روزہ

فرمایا ماہ رمضان المبارک میں روزے رکھنے کا حکم تندرست اور مقیم کے لیے ہے، جسے روزہ رکھنے میں غیر معمولی مشقت نہ برداشت کرنی پڑے۔ البتہ سالے لوگوں کے لیے روزے مؤخر بھی کیے جاسکتے ہیں۔ جو مقررہ ماہ میں روزہ رکھنے کے قابل نہ ہوں۔ قَصْنُ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا پس جو کوئی تم میں سے بیمار ہو۔ اَوْ عَلٰی سَفَرٍ یا مسافر ہو فَعِدَّةٌ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ترہ گنتی دو ستر دنوں میں پوری کرے مثال کے طور پر کسی شخص کو بخار آتا ہے ظاہر ہے کہ اس حالت میں خاص طور پر گرمی کے موسم میں وہ زیادہ دیر تک بھوک پیاس برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر روزہ رکھنے کی کوشش کرے گا تو بیماری میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اُسے اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے بلکہ رمضان کے بعد چھوٹ جانے والے روزوں کے بدلے روزے رکھ لے۔

اسی طرح مسافر کو بھی روزے مؤخر کرینیکی اجازت ہے۔ سفر آرام و سکون کا ہو یا مشقت طلب، ہوائی جہاز کا ہو یا بحری جہاز کا، ریل گاڑی کا ہو یا بس کا، کسی

جانور کی سواری ہو یا پیدل سفر کر رہا ہے۔ اگر اُس کا جی نہیں چاہتا تو اسے اجازت ہے کہ روزہ قضا کر لے۔ اُس پر کوئی عرج نہیں۔ رمضان کے بعد روزے رکھ سکتا ہے تاہم یہ گنتی پوری کرنی پڑے گی۔ اس سے بچ نہیں سکتا۔ یہ ایک قسم کا نصاب ہے جسے ہر حالت میں مکمل کرنا ہو گا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی طالب علم کسی امتحان میں شریک ہو رہا ہے مگر کسی ایک یا دو پرچے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یا سرے سے وہ پرچے دیتا ہی نہیں۔ تو اسے وہ نصاب تسلیم کرنی پڑتی ہے امتحان کی صورت میں پورا کرنا ہو رہا ہے۔ اس کے بغیر اُسے ڈگری نہیں مل سکتی۔ اسی طرح جب تک چھوٹے ہوئے روزے پورے نہیں کرے گا، اس فرض سے عہدہ برائے نہیں ہو سکتا۔ اُسے تقویٰ کی سند نہیں مل سکتی۔

روزہ کے
برے فدیہ

فَرِيًّا وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ اُن پر ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔ مفسرین کو کم نے اس حصہ آیت کی مختلف تفسیر کی ہیں۔ اہم ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حکم روزوں کا حکم آنے کے بعد ابتدائی ایک دو سال کے لیے تھا جب تک لوگ اس مشقت سے ابھی مانوس نہیں ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں اجازت تھی کہ جو کوئی روزہ نہ رکھے اور وہ اس قابل ہو کہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو دین رات کا کھانا کھلائے، تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ جس سے اُس کا روزہ ادا ہو جاتا تھا، اس کے بعد جب اگلی آیت نازل ہوئی، تو مریض اور مسافر کے سوا روزہ رکھنا لازم قرار دے دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے فائدہ بھی سمجھائیے گئے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ اس آیت يُطِيقُونَهُ سے پہلے لفظ لَا مَحْدُوف ہے اور مراد یہ ہے کہ فدیہ ادا کرنے کی رعایت ان لوگوں کے لیے ہے۔ لَا يُطِيقُونَهُ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں دو قسم کے لوگ آتے ہیں، اولادہ لوگ جو بہت بوڑھے ہو گئے ہوں۔ شیخ فانی یا مجوزہ فانیہ یعنی بہت بوڑھا مرد ہے۔ یا بہت بوڑھی عورت ہے

دو چار گھنٹے بھی بغیر کھائے پیئے نہیں رہ سکتے تو ایسے لوگوں کے لیے حکم ہے کہ اگر وہ مالدار ہیں تو روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

ثانی، ایسے بیمار لوگ جو طبی بیماری میں مبتلا ہیں، تندرست ہونے کی چندال امید نہیں کہ تندرست ہو کر روزہ قضا کر لیں گے، تو ایسے لوگ بھی روزہ کے بدلے میں اُس کا فدیہ ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ اگر بعد میں تندرست ہو جائیں۔ تو انہیں روزہ رکھنا ہوگا، اس کے بغیر ان کی فرضیت ادا نہیں ہوگی، البتہ ادا شدہ فدیہ کا انہیں عکثرہ ثواب حاصل ہوگا۔ اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ روزہ کے بدلے میں فدیہ ادا کر دے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس حالت میں روزہ نہ رکھے جب کہ پیٹ میں کچھ ہے۔ یا دودھ پینے والے بچے کی زندگی خطرہ میں ہے۔ تاہم مصنف عبد الرزاق میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فتویٰ موجود ہے کہ ایسی عورتوں کو روزہ معاف نہیں ہوگا۔ جب ان کی علت دور ہو جائے۔ تو روزہ قضا کرنا ہوگا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ یُطَيِّقُوْنَہُ، لفظ اطاقہ سے ہے اور یہ باب افعال سے ہے۔ اس کا معنی ہے جو لوگ روزے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یعنی روزے سے مانوس نہیں ہیں۔ اس کے عادی نہیں ہیں۔ وہ روزے کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس کی دوسری تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ یہاں پر فدیہ سے مراد صدقہ فطر ہے۔ جو صاحب استطاعت پر واجب ہے۔ اور یہ روزوں کا کفارہ بنتا ہے۔ اس میں اور بھی کئی ایک مصلحتیں ہیں۔ بہر حال اسے صدقہ فطر پر محمول کیا گیا ہے۔ جسکی مقدار ایک مسکین کا دو وقت کا کھانا ہے یا ہر روزہ کے بدلے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کرے۔ گندم کی بجائے اگر باجرہ وغیرہ ہے۔ تو ایک صاع یعنی چار سیر ادا کرنا ہوگا اور گندم ہے تو نصف صاع یعنی دو سیر۔

فَرَّيَا فَمَنْ ذَلُّوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّہُ اَوْ جَوَّكُنَّ خَوْشًۢی سَیِّئًا

روزہ رکھنا
بھی بہتر ہے

کر دیکھا اگر یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ یعنی اگر شرعی عذر کے باوجود روزہ رکھتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور روزہ رکھنے والے کے لیے بہتر ہے۔ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی اگر تم روزہ رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ روزہ رکھنے میں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ قانون کی پابندی کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے شریعت کے جملہ احکام کی تعمیل آسان ہوتی ہے۔ اور انسان کے لیے جلدی درجہ کا ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم سمجھ لو جو رکھتے ہو، تو تمہارے لیے روزہ چھوٹنے کی بجائے روزہ رکھنا ہی بہتر اور افضل ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و سوم (۷۳)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۸۵

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ
الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ
بِكُمُ الْعُسْرَ ۖ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا
هَدَاكُمُ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

ترجمہ :- رمضان کا مہینہ وہ ہے جس کے اندر قرآن نازل کیا گیا ہے۔ وہ قرآن جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور فرقان کی واضح اور روشن دلیلیں ہیں اور فصلہ کھانے والی بات ہے۔ پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں حاضر ہو جائے پس اُس کو اسکا روزہ رکھنا چاہیے۔ اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو، پس دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ دشواری کا ارادہ نہیں کرتا۔ اور تاکہ تم گنتی پوری کرو۔ اور تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔ جیسا کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔

اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ ﴿۱۸۵﴾

انسان کے متقی بننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے اصول بیان فرمائے ہیں۔ پہلا قانون قصاص کی پابندی ہے اور دوسرا اصول مال کے معاملہ میں عدم زیادتی ہے۔ تاکہ کسی شخص کی حق تلفی نہ ہو۔ تقویٰ کا تیسرا اصول مقررہ اوقات میں روزہ رکھنا ہے۔ یہ سب ایسے افعال ہیں جن کی ادائیگی سے ایک مسلمان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

گزشتہ پیروی

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے روزہ کی فرضیت بیان فرمائی کہ ایمان والوں پر ایک ماہ کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہ چنر گئے ہوئے دن ہیں جو کہ پورے سال میں انیس یا تیس دن ہیں اور جن میں روزہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا یہ روزہ حضور نبی علیہ السلام نے بھی رکھا اور دوسرے لوگوں سے بھی رکھا یا گیا، بلکہ بچے بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم نازل ہوا، تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت ختم ہو گئی۔ البتہ عاشورہ کے دو روزے رکھنے کی اب بھی بڑی فضیلت ہے۔ اور یہ بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ یوم عرفہ کا روزہ بھی بڑے ثواب کا حامل ہے۔ مگر فرض نہیں ہے اسی طرح ایام بیض یعنی ہر ماہ کے درمیانی تین روزے مستحب ہیں۔ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے بہت بڑے اجر کا موجب ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے۔ اور اس کے بعد چھ روزے شوال سے ملا لیے، وہ شخص ایسا ہے۔ جیسے پورے سال کا روزے دار ہو۔ اہم فرضیت صرف رمضان کے روزوں کی ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فرمائی۔

ماہ رمضان اور
قرآن پاک

اب آیت ذیل در کس میں ماہ رمضان کے ان گنے چنے دنوں کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي رَمَضَانَ كَامِينَهُ وہ مبارک مہینہ ہے۔ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ جس میں قرآن پاک نازل ہوا۔ یہ بڑی برکتوں والا مہینہ ہے۔ اور سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ نزول قرآن کے سلسلہ میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ مجملہ اُن کے یہ ہے۔ کہ اس ماہ میں قرآن کریم کو نقل کر کے لوح محفوظ سے بیت العزت میں رکھا گیا جو کہ آسمان دنیا یعنی

پہلے آسمان پر واقع ہے۔ اہم جعفر صادق کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے دو نعمتیں سب سے بڑی ہیں۔ ایک حضور علیہ السلام کا وجود مبارک اور دوسرا

قرآن پاک، کتب میں تو دنیا میں ہزاروں لاکھوں ہیں مگر قرآن حکیم کوئی اور ہی چیز ہے۔
 ایں کتاب نیست، چیزے دیگر است

ہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کا حکم دوسرے کلاموں جیسا نہیں ہے
 لوگوں کا مقولہ ہے کلام الملوک ملوک، کلام بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے
 مگر یہ کلام تو مالک الملک کا ہے۔ جو کہ شمشاد مطلق ہے، اس کا کلام کس قدر قدر و
 منزلت کا حامل ہو گا۔ لہذا یہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے بہت
 بڑا انعام ہے۔

انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے جس نے قرآن پاک جیسی بڑی نعمت کی قدر
 نہیں کی۔ جس قوم کے پاس یہ کلام ہوا، وہ بھی بھیجتی پھرے تو کتنی افسوس کی بات
 ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص کے پاس قرآن پاک جیسی نعمت
 موجود ہو، وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں وہ بڑی عزت والا ہے
 مگر افسوس کہ حامل قرآن نے اغراض فاسدہ اور غفلت کی وجہ سے اس کی کوئی قدر
 نہیں کی، خود تو اس سے استفادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ باقی دنیا کو بھی محروم رکھا ہوا
 ہے۔ مسلمانوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت موجود ہے۔ مگر پھر بھی یہ
 ناشکر گزار ہیں۔

شہر کے معنی مینہ کے ہیں اور اس کی جمع شہوں، آتی ہے۔ رمضان کا
 معنی پیش ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ فرضیت روزوں کے زمانہ میں گرمی کے موسم
 میں رمضان کا مینہ آیا تھا۔ اس واسطے اسے رمضان یعنی گرمی یا پیش والا مینہ کہتے
 ہیں۔ رجب سے مراد عزت والا یعنی معظم مینہ ہے۔ جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخری
 سردی کے موسم کے مینے تھے۔ جد کا معنی سمجھ ہونا یا جم جانا ہے۔ اسی طرح شعبان
 کا معنی پراگندہ ہونا ہے۔ اس موسم میں قبائل ادھر ادھر پراگندہ ہو جاتے تھے
 ذی قعدہ، قعدہ یعنی بیٹھنے کے معنی میں آتا ہے۔ ذوالحجہ کا یہ نام اس لیے ہے
 کہ اس مینہ میں حج ادا کیا جاتا ہے۔ محرم سے مراد حرمت والا مینہ ہے۔ صفر

مختلف مینوں
 کی وجہ سے

سے مراد خالی مہینہ ہے اسی طریقہ سے ربیع بہار کو کہتے ہیں۔ ربیع الاول اور آخر اسی مناسبت سے نام ہیں۔

الغرض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ رمضان کو یہ نام پیش کی وجہ سے ملا ہے۔ جب ہر چیز گرم ہو کر پگھلنے لگتی ہے، سمیں پگھلنے اور پگھلانے کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اسکی ایک توجہ یہ بھی کی جاتی ہے کہ روزے رکھنے سے مسلمان کو جسمانی طور پر تکلیف پہنچتی ہے، جب وہ اس تکلیف کو برداشت کرتا ہے تو اس کے گناہ پگھلنے لگتے ہیں۔ گویا یہ مہینہ گناہوں کو پگھلانے والا مہینہ ہے۔

مسئلہ خلق قرآن

ایک زمانہ میں مسئلہ خلق قرآن پیدا ہوا تھا۔ بعض گمراہ لوگوں نے قرآن پاک کے کلام اللہ ہونے کا انکار کیا۔ اس کے بجائے قرآن کو مخلوق کہا گیا۔ اللہ یہ فتنہ دو تین صدیوں تک قائم رہا، البتہ اور کئی قسم کے فتنے موجود ہیں۔ اس زمانہ میں اس مسئلہ کی وجہ سے اللہ والوں نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں کئی علماء اسی مسئلہ کی وجہ سے سولی پر لٹک گئے۔ اہم احمد بن حنبلؒ نے چار حکومتوں کا زمانہ اسی ابتلا میں گزارا۔ ان پر مسلسل ظلم و ستم کے پہاڑے توڑے گئے۔ ان سے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا، فرماتے تھے میرے پاس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت ہے تم کوئی اور چیز لے کر آئے ہو، تاکہ میں اس کے مطابق بات کر دوں۔ آپ نے ہزار مصائب برداشت کیے مگر قرآن و سنت کے خلاف فتویٰ نہ دیا۔

نزدل قرآن

قرآن پاک کے رمضان المبارک میں نزول کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سعید بن جبیرؓ، اور اہم حسن بصریؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ماہ رمضان کی ایک رات لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے بیت العزت میں اتارا۔ اور پھر وہاں سے پورے تیس برس میں پھوٹا پھوٹا کر کے حضور عالم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، نزول قرآن کی اس رات کے متعلق خود رب العزت نے فرمایا لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ یہ تو ایک ہزار مہینوں سے

بھی زیادہ بہتر ہے۔ اگر یہ میسر آہلٹے۔ تو اس ایک رات کی عبادت قرآسی سال کی عبادت سے زیادہ افضل ہے۔ یہ بڑی فضیلت والی رات ہے۔

دیگر آسمانی کتابوں کی فضیلت کے متعلق بھی بہت سی روایات آئی ہیں۔ مثلاً طبرانی شریفیت کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو نازل ہوئے۔ قرأت چھ رمضان کو اور انجیل ۱۲ رمضان کو نازل ہوئی۔ قرآن پاک جو بیس رمضان کو نازل ہوا۔ یہ تفسیری روایات سے معلوم ہوا ہے۔ بہر حال رمضان المبارک کو قرآن پاک کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ یہ وہ ماہ مبارک ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت بڑی نعمت عطا فرمائی۔

تلاوت قرآن

اس ماہ مبارک کو قرآن پاک کے ساتھ بطور یادگار خصوصی لگا رکھا ہے۔ اسی لیے حکم ہے کہ اس مہینہ میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جائے اگرچہ محض تلاوت منہ سے مقصود نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس سے نصیحت پکڑ لی جائے اس کے بتلائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی جائے اور اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ”مقصد از نزول قرآن محض تلفظ نیست، اگرچہ اس زمانہ میں محض تلاوت بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ قرآن پاک کا ایک ایک حرف پڑھنے سے دس دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ فرمایا جب کوئی شخص خلوص دل کے ساتھ تین حرف اللہ پڑھتا ہے۔ تو تیس نیکیوں کا مستحق ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے کلام کی اس قدر برکت ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ باقی جو بھی کلام یا اور ادویں، انہیں بغیر سمجھے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صرف کلام پاک ہی ایک ایسا کلام ہے۔ جسے سمجھ کر یا بے سمجھے ہر حالت میں پڑھنے سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس کے لیے صرف ایمان اور نیت صاکی کی ضرورت ہے۔

قرآن کیا ہے ہُدیٰ للناس یہ لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے

قرآن درجہ ہدایت ہے

یہ ایسی ہدایت ہے جو انسان کے لیے سب سے ضروری چیز ہے آپ غازی کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ اے اللہ! ہم کو سیدھے راستے پر چلا اور ہمیں سیدھا راستہ دکھا، تو سیدھا راستہ وہی ہے جو قرآن پاک دکھاتا ہے یعنی اس طرح اعتقاد رکھو، اس طرح عمل کرو اس طرح کے اخلاق پیدا کر دینے معاشرتی اور معاشی مسائل کو اس طرح حل کرو، قرآن پاک میں ہے حضور علیہ السلام کی حدیث اس کی شرح ہے یہ قرآن پاک کہ کھول کر بیان کرتی ہے، امام شافعی، شاہ ولی اللہ اور مولانا رشید احمد گلگامی فرماتے ہیں کہ ہر صحیح حدیث قرآن پاک کی شرح ہے۔ صحیح احادیث کے بغیر قرآن پاک کو سمجھنا ممکن نہیں پروردگاری اور چمکدار الٰہی محض اس لیے حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ قرآن پاک کی من مانی تفسیریں کر سکیں۔ اس طرح کہنا گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے۔ کیونکہ احادیث کے بغیر انسان قرآن کی منزل کو نہیں پاسکتا۔ لہذا جب بھی دشواری پیش آئے قرآن پاک کی طرف رجوع کرو۔ هَلْ مِنْ مَّذْكُرٍ كُنْ هَبْ جِوَّاسِ سے نصیحت پکڑ لے۔ خود مفتی نہ بن بیٹھو، بَلْكَ فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ اگر تمہیں خود علم نہیں تو اہل علم کے پاس جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قسم اٹھا کر کہا، کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کا کوئی شریک نہیں۔ حضور علیہ السلام کے بعد اپنے اس دور میں اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص مجھ سے زیادہ قرآن کریم جاننے والا ہے۔ تو میں سواری پر سوار ہو کر اس کے پاس جاؤں، خواہ مجھے کتنا ہی لمبا سفر کرنا پڑے۔ صحابہ کرامؓ نے ایک ایک حدیث کی خاطر دو دو ماہ کا سفر کیا۔ ایک ایک مسئلہ معلوم کرنے کے لیے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مگر اس مقصد سے ہٹ کر کوئی دوسرا مفاد حاصل نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہاں سے کھانا تک نہیں کھایا۔ ناشتہ تک نہیں کیا۔ اور حصول مقصد کے بعد فوراً واپس لوٹ گئے۔ ڈر تھا کہ ایسا کہنے سے کہیں ہمارے اجر میں کمی نہ واقع ہو جائے۔ وہ لوگ اتنے محتاط تھے۔ خراسان سے حجاز یا حجاز سے خراسان تک ہزاروں میل کی مسافت محض کسی آیت کی تشریح معلوم کر لے کے لیے طے کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن کو مولوی محمد رفیع قندھاری کے نام سے مسنون کیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب نے قرآن پاک کی چند آیات کی تفسیر سمجھنے کے لیے قندھار سے رنجی تک کا سفر اختیار کیا۔ انہوں نے مولانا کے پرچے البلاغہ میں بعض آیات کی تفسیر پڑھی، تو کچھ شبہ پیدا ہوا جسے دور کرنے کے لیے آپ نے اتنا طویل سفر کیا۔ مولانا ان دنوں رنجی میں نظر بند تھے۔ اُس شخص نے ایسا مسئلہ حل کرنے کے بعد مسجد میں نماز ادا کی اور چلتا بنا۔ مولانا نے ہر چند کوشش کی کہ اس کی کچھ خاطر مدت کی جائے۔ اُسے واپسی کے لیے کہیں ہی فراہم کیا جائے مگر اس شخص کا کوئی پتہ نہ چلا۔ مولانا اس کے تقویٰ سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ اپنی تفسیر کو ان کے نام سے مسنون کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن پاک لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہے۔ جو چاہے اس سے مقصد حاصل کر سکتا ہے۔

واضح فرمادیں
دلائل

فرمایا قرآن پاک سامان ہدایت ہی نہیں، بلکہ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ اس میں ہدایت کے واضح دلائل موجود ہیں اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن بات بھی ہے۔ یہ کسی معاملہ کو اوصاف میں چھوڑنا، بلکہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنا ہے۔ کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے لِيَهْلِكَ مَن هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ مَّا كَرِهَ جَسَدٌ هَلَكَ هُوَ وَبَيِّنَةٍ مِّنْ حُجَّتٍ عَنِ بَيِّنَةٍ اور جو زندہ ہے۔ وہ واضح بات کے بعد زندہ ہے یعنی کسی انسان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہنا چاہیے۔ کہ اُسے حق و باطل کی پہچان نہیں ہوئی۔ قرآن پاک ہر چیز کی خوب خوب وضاحت کرتا ہے گویا قرآن پاک ہدایت بھی ہے اور فرقان بھی ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان المبارک میں تڑاویج ادا کی جائیں جن کے دوران قرآن پاک کی تلاوت ہو۔ اور پورے رمضان میں ہر مسلمان کے کان سے کم از کم ایک دفعہ قرآن پاک گزر جائے۔ یہ خدا تعالیٰ کی ہدایت کا پردہ گرام ہے اُسے ہر گھر میں پڑھا جانا چاہیے۔ اس کی اشاعت اور تعلیم عام ہو، تاکہ کوئی نفس اس سے محروم نہ رہے حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے

یہ رمضان کے روزے فرض کیسے اور میں نے تمہارے لیے تراویح کو سنت قرار دیا۔ اس میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت ہونی چاہیئے۔

روزہ لازم ہے

فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ جو کوئی تم میں سے ماہ رمضان المبارک کو پائے تو اسے روزہ رکھنا چاہیئے۔ مگر اس آیت کے ذریعے روزہ لازم قرار دے دیا گیا۔ اور اس سے پہلے روزہ کے عوض میں فدیہ کی جو رعایت دی گئی تھی، وہ ختم ہو گئی، اب سوائے عذر شرعی ہر عاقل بالغ کے لیے روزہ ضروری ہو گیا۔ عذر شرعی میں بیمار اور مسافر آتے ہیں۔ اور شرعی سفر تین دن کی مسافت ہے جو کہ ۲۸ میل بنتا ہے۔ اہم ابو حنیفہؒ کے نزدیک کم از کم اس قدر سفر کرنا ہو تو روزہ قضا کر سکتا ہے۔ بعض علماء نے کم از کم مسافت ۳۶ میل بتائی ہے۔ البتہ البرادہ شریف کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ مَنْ كَانَ لَهُ حَمُولَةٌ جس کے پاس سفر کے لیے سواری موجود ہو، اس کے لیے بہتر ہے کہ سفر میں بھی روزہ رکھے اور اگر نہیں رکھ سکے۔ تو بعد میں قضا بہر حال لازم ہے۔

روزے کی قضا

فرمایا وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو، تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ سال بھر میں ۲۹ یا ۳۰ دن کی گنتی پوری کرنا انسان کے اندر تقویٰ اور روحانیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر تقویٰ کا ڈپلومہ نہیں ملے گا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی طالب علم کو سند اسی صورت میں ملتی ہے جب وہ امتحان میں پاس ہو جاتا ہے۔ لہذا حصول تقویٰ کے لیے روزوں کی گنتی پوری کرنا لازم ہے۔ خواہ یہ رمضان کے بعد ہی کرنی پڑے۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے رمضان کے بعض روزے رہ جائیں اور وہ آئندہ رمضان تک ان کی قضا نہ کر سکے۔ تو پھر ہر قضا روزہ کے ساتھ اسے دو مدغل بطور تادان بھی ادا کرنا ہو گا۔ اہم ابو حنیفہؒ کا فرمان ہے کہ تادان ضروری نہیں ہے۔ اسے روزوں کی قضا کرنی پڑے گی۔ خواہ آئندہ رمضان کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

فرمایا يُيَسِّرُ اللَّهُ بِكُمْ أَيْسَى اللَّهِ تَعَالَى تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ
 کرتا ہے۔ وَلَا يُيَسِّرُ بِكُمْ أَيْسَى تَعَالَى تمہاری دشواری منظور نہیں۔ اس
 نے تمہاری آسانی کی خاطر تمہیں سہولتیں اور نصیحتیں بھی دی ہیں۔ جیسا کہ حاملہ اور مرضہ
 کو سہولت حاصل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وَلَا تَكُونُوا الْوَدَّاعَةَ تاکہ تم گنتی پوری
 نہ کرو۔ اور اس کے اثرات تمہارے اندر تقویٰ کی صورت میں ظاہر ہوں وَلَا تَكُونُوا
لِللَّهِ عَلَى مَا هَدَاكُمْ اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان نہ کرو جیسا کہ اُس نے تمہیں
 ہدایت دی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے وہ تجیر میں مراد ہیں۔ جو رمضان المبارک
 کے اختتام پر نماز عید پر پڑھی جاتی ہیں۔ وَلَا تَكُونُوا تَشْكُرُونَ اور تاکہ تم اللہ
 کا شکر یہ ادا نہ کر لو۔ الزُّكُوَّةُ شریف کی روایت میں ہے۔ لِكُلِّ شَيْءٍ زَكَاةٌ
 ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے وَزَكَاةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ اور جسم کی زکوٰۃ روزہ
 رکھنے سے ادا ہوتی ہے۔ اور اس طرح انسان اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ
 کی توفیق سے اس نے اس فریضہ کو پورا کیا۔ اور اس طرح تقویٰ اور رومیت
 کو اپنایا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

سَيَقُولُ ۲

(دس ہفتہ چار ۴۳)

الْبَقْعَةِ ۲

آیت ۱۸۶

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۱۸۶﴾

ترجمہ: اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھتے ہیں، پس میں قریب ہوں۔ میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے پس چاہیے کہ یہ لوگ میرا حکم مانیں اور چاہیے کہ یہ مجھ پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ ٹھیک راہ پا جائیں (۱۸۶)

آیت زیر در کس سے ماقبل اور مابعد آیات روزہ سے متعلق ہیں۔ پہلی آیت میں مخدور لوگوں کو حاصل ہونے والی رعایت کا ذکر تھا۔ اور بعد والی آیت میں روزے کے احکام ہیں۔ اس درمیانی آیت میں اُس دعا کا ذکر ہے۔ جو بندہ اپنے رب کے حضور کرتا ہے گذشتہ آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا بیان تھا۔ اس ضمن میں بعض حضرات نے حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کو کس طرح پکارنا چاہیے۔ کیا وہ انسان کے قریب ہے یا بعید۔ اگر قریب ہے تو اس کے ساتھ سرگوشی سے مناجات کریں۔ اور اگر وہ دور ہے تو زور سے پکاریں۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۱۸۶﴾

کریں، فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ تو میں ان کے بالکل قریب ہوں۔ اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ میں دعا کرنے والے کی دعا کو سناتا ہوں، جب وہ دعا کرتا ہے، اور مجھے پکارتا ہے۔

روحانیت کے لحاظ سے رمضان کا مہینہ یلسم ہی ہے۔ جیسے سال بھر کے مہینوں میں موسم بار بار ہوتا ہے۔ جب ہر چیز اپنے جو بن پہ ہوتی ہے۔ اسی طرح

رمضان شریف میں دوسرے مہینوں کی نسبت نیکی کی قدر قیمت اور وقعت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ نفل فرض کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور ایک فرض ستر فرضوں کے اجر کے برابر ہوتا ہے، ترمذی شریف میں امام زہریؒ کا قول ہے فرماتے ہیں تسبیحۃ فی رمضان خیر من الف تسبیحۃ فیما سواہ رمضان المبارک میں اخلاص کے ساتھ کی گئی ایک تسبیح غیر رمضان کی ایک ہزار تسبیح سے بڑھ جاتی ہے۔ گویا یہ مہینہ تکمیل روحانیت کے لیے موسم بہار کا درجہ رکھتا ہے۔ لہذا قبولیت دعا کے لیے بھی یہ مبارک مہینہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے دعا کی قبولیت میں زمان اور مکان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے رمضان کا مہینہ الیا مبارک مہینہ ہے۔ جس میں دعا زیادہ مستبول ہوتی ہے۔ زمان کے لحاظ سے حضورؐ نے جَوْفَ اللَّیْلِ الْآخِرِ یعنی رات کے آخری حصہ کا ذکر فرمایا کہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے جمعۃ المبارک کے متعلق بھی فرمایا کہ اس روز ایک ایسی گھڑی ہوتی ہے۔ جس میں دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے۔ مکان کے لحاظ سے ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں کی گئی دعائیں لازمی قبول ہوتی ہیں جیسے مقامات مقدسہ منیٰ، عرفات، مزدلفہ، صفا و مروہ۔ بیت اللہ شریف، ملتریم عظیم وغیرہ۔

ایک حدیث میں لیا ہے کہ جو شخص رمضان المبارک میں مانجنا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ناکام نہیں لٹاتا۔ دعا ہمارے دین کا اہم حصہ ہے عبادت کا ایک اہم اصول ہے الدعاء هو العبادة دعا عبادت ہی ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ قرآن پاک میں آتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ جَزَآءُ مِیْرَے سامنے دعا کرنے سے تکبر کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ہو کر دوزخ میں داخل ہوں گے۔ متدرک حاکم کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں الدعاء نور المؤمن سلاح المؤمن، نور السموات والارض، عماد الدین یعنی دعا مؤمن کا نور ہے۔ مؤمن کا ہتھیار ہے۔ زمین و آسمان کا نور اور دین کا ستون ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر آہستہ آواز سے کرنا چاہیئے۔ یا بلند آواز سے اس کا بیان آواز بلند
چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں بندے سے بالکل قریب ہوں۔ ایک
موقع پر سفر کی حالت تھی۔ صحابہ کرام حضور علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ اور بلند آواز
سے ذکر الہی یعنی تجسیر و تسلیل میں مصروف تھے آپ نے ارشاد فرمایا اِنْ هِيَ اَعْلٰی اَلْهَيْسَلِمْ
لوگو! اپنی جانوں پر نرمی اختیار کرو۔ تم جس ذات کو پکار رہے ہو، وہ بعید نہیں ہے۔
وہ تو قریب ہے۔ لہذا بلند آواز سے چیخ و پکار نہ کرو۔ ترمذی شریف کی حدیث میں آتا
ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور قرآن کریم
میں یہ بھی موجود ہے وَخَنُّ اَقْرَبُ الْيَدِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ
ہم تو انسان کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ لہذا اُسے آہستگی سے پکارو
اور اس کے سامنے آہستہ اور خاموشی سے دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
ادْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ اِنَّ رَّبَّكُمْ لَوُجُوْذٌ شَدِيْدٌ
گر گڑ گڑا کر پکارو۔

البتہ اونچی آواز سے دعا کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن بلند آواز اس جگہ پر ہوگی جہاں
کسی کو تکلیف نہ پہنچتی ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ آواز بلند کرنے سے اگر کسی
کی نماز میں خلل واقع ہوا ہو یا تلاوت متاثر ہوتی ہو تو پھر بلند آواز سے دعا کرنا بھی
مکروہ ہے۔ لہذا آہستہ آواز سے پکارنا ہی بہتر ہے اگرچہ با آواز بلند بھی روا ہے
حضرت ذر کر یا علیہ السلام کے بیان میں خود قرآن پاک کا ارشاد ہے اِذْ سَآذٰی
رَبُّہٗ سَدًا خَفِيًّا ۚ تَبَّ كَدُوْہٖ ۙ سَجَّۢہٗۤ اُخْفٰی ۙ اِنَّ رَّبَّہٗۤ اَكْبَرُ ۙ سَمِعَ دُعَاۤہٗ
کر رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد بھی ہے۔ خَفِيَ لَدِكُمْ مَا عَنَّا
بہتر ذکر وہ ہے جو مخفی ہو دوسری جگہ فرمایا خَفِيَ لَدِكُمُ الْخَفِيُّ وَخَفِيَ لَدِكُمُ
مَا يَكْفِيٰ ۙ بہترین ذکر وہ ہے جو پوشیدہ ہو اور بہترین روزی وہ ہے
جو کفایت کر جائے۔

غرضیکہ مخفی ذکر میں ایک تو دوسرے کی ایذا رسانی نہیں ہوتی اور دوسرے

ریا کاری سے بچ جاتا ہے۔ لوگ بندہ آواز سے ذکر واذکار کرتے ہیں اور درد و شریف پڑھتے ہیں۔ لاد و پیکر کھول کر اہل محلہ بیاروں اور دیگر عبادت گزروں کے لیے ایذا رسانی کا باعث بنتے ہیں۔ دوسروں کی عبادت میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ اچھی علامت نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی عبادت اللہ کی بارگاہ میں باعث گناہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال ماہ رمضان سے متعلق دو آیات کے درمیان دعا کا ذکر اس لیے ہوا کہ اس ماہ مبارک میں دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ میسر بندے جب بھی مجھے پکاریں، میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دعا سُننا ہوں اور اُسے مقبول کرنا ہوں مگر دو شرائط کے ساتھ۔ ایک یہ کہ دعا کرنے والا میرے حکم کو مانے اور دوسری یہ کہ وہ ایمان رکھتا ہو۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا خاندان برصغیر پاک و ہند کا مشہور خاندان ہے۔ اس خاندان کے علمی کارنامے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا شاہ عبدالرحیم بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ آپ ان پانچ سو علماء کی مجلس کے رکن تھے جنہیں اورنگ زیب عالمگیر نے خادمی عالمگیری مرتب کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ سارے علماء بادشاہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ مگر شاہ عبدالرحیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی۔ ان کا ضمیر تنخواہ لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب عالمگیر نے آپ کا نام اس مجلس سے خارج کر دیا۔ تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ کہ اُس نے انہیں اُس معاملے سے بچالیا جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے اس کے بعد آپ نے مدرسہ قائم کر کے درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ آپ امجد الف ثانی کے مریدوں کے مرید تھے۔

خاندان
شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ بارہوی محدثی مجدد تھے۔ آپ نے دین اور علم کی تجدید کی آپ نے سب سے پہلے فارسی زبان میں فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن کے نام سے

سے قرآن پاک کا ترجمہ لکھا۔ اُس وقت فارسی ہی دفتری زبان تھی۔ لہذا اس زبان میں استفادہ کا زیادہ امکان تھا۔ اُس وقت اردو زبان ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ تاہم آپ کے فرزند ارجمند شاہ رفیع الدین نے اردو زبان میں قرآن پاک کا سب سے پہلا ترجمہ کیا۔ اگرچہ آج وہ زبان پُرانی ہو چکی ہے۔ تاہم یہ لفظی ترجمہ کمال درجے کا ہے آپ نے قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اور آپ کے ایک شاگرد نے آپ کے ارشادات نوٹ کر کے سورۃ بقرہ کا حصہ شائع بھی کیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر عزیزی بھی اپنی نوعیت کی بہترین تفسیر میں سے ہے یہ تفسیر صاحب نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی، آپ تو نابینا ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ خدمت آپ کے شاگردوں نے انجام دی۔ آپ تو زبانی تفسیر بیان کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دن وعظ بھی کرتے تھے۔ جس میں ہزاروں لوگ شریک ہو کر فیضیاب ہوتے تھے۔ بعض اوقات غیر مسلم بھی اس پاکیزہ مجلس میں شریک ہوتے اور ایمان کی دولت سے لالا مال ہو کر جاتے، وعظ اتنا مؤثر ہوتا تھا کہ اپنا محاورہ درست کر لے کے لیے شاعر لوگ بھی مجلس وعظ میں بیٹھ جاتے۔ اُس زمانے میں مومن خان مومن بڑا مشہور شاعر ہوا ہے۔ صحیح العقیدہ آدمی تھا۔ شاہ صاحب کی محفل میں شریک تھا، کسی نے پوچھا آپ تو وعظ وغیرہ کے شائق نہیں ہیں، آپ کیسے تشریف لائے۔ تو دیکھنے لگا، کہ شاہ صاحب کی زبان کی کشمچی حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہم لوگ محاورہ میں استعمال کر کے اپنی شاعری کو چمکاتے ہیں۔

مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو کما جا سکتا تھا۔ کہ امت نے قرآن پاک کا سچی ادا کر دیا ہے۔ غرضیکہ یہ تفسیر پُر مغز، با محاورہ اور حکمت آمیز تفسیر ہے۔ یہ تفسیر قرآن پاک کے آخری دو پاروں اور دو سکر پاویں کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصَّیَامُ تک ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب وفات پا گئے اور یہ سلسلہ یہیں رُک گیا۔ بہر حال جتنا حصہ بھی میسر ہے، جیگانہ تفسیر کے لحاظ سے بہترین تفسیر ہے۔

شاہ عبدالقادر نے بھی قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا۔ جسے حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے مزید سلیس کیا ہے۔ مولانا شیخ الحداد کا ترجمہ جو میرے سامنے ہے، وہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کی آسان صورت ہے۔ آپ نے ایڈورڈ روڈ دہلی کی اکبری مسجد میں بارہ سال تک احتکاف کیا اور یہ ترجمہ لکھا۔ جو کہ بالکل بامحاورہ اور سلیس ترین ہے۔ تاج کمپنی اور دیگر اداروں نے اس کے میٹھا ریڈیشن شائع کیے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نے بھی آج سے اسی برس قبل قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ آپ نے ترجمہ قرآن کو اور زیادہ آسان کرنے کی کوشش کی۔ اپنی نوعیت کی یہ بھی کمال درجے کی کاوش ہے۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے حضرات نے قرآن پاک کے تراجم لکھے ہیں۔

الغرض! شاہ رفیع الدینؒ تفسیر رفیعی میں فَانِّ قَرِيبٌ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قَرِيبٌ خداوندی کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ باعتبار ذات قریب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں جس کا قیام اور بقا خدا تعالیٰ کے وجود کے بغیر حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ کی صفت قیومیت کی وجہ سے ہر چیز کو وجود حاصل ہوتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ وجود اور ذات کے اعتبار سے قریب ہے۔

قریب خداوندی

علم اور قدرت کے لحاظ سے بھی خدا تعالیٰ قریب ہے۔ کیونکہ اُس کے علم، ارادے اور تاثیر کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ محبت اور حمد کے اعتبار سے بھی قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ تجلی کے اعتبار سے بھی قریب ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے، تو اُدھر سے تجلی پڑتی ہے اسی طرح عبادت کے رابطہ کے اعتبار سے بھی خداوند تعالیٰ قریب ہے انبیاء علیہ السلام کو بارگاہِ خداوندی کے ساتھ براہِ راست رابطہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ رابطہ وحی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کو انبیاء کے کرام کے بتلانے سے قریب خداوندی حاصل ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کو رابطہ بندگی کے ذریعہ اللہ کا قریب حاصل ہوتا ہے

یہ تو یہودی اور عیسائی سب تسلیم کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر ماں باپ کے مٹی سے پیدا کیا۔ بائبل اور قرآن دونوں کتابوں میں یہ آیات موجود ہیں۔ لہذا اگر تم آدم علیہ السلام کو ماں باپ کے وسیلہ کے بغیر مانتے ہو تو تو عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ گویا اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب و غریب چیز پر قیاس کر کے مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا مسئلہ سمجھا لیا ہے۔ تو فرمایا بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی مثال خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ اے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِ اس میں جان ڈالی۔ قرآن پاک میں خشک مٹی اور گارے کا ذکر بھی آتا ہے گارے میں جب خمیر پیدا ہوتا ہے تو وہ گل ٹھرتا ہے۔ یہ وہ عنصر (ELEMENT) ہے جس سے آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ اے قرآن پاک میں صَلَٰوٰتِ اور حَمْدِ مَسْنُوْنِ بھی کہا گیا ہے۔ اور پھر یہ بھی ذکر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما کر اپنے دست قدرت سے اس میں روح ڈالی۔ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ پھر اُسے کہا ہو جاؤ، تو وہ کامل انسان ہو گیا۔ آدم علیہ السلام کامل انسان تھے۔ عقلمند ایسے کہ نبی سے زیادہ کوئی شخص عقلمند، ذہین اور دانا نہیں ہو سکتا۔ ڈارون کا نظریہ بالکل باطل ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ اولین انسان کی تخلیق بطور بندر ہوئی، پھر آہستہ آہستہ ترقی کر کے انسان بن گیا۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ حضور نے فرمایا نَبِيًّا مُّكَلَّمًا آدم علیہ السلام نبی مکلم تھے۔ نبی ہمیشہ کامل انسان ہوتا ہے۔ آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان اور نبی تھے۔ اور بالکل مکمل انسان تھے۔ سمجھنا یہ مطلوب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بغیر ماں باپ کے مٹی سے انسان کی تخلیق کر لیا ہے۔ تو عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا فرما دینا کون سی شکل بات ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ لہذا عیسیٰ علیہ السلام عبد اللہ یعنی اللہ کے بندے ہیں، وہ خود اللہ نہیں ہیں۔ فرمایا الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ سَٰحِقُ وہ ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے

تِلْكَ الْقُرْآنُ ۲

اَلْاَمَلْنَ ۳

درس بستم ۲

آیت ۶۱ تا ۶۳

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ
 الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَ
 نِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ
 نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلُ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾
 إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ
 وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا
 فَإِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِم بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

۱۰۰

ترجمہ: پس جو شخص اس بات سے میں آپ سے جھگڑا کرے بعد اس کے کہ آپ
 کے پاس علم آچکا ہے۔ پس کہ دیجئے، آؤ، بلائیں ہم اپنی اولادوں کو، تم اپنی اولادوں
 کو، ہم اپنی عورتوں کو، تم اپنی عورتوں کو۔ ہم اپنی جانوں کو، تم اپنی جانوں کو۔ پھر ہم
 التجا کریں اور گڑگڑائیں۔ پھر ہم سب اللہ کی لعنت کریں اُن لوگوں پر جو جھگڑیں ﴿٦١﴾
 بیشک یہی بات صحیح اور سچا بیان ہے۔ اور نہیں ہے کوئی عبادت کے لائق سوائے
 اللہ کے۔ اور بیشک البتہ اللہ زبردست اور حکمت والا ہے ﴿٦٢﴾ پس اگر یہ
 لوگ قبول نہ کریں، تو بیشک اللہ خوب جانتا ہے مفسدوں کو ﴿٦٣﴾

گزشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندہ
 اور رسول ہیں۔ وہ نہ تو خدا کے بیٹے ہیں اور نہ خود خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو
 فضیلت عطا فرمائی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات ایک واضح مثال کے
 ذریعے سمجھائی۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ناممکنات میں سے
 نہیں ہے۔ آپ کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی مثال جیسی ہے۔ جسے

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و پنج (۷۵)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۸۷

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ ثُمَّ أَتِمُوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَجِدِ ۚ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ :- حلال قرار دیا گیا ہے تمہارے لیے روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ بے پردہ ہونا۔ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اپنی جائزوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے پس اللہ نے تمہارے اوپر رجوع فرمایا ہے مہربانی کے ساتھ، اور تم کو معاف کر دیا ہے۔ پس اب بطور عورتوں سے اور تلاش کرو وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے تمہارے لیے سفید دھاگہ یا سیاہ دھاگے سے فجر ہے۔ پھر پورا کرو روزہ کو رات تک۔ اور نہ طوعورتوں سے اس حال میں کہ تم مسجدوں میں استسکات بیٹھنے والے ہو۔ یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں پس ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ متقی بن جائیں۔ (۱۸۷)

زیادہ سمجھدار اور صاحبِ رائے تھا وہ کہنے لگا وَاللّٰهِ لَقَدْ عَرَفْتُمْ بَيِّنَاتَهُ
 خُدا کی قسم تم اس شخص کی نبوت کو پہچان چکے ہو۔ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْفَصْلِ
 فِيْ اَمْرِكُمْ صَاحِبُكُمْ اور تمہارے صاحب یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے
 متعلق اس نے فیصلہ کن بات کی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے
 اور اس کے رسول ہیں۔ وہ الذہر گز نہیں ہیں۔ اور میں کہتا ہوں وَاللّٰهِ مَا بَآهَلَ
 قَوْمٌ نَّبِيًّا اِلَّا هَلَكَوْا خُدا کی قسم جس قوم نے بھی کسی نبی سے مباہلہ کیا، وہ قوم
 ہلاک ہو گئی۔ فَاِنْ اَبَيْتُمْ اِلَّا اَلْفَ دِيْنِيْكُمْ اور اگر تم اس رسول
 برحق کا انکار کرتے ہو۔ اور اپنے ہی دین پر قائم رہنا چاہتے ہو۔ فَوَالْحَاجِّ لِلْجَلِّ
 تو اس شخص کے ساتھ مزاحمت کر لو، مصاحبت کر لو۔ اور یہاں سے واپس چلے جاؤ
 چنانچہ وہ لوگ مشورہ کے لیے باہر چلے گئے۔ حضور علیہ السلام خود بھی گھر
 تشریف لے گئے۔ اور پھر اس حالت میں باہر آئے کہ حضرت حسینؑ آپ کی
 گردن میں تھے۔ وَلَخَذَ بِيَدِ الْحَمَنِ اور آپ نے حضرت حسنؑ کا ہاتھ پکڑا
 ہوا تھا۔ حضرت فاطمہؑ آپ کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ اور حضرت علیؑ
 اُن کے پیچھے تھے۔ آپ اُن سے فرما رہے تھے اِذَا اَنَا دَعَوْتُ فَاَمِنُوْا
 جب میں مباہلے کے لیے دُعا کروں، تو تم آمین کہنا۔ گویا آپ مباہلہ کے لیے
 بائبل تیار ہو کر تشریف لے آئے۔ جب عیسائیوں نے آپ کو اس حالت میں
 دیکھا تو ان کا لاٹ پادری اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا لِيَمْعَشُوا النَّصَارَى
 اے نصاریٰ کے گروہ! اِنِّيْ لَا رَآى وُجُوْهًا مِثْلَ اَبِيْ جَرَّجٍ دیکھ رہا ہوں
 لَوْ مَسَّآلُوا اللّٰهَ اَنْ تُبَيِّنَ لَنَا جَبَلًا مِنْ هٰذَا كَانِهِ لَا ذَالْ اِغْر
 یہ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ یہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے، تو وہ ضرور ہٹا
 دے گا۔ لہذا تمہاری خیریت اسی بات میں ہے فَلَا تَبْأَهُلُوْا
 کہ تم مباہلہ نہ کرو، ورنہ تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔
 چنانچہ عیسائیوں کے وفد نے مباہلے کا چیلنج قبول نہ کیا۔ اور ان شرطان پر

باب
فرار

کہ جنت صرف انہی کے لیے ہے، کوئی دوسرا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا تو پھر یہ لوگ موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے، حضور نے فرمایا: اگر یہ موت کی تمنا کرتے تو فوراً مر جاتے۔ اور اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھ لینے۔ قرآن پاک کا دعویٰ اس قدر سچا ہے۔ کہ یہودیوں نے کبھی موت کی تمنا نہیں کی۔ نیز فرمایا کہ اگر تجھ کو ان کے عیسائی مبالغہ پر آمادہ ہو جاتے، تو جب واپس لوٹتے نہ ان کا مال باقی رہتا نہ اہل۔ ہر چیز فنا ہو جاتی۔ ایک دوسری روایت میں جسے امام بیضاوی نے نقل کیا ہے۔ یہ الفاظ آتے ہیں۔ لَعَبَسُوا قِصْدَةً وَخَنَّا نَوَيْسَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنْ كُنْ يَكْسِیْ سَخِرَ كَرَّكَ بِنْدَرٍ اَوْ سَوْرًا یَا اللّٰهُ تَعَالٰی وَاَدْرٰی نَجْرَانٍ اَوْ اَكْبَرًا اَوْ سَارٰی وَاَدْرٰی اَكْبَرًا سَخِرَ كَرَّكَ اَمْحَطَیْ، پوری وادی میں پرندوں اور درختوں تک کوئی چیز باقی نہ رہتی، بغیر مبالغہ کے لوٹ جانے سے وہ لوگ اس وبال سے بچ گئے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ مبالغہ کے لیے حضور علیہ السلام اپنے اہل خانہ میں سے بیٹے فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ اور علیؓ کو لے کر نکلیے۔ شیعہ حضرات اس ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے اہل بیت ہی افراد ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی اہل بیت میں شامل نہیں ہے۔ حالانکہ اہل بیت میں اندراج مطہرات بھی شامل ہیں۔ مگر سب کو اس موقع پر لانا ضروری نہیں تھا۔ یہ تو دُعَا کا مقام تھا، آپ چند افراد کو لے کر فوراً نکل آئے۔ تاہم مذکورہ روایت میں واقعہ کی پوری تفصیل موجود نہیں ہے۔

ابن عساکر بہت بڑے مؤرخ گزشتے ہیں جنہوں نے بڑی مستند تاریخ لکھی ہے۔ وہ امام جعفر صادقؑ سے اور وہ اپنے والد امام محمد باقرؑ سے روایت بیان کرتے ہیں۔ کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبالغہ کے لیے تشریف لائے تو ان کے ساتھ حضرات ابو جحیم صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی المرتضیٰؓ اور ان سب کی اولاد بھی تھی۔ یہ روایت امام جلال الدین سیوطیؒ نے درمنثور میں اسی طرح بیان کی ہے۔ اور یہی روایت تفسیر روح المعانی میں بھی موجود

منقطع ہوتی ہے۔ کیونکہ متعہ کے ذریعہ پیدا ہونے والی اولاد مرد کی اولاد ہی تصور نہیں ہوتی نہ اس سے نسب ثابت ہوتا ہے۔ اور نہ مولود کو وراثت میں حصہ ملتا ہے۔ لہذا یہ غلط کام ہے نہ صرف انسانی حقوق تلف ہوتے ہیں بلکہ یہ تو انسانیت کی توہین ہے لہذا نکاح کا مقصد نسل انسانی کی بقا ہونا چاہیے

مکمل ۲۷۰

فَرَأَى ذَکُلًا وَاشْرَبُوا رَاتٍ کُوکْھَا دُہِو اُسکی اجازت ہے۔ اب کوئی پابندی باقی نہیں رہی سوائے اس کے کہ حَتَّى یَتَّبِعَنَّ لَکُمُ الْخِطَّ الْأَبِیضُ وَ مِنْ الْخِطِّ الْأَسْوَدِ یہاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس معاملہ میں غلطی لگی اور انہوں نے دھاگے سے عام قسم کی ڈوری مراد لیا۔ عدی بن حاتمؓ کا ذکر اس ضمن میں خاص طور پر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے پاس سفید و سیاہ رنگ کی دو دریاں رکھ لیں تاکہ اُن کی شناخت تک کھاپی سکیں۔ جب اس بات کا ذکر حضور علیہ السلام سے کیا، تو آپؐ مکرانے۔ اور فرمایا اِذَا وَسَّادَتْکَ عَرِیضٌ تَبَاهُ اُحْکِیْہُ تو بہت لمبا چوڑا ہے کہ اس میں رات اور دن کو لپیٹ رکھا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب اس قسم کی غلط فہمی پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اگلے الفاظ مِنْ الْخِطِّ الْأَسْوَدِ اُنار کہ معاملہ کو بالکل واضح کر دیا کہ دھاگے سے مراد عام ڈوری نہیں بلکہ اس سے مراد صبح کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے۔ جب رات کی سیاہی ختم ہو کر صبح کی سفیدی ظاہر ہو جائے، اس وقت تک تم کھاپی سکتے ہو اور اپنی بیویوں سے مباشرت بھی کر سکتے ہو۔ گویا روزے کی ابتدا صبح صادق سے ہوگی۔

ثُمَّ اَتَتْهُمُ الصَّیَامُ اِلَى اللَّیْلِ پھر رات تک روزے کے پورا کر دینے کا طلوع فجر سے لے کر رات کی آمد تک روزہ رکھو۔ رات سے مراد مطلق غروب آفتاب ہے نہ کہ سرخی یا سفیدی کا زائل ہونا جو منی سورج ڈوب گیا، رات ہو گئی۔ روزہ افطار کر لینا چاہیے۔ مزید کسی چیز کا انتظار نہیں کرنا چاہیے

اس سے یہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ عام لوگ صوم وصال نہ کریں یعنی منزاتہ کر لیں

سبحی کی بات

بعض فرماتے ہیں کہ مباہلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ مخصوص تھا۔ اگر آپ کے بعد کوئی دوسرا شخص مباہلہ کرے گا، تو اس کے وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے جو حضور علیہ السلام کے اپنے زمانے میں ہوتے، تاہم اس کے جواز کی گنجائش موجود ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ جب نصاریٰ حضور علیہ السلام کے مقابلہ پر آئے تو ان کے سمجھاروں نے کہا، اے گروہ نصاریٰ! تم خوب سمجھ چکے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں اور انہوں نے مسیح علیہ السلام کے متعلق بڑی واضح اور فیصلہ کن بات کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسماعیل میں آخری نبی بھیجے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ لہذا کچھ بعید نہیں کہ یہ وہی نبی ہوں جن کی بشارت ہم سنتے چلے آئے ہیں۔ یاد رکھو! نبی کے ساتھ مباہلہ کسی قوم کے حق میں اس کے سوا کیا نکل سکتا ہے کہ ایسی قوم کا کوئی چھوٹا بڑا غائب الہی سے نہ سچ سکے۔ اور پھر پیغمبر کی نعمت کا اثر نسلوں تک پہنچے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بقول کو روٹ جائیں۔ ہم سائے عرب سے لڑائی مول نہیں لے سکتے آخر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ حسن، حسین، فاطمہؑ اور علیؑ کو ساتھ لے کر باہر تشریف لائے تھے۔ یہ نورانی صورتیں دیکھ کر عیسائیوں کے لاٹ پادری نے کہا، میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دُعا ہاڑوں کو بھی اُن کی جگہ سے سرکا سکی ہے۔ تم ان سے مباہلہ کر کے اپنی ہلاکت کو دعوت نہ دو۔ ورنہ زمین پر ایک بھی نصرانی باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ نجرانیوں نے مقابلہ ترک کر دیا۔ جزیرہ دین قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔

مولانا عثمانی دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک نے یہ نہیں بتایا کہ مباہلہ حضور علیہ السلام کے بعد بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ مباہلے کا اثر آپ کے بعد بھی وہی ہونا چاہیے جو آپ کی موجودگی میں ہونے والا تھا۔ البتہ بعض سلف اور بعض فہمے خفہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلے کی مشروعیت اب بھی باقی ہے۔

سے نہیں مل سکتے۔ اگر عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانے سے بھی مادہ خارج ہو گیا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ یہاں پر مسجد کے ذکر سے یہ مراد نہیں کہ گھروں میں اعتکاف کی حالت میں ایسا کر سکتے ہو۔ بلکہ لَا اِعْتِكَافَ اِلَّا فِي الْمَسْجِدِ مسجد کے بغیر تو مرد کا اعتکاف ہوتا ہی نہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مسجد بھی ایسی ہونی چاہیے جہاں پنجگانہ نماز باجماعت کا انتظام ہو۔ تاکہ نماز کے لیے کئی دوسری جگہ نہ ملنا پڑے۔ البتہ اعتکاف کے لیے جامع مسجد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ معتکف کو نماز جمعہ کے لیے دوسری مسجد میں جانے کی اجازت ہے۔ ایسی صورت میں نماز جمعہ کے بعد اُسے فوراً واپس اپنی اعتکاف والی جگہ میں آ جانا چاہیے۔

عورتوں کا
اعتکاف

عورتوں کے اعتکاف کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہم مالک کا مسلک یہ ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی مسجد میں اعتکاف کریں مگر اہم شافعی فرماتے ہیں۔ چونکہ عورت اور غلام پر نماز باجماعت اور جمعہ فرض نہیں ہے۔ اس لیے وہ جہاں بھی اعتکاف بیٹھنا چاہیں ایسا کر سکتی ہیں۔ ان کے لیے اپنے گھر میں اعتکاف بیٹھنا بھی روا ہے۔ اہم ابوحنیفہ اور اُن کے شاگردان اہم ابو یوسف اور اہم محمد اور اہم زفر فرماتے ہیں کہ عورت کو اپنے گھر میں ایسی جگہ اعتکاف بیٹھنا چاہیے جو اُس نے نماز کے لیے منتخب کر رکھی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے لَا تَجْمَعُوا اَمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ کی بیویوں کو مسجدوں میں جانے سے مست روکو وَبُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لِّهِنَّ مَغَارِئُ کے گھرانے کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔ عورت کی گھر میں نماز مسجد کی نسبت زیادہ فضیلت رکھتی ہے لہذا عورت کو اعتکاف بھی گھر میں ہی بیٹھنا چاہیے۔ ہاں اگر مسجد پر امن ہو اور وہاں عورتوں کے اعتکاف بیٹھنے کا عقول انتظام ہو، تو مسجد میں اعتکاف بیٹھ سکتی ہے حضور علیہ السلام کی ازواج مطہرات مسجد میں اعتکاف کیا کرتی تھیں۔

یہ مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ بَيْنَ الشَّرْكِ اَتَمَّ كُودِهِ حدیں ہیں۔ فَتَلَا تَقَرُّ بَوَّهَا پس ان کے قریب مت جاؤ، یعنی حدوں

حفاظت بر
حدود شرعیہ

ہے۔ سب اُسی کے محتاج ہیں۔ آگے سورۃ مائدہ اور بعض دوسری صورتوں میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفصیل سے موجود ہے کہ وہ خود بھی محتاج ہیں۔ فرمایا **وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ**۔ بیشک خدا تعالیٰ ہی غالب اور کمال قوت رکھنے والا حکیم ہے۔ وہ اپنی حکمت سے چاہے کسی کو بغیر باپ کے یا مال اور باپ دونوں کے بغیر پیدا فرمائے۔ وہ کمال حکمت کا مالک ہے۔

فرمایا **فَنَآئِذَا نَقَّصْنَا لَكَ أَهْلَكَ** اگر یہ لوگ اعراض کریں۔ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی خدا کی وحدانیت کو تسلیم نہ کریں۔ اور اسی طرح عباد کرتے رہیں، تو آپ فرما دیجئے **فَنَآئِذَا نَقَّصْنَا لَكَ أَهْلَكَ** بالْمُفْسِدِينَ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ اور زمین میں سب بڑا فساد شرک ہے۔ کیونکہ امن کا قیام ایمان، توحید، اطاعت اور نیکی سے ہی ممکن ہے۔ کفر، شرک اور برائیوں سے بلامنی، فساد، بدبختی، فتنہ پستی اور طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا خوب اچھی طرح سمجھ لو، کہ فساد ہی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ فساد کی خاطر کفر و شرک کا ارتکاب کرنے والے اُس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ضرور سزا دے گا۔

البقرة ۲

آیت ۱۸۸

سیقول ۲

درس مفکر و شش (۶۶)

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى
الْحُكَّامِ لِيَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ
تَعْلَمُونَ ۝۱۸۸

ترجمہ: نہ اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال اپنے درمیان باطل اور ناحق کے ساتھ اور
نہ پہنچاؤ مالوں کو حاکموں تک تاکہ تم لوگوں کے مالوں سے ایک حصہ گناہ کے
ساتھ کھاؤ۔ اور تم جانتے ہو ۱۸۸

اس سے پہلے اعتکاف کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ اعتکاف کی حالت
میں عورتوں سے مفارقت جائز نہیں۔ حدود الشہ کی حفاظت کا مسئلہ بھی بیان ہوا۔
تاکہ انسان کے اندر تقویٰ کی روح پیدا ہو جائے۔ روزہ کی مدت کا تذکرہ بھی آگیا کہ
روزہ طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک کے لیے ہے۔ رات کو کھانے
پینے اور عورتوں سے بٹھنے کی اجازت دے دی۔ الغرض اس پورے دکر میں
روزہ ہی کا بیان ہے۔ جس میں صدقہ فطر، نذر دل قرآن، دعا، سحری کھانے اور
اعتکاف کے مسائل شامل ہیں۔

گزشتہ پیر

اس رکوع کے بعد اگلے رکوع میں حج کا ذکر ہے۔ یَسْتَلُوْا نَدْوً عَنِ
الْاَهْلِیَّةِ سے شروع کر کے مناسک حج کی ترتیب بیان کی گئی ہے۔ اس
کے بعد جہاد کا مسئلہ ہے۔ مفسرین کرام کے لیے اشکال پیدا ہو سکتے ہیں کہ درمیان
میں مال کا تذکرہ کیونکر آگیا ہے۔ جب کہ ایک طرف روزے کا بیان ہے اور
دوسری طرف جہاد کا مسئلہ ہے۔ بظاہر یہ مضامین آپس میں غیر مربوط معلوم ہوتے
ہیں مگر حقیقت میں سابقہ مضمون کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہے۔

ربط آیات

حضرت مولانا شیخ الحدیث نے اس کی تشریح یوں بیان کی ہے کہ روزہ

کی نواسی آپ کے نکاح میں تھی۔ اُس کے علاوہ سندھ کے انگریز مقرر کی بیٹی مسلمان ہو کر آپ کے نکاح میں آئی اور تیس سال کی رفاقت کے بعد فوت ہوئی۔ مولانا عزیز گل ایک تاریخی انسان ہیں۔ سخاکوٹ ایجنسی میں اُن کی اپنی زمین ہے، وہیں آپ کی رہائش ہے۔ کافی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ماہم اپنے زمانے میں بڑے بہادر اور دلیر آدمی تھے۔ مولانا شیخ الحدیث کے ساتھیوں میں مولانا سید حسین احمد مدنی کے بھتیجے مولانا وحید احمد مدنی بھی تھے۔ آپ کے ایک شاگرد مولانا حکیم سید نصرت حسین صاحب بھی آپ کے ساتھ مالٹا میں قید رہے۔ اور وہیں فوت ہوئے۔ انگریزوں نے اُن کے ساتھ بڑے ظلم کیے۔ اُن کی وفات کے بعد مولانا شیخ الحدیث نے بڑی کوشش کی کہ حکیم صاحب کو دفن کرنے سے پہلے سنوں طریقے سے غسل دیا جاسکے۔ مگر انگریزوں نے اسی اجازت نہ دی اور کہا کہ اُن کی طرف سے دیا گیا غسل کافی ہے۔ بہر حال آپ نے تیمم کرا کے جنازہ پڑھا، اور ان کو دفن کیا۔

مولانا قید

حضرت شیخ الحدیث انگریز کے سخت مخالف تھے۔ اگر کوئی انگریز کے متعلق مسئلہ دریافت کرتا، تو فرماتے ابھی کسی اور عالم سے پوچھ لو، شاید میں باغیہ نہ کر جاؤں کیونکہ مجھے انگریزوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ خوب سمجھتے تھے کہ انگریز نے اسلام کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ ترکوں کی سلطنت کو انگریز نے ہی درہم برہم کیا۔ مولویوں کی قلم اور زبان سے ترکوں کی خلافت پر کفر کا فتویٰ لگوا دیا۔ اور انہیں بدنام کیا۔

انگریز کی چال بازی

شخصی طور پر انگریز بڑی با اخلاق قوم ہے۔ آپ اُن سے تجارت کریں، کوئی اور لین دین کا معاملہ ہو، بڑے اچھے طریقے سے پیش آئیں گے، اسی لیے انگریز بڑا چال باز ہے۔ گزشتہ زمانے میں تجربہ کار لوگوں میں یہ محاورہ مستعمل تھا۔ کہ اگر جرم ختم ہو جائے، تو دنیا سے مشیز ختم ہو جائے۔ کیونکہ جرمنی لوگ مشینی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بڑی مشینری ایجاد کی ہے۔ حتیٰ کہ سلائی مشین بھی انہی کی ایجاد ہے۔ تو یہ محاورہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر دنیا سے انگریز قوم ختم ہو جائے تو چال بازی ختم

میتے ہیں مسلمانوں میں اولیاء پرستی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ شہد پرستی اور پیر پرستی مسلمانوں میں عام پائی جاتی ہے۔ ان کی ایسی تعظیم کرتے ہیں جیسی خدا کی کرنی چاہیے۔ اُن کی بات کو خدا اور رسول کی بات سے متحد سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے سجدے کرتے ہیں۔ اور ان کا قہرب حاصل کرنے کے لیے نذر دنیا ز مینے ہیں۔

قبر پرستی کی بیماری یہود و نصاریٰ میں بھی اور اب مسلمانوں میں بھی عام ہے۔ حکومت خود اس معاملے میں پیش پیش ہے۔ چاروں چڑھائی جاری ہیں۔ قبروں کی بے جا تعظیم ہو رہی ہے۔ یہ سب، شرکیہ رسوم اور اسراف ہے بھائی! قبروں پر جا کر وہ کام کرو، جو شریعت سے ثابت ہے اور جس کا حکم دیگیا ہے۔ وہاں جا کر فاتحہ پڑھو، اور فوت شدگان کے لیے دعا کرو۔ جنور علیہ السلام نے خود اپنے متعلق فرمایا اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ اِلٰهِي اللّٰہ! میری قبر کو صغیر یا ثبوت نہ بنا کہ لوگ اس کی پوجا کرنے لگیں۔ اس زانیہ قبر پرستی کی بہت سی صورتیں رائج ہیں۔ یہ عکس کیا ہے۔ شرک و بدعت کے ارتکاب کا ایک طریقہ ہے۔ قبر کو پختہ بنانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے جنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَجْصَصُوا قُبُورَ بَنِي إِسْرَءِیْلَ وَلَا تَنْكُحُوْهُنَّ وَلَا تَعْبُدُوْهُنَّ۔ اللہ کے بندو! یہ ایڑٹ، مسالہ کسی غریب کو دے دو، اُس کے سر چھپانے کے لیے جھونپڑی بن جائے اور تمہیں لڑا ب بھی حاصل ہو۔ کسی محتاج کی دعائیں لو، قبروں پر چراغاں کرنے، بلب لگانے اور پنکھے نصب کرنے سے کیا حاصل۔ یہ تو صریحاً قبر پرستی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بہت بڑے ولی اللہ ہوئے ہیں۔ آپ کا لقب سلطان الہند ہے۔ تقریباً نوے لاکھ انسانوں کو آپ کی وساطت سے ایمان کی دولت نصیب ہوئی، اسی طرح سید خواجہ علی ہجویریؒ اپنے پیر و مرشد حضرت نکی کے حکم سے لاہور تشریف لائے اور تبلیغ کا کام کیا۔ جب آپ کو لاہور آنے

ہیں، جو ایک آدمی کا کام معلوم نہیں ہوتا۔

بہر حال شیخ سعدی کی قید و بند سے واضح ہو لے کہ ساتویں صدی ہجری میں بھی انگریز مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں مگر وہ بام عروج پر تھے۔ فرانس اور برطانیہ تو اس وقت بالکل غیر متقدم تھے انہیں ترکہ بڑے پٹنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ پشت پر چمڑا باندھتے تھے۔ انگریز اس وقت بالکل پسماندہ تھا۔ انہیں مسلمانوں کی درجہ ترقی نصیب ہوئی۔ اندلس میں بھی مسلمانوں کا طوطی بولتا تھا۔ انگریز تو چودھویں صدی میں جا کر متقدم ہوئے ہیں انہوں نے سائنس میں ترقی کی اور پھر انہیں غلبہ حاصل ہوا۔

ترک سلطنت

اس زمانے میں مسلمانوں کی ترک سلطنت کو بڑا عروج حاصل تھا ترکوں نے چار سو سال تک عیسائی سلطنتوں کے ساتھ ٹکرائی۔ انگریز، جرمن، فرانسیسی، روسی سب اسلام کے ازلی دشمن تھے۔ ترکوں نے ہر ایک کے ساتھ خوب مور کے سر یکے بڑے بباد لوگ تھے۔ حنفی مسلک کے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ علم کی طرف سے زیادہ تر تشنہ ہی ہے۔ مگر اسلام کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ ہاہم کمال انا ترک جس کا آج کل ٹٹے منایا جا رہا ہے۔ اس کے اسلام کو نقصان بھی پہنچا رہا ہے۔ اس نے مخالفت کو ختم کر دیا جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنا۔ مگر اس نے ترکی کو بڑی طاقتوں سے الگ کر کے اسے سازشوں سے بچالیا۔ اس نے عربی زبان کو ملک سے بالکل نکال باہر کیا حتیٰ کہ عربی اذان بھی بند کر دادی۔ اس نے غلطیاں بھی بہت کی ہیں مگر ترکی حکومت کا زوال عربوں کی درجہ آہیہ غدارانہ کھلے۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر ان کے آلہ کار بن گئے۔ اردن کے موجودہ فرمانروا کا دادا شریف حین سید یمن کے باوجود انگریزوں کا پھٹو تھا، اس نے ترکوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ انگریز نے ان کو وفاداری کی بنیاد پر چھوٹی چھوٹی ریاستیں دے دیں۔ ایک کو عراق میں جگہ دے دی۔ ایک کو اردن میں اور ایک کو اردوہ کو فلسطین میں بٹھا دیا پھر اس نے شاہ سعود کے ساتھ ساز باز کی۔ اس کی پوزیشن بددوں والی تھی، یہ مستقل مزاج

نہ عظیم کل، نہ مشکل کشا اور حاجت روا۔ کسی کو پیر دستگیر اور غوث اعظم بھی تسلیم نہ کریں یہ سب شرکیہ باتیں ہیں۔ صرف خدا تعالیٰ کے لیے لائق ہیں۔ مافوق الاسباب طہیثی اور مشکل کشائی صرف خدا کی ذات ہی کہہ سکتی ہے۔ جگہ جگہ یا علی اور یا غوث لکھا ہوا ہے یہ سب شرک کی نشانیاں اور غلط عقیدے کا اظہار ہے۔ پیروں کے سامنے رکوع اور سجدہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ قبیل پر بھی سجدے ہوتے ہیں۔ یہ تو انجیل نے بھی منع کیا ہے۔ وہاں یہ آیت موجود ہے۔ خداوند کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کرو مگر عیسائی اس کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ یا اللہ مانتے ہیں۔ مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

آگے فرمایا وَلَا تَجْعَلْ بَعْضُنَا رُبًّا لِّبَعْضٍ اَنْ يَّبَابُ مَنْ دُونِ اللّٰهِ مُمْهِمٌ س سے بعض بعض کو اللہ کے سوا رب نہ بنالیں۔ کسی کو رب بنانا بھی کفر اور شرک میں داخل ہے۔ لَا رُبَّ سَآءٍ فَاَكْءِ سوا کوئی رب نہیں۔ ہم بار بار پڑھتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ پھر یہ بھی کہتے ہیں۔ قُلْ اَعُوْذُ بِعِلَّةِ النَّاسِ ۝ مِلَّةِ النَّاسِ مطلب یہ کہ ربوبیت کا مالک، پرورش کرنے والا کسی چیز کو درجہ کمال تک پہنچانے والا اور تمام اسباب مہیا کرنے والا

بزرگانی دین کے کلام میں پیر دستگیر اور غوث اعظم وغیرہ الفاظ بعض مقامات پر استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس سے ہرگز وہ معانی مراد نہیں لیے جو اہل شرک مراد دیتے ہیں۔ بلکہ غوث سے مراد ایسی مقبول کار آمد مستجاب الدعوات ہستی جتنی دعاؤں اور برکات سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو فیض پہنچاتا ہے اور یہ لوگوں کا نزدیک کرتے ہیں اور روحانی فیض پہنچاتے ہیں۔ اور لوگوں کی طرح طرح کی مشکلات اور ضروریات کی گرہ کشائی ان حضرات کی تعلیم و تربیت، تلقین و تہذیب، نصیہ، دعاؤں اور توجہات وغیرہ کی وجہ سے ہوتی رہتی ہے۔ ۱۲۔

عبدالحمد سواتی

مولانا شیخ المنذر فرمایا کرتے تھے کہ وسیع مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کے دو اسباب ہیں، قرآن سے دوری اور فرقہ بندی۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ دہلوی، ان کے خاندان اور حضرت شیخ المنذر نے قرآن پاک کی تعلیم دینے میں زندگیاں بھیا دیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت لاہوریؒ کو قرآن پاک کی تعلیم سے آراستہ کر کے فرمایا تھا، احمد علی اپنی پوری زندگی قرآن کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا اور پھر اپنے اس نصیحت پر پورا پورا عمل کیا۔ ساری عمر لوگوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہے۔ چالیس برس میں آپ نے پانچ ہزار علماء کو قرآن کی تعلیم دی۔ آپ دوسری کتابیں عام طور پر نہیں پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی مشکوٰۃ شریف یا حجة اللہ البالغہ کا درس دے دیتے تھے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر لکھی ہے۔ یہ بھی کمالی وجہ کا مفضل ترجمہ ہے۔ آپ سمجھتے تھے کہ لوگ قرآن سے دور ہو گئے ہیں۔ انہیں قریب کرنے کی کوشش میں آپ نے یہ ترجمہ اور تفسیر لکھی۔

حضرت شیخ المنذر فرقہ بندی کو بہت بڑی لعنت سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پارٹی بازی مسلمانوں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے اور اگر اسے دور نہ کیا گیا تو مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ وہ ہمیشہ اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ والوں کو قریب کرنے کی کوشش بھی کی۔ آپ نے مولانا شریک علیؒ اور مولانا محمد علی جوہر کو قریب کیا اور پھر علی گڑھ پارٹی کو ساتھ ملا لیا، تاکہ سب مل کر مسلمان قوم کی خدمت کر سکیں اور اس سلسلہ میں متحدہ پروگرام پر عمل پیرا ہو سکیں حضرت مولانا محمود حسنؒ کو شیخ المنذر کا خطاب مولانا محمد علی جوہر نے ہی دیا تھا جسے برصغیر کے تمام لوگوں نے تسلیم کیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مولانا محمود الحسن نہایت نیک، متدین اور صالح آدمی تھے۔ خاموش رہ کر بڑے بڑے کام کرتے تھے۔ ہندوستان میں انگریز کی جہڑیوں کو انہوں نے ہی کھوکھلا کیا۔ اپنے شاگردوں اور مریدوں کے ذریعے دور دور تک جانے پہچانے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ غالب پاشا اور الزمر شاہ بھی سمجھتے تھے کہ آپ

کی سخاوت ضرب المثل بن چکی ہے۔ امام ابن قیمؒ نے اپنی کتاب الشعر والشعراء میں تذکرہ کیا ہے۔ کہ حاتم کی سخاوت کو شہرت ایسے ہی حاصل نہیں ہوگی، اس شخص نے انیس سو مرتبہ اپنا گھربار، مال و متاع لٹا دیا تھا۔ عیسیٰؑ مذہب رکھتا تھا اور اسی پر اُسکی موت واقع ہوئی، اُس کا بیٹا عدیؒ بن حاتم بھی عیسیٰؑ تھا اور اہل بیت میں اسلام کا سخت مخالف تھا۔ مگر کسی نیک آدمی کے مشورہ سے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف براسلام ہوا۔ اُس کی بہن کو بھی ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ عدیؒ خود بیان کرتے ہیں کہ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اُس وقت فِي عُنُقِي صَلِيبٌ مِّنْ ذَهَبٍ میری گردن میں سونے کی صلیب لٹک رہی تھی۔ آنحضرت علیہ السلام نے دیکھتے ہی فرمایا اَلْقِ عَنكَ هَذَا النُّكْثَ اِنَّ اِسْمَ بَيْتِ كُوَيْلٍ مِّنْ دُنْ سِائِرِ بَنِي كَلْبٍ۔ گویا آپ نے صلیب کو دُشَن کہا۔ صنم اور دُشَن میں فرق یہ ہے کہ جو بے گھڑا ہوا ہوتا ہے وہ صنم کہلاتا ہے۔ اور جو اُن گھڑا ہوا ہے وہ دُشَن کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے صلیب کو دُشَن فرمایا۔ نیز حضور علیہ السلام نے یہ بھی تلاوت فرمایا اَللّٰهُمَّ اَحْبِبْهُمْ وَوَدِّعْهُمْ وَارْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ اِنَّ يَهُودِيًّا وَّ اَنْصَارِيًّا وَّ عَجَازِيًّا اپنے مولویوں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے۔ حضرت عدیؒ کہتے ہیں میں نے عرض کیا حضرت! مَا كُنَّا نَدْبُهُمْ ہم ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ رب تو جب بتاتے جب ان کی عبادت کرتے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَلَيْسَ اَنَّهُمْ كَالنَّوَاجِلِ كُنْ لَهُمْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اہل کتاب، کے مولوی اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو حلال قرار دیتے تھے اور وہ لوگ اُسے حلال ہی سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ جس چیز کو اللہ نے حلال فرمایا یہ درویش اُس چیز کو حرام قرار دے دیتے تھے، اور وہ لوگ اُسے حرام ہی سمجھتے تھے۔ حضرت عدیؒ نے عرض کیا حضور! اَلَا تَرَىٰ تو آپ نے فرمایا۔ یہی تو رب بنالیا ہے۔ کیونکہ حلال و حرام اُن کے اختیار میں نہیں تھا۔

اکل حرم

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد پاک ہے۔ لَا تَحْجِلْ مَالُكَ امْرُؤًا لَا يَطِيبُ نَفْسَهُ، کسی مسلمان کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر حلال نہیں۔ دوسرے مقام پر یہ بھی آتا ہے ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ اَلَا اَنْ تَكُوْنُ تَجَارَةً سَلَّے اس کے کہ تجارت ہو کہ اس طریقے سے منافع کھانا جائز ہے۔ منافع بھی دوسرے کے لیے فائدہ ہی ہوتا ہے، اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ مگر ناجائز اور باطل چیز کسی وقت بھی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ ناجائز مال خواہ چوری کے ذریعے حاصل ہو یا خیانت یا دھوکا یا رشوت کے ذریعے یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

رشوت

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ رشوت مسلفوں کو تباہ و برباد کرنے والی لعنت ہے۔ اس لعنت سے کوئی بھی محفوظ نہیں امریکہ ہو یا برطانیہ، اور آپ کا ملک تو صفحہ اول میں ہے۔ اس کے بغیر کوئی جائز کام بھی نہیں کر لیا جاسکتا۔ آپ رشوت دیے بغیر جس سے سامان نہیں چھڑا سکتے۔ اس کے بغیر ڈاک خانے والے بات نہیں سنتے پولیس میں رپٹ نہیں لکھائی جاسکتی۔ محکمہ اوقاف مقدس محکمہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اس لعنت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ انسانیت کی دو بڑی دشمن طاقتیں رشوت اور سود ہیں، اسلام نے ان دونوں چیزوں کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔

غاصبہ قبضہ

اکل حرم کی ایک اور صورت غاصبہ قبضہ بھی ہے، جیسا کہ پمپلز پارٹی کے زمانہ میں زمین اور کارخانے چھینے گئے، پچیس سال میں واجب الادا قیمتیں لگائی گئیں اور اصل مالکوں کو بے دخل کر دیا گیا۔ اس سے تو تجارت والے اچھے رہے جنہوں نے چھینا بیشک مگر طریقے سے۔ یکدم کسی کی زمین یا کارخانہ چھین لینا ظالمانہ طریقہ ہے اس کا درست طریقہ یہ تھا کہ کوئی کمیشن بٹھایا جاتا جو تحقیقات کے بعد فیصلہ کرتا کہ کون سی جائیداد جائز ذرائع سے حاصل کر رہا ہے اور کون سی ناجائز ذرائع سے۔

اجرم بھی یعنی دوسرا اجر ملے گا۔ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ اور اگر تم روگردانی کرو گے فَإِنَّ
عَلَيْكُمْ إِثْمَ الْيَاسِينِ تو تمام رعیت کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ کیونکہ تمہاری وجہ
سے سب لوگ ایمان سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کے بعد یہ آیت بھی جو آج
کے درس میں آئی ہے۔ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا۟ اِلٰى كَلِمَةٍ
سَوَآءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ
شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ
تَوَلَّوْا۟ فَقُولُو۟ا اَشْهَدُو۟ا بِاَنَّا مُسْلِمُو۟نَ

حضور نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کی سنتوں میں پہلی
رکعت میں پہلے پائے کی یہ آیت تلاوت فرماتے تھے۔ قُولُوا۟ اٰمَنَّا
بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلَى الْاِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَاِلٰسْبٰطَ وَمَا اَوْفٰى مُوْسٰى وَعِيسٰى وَمَا
اَوْفٰى النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نَفَرِقُ بَيْنَ
اَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ كُلُّهُ مُسْلِمُو۟نَ اور دوسری رکعت میں آج کی آیت
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تلاوت فرماتے۔ بعض اوقات آپ پہلی رکعت میں سورۃ کافرون
اور دوسری رکعت میں سورۃ اخلاص بھی تلاوت فرماتے۔ یہ آیات اور سورہیں تحفیدہ
توحید اور تردید شرک پر مشتمل ہیں۔ اس لیے بڑی اہم ہیں۔ ان میں اسلام کی بنیادی باتیں
اور اسکی دعوت ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و ہفت (۷۷)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۸۹

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْإِهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط
وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ اتَّقَى وَأَتَى الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ص وَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (۱۸۹)

ترجمہ :- لوگ آپ سے پوچھ رہے ہیں کہ اہل بیت کی طرف سے کیا دعا ہے؟
ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے۔ اور یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کہ تم گھروں میں پشت
کی طرف سے آؤ۔ لیکن نئی قرآن شریف کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ اور گھر
میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تاکہ تم نفع پا جاؤ ۝ (۱۸۹)
رابطہ ایات
قبل ازیں اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کے احکام بیان فرمائے۔
اور اس کے بعد مال کے متعلق مسائل بیان ہوئے۔ اب اس آیت میں سنئے
چاند کے متعلق سوال اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔

بظاہر یہ دو مختلف چیزیں معلوم ہوتی ہیں مگر مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ چاند
کے گھٹنے بڑھنے کا رمضان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ کیا چاند نکلنے پر ہی روزہ
شروع کیا جاتا ہے۔ اور اگلا چاند نظر آنے پر ماہ رمضان ختم ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف
میں آتا ہے۔ أَفْطِرُ ذَا الرُّمَّةِ يَتِمُّ وَصُومُ الرُّمَّةِ يَتِمُّ چاند دیکھ کر روزہ
رکھو اور دیکھ کر افطار کرو۔ اس لیے دونوں مسائل کو یکے بعد دیگرے بیان کیا
گیا ہے کہ ان دونوں میں باہمی ربط ہے۔

در اصل یہ آیت ایک سوال کا جواب ہے، جو حضور علیہ السلام کی خدمت
میں پیش کیا گیا۔ اس کوہ ارض کے لیے روشنی کے دوہی ذرائع ہیں یعنی سورج

شان نزول

گزشتہ درس میں اہل کتاب کو اُس کلمہ توحید کی دعوت دی گئی تھی، جو تمام انبیاء علیہم السلام، تمام کتب اور تمام شرائع کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ یعنی خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ اور ہم ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے اجداد اور یہاں کو رب بنالیا۔ اور رب بنانے سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کو مولوی اور درویش حلال قرار دے دیں اُسے حلال سمجھ لیا جائے اور جسے حرام کہیں اس کو حرام ہی سمجھ لیں۔ گزشتہ درس میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ تحلیل و تحریم اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو حلال یا حرام قرار دینے کا اختیار نہیں ہے۔ جب بنی کسی چیز کو حلال یا حرام کہتا ہے تو اس کو قطعی سمجھ لینا چاہیے کیونکہ بنی وہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرنا ہے۔ آج کے درس میں بھی خطاب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے۔ اور ان کے آپس کے اُس جھگڑے کے متعلق ہے، جو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کرتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ شامیوں نے جب انجمن کے عیسائی حضور علیہ السلام کے ساتھ بحث و مناظرہ کرنے کے لیے مدینہ آئے تو مدینے کے یہودی بھی جمع ہو گئے۔ عیسائیوں کا لاٹ پادری بھی دند میں شامل تھا، ادھر یہودیوں کے عطار بھی اکٹھے ہو گئے اور یہ دونوں گروہ آپس میں جھگڑنے لگے۔ یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے طریقے پر تھے۔ مگر نصاریٰ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کا دعویٰ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام عیسائیوں کے طریقے پر تھے۔ مگر دوسرا گروہ طے ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ گویا دونوں گروہ اپنی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے۔ یہ معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھی پیش ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں کی تردید فرمائی۔ کہ دونوں فریق ابراہیم علیہ السلام

کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپ نے نو نشانیاں بتانے کی بجائے احکام عشرہ بیان فرما دیے۔ مقصد یہ تھا کہ مسئلہ نشانیاں معلوم کر لینے سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ کہ مولیٰ علیہ السلام کو اللہ نے فلاں فلاں معجزہ فلاں فلاں نشانیاں عطا کی تھیں، بلکہ تمہارا فائدہ اس بات میں ہے کہ تمہیں احکام شریعت معلوم ہو جائیں جن پر تم عمل کر سکو۔ لہذا انوشانیوں کی بجائے حضور علیہ السلام نے بیودلیوں کو ان کے دس احکام بتا دیے۔ بعض چیزیں خامض ہوتی ہیں ان کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تم وہ بات معلوم کر نیچے کر کشش کرو جس میں تمہارا فائدہ ہے۔

یہ چاند کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سوال کے جواب میں چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت بیان نہیں فرمائی، بلکہ اُس کے فائدہ بتا دیے کہ اس عمل سے اوقات متعین ہوتے ہیں اور دین میں در سال کا حساب ہوتا ہے۔ سورج سے اس قسم کا حساب رکھنا ایک عام سمجھ بوجھ کے انسان سے مشکل ہے کیونکہ وہ تو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے موسموں میں تغیر و تبدل آتا ہے، کبھی گرمی ہے، کبھی سردی ہے۔ بار اور خزاں کے موسم آتے ہیں مگر سورج کی بظاہر شکل و صورت اور حجم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اسی لیے فرمایا کہ تم چاند کی کمی کی حکمت کے چکر میں نہ پڑو۔ اس کا تعلق تو علم ربانی سے ہے، جو اس علم کو حاصل کرے گا۔ اُسے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت معلوم ہو جائے گی کہ کس طرح سورج اور

چاند کے درمیان کروہ ارض حاصل ہو کر اس کا سبب بنتا ہے۔ تم اس کا فائدہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں لوگوں کو کیا فائدہ حاصل ہوتے ہیں۔

ہلال پہلے دن کے چاند کو کہتے ہیں جب وہ حجم میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ عربی لغت میں ہلال سے مراد آواز بلند کرنا ہے۔ جب پہلے دن چاند نظر آتا ہے، تو لوگ اُسے دیکھ کر خوش سے آواز بلند کرتے ہیں کہ وہ چاند نظر آگیا، اسی لیے اُسے

چاند کی محفٹ
صورق

بعد کی بات ہے۔ الغرض! عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بگڑے ہوئے دین کا نام ہے۔

ہمارے ملک میں بھی دین کے ساتھ کم و بیش ایسا ہی ہوا ہے۔ آج کی بیشتر رسوم ہندوؤں سے ماخوذ ہیں۔ خصوصاً موت کی رسوم منجھتیرا، ساتواں، دسواں، چالیسواں، برسی وغیرہ ہندو مذہب میں ہیں۔ آریاؤں کی آمد کے بعد برصغیر میں ہندو مذہب اختیار کر لیا گیا۔ اور ان کی رسوم صدیوں تک اس ملک میں جاری رہیں۔ پھر جب اسلام آیا تو یہی رسوم اسلام میں داخل ہو گئیں۔ شاہی بیاہ کے سلسلہ میں گانا، سہرا، بلایا وغیرہ سب ہندوؤں کی رسمیں ہیں۔ یہ چیزیں اسلام کے ساتھ عرب سے نہیں آئیں۔ بلکہ یہاں پر دین میں داخل کر لی گئیں۔ شب معراج اور دیگر مواقع پر چراغاں کی بیماری مجوسیوں کے راستے سے آئی کیونکہ وہ آگ کو مقدس مانتے تھے۔ ہندو بھی اپنی دیوالی اور دوسرے کے موقع پر چراغاں کرتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی جاری ہو گیا الغرض! جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے غلط عقیدے اور رسوم اپنے دین میں داخل کئے، اصل دین کو بگاڑ دیا۔ اسی طرح مسلمان بھی اس کام میں ان سے پیچھے نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تو رات کا نزول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہزار سال بعد ہوا۔ اور انجیل کے نزول کے وقت تو دو ہزار سال سے بھی زیادہ گزر چکا تھا۔ تو ابراہیم (علیہ السلام) پر ہزاروں سال بعد پیدا ہونے والی یسوعی یا عیسیٰ کیسے چپاں کی جاسکتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے اہل کتاب! تم ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ مَا اُنْزِلَتْ التَّوْرَةُ وَالْاِنْجِيلُ اِلَّا مِنْ قَبْلِهِمْ اَفَلَا تَعْقِلُونَ تو راست اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے ہزاروں سال بعد نازل ہوئیں۔ تو جو کتابیں ان کے بعد نازل ہوئیں تم ان کی نسبت ان کتابوں کی طرف کیسے کر رہے ہو، عقل کی بات کرو۔ پھر تنبیہ کے طور پر فرمایا

مَا نَسْتُمْ هَؤُلَاءِ مَا جَحَبْتُمْ فَاِنَّكُمْ لَعَمْرُؤُا

کے لیے اوقات کا تعین ہوگا۔ اسی طرح عبادات کو لے لیں۔ نماز کی ادائیگی کے لیے اوقات مقرر ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنی ہو، تو سال کا تعین کرنا ہوگا، روزہ کے لیے چاند کے اوقات کی ضرورت پڑے گی کہ اس کی ابتداء اور انتہا چاند کے نکلنے پر ہی منحصر ہے۔ اور پھر اور کابین اسلام میں سے حج چوتھا کرکُن ہے۔ یہ بھی مقررہ مہینہ کے مقررہ ایام میں ہی ادا کیا جاتا ہے حتیٰ کہ عورت کی عدت کے تعین کے لیے بھی چاند کا حساب ہی لینا پڑتا ہے اسی لیے فرمایا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں تمہارے لیے بہت سے فوائد ہیں۔

پانچواں کی تقویم

اہم رازنی کی طرح اہم البو بکر جصاص رازنی بھی بڑے پائے کے عالم الفہرست قرآن ہوتے ہیں۔ آپ کا زمانہ چوتھی صدی تیسرا ہے۔ آپ اہم ابو حنیفہ کے میر کارل میں سے تھے۔ انہوں نے احکام القرآن کے نام سے تفسیر لکھی ہے۔ قریہ مولد اہم فرماتے ہیں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ تقویم چاند کے حساب سے رکھیں اگر مسلمان اس حساب کو ترک کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ بیشک سورج کی تقویم بھی رکھیں، اس میں ممانعت نہیں ہے۔ مگر چاند کے حساب کو بھی ضرور اپنے روز مرہ کے امور میں جاری رکھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے چاند کا حساب رکھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اھلۃ سے مراد مہینہ لیتے ہیں۔ اور اس آیت کا معنی یوں کرتے ہیں کہ لوگ آپ سے مہینوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ ان کا حساب چاند سے رکھا جائے گا یا سورج سے۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ چاند کے ذریعے حساب رکھنا مقدم، بہتر اور فطری ہے۔ چاند کے حساب سے ماہ و سال کا تعین تو ان پڑھ دہانتی بھی کر سکتا ہے۔ جب کہ سورج کی تقویم کو یاد رکھنا مشکل کام ہے۔ سورج تو ہر روز یکساں طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ مہینہ کی ابتداء اور انتہا کا تعین ایک آدمی کے لیے مشکل ہے مگر چاند کا حساب بالکل واضح ہے۔ جس دن نیا چاند نکلے گا تو مہینہ کی ابتداء ہو جائے گی۔ لہذا چاند کی تقویم آسان ہے

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عبادات کے معاملہ میں چاند کی جنتری کو حتمی

کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ سب حنیف کی علامتیں ہیں، تو کوئی مشرک آدمی حنیف کہے ہو سکتا ہے۔ بمشرک اور حنیف کو متضاد صفات ہیں۔

فرمایا ابراہیم علیہ السلام حنیف بھی تھے اور مسلمان بھی۔ دراصل حنیف اور مسلمان ہونا ایک ہی چیز ہے۔ اسلام کا معنی اطاعت اور فرمانبرداری ہے جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا اَسْلِمْ فرما بنذر ہو جاؤ اسلام قبول کرو۔ قَالَ اَسْلَمْتُ لِسَبِّ الْخَلَمِ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا۔ اے مولا کریم! میں نے تیری فرمانبرداری قبول کر لی۔ میرا تو مقصد حیات ہی تیری اطاعت ہے۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی تھے۔ یہ اپنی نسبت غلط طور پر ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

بزرگوں کی طرف خالی نسبت کی وہ مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو حنفی کہلانے والے کیا واقعی اسلاف کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ محض دعویٰ ہے، کام اُلٹ ہیں۔ اسی طرح آج کل حنفیوں کی اکثریت امام ابوحنیفہؒ کے عقیدے سے بالکل مختلف عقیدہ رکھتی ہے۔ قادری اپنی نسبت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی طرف کرتے ہیں مگر ان کا معاملہ آپ کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے یہود و نصاریٰ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ شیخ جیلانیؒ کا عقیدہ پاک تھا، ان کی عمل پاکیزہ تھا، اعلیٰ درجے کی روحانیت کے مالک تھے مگر ان کی طرف نسبت رکھنے والے شرک و بدعت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہی حال نقشبندیوں اور چشتیوں کا ہے۔ آج کل چشتی گانے بجانے والے کو سمجھا جاتا ہے۔ کیا خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی یہی تعلیم تھی۔ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کا دروازہ سال کے بعد کھولو۔ لاکھ دو لاکھ آدمی اس میں سے گزر گئے تو چشتی اور حنفی ہو گئے۔ العیاذ باللہ یہ بزرگ اعلیٰ درجے کی روحانیت کے مالک تھے۔ بچے توحید پرست اور متبع سنت تھے۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ چشتیوں کی طرف

بزرگوں کی
طرف نسبت

جان بھیلی پر رکھ کر نکلنا پڑتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مال بھی خرچ کرنا ہوتا ہے
 کیونکہ اس میں یہ دونوں عمل شامل ہیں۔ وَجَاهٌ مُّذَوَّبًا هُوَ الْبُحْرُ وَانْفِصَاؤُ
 یعنی مال اور جان دونوں چیزوں کے ساتھ جہاد کرو۔

درست باطلہ

حج کا ذکر آیا تو اس میں بعض رسومات باطلہ کا رد بھی پایا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت
 میں عربوں کا یہ دستور تھا۔ کہ جب کسی سفر پر نکلتے، خواہ وہ حج کا سفر ہی کیوں نہ ہو۔
 اور گھر میں کوئی چیز بھول جاتے تو پھر واپس آکر مکان کے دروازے سے داخل نہیں
 ہوتے تھے۔ بلکہ اُس کے پیچھے سے آتے تھے، خواہ انہیں دیوار توڑنی پڑے
 یا پھلانگنی پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا وَلَیْسَ
 الْبَدْنُ اَوْ رِیْہِ کوئی نیکی نہیں ہے اِنْ تَاْتُوا الْبُیُوتَ مِنْ ظُهُورِہَا کہ تم اپنے
 گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ۔ بلکہ اگر واپس آنے کی ضرورت پیش آہی جائے
 تَرَوَاتُوا الْبُیُوتَ مِنْ اٰثَرِہَا تو دروازے کے راستے سے اندر داخل ہونا
 چاہیے۔ فرمایا یہ کہ نہ ہی نیکی ہے۔ کہ تم دیوار پھلانگتے پھر دو۔ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ
 اتَّقٰی بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا اپنے اندر خوف خدا
 پیدا کر کے اُس کے احکام کی پیروی کرو۔ یہی اصل نیکی ہے۔ جاہلیت کی رسوم باطلہ
 کہ ترک کر دو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر رسومات باطلہ کی تردید کر کے
 اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا اصول بیان فرمادیا ہے۔ کہ اہل نیکی تو تقویٰ ہے۔ جب
 تقویٰ پیدا ہو جائے گا تو تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔ رسومات باطلہ خود بخود
 ختم ہو جائیں گی شرک، بدعت اور دیگر رسوم پر عمل کرنے سے نیکی نہیں آسکتی۔ نیکی تو تقویٰ
 کو اختیار کرنے سے آئیگی، لہذا اس کے لیے کوشش کرو۔

مطلوبہ مستقیم

حصول نیکی کے متعلق ایک مسلمہ اصول یہ ہے۔ کہ شریعت کے اصول پر
 چل کر ہی آدمی کامیاب ہو سکتا ہے۔ صراطِ مستقیم وہی ہے۔ جو شریعت نے قائم
 کیا ہے۔ اگر اس راستہ کو اختیار نہیں کرو گے تو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ کام کوئی
 بھی ہو، خواہ اس کا تعلق عبادت سے ہو یا معاملات سے، ٹرسٹ سے ہو یا نظام حکومت

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا حال دیکھو۔ اُن کے ماننے والوں نے عرس منانے پر ہی اکتفا کر لیا ہے۔ اور سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا میں مجددیت کو ترقی دے رہے ہیں۔ یہ سب غلط نسبتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیت یا نصرانیت کی محض ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کچھ فائدہ نہیں دیگی۔ ان تمام بزرگوں کی طرف نسبت اُسی وقت مفید ہو سکتی ہے۔ جب اُن کا عقیدہ اور عمل بھی اپنایا جائے۔ آج کل تو محض مزار بنالینا، اس پر عمارت بنا کر قوالی کرالینا اور عرس منالینا ہی کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ عقیدے اور عمل کو کون جانچتا ہے۔ یہاں گرجہ و نوالہ میں ایک پاگل یا فاجر العقل کا مزار بنادیا گیا ہے۔ کسی نے نہیں روکا کہ کیا کر رہے ہو۔ اتنے متدن شہر میں اس دیوانے کی قبر پر چڑھا دے چڑھنے لگے ہیں۔ وہ سچا رہ نمونہ تھا یا مجذوب تھا، بہر حال غیر مکلف تھا۔ اُس کو خدا کا ولی بنا کر پوجا پاٹ شروع کر دی۔ کیا ایمان اور توحید اسی چیز کا نام ہے !

حضرت ابراہیم
کے عقیدے

فرمایا یاد رکھو ! اِنَّ اَوَّلَکَ النَّاسِ بِاِبْلِہِیْمَ لَکَذِبِیْنَ
اتَّبَعُوْهُ بِشَکِّ اِبْرٰہِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے
اُن کے دور میں اُن کا صحیح اتباع کیا۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت آپ کے ساتھ
درست ہے۔ اُن کے علاوہ وَہٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
یہ خاتم النبیین اور آپ پر ایمان لانے والے جو درحقیقت ابراہیم علیہ السلام کے
متبع ہیں، یہ بھی اُن سے مناسبت رکھتے ہیں۔ ان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی نسبت
ابراہیم علیہ السلام کی طرف کریں۔ یہود و نصاریٰ کو یہ حق قطعاً نہیں پہنچتا۔ مندرجہ
وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ اللہ ہی مومنوں کا کارساز ہے۔ ولی کا معنی
رفیق، سرپرست، دوست اور کارساز ہے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے پھر وہ
اُس کا کارساز بن جاتا ہے۔ پھر اُسے کسی دوسرے دروازے پر جانے کی ضرورت
باقی نہیں رہتی۔

سَيَقُولُ ۲

الْبُقَرَةُ ۲

درس ہفتاد و ہشت (۷۸)

آیت ۱۹۰ ۱۹۳

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْدُوا
 إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ①۹۰ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ
 ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُم
 وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ
 الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ
 كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ①۹۱ فَإِنْ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
 ①۹۲ وَاقْتُلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ
 لِلَّهِ فَإِنْ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ①۹۳

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ اور زیادتی نہ
 کرو بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ①۹۰ اور انہیں جہاں
 بھی پاؤ قتل کرو، اور اُن کو نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔ اور فتنہ مٹانے
 سے زیادہ سخت ہے۔ اور مسجد حرام کے پاس اُن سے سخت لڑو۔ یہاں تک کہ وہ
 خود تم سے اُس میں لڑیں۔ اور اگر وہ لڑیں تم سے پس مارد اُن کو۔ اس طرح بدلو
 کفر کرنے والوں کا ①۹۱ اور اگر وہ باز آجائیں۔ پس بیشک اللہ تمہارے
 سختی والا اور نہایت ہی مہربان ہے ①۹۲ اور لڑو اُن سے یہاں تک کہ
 فتنہ باقی نہ رہے۔ اور اطاعت اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ پس اگر یہ باز آجائیں
 پس نہیں زیادتی مگر اُن لوگوں پر جو ظلم کرنے والے ہیں ①۹۳

اسلام کے پہلے چار ارکان کا بیان سابعہ دروس میں آچکا ہے۔ اب یہاں سے
 جہاد کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ لفظ جہاد ایک عام لفظ ہے اور یہ وسیع تر معانی میں

جہاد کی قسمیں

تورات اور انجیل کی بخڑی ہوئی شکل کا نام ہے۔ اہل کتاب نے تورات و انجیل میں تحریف کر کے اصل دین کو بگاڑ دیا۔ کفر اور شرک دونوں گروہوں میں قدر مشترک ہے۔

دوسری طرف مشرکین بھی اپنا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جوڑنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے مختلف مقامات پر ان کے دعوے کی بھی تردید فرمائی ہے۔ نیز یہ بھی واضح فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نسبت وہ لوگ رکھتے ہیں جنہوں نے آپ کے دور میں آپ کا اتباع کیا۔ اور اس دور میں خاتم النبیین علی النبی علیہ وسلم کا اتباع کیا۔ اور حقیقی معنوں میں اسلام میں داخل ہوئے۔

اہل کتاب کا مضمویہ

اب اہل کتاب کے پیرواؤں کی گمراہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ لوگ جھٹک کر اپنے دور نکل گئے ہیں اور ان کے دل ضلالت میں اس قدر سخت ہو چکے ہیں کہ اب یہ کفر کے امام بنے ہوئے ہیں۔ یعنی جو شخص ایمان قبول کر کے صحیح راستے پر چلتا ہے۔ یہ لوگ اُسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَذَرْتُ طَائِفَةً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ الْأَنْبِيَاءِ گمراہ کر دے۔ گمراہ کر دے۔ گمراہ کر دے۔ کہ وہ کسی نہ کسی طرح تم کو گمراہ کریں۔ گزشتہ چودہ سو سال کے عرصہ میں اہل کتاب یہی کچھ کرتے آئے ہیں۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے دین سے متنفر کر دیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا کہ یہ لوگ خواہش کرتے ہیں کہ تم گمراہ ہو کر ان کے ساتھ برابر ہو جاؤ۔ قَتَلُوا نَبِيَّ سَوَآءَ آتِیَهِ الْفَاطِیَہِ آتِیَہِ ہوں۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ عیسائیوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے مرکزی نقطہ سے ہٹا دیا جائے۔ تاکہ وہ بھی گمراہ ہو کر ان ہی کے ساتھ آئیں۔ اگرچہ ان کو جزوی کامیابی ہوئی ہے۔ مگر مجموعی طور پر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں وعدہ کر رکھا ہے کہ سچا دین ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مسلمان قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل پیرا رہیں۔ حضرت عثمان غنی کے زمانے تک مسلمان اپنے دین پر بالکل متفق

قبول فرماتے ہیں۔ اور اس کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے۔ یہ جہاد بالسیف ہے جس کی تعریف میں خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ یعنی کبھی مومن کافر کو مار ڈالتا ہے۔ اور کبھی خود شہید ہو جاتا ہے۔

جہاد پر عمل کرنے

مسلمانوں کے مسئلہ جہاد پر بعض بے دین قسم کے لوگوں خصوصاً عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے۔ کہ لوگوں کو تلوار کے ذریعے مرعوب کر کے دین میں داخل کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ تاہم اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ جہاد کا حکم فطرت کے عین مطابق ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہ لازم ہو جاتا ہے جب دنیا میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے، کسی کی جان و مال محفوظ نہ رہے تو پھر ایسے لوگوں کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کے تمدن لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عوام کی جان و مال اور عزت و اہمروں کی حفاظت ہونی چاہیے۔ تو پھر انہیں فلسفہ جہاد کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ اس کے بغیر ظلم و ستم کی تیغ کئی ممکن ہی نہیں۔

جہاد دو قسم کا ہے اقدامی یعنی جارحانہ اور دفاعی یعنی مدافعتی۔ مسلمان کے لیے عام حکم یہی ہے کہ وہ جنگ میں پل نہ کرے۔ بلکہ اگر دشمن حملہ آور ہو جائے تو اپنا دفاع کرے۔ مگر بعض اوقات اقدامی جہاد بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ بعض نفوس شریک ہوتے ہیں، وہ ہیئتہ دوسروں کے مال و جان کے نقصان کی تاک میں رہتے ہیں۔ اور معاشرے کے امن و امان کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے امن کی خاطر لوگوں کے جان و مال اور عزت و ناموس کی خاطر بعض اوقات جہاد میں جارحانہ انداز بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اس شر و فساد کا قلع قمع کیا جاسکے جس نے معاشرے کے امن و امان کو تباہ کر رکھا ہے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایسے شخص کی مثال خطرناک پھوٹے سے دی ہے جس طرح انسانی جسم کی حفاظت کے لیے جسم کے گلے سڑے حصے کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے یا جس طرح کسی پھوٹے کا آپریشن کر دینا مریض کی صحت کے

اقدامی اور
دفاعی جہاد

شامل ہو گئی ہیں۔ اس لیے آپ کو اتنا لمبا مقدمہ لکھنا پڑا۔ آپ نے پورے عالم اسلام کی سیاسی، اقتصادی، تمدنی حالت پر سیر حاصل بحث کی۔ اور تمام ممالک اسلامیہ کی مردم شماری بھی پیش کی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم گریانی عرصہ میں یہ بڑی اہم کتاب تصور کی جاتی تھی۔ مجموعی حالات کے لحاظ سے عالم اسلام پر اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہ تھی۔ آپ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ یورپ کے یہودی اور عیسائیوں نے گزشتہ زمانے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کم و بیش چھوٹی بڑی چھ لاکھ کتابیں لکھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں ان لوگوں نے مسلمانوں اور ان کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کس قدر طوفان اٹھایا ہو گا۔

مشرقی علوم کے ماہر انگریز اور یورپین لوگ مشرق کھلاتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے ہمدرد بن کر اسلامی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر اسے بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنرل ایوب کے زمانے میں فضل الرحمن اسی قبیل سے تھا۔ وہ بھی مشرقین کا شاگرد ہی تھا جس نے کہا تھا کہ قرآن پاک کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کچھ حصہ میں حضور علیہ السلام کے اقوال بھی ہیں۔ اس نے بظاہر خدمتِ اسلام کے جذبہ سے کتاب لکھی مگر اس میں اس قسم کا طوفان باندھا۔ پاکستان میں اس کے خلاف شور برپا ہوا تو فضل الرحمن کو اس کے حملہ سے ہٹا دیا گیا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے لوگ مسلمانوں کو دین سے بظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ یہود و نصاریٰ اور مشرقین کا مشترکہ نصب العین ہے ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح مسلمان اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور قرآن پاک سے متنفر ہو جائیں۔ یہ لوگ ایسے ایسے اعتراضات اٹھاتے ہیں کہ بعض لوگ شک میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کے حملہ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمان اپنے مرکزی عقیدہ اور قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھیں۔ اگر مسلمان ان دو چیزوں کا دامن چھوڑ دیتے تو پھر گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

دیکھ کر مسلمانوں کے ساتھ پہلی تین جنگیں کہاں لڑی گئیں۔ پہلی جنگ بدر کے مقام پر ہوئی جو مکہ سے سینکڑوں میل دُور ہے۔ جب کہ مدینہ سے قریب ہے، پھر دوسری جنگ احد کے میدان میں ہوئی، وہ بالکل ہی مدینہ کے مضافات کا واقعہ ہے۔ کفار نے اتنی دُور سے مدینہ پر چڑھائی کی۔ اور تیسری بڑی لڑائی جنگ خندق ہے۔ اس میں بھی کفار بنی مویل کا سفر طے کر کے حملہ آور ہوئے مگر اہل اسلام نے مدینہ کے اندر رہ کر اپنا دفاع کیا۔ لہذا مسلمانوں پر یہ الزام لگانا قطعاً ناروا ہے۔ کہ اُن کا دین تلوار کے فیعلے پھیلا۔

فرمایا جو تم سے لڑتے ہیں تمہیں بھی اُن سے لڑنے کی اجازت ہے۔ وَلَآ تَقَاتُوا مَعَهُ زِيَادَتِي نہ کرو۔ زیادتی نہ کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جو کوئی تم سے لڑائی نہیں کرتا، تم اُس سے مت لڑو اور بے گناہوں کو قتل نہ کرو۔ مقصد یہ کہ تم سے تو لڑنے کے لیے میدان جنگ میں نہ جواں آئے ہیں۔ تم اُن کو مارو مگر اُن کے بچوں، اُن کے بوڑھوں اور اُن کی عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ایک جنگ کے دوران حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک عورت مری پڑی ہے۔ آپ بہت ناراض ہوئے اور نَهَى عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبَانِ عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا کہ زیادتی ہے۔ اسی طرح کوئی بہت بوڑھا ہے، معذور ہے، ہتھیار بھی نہیں اٹھا سکتا، یا اصحاب الصواع میں سے ہے۔ کہ کٹیا میں بیٹھا رہتا ہے۔ دینا سے کنارہ کش ہو کر عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ ایسے شخص پر ہتھیار اٹھانا تعدی کی بات ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

زیادتی کی
ممانعت

غنائے راشدین نے بھی اپنے اپنے عہد میں حکم دیا اَعَزُّوْا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، مگر کسی بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی بچے پر ہاتھ نہ اٹھانا، کسی عورت کو تکلیف نہ پہنچانا اور جو لوگ دینا سے الگ تھلک گر جائیں ان میں جاگزیں ہو گئے ہیں اُن کو بھی قتل نہ کرنا جو کوئی تہلے سے مقابلے پر لڑنے کے لیے آتا ہے اس سے لڑائی کرو، اور اس کو قتل نہ کرو بے گناہ پر زیادتی مت کرو۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے تو یہاں تک وصیت فرمائی تھی کہ کسی پیل دار درخت کو نہ کاٹنا، سوائے

کا علاج قرآن و سنت پر استقامت میں ہے۔ مگر اس دور میں دنیا بھر کے مسلمان
یہودیت اور نصرانیت کا شکار ہیں۔

مشنری
اداروں
کا جال

دنیا بھر میں پھیلے ہوئے عیسائیوں کے مشنری ادارے بھی مسلمانوں کو ان
کے دین سے گمراہ کرنے کا "فریضہ" ادا کر رہے ہیں۔ گرجے، سکول، ہسپتال، سب
گمراہی کے اڈے ہیں۔ ہسپتالوں میں مریضوں کو انجیل کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ جب
مریض تندرست ہو کر باہر نکلتا ہے۔ تو آدھا عیسائی ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی حال مشنری
سکولوں کا ہے۔ جہاں بائبل کی تعلیم لازمی ہے۔ ان مشنری اداروں کو چلانے والے
امریکی، کینیڈا، برطانیہ اور جرمنی کے عیسائی ہیں۔ انہوں نے مشنری ممالک پر بیچارہ کی
ہوتی ہے تاکہ مسلمان اپنے اسلام سے بیگانہ ہو کر ان کے مشن کو اپنالیں۔ آج کی
دنیا میں عالمی خبریں تمام کی تمام یہود و نصاریٰ کے توسط سے آتی ہیں اور وہ انہیں
اپنی مرضی کے مطابق توڑ موڑ کر اخبارات میں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے
خلافت یہود و نصاریٰ کو تقویت حاصل ہو۔ پوری دنیا میں کوئی مسلمان خبر ایجنسی
نہیں جو ان تک صحیح خبریں پہنچائے۔ لوگ غلط غلط خبریں پڑھ کر یقین کر لیتے ہیں
حالانکہ ان میں بیشتر من گھڑت ہوتی ہیں، ان کا مقصد محض یہ ہے کہ تمہیں اپنے
اصل نظریات سے متفرک کر کے باطل نظریات کی طرف راغب کریں تاکہ قرآن
کے ساتھ تمہارا تعلق منقطع کر دیں۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے مرکزی عقیدہ اور قرآن پر قائم رہیں
گے تو وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ نہیں گمراہ کر سکیں گے مگر اپنی ہی
جانوں کو۔ ان کی پھیلائی ہوئی گمراہی کا وبال انہیں پڑیگا بشرطیکہ مسلمان اپنے
صحیح عقیدہ پر قائم رہیں۔ آگے قیامت کا محاسبہ آیا والا ہے۔ ان کو معلوم ہو
جائے گا کہ گمراہی پھیلانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ وہ اس
وقت نہیں سمجھتے۔

تخیز آیات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا يَا هَلْ اَلِكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ

تھے۔ اُن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، مگر تم جان بوجھ کر گمراہی میں پڑے ہوئے ہو تمہارا کوئی علاج ممکن نہیں، جب یہ لوگ مکے میں آئے تو مشرکین ان سے دریافت کرتے کہ ہمارا مذہب اچھا ہے یا تمہاروں کا تو کہتے تمہارا دین صحیح ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ یہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہو۔ یہ اہل کتاب ہیں۔ انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں مگر اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مسلمانوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت ساری دنیا میں یہود و نصاریٰ کی سازش پھیلی ہوئی ہے۔ مگر بہت تھوڑے مسلمان اس سازش کو پہچانتے ہیں۔ اور اپنے دین پر قائم ہیں۔ درندہ گزشتہ ان کے جال میں پھنس چکی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ترقی یافتہ لوگ ہیں جو کچھ کہتے ہیں، درست کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حق و باطل کی پہچان کی تو منسحق عطا فرمائے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةُ ۲

درس ہفتاد و نہ (۷۹)

آیت ۱۹۴ تا ۱۹۵

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتِ قِصَاصٌ مِّمَّنْ
 اَعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا عَتَدَے
 عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۹۴﴾
 وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ
 وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹۵﴾

ترجمہ: حرمت کا میز حرمت کے میلنے کے مقابل ہے۔ اور تمام حرمتوں کا بدلہ ہے۔
 پس جس شخص نے تم پر زیادتی کی، تم بھی اُس پر زیادتی کرو جیسی کہ اُس نے زیادتی
 کی ہے تم پر اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں
 کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اور احسان کرو بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۹۵﴾

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کا حکم دیا تھا، اور اس کی
 وجہ بھی بیان فرمائی کہ مشرکین کے برابر اگر وہ فتنہ و فساد کو فرو کرنے اور ظلم و زیادتی
 کو ختم کرنے کے لیے جہاد ضروری قرار دیا گیا ہے، یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ
 عام طور پر جہاد اپنے دفاع کے لیے کیا جائے، البتہ اگر اختیار کے ظلم و ستم کی بنا پر
 مخلوق خدا کی جان و مال اور عزت و ناموس خطرے میں ہو تو جنگ میں پہلی بھی کی جائے
 حرمت والے چار مہینوں کا ذکر بھی اجمالاً آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ ارض و
 سما کے وقت سے ہی بارہ مہینوں کی تقویم مقرر کر رکھی ہے۔ جس میں سے چار
 مہینے حرمت والے ہیں۔ حکمتِ الہیہ میں یہ امر مسلم ہے کہ ان چار مہینوں میں شرک
 بھی لڑائی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ عام رہن بھی کسی کامال نہیں لڑتے تھے اور تجارتی

گذشتہ پریز

کے برے خصال کا تذکرہ ہے۔ ان آیات کا مصداق مہینے کے ارد گرد بسنے والے یہودی خاص طور پر ہیں۔ اب تک اہل کتاب کی دینی خیانت کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ آج کا درس بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ تاہم آئندہ آنے والے درس سے اہل کتاب کی دُخروی خیانت کا بیان ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ دینی طور پر بھی خائن ہیں اور دنیوی طور پر بھی ایسے ہی ہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ درس میں یہ بیان ہوا تھا کہ اہل کتاب کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر دیں۔ اس سلسلہ میں وہ ہر حیل اختیار کرنے پر کمر بستہ ہیں آج کے درس میں ان کی ایک تدبیر کا تذکرہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں سے کچھ لوگ صبح کے وقت ایمان لے آئیں۔ اور شام کو انکار کر دیں۔ تاکہ اس طریقہ سے ان لوگوں کو دین سے بظن کر سکیں جو پہلے ہی ایمان لائے تھے۔

سورۃ بقرہ میں تحویل قبلہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ جب وہ آیات نازل ہوئیں یہودیوں کی تدبیر

قَدْ نَدَىٰ نَفْلَبَ وَجْهَكَ فِي السَّمَاوَاتِ اَوَّلَ مَا قَبْلَ
بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو مقرر کر لیا تو مہینے کے یہودی بہت
سرخ پا ہوئے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ کہ کسی طرح اسلام کے بڑھتے ہوئے
سیلاب کے سامنے بند باز نہ جا بلئے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے یہ تدبیر
بنائی کہ ان میں سے کچھ لوگ دین کے پہلے حصے میں اوپر سے دل سے اسلام
قبول کر لیں اور آخری حصے میں اسلام سے باہر آجائیں۔ اس طرح کمزور ایمان یا
ناواقف لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کہ اگر اسلام سچا مذہب ہو تو یہ
پڑھے لکھے یہودی اسے قبول کر کے منحرف کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح
اسلام میں نئے آنے والے رک جائیں گے۔ اور جو ایمان لائے تھے، ان کے
ایمان متزلزل ہو جائیں گے۔

یہودی اسی تدبیر کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اَرْمَنُوا بِالَّذِي أُتِّلَ

درگزر سے کام لیا گیا۔ اب اگر ایسا کریں تو تمہیں لڑائی کی اجازت ہے۔ اُن سے پورا پورا مقابلہ کیا جائے اور انہیں ترکی بر ترکی جواب دیا جائے گا۔ اس سال پھر ذی قعدہ کا حرمت والا مہینہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اب انہوں نے اس مہینہ کا احترام نہ کیا اور آگاہہ جنگ ہوئے، تو تم پر بھی ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔

فرمایا الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے مقابل ہے۔ وَالْحُرُمَاتُ قِصَصٌ اور تمام ارب والی چیزوں کا بدلہ ہے۔ حرمت والی چیزوں میں بیت اللہ شریف، مسجد الحرام تمام مساجد اور حرم کا پورا خط شامل ہے۔ لہذا ان تمام چیزوں کا احترام کرنا چاہیے۔ ان میں جنگ، بدال اور فتنہ و فساد برپا نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان تو ہر حال ان کا احترام کرتے ہیں۔ البتہ اگر مشرکین ان کے ارب کو ملحوظ نہ رکھیں اور لڑائی پر آمادہ ہوں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت ہے۔ کہ ان کا بدلہ چکائیں۔ مطلب یہ کہ فَهَنْ اَعْتَدِیْ عَلَیْکُمْ جو کوئی تم پر زیادتی کرے، فَاعْتَدِیْ عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا لَعْنَتْہِی عَلَیْکُمْ تو تم بھی اُس پر اُسی طرح زیادتی کرو، جس طرح اُس نے تم پر کی ہے۔ یہی قانون اللہ تعالیٰ نے سورۃ نمل میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اگر اُن کی تعدی کے عوض میں صاف کردو، تو تمہیں بڑا اجر ملیگا۔ اور اگر بدلہ لینا ہے۔ تو پھر انہیں اُسی قدر ایذا پہنچاؤ، جس قدر انہوں نے تمہیں پہنچائی ہے۔ اُن سے زیادتی نہ کرو

وَاقْفُوا لِلّٰہِ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کہ اُس کے قانون کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ اور اگر تم خوف خدا کو دل میں جگہ دو گے تو پھر تمہیں خوشخبری ہو کہ وَلَعَلَّکُمْ اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اُس کی رضا اور خوشنودی بھی ایسے ہی لوگوں کے حق میں ہوتی ہے، نہ کہ کافروں اور ظالموں کے ساتھ۔ ہر حال مسلمانوں کو حکم دیا کہ لڑائی میں تم ابتداء نہ کرو اور حرمت والے مہینوں کا پورا پورا احترام کرو۔ البتہ اگر مشرکین اس بات کی پروا نہیں کرتے تو پھر تمہیں بھی اپنا دفاع کر نیکی اجازت ہے۔ مگر وہ بھی اس حد تک جس حد تک

عارضی طور پر دین کے اول حصہ میں بظاہر ایمان بھی لے آؤ، تو تصدیق صرف اُسی چیز کی کرنا جو تمہارے دین میں شامل ہے۔ کسی دوسری بات کی تصدیق نہ کرنا۔ کیونکہ سچا دین صرف تمہارا ہی ہے۔ اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں اُن کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ **وَمَا لَكُمْ لَنْ تَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِنْ مَنِ حَكَانَ هُوَ اَوْ اَوْلَاٰی** یعنی جنت کا داخلہ صرف یہودیوں اور نصراؤں کے لیے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم ہو! اِنَّ اِلٰہَہِیْ هُوَ الَّذِیْ اَن سَمَہِیْ کہ دیں، ہدایت تو وہی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ کسی پارٹی کا باطل پر پختہ ہونا حق کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہدایت یافتہ وہ ہے جو ہدایت من جانب اللہ پر عمل کرتا ہے۔ یہودیت اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ یہ اصل دین کی منسوخ شدہ صورت ہے اور اس میں کفر اور شرک کی آمیزش ہے۔ اگر صحیح ہدایت کی تلاش ہے، تو وہ ہدایت ایسی ہے۔ جو اللہ کے نبیوں پر نازل ہوئی۔ اور جس کی آخری کڑی قرآن پاک ہے **اَنْ یَّکُوْنَتْ اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اَوْ تَشِیْطُ** یہ کہ کسی دوسرے کو بھی ایسی ہی چیز دی گئی ہے جو تم کو دی گئی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ آیت کے اس حصے کا تعلق گذشتہ حصہ **وَلَا تَوَہْمُوْا اِلٰہَ لَہُنْ شَیْءٌ دِیْنُکُمْ** کے ساتھ ہے۔ یعنی یہودی اپنے ہی دینی بھائی ہندو کو کہہ رہے ہیں۔ کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی تصدیق نہ کرنا، کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے کو بھی ویسی ہی فضیلت، برتری یا کتاب دے دی جائے جیسی تم کو دی گئی ہے تمہارا دین ہی برتر اور افضل ہے۔ لہذا اسی پر قائم رہنا۔ اور ان خیال کی عدم تصدیق کی دوسری حکمت یہ ہے کہ **اَوْ یَّحْجُوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ** یا وہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کے پاس جھگڑا کریں۔ اس کے درمطالعہ ہو سکتے ہیں کہ اگر تم نے اہل ایمان کی تصدیق کر دی تو پھر بحث مباحث میں تم پر غالب

تھے۔ پھر جب دجال کا زمانہ قریب آئے گا تو اس علاقہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جائے گا اس کے بعد پھر مسلمان غالب آجائیں گے۔

الغرض اس جہاد کی کمان مشور سپہ سالار خالد بن ولید کے بھائی عبدالرحمن بن ولید کو سہ تھے۔ میدان جنگ کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ سامنے دشمن تھا۔ اور مسلمانوں کے پیچھے دیوار تھی، مگر یہ مسلمان گھسے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان جذبہ جہاد میں کفار کی صفوں میں گھس گیا، بڑے زور شور سے حملہ کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یرموک کی لڑائی میں حضرت زبیرؓ لاکھ سوار لاکھ کفار کی صفوں پر تنہا حملہ آور ہوئے تھے۔ اسی طرح یہ گھوڑ سوار صحابی دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے اور پھر اُدھر سے حملہ آور ہو کر واپس آئے۔ اس موقع پر ایک شخص نے یہ آیت پڑھی وَلَا تَنْتَظِرُوْا اَنْ يَّجِيْدَكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو تنہا اتنے بڑے لشکر میں گھس جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

حضرت ابوالدب النصارىؓ دہاں موجود تھے، کہنے لگے بھئی اس کا یہ مطلب نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ یہ آیت تو ہمارے یعنی انصار مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کو ترک کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی اگر تم نے جہاد سے منہ موڑ لیا۔ تو من حیث القوم زندہ نہیں رہ سکو گے۔ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ہم نے مہاجرین کی مینز بانی کی، پھر اسلام کی خاطر جنگیں بھی لڑیں، پھر جب دین کو کافی مدد تک غلبہ حاصل ہو گیا۔ تو ہم انصار نے خیال کیا کہ ہم مالی لحاظ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں لہذا اب ہمیں اپنے کاروبار اور زمینوں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بات سمجھا دی۔ کہ کاروبار میں مصروف ہو کر جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ کو ترک نہ کر بیٹھنا۔ اگر ایسا کیا تو ذلیل و خوار ہو جاؤ گے، ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ لہذا جہاد کے لیے ہر آن اور ہر لمحہ کمر بستہ رہو۔ مطلب یہ ہے کہ دشمن کی صفوں میں گھس جانا

بَادِيَاجَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا ۖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ تُمُّوْا حَيْدَ اُمَّةٍ تَمَّ سَبِّ اُمَمَتُوْنَ سے بہترین امت ہو۔ گویا آخری امت کو اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ اہم پر برتری عطا کر دی۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب سے پہلے میری امت کا فیصلہ ہوگا اور جنت میں بھی سب سے پہلے یہ آخری امت ہی جائے گی۔ لہذا اہل کتاب کی دائمی برتری کا دعویٰ باطل ہے۔

فَرِیَا قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ اِنَّیْ مَغْمِرٌ مَّوْجٍ عَلَیْہِمْ وَاِنَّکُمْ لَمِنْ اُمَّةٍ خَلَلَتْ۔ کہیں کہیں کہ فضل تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ لَمِنْ اُمَّةٍ خَلَلَتْ۔ وہ جس کو چاہتا ہے، فضل عطا کر دیتا ہے۔ جب تک بنی اسرائیل اس کے احکام پر عمل پیرا رہے، اللہ نے اُن کو فضیلت عطا کی۔ پھر جب اُن کی صلاحیت ختم ہو گئی، تو اللہ نے فضیلت والی نعمت بھی اُن سے واپس لے لی۔ اور دوسری امت کو نئے دی۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ ہر امت کی صلاحیت کو جانتا ہے اور پھر اُس کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق حضور علیہ السلام کا اشارہ تھا۔ کہ میری امت کے عروج کا زمانہ نصفِ دین سے کم کا نہیں ہوگا۔ اور نصفِ دین پانچ سو سال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ تقریباً چھ سو سال تک دنیا میں مسلمانوں کو مکمل عروج حاصل رہا۔ پھر حوجوں ان کی صلاحیت ختم ہوتی گئی، اقتدار بھی ان سے چھینا گیا۔ اب گذشتہ آٹھ سو سال سے پستی میں جا رہے ہیں۔ اور دوسری اقوام مادی لحاظ سے ترقی پر ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔ جب تک صلاحیت موجود رہی برتری حاصل رہی، جب صلاحیت ختم ہو گئی، تو فضیلت بھی چھین گئی۔

فَرِیَا فِضْلِیْتِکَ کَا مَالِکٍ وَہے بِمَحْتَضِیْنِ حِمَّتِہَا مِنْ یَّکْشَاہُ وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے۔ اپنے اپنے وقت

قانون صلح و جنگ

اہم محمدؐ نے سیر کبیر اور سیر صغیر دو مشہور کتابیں لکھی ہیں ان میں سیر کبیر اسلام کے قانون صلح و جنگ کے متعلق ہے۔ اسلام کے اس قانون کو سمجھنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی کتاب نہیں۔ اس میں اس حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم آثار صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کی روشنی میں مسائل صلح و جنگ کو حل کیا گیا ہے۔ ان کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہوا کہ اگر کفار کی کثیر تعداد سامنے موجود ہو تو اس کے ساتھ ایک تنہا مسلمان کو جنگ کرنا کس حد تک درست ہے۔ جب کہ اس کی جان تلف ہو جانے کا غالب گمان ہو۔ اہم صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کرنے سے دشمن کو نقصان پہنچ سکتا ہو جس کا بحیثیت مجموعی مسلمانوں کو فائدہ ہو تو اس قسم کی قربانی پیش کرنا روا ہے۔ اور اگر ایسا کرنے سے نہ کفار کو نقصان پہنچ سکتا ہو، اور نہ ہی اسلام کو فائدہ ہو تو پھر محض جان کا ضیاع ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

بیان پر مطلق حکم ہے۔ **وَأَنْفَقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ** یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ اللہ کا راستہ کون سا ہے۔ قرآن پاک میں اس کی مختلف مدت بیان کی گئی ہیں۔ **مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ** میں بھی یہی بات ہے خرچ کریں مگر کہاں۔ تو اس کی تشریح پہلے آچکی ہے۔ سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرو اور پھر حج و عمرہ کا خرچہ ہے۔ غزوات و ساکین پر خرچ کرو۔ اس کے بعد دفاع ہے اور اسی میں جہاد فی سبیل اللہ بھی آتا ہے۔ اور پھر اللہ کے راستے کی آگے کی شاخیں ہیں۔ جیسے دین کی تعلیم کا شعبہ ہے تفصیلاً و تالیف کی مدد ہے، مجاہدین کی اعانت ہے۔ ان سب امور پر خرچ کرنے کا حکم ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، محض زکوٰۃ ادا کر لینے سے سارے مالی حقوق ادا نہیں ہو جاتے بلکہ **إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا** سَوَى الزَّكَاةِ حَضَرَ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق باقی ہے۔ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس کے بعد صدقہ فطر واجب ہے۔ قربانی بھی واجب ہے۔ اسی طرح اعزہ و افاہر سب پر خرچ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اخراجات سنت اور مستحب ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْعَمْرَانِ ۲

درس بست و پیغ ۲۵

آیت ۴۵، ۴۶

وَمَنْ أَهْلُ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِنطَارٍ
يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِدِينَارٍ
لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَٰلِكَ
يَا نَهْهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّينَ سَبِيلٌ
وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٥﴾
بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾

ترجمہ: اور اہل کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس ایک قنطار
امانت رکھیں۔ تو وہ اس کو تھاری طرف لوٹائے گا۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہیں
کہ اگر آپ ان کے پاس ایک دینار امانت رکھیں، تو اُسے آپ کی طرف واپس
نہیں کرے گا، جب تک کہ آپ اُس پر قائم نہ رہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں
کہ ہم نے اُپر پڑتی لوگوں کے حق میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور یہ لوگ اللہ پر جھوٹ
کہتے ہیں۔ اور وہ جانتے ہیں ﴿۴۵﴾ کیوں نہیں۔ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے گا
اور ڈرتا ہے گا۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ ڈرنے والے اور تقویٰ
اعتقاد کرنے والوں کو ﴿۴۶﴾

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی دینی خیانت کا ربط آیات
ذکر فرمایا تھا کہ اہل اسلام کو گمراہ کرنے کے لیے کیسی کیسی تدبیریں اختیار کرتے
ہیں۔ اس کے علاوہ تبلیغ کا ذکر تھا۔ کہ یہ لوگ حق کو باطل کے ساتھ غلط طوطی
میتے ہیں اور حق کو چھپاتے ہیں۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ اہل کتاب باطل

زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ یہ وظیفہ محض علم دین کی تحصیل کے لیے دیا گیا تھا اور وہ لوگ ذرا بے کسی پالیسی کے پابند نہیں تھے۔ جیسا کہ آجکل یورپ و کرسی کا شیوہ ہے کہ کسی کو چند لکے دیکر اس کا دین ایمان تک خرید لیا۔ ایسا نہیں تھا۔

آج مسلمان تبلیغ دین کے لیے کتنی رقم خرچ کر رہے ہیں۔ عیسائیت کا راستہ بند کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اربوں روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ لہیں سکول کے نام پر، کہیں کسی ہسپتال کی آڑ میں اور کہیں کسی اور رفاہی ادارہ کی صورت میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مگر سچے دین کا داعی مسلمان جس سے مس نہیں ہوتا۔ خدا کا فرمان ہے خرچ کر دو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مگر ہم پر کوئی اثر نہیں۔ ایسی صورت حال میں دشمن غلبہ حاصل نہیں کرے گا، تو اور کیا ہو گا۔

احسان کرو

فرمایا، وَأَحْسِنُوا یعنی مستحقین کے ساتھ احسان کرو۔ قربت دالیں غریبوں، مسکینوں، یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگر اللہ کی رضا چاہتے ہو تو اللہ کے راستے میں خرچ کر کے احسان جیسے اہم اصول پر عمل کرو۔ دگر نہ اللہ تعالیٰ ظلم و زیادتی کرنے والوں، کفر و شرک اور بدعات کے مرتکبین کو کبھی پسند نہیں فرماتا۔

کے پاس ۱۲ سواؤنس چاندی امانت رکھی۔ ایک
 اونس چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے۔ جب اُس شخص نے اپنی امانت طلب
 کی تو عبداللہؑ نے کوئی پس و پیش نہ کی اور امانت اس کے حوالے کر دی۔ ایک
 دوسرا یہودی عالم فحاص بن عازر دانتا تھا، اس کا حال یہ تھا کہ قریشِ خاندان کا کوئی مسافر
 مدینے آیا۔ تو فحاص کو شکل و صورت سے بڑا بزرگ شخص خیال کر کے ایک دینار
 اس کے پاس امانت رکھ دیا۔ مگر جب اپنی امانت واپس لینا چاہی تو فحاص نے
 انکار کر دیا کہ میں نے تمہاری کوئی امانت نہیں رکھی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ پاس ہی
 اس کا شاگرد تھا۔ اُس نے کہا کہ حضرت اس شخص کی امانت آپ کے پاس موجود ہے
 اُسے واپس کر دیں۔ کہنے لگا، ٹھیک ہے میں نے ایک دینار اس سے لیا تھا۔
 مگر یہ اُمّی (ان پڑھ) لوگ ہیں، ان کا مال ہضم کر جانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ ہمارے
 لیے جائز ہے۔ کیونکہ ہم اللہ کے محبوب ہیں اُنْحَنُ ابْنَاءُ اللّٰهِ وَاجِبُ اَمْرِهِ
 یہ لوگ ہمارے مرید ہیں۔ ان کا مال ہمارے لیے حلال ہے۔ آخر ہم نے علم حاصل کیا
 ہے۔ اس کے لیے محنت کی ہے، خرچ کیا ہے، وہ ان سے پورا نہیں کریں گے،
 تو اور کس سے کریں گے۔ جب وہ مسافر واپس ہو گیا۔ تو ایک دوسرا یہودی نے
 اُسے یہ ترکیب بتائی کہ تم امانت دار سے یوں کہو کہ میں نے تمہیں نیک آدمی سمجھ کر تمہارے
 پاس امانت رکھی تھی۔ اگر میری امانت واپس نہ کی تو میں مدینے میں یہ اعلان کروں
 گا کہ فلاں شخص میری امانت کھا گیا ہے اور تم بدنام ہو جاؤ گے، چنانچہ اس بدنامی سے
 ڈرتے ہوئے فحاص نے وہ ایک دینار واپس کر دیا۔ غرضیکہ ان واقعات کے
 پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اہل کتاب میں سے بعض ایسے
 ہیں کہ ڈھیروں مال امانت کے طور پر ان کے پاس رکھو، تو وہ عند الطلب لوٹا
 دیتے ہیں۔ اور اس میں ذرہ بھر خیانت نہیں کرتے اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ایک
 دینار امانت رکھ کر مکر جاتے ہیں۔

اُس زمانے میں دینار سونے کا سکہ ہوتا تھا، جس کا وزن چارٹھ ہوتا تھا۔ اور دینار محمدیہ

خاص طور پر حج کے اوقات معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ لہذا قمری مہینے کی تقویم ضروری ہے۔ حج اور اس کے ساتھ جہاد کا بیان بھی اگیا ہے۔ قتال فی سبیل اللہ کی غرض و غایت بھی آگئی ہے کہ اس سے مقصود فتنہ و فساد کی بیخ کنی ہے۔ جہاد ہی کے ضمن میں انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اس کے بغیر جہاد کی تکمیل ممکن نہیں۔ اور اگر جہاد کا جذبہ ختم ہو جائے گا تو دشمن غالب آجائے گا۔ حرمت ملے مہینوں کا بیان بھی آچکا ہے۔ کہ یہ کون کون سے مہینے ہیں۔ اور پھر ان میں قتال کے کیا احکام ہیں۔ مسلمانوں کو ان مہینوں کا پورا پورا احترام کرنے کا حکم دیا گیا، تاہم اگر کفار لڑائی سے باز نہ آئیں، تو پھر مسلمانوں کو بھی اس کا جواب دینے کی اجازت دی گئی ہے۔

حج اور عمرہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور اس سفر کے دوران اگر احصار پیدا ہو جائے یعنی رکاوٹ کھڑی ہو جائے اور کوئی شخص حج و عمرہ کی تکمیل نہ کر سکے، تو اُسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ مسائل بیان ہوئے ہیں حج اور عمرہ کے ارکان ملتے جلتے ہیں، تاہم ان کی ادائیگی کے اوقات مختلف ہیں۔ عمرہ کو حج اصغر بھی کہتے ہیں اور یہ سال بھر کے تمام ایام میں ہو سکتا ہے۔ حج کے ادا کیا جاسکتا ہے۔ حج مخصوص ایام یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تا تیرھویں تاریخ کو ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔ ان ایام کے علاوہ کسی اور تاریخ پر حج ادا نہیں ہو سکتا۔ حج عمرہ میں صاحب استطاعت کے لیے ایک دفعہ فرض ہے، البتہ عمرہ سنت ہے ہاں اگر ایک دفعہ اس کی نیت کر لے تو پھر واجب ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر عمرہ کا احرام باندھ لیا ہے، تو پھر لازماً اس کو پورا کرنا پڑے گا۔ اگر سفر کے دوران کوئی رکاوٹ پڑ جائے اور انسان عمرہ مکمل نہ کر سکے۔ تو اُسے بہر حال قضا کرنا ہوگا اب اُس کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ خود حضور علیہ السلام کا عمل موجود ہے۔ آپ نے صحابہ کرامؓ کے ہمراہ سہ ماہی میں عمرہ کا سفر اختیار کیا مگر مدینہ کے مقام پر کفار نے روک دیا اور بغیر عمرہ ادا کیے واپس جانا پڑا۔

کوئی حق نہیں دیا۔ اللہ جل جلالہ نے جاہلیت کی تمام باتیں (رسومات) میرے پاؤں کے نیچے روند دی ہیں۔ ان کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ اِلَّا اَلْاَمَانَةُ سوائے امانت کے کیونکہ اِنَّهَا ثَوْدَةٌ اِلَیَّكَ الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ امانت خواد نیک آدمی کی ہو یا بُرے شخص کی، اسکا ادا کرنا ضروری ہے۔ اس میں دوستی اور دشمنی کو کوئی دخل نہیں۔ کوئی شخص کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، جاہل ہو یا عالم، امانت بہر حال واجب الادا ہوتی ہے۔ دھوکہ دہی، چوری، خیانت وغیرہ کا مال قطعاً حرام ہے ہاں اگر کوئی اپنی خوشی سے کسی کو کچھ دے دے تو لینے والے کے لیے جائز ہے۔ وگرنہ امانت کی ادائیگی ہر ایک کے لیے لازم ہے۔

تقسیم ہند کے موقع پر لوگوں نے ایک دوست کا مال کھلے عام کھایا خوب لوٹ مار کی۔ یہ قطعاً حرام ہے۔ اس کا حساب قیامت کو دینا پڑے گا۔ ہندو تو جیسے ہی کافر ہے۔ اگر کسی مسلمان نے ہندو کا مال کھایا ہے۔ تو وہ بھی معاف نہیں ہوگا۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ ہم جہاد کے لیے جلتے ہیں۔ ذمیوں کے علاقے سے گزرتے ہوئے کوئی بیضر بجسی یا سرخی وغیرہ مل جائے تو ہم کھا لیتے ہیں۔ آخر ہم غازی ہیں ذمیوں کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ حضرت ابن عباسؓ ناراض ہوئے اور فرمایا یہ تو وہی بات ہے جو یودیوں نے کی تھی۔ لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیَّیْنَ سَبِیْلٌ یعنی امیوں کا مال کھا جانے میں کوئی حرج نہیں۔ فرمایا جب ذمی لوگ مسلمانوں کو جزیہ ادا کرتے ہیں تو پھر ان کے مال و جان کی حفاظت ہم پر لازم آتی ہے۔ ان کے مال کو اٹھی رضامندی کے بغیر کھانا حرام ہے۔

فرمایا بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ اگر آپ اس کے پاس کثیر مال بطور امانت رکھیں، تو وہ لوٹا دے گا۔ اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ایک دینار بھی امانت رکھیں، تو یہ بر اصرار وہ واپس نہیں کرے گا۔ ہاں امانت کی واپسی کی ایک صورت ہے اِلَّا اَمَّا دُمْتُ عَلَیْهِ فَاَیُّمًا کہ تو اس کے سر پر سوار ہے۔ یعنی وقتاً فوقتاً مطالبہ کرتا ہے۔ ام ابوجنیضؓ نے اسی سے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ قرض خواد اپنے قرض کا چھپا کر لکھتا ہے۔

یہی کچھ ہوتا ہے حاجی کو ہاروں اور اب خاص طور پر کرنسی نوٹوں کے ہاروں سے لادا جاتا ہے۔ اور اگر ہار ہٹانے والا کرنی نہیں پہنچا تو اپنے پاس سے ہار نکال کر گلے میں ڈال لیا جاتا ہے۔ کہ حاجی کی پہچان ہو۔ یہ سب فخریہ چیزیں ہیں۔ ان کی وجہ سے رضا خالص اللہ کی نہیں رہتی بلکہ اس فعل میں دوسرے لوگوں کی رضا کو بھی شامل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اور یہی چیز لفظ اللہ کے مفہوم کے خلاف ہے۔

فرمایا حج اور عمرہ کو اللہ کی رضا کے لیے پورا کرنا اُحْصِیْہ پھر اگر تم روک دیے گئے۔ یعنی تم نے احرام باندھ کر حج یا عمرہ کا سفر شروع کر دیا ہے۔ اور راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی تو احصار کہتے ہیں۔ احصار کی تعریف کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہم شافعی کے نزدیک شرعی احصار صرف ایسی صورت میں شمار ہوتا ہے۔ جب حج و عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے۔ اس کی مثال سترہ میں حضور علیہ السلام اور صحابہ کا واقعہ ہے۔ جب ان کو مدینہ کے مقام پر روک دیا گیا اور آپ بغیر عمرہ کے مدینہ طیبہ کو لوٹ گئے۔ اہم ابو حنیفہ کے ممالک کے مطابق دشمن کی رکاوٹ کے علاوہ بیماری یا حادثہ بھی احصار کا سبب بن سکتا ہے۔ کوئی ایسی تجارتی لائق ہو گئی ہے جس کی وجہ سے خانہ حج سفر نہیں کر سکتا یا کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا ہے، سخت زخمی ہو گیا ہے، ٹانگ زخمی ہو گئی ہے کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے۔ کسی دھننے نے راستہ روک رکھا ہے۔ سیلاب آ گیا ہے یا کسی اور وجہ سے راستہ ٹک گیا ہے۔ یہ بھی شرعی احصار کی تعریف میں آئے گا۔

اس قسم کی صورت حال کے متعلق ارشاد فرمایا فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَاجِ جَوْسِتَر ہو قربانی کر دو۔ احرام باندھ کر حج و عمرہ سے محروم ہونے کی صورت میں قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ ایک بکری یا گائے یا اونٹ جو بھی میسر ہو، قربانی کر دے اور احرام کھول دے۔ یہ قربانی کس مقام پر کھے، اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ جس مقام پر کوئی ٹک جائے، وہیں قربانی کر کے احرام

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

اِلٰی عِمْرَانَ ۳

درس بست و شش ۲۶

آیت ۷۸ تا ۸۰

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا
 قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ لَا خَلٰقَ لَهُمْ فِيْ الْاٰخِرَةِ وَلَا يَكْلَهُمُ
 اللّٰهُ ۚ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يَزْكِيْهِمْ
 وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۸﴾ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا ۙ
 يَّسْلُوْنَ اَلْسِنَتَهُمُ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنْ
 الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا
 هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكُذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ:۔۔ بیشک جو لوگ اللہ کے عہد و اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی سی قیمت خریدتے
 ہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور اللہ ان سے کلام نہیں کہے
 گا۔ اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا قیامت کے دن۔ اور نہ ان کو پاک کرے گا۔
 اور ان کے لیے دردناک عذاب ﴿۷۸﴾ اور بیشک ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ
 ایسا ہے۔ جو مڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ، تاکہ تم ان سے کتاب سے
 گمان کرو۔ حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب
 سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے اور یہ اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں اور یہ جانتے ہیں ﴿۷۹﴾

اس سے پیشتر اہل کتاب کی دینی اور مالی خیانت کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ آج کی پہلی کتاب کی
 آیات بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں اور ان میں اہل کتاب کی تیسری بڑی خیانت کا ذکر ہے
 یہ لوگ ان پیش گوئیوں کو چھپاتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتب میں قرآن کریم اور
 حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازل فرمائی تھیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے

نہیں کاٹ سکتا۔ بیوی کے پاس نہیں جاسکتا وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر مجبور کسی پابندی کو توڑنا پڑے۔ تو پھر اس کے عوض میں فدیہ دینا پڑتا ہے۔ یہاں پر اسی مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّنْ رَّأْسِهِ یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو ففدیۃ مِّنْ صَّيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ پس فدیہ ہے روزے سے یا صدقہ ہے یا قربانی ہے۔ یعنی غدر کے ساتھ احرام کی پابندی توڑنے کی صورت میں ان تین چیزوں میں سے کوئی ایک ادا کرنی ہوگی۔ تین روزے رکھنے یا صدقہ میں تین صاع گندم ادا کرے یا کم از کم ایک بھیڑ یا بکری ذبح کرے۔ عہدہ کی صورت میں چھ مساکین کو نصف صاع گندم فی کس ادا کرنا ہوگا۔

حضرت کعب بن عجرؓ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ ہانڈی پکانے کے لیے آگ جلا رہے تھے اور آپ کے سر سے جوئیں شیشے گر رہی تھیں حضور علیہ السلام کا گزیر ہوا تو فرمایا تمہارے سر کے جانور تمہیں بہت ستاتے ہیں؟ عرض کیا حضور! واقعی بہت ستاتے ہیں۔ مگر میں نے احرام باندھا ہوا ہے کیا کر سکتا ہوں حکم ہوا اگر سر منڈوانا ہے۔ تو ایک بھیڑ یا بکری کا دم دیدے یا چھ مساکین کو صدقہ دے یا تین دن کے روزے رکھ لے، اس جنایت کی تلافی ہو جائے گی۔

حج کا اتمام

حج کی تین قسمیں ہیں یعنی افراد، قرآن اور تمتع۔ افراد حج یہ ہے کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھے اور حج کر کے احرام کھول دے۔ اس میں عمرہ شامل نہیں ہوتا۔ دوسری صورت قرآن ہے کہ کوئی شخص میقات سے عمرہ اور حج کا مشترکہ احرام باندھے۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہ کھولے بلکہ اُسی احرام سے ایام حج میں حج کرنے کے بعد یعنی دس تا دس بج کر احرام کھول دے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کیا تھا کیونکہ احرام میں واضح طور پر آتا ہے کہ آپ نبیہ میں کہتے تھے لَکِنَّا لَنَحْنُ ذُرِّيَّةُكَ وَنَحْنُ ذُرِّيَّةُكَ

وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اُس پر غضبناک ہوگا۔ آپ نے یہ آیت بھی تلاوت فرمائی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْكُرُوْنَ بَعْدَ اللّٰهِ وَاِيْمَانِهِمْ
حضرت اشعث بن قیس فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔

اہل کتاب
کی بڑھتی

ارشادِ ربانی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْكُرُوْنَ بَعْدَ اللّٰهِ وَاِيْمَانِهِمْ
ثَمَنًا قَلِيْلًا جَرَلُوْا بِنَفْسِهِمْ اَوْ قِسْمًا مِّنْهُ سَلَسَلُوْا
ہیں اُولٰٓئِكَ لَا خَلٰقَ لَهُمْ فِيْ الْاٰخِرَةِ اُنْ کے لیے آخرت میں کچھ
نہیں۔ دنیا کا مال جس قدر بھی زیادہ ہو۔ آخرت کے مقابلے میں بالکل حقیر ہے۔
مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعٌ یہ دنیا کی زندگی تو تھوڑا سا بستے کا سامان
ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ آپ کہ دیں دنیا کا سامان اسباب
آخرت کے مقابلے میں بالکل قلیل ہے۔ لہذا دنیا کے حقیر مال کو ناجائز ذرائع سے
حاصل کرنے والوں کو آخرت میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وَلَا يَكْلَمُهُمُ اللّٰهُ اور
اللہ ان سے شفقت و مہربانی کے ساتھ کلام نہیں کرے گا۔ غصے اور باز پرس کی
صورت میں تو ضرور کلام کرے گا۔ مگر لطف و کرم کے ساتھ گفتگو نہیں فرمائے گا۔
وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور نہ نگاہِ شفقت سے ایسے لوگوں
کی طرف دیکھے گا۔ وَلَا يَزَكِّيْهِمْ اور ان کو پاک بھی نہیں کرے گا۔ یہ
ہیشہ سجاستوں میں لت پت رہیں گے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اور
وہ عذاب الیم کا شکار ہوں گے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے عہد لیا تھا کہ ہر نبی برحق کی حمایت
کرنا اس پر ایمان لانا اور اس طرح خدا تعالیٰ کے عہد کی پابندی کرنا۔ مگر ان لوگوں
نے عہد کو توڑ دیا۔ انبیاء کی تکذیب کی اور اللہ کے احکام کو چھپایا۔ کلامِ الہی میں
تحریف کی۔ جھوٹی قسم کھا کر دنیا کا مال حاصل کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد کی پابندی
کی سخت تاکید کی تھی، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَكَانَ عَهْدُ
اللّٰهِ مَسْمُوعًا۔ اللہ کے عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ

سکتا ہے۔ البتہ ایسی قربانی کو محدود حرم کے اندر ذبح کرنا ضروری ہے۔

بعض صورتیں ایسی بھی پیش آسکتی ہیں کہ انسان قربانی کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ ایسے ہی حالات کے متعلق فرمایا فَمَنْ لَمْ يَجِدْ جو کوئی قربانی نہ پائے فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ تو وہ ایام حج میں تین روزے رکھے وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ اور سات اس وقت جب تم واپس لوٹ جاؤ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ یہ پورے دس ہو گئے۔ یعنی جو شخص حج قرآن یا حج تمتع ادا کرے اور قربانی کرنے کے لیے اس کے پاس مال نہ ہو یا جانور نہ مل سکے، تو اس قربانی کا نعم البدل دس روزے ہیں۔ تین روزے تو واضح ہیں کہ ایام حج میں رکھے جائیں گے یعنی ذی الحج کی سات، آٹھ اور نو رکھتے جائیں۔ کیونکہ دس تاریک کو روزہ رکھنا منع ہے۔ البتہ سات روزوں کے متعلق اختلاف ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واپس لوٹنے سے مراد حاجی کا اپنے وطن پہنچنا ہے۔ اور یہ روزے اُسے اپنے گھر آکر رکھنا چاہئیں۔ مگر امام عاصم فرماتے ہیں کہ واپس لوٹنے سے مراد حج سے واپسی ہے۔ جب ایام حج ختم ہو جائیں تو یہ سات روزے اگر قیام ہو تو حرم میں رکھے جاسکتے ہیں۔ یا راستے میں یا گھر واپس آکر ہر طرح درست ہے۔ دس روزے پورے کرنے سے قربانی کی تلافی ہو جائے گی۔ اور حاجی کا قرآن یا تمتع درست ہو جائے گا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایام حج میں تین روزے لازمی ہیں۔ اگر یہ جھوٹ گئے تو پھر باقی سات رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اُسے بہر حال دم دینا پڑے گا۔

تمتع کی شرط

فرمایا حج تمتع اور قربانی کے مسائل کے متعلق شرط یہ ہے ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلًا حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کہ تمتع کرنے والے کا گھر بار مسجد حرام کے پاس نہ ہو۔ یعنی حج تمتع اس شخص کے لیے روا ہے جو حدود حرم کا پہننے والا نہ ہو بلکہ آفاقی ہو۔ حدود حرم کے پہننے والے اور محلی تو جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں۔ حدود حرم سے باہر جا کر احرام باندھیں اور مکہ مکرمہ آکر

ہیچ امدادیت میں آتا ہے۔ کہ تین قسم کے آدمی اس زمرہ میں آتے ہیں اُنْشَبِلْ وہ شخص جو اپنے پاجامے یا تہ بندہ۔ پتوں و ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔ مردوں کے نیلے مکروہ تحریمی ہے۔ البتہ عورتیں مستثنیٰ ہیں۔

دوسرا شخص وَالصَّنْفَقُ سُلْعَتُهُ جو جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچتا ہے۔ گو وہ کو جہوتا یقین دلاتا ہے۔ اور تیسرا شخص الْمَنَانُ ہے۔ جو کسی پر احسان کر کے جلاتا ہے اس کا نہ صرف احسان ضائع ہوا۔ بلکہ وہ بھی بمرضِ گروہ میں شامل ہو گیا۔ ایک حدیث میں منور بنی کہیم کا ارشاد ہے تین شخص ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ بغض رکھتا ہے پہلا شخص

الْأَخْبِلُ الْخِلَافُ یعنی قسین

کھانے والا ناجر ہے۔ وَالْفَقِيرُ الْمُحْتَالُ دوسرا شخص وہ ہے جو محلج ہو کر غرور کرے۔ وَالْخَبِيلُ الْصَّكَّانُ اور تیسرا شخص احسان جلالنے والا بخیل ہے ان تینوں اقسام کے آدمیوں سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔

پھر فرمایا تین زمرہ کے لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پہلا محروب لوگ شخص وہ ہے جو دشمن کے مقابلے میں جہاد کرتا ہے۔ پھر یا کو فتح تک پہنچتا ہے یا شہید ہو جاتا ہے۔ فرمایا دوسرا محبوب آدمی وہ ہے۔ جو کسی قافلے میں شامل ہو کر سفر پر جاتا ہے۔ پڑاؤ کے مقام پر قافلے والے سو جاتے ہیں اور وہ خدا کے حضور کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے اللہ کے سامنے اپنی مناجات پیش کرتا ہے۔ پھر جب نماز فجر کا وقت ہو جاتا ہے۔ تو اپنے ساتھیوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ فرمایا تیسرا محبوب خدا وہ شخص ہے۔ جو پڑوسی کی تکالیف پر صبر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اُسے موت آجائے یا وہاں سے علیحدگی اختیار کرے۔ ان اقسام کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔

آیت زیر درس میں یہودیوں کا ذکر اُس گروہ میں کیا گیا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔ وہ بخوض لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کو توڑا اور جھوٹی قسمیں کھائیں

سَبَقُولُ ۲

درس ہشاد ویک (۸۱)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۹۷ تا ۱۹۸ تقریباً نصف

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۚ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَالتَّقْوَىٰ يَأُولَىٰ الْأَلْبَابِ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ ۚ

وَقَدْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ترجمہ: حج کے چند مہینے ہیں، جو معلوم ہیں۔ پس جس شخص نے حج کو لازم کر لیا ان مہینوں میں، پس عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہونا جائز نہیں ہے اور زنگاہ کی بات اور نہ حج میں جھگڑا کرنا۔ اور جو کچھ کرو تم نیکی سے اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے اور تو شر بنا لو۔ بیشک بہتر ترشہ تقویٰ ہے۔ اور مجھ سے ڈرو، اے عقل مند (۱۹۷)

تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو

اس سے پہلے جہاد اور حج کا مشترکہ حکم بیان ہو چکا تھا کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اگر کوئی رکاز ٹپ پیدا ہو جائے یعنی بیماری لاحق ہو جائے یا دشمن کی وجہ سے راستہ غیر محفوظ ہو جائے تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں احصار کا مسئلہ بیان ہوا۔ اس کے بعد تمتع اور قرآن کا بیان آیا کہ جسے حج اور عمرہ نصیب ہو جائے یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ایسے شخص کو دم یعنی قربانی دینا ہوگی۔ اگر قربانی کی استطاعت نہیں ہے۔ تو دس روزے رکھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

ربط آیات

ان آیات میں بھی حج کے مختلف احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرکین کی اس تحریف کا رد ہے جو انہوں نے حج سے متعلق زمانہ جاہلیت

انجیل میں موجود لفظ فارقیط کی جگہ مرد گار یا شیفع لکھ دیا۔ اور دس ہزار کی بجائے لاکھوں لکھ دیا۔ اور اس طرح لفظی تحریف کی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ اُس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا۔ آگے فرمایا مَا مَسْتَأْذِنُ الْغُيُوبِ "یہ اس لیے فرمایا کہ ان بد بختوں نے تو رات میں بھی رد و بدل کیا، تو رات میں بھی موجود ہے کہ اللہ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔ مگر ان لوگوں نے آگے بکھ دیا فاسق و فاجر (پھر اس نے آرام کیا) اللہ نے فرمایا یہ تو کفر کا کلمہ ہے۔ کیا خدا تعالیٰ تھک گیا تھا، جو آرام کی ضرورت پڑی۔ اللہ کے ساتھ ایسی بات منسوب کرنا صریح کفر ہے۔ مگر ان لوگوں نے محض ساتویں دن کی چھٹی ثابت کرنے کے لیے یہ لفظ بڑھا دیا۔ یہ بھی تحریف لفظی کی ایک مثال ہے۔ انہوں نے نہ صرف الفاظ کو تبدیل کیا، بلکہ معنوی طور پر بھی مطلب کچھ کا کچھ کر دیا۔

مسلمانوں میں سے اہل بدعت بھی اس بیماری کا شکار ہیں۔ یہ قرآن پاک کے الفاظ کو تبدیل نہیں کر سکتے مگر مطلب سارا الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ جس آیت سے چاہتے ہیں، اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔ دیکھیے میلاد کا موسم آتا ہے۔ پاٹریاں بنائی جاتی ہیں۔ پوچھو بھائی یہ پاٹریاں کیسی ہیں، کہتے ہیں قرآن میں صفا و مردہ پاٹریوں کا ذکر آیا ہے اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَابِ اللّٰهِ کہ یہ پاٹریاں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس قسم کی باتیں قرآن پاک میں صریح تحریف ہے۔ قطعاً ناجائز اور گمراہی کا باعث ہے۔

بہت سے واعظین اور خود ساختہ مفسرین بھی اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ ایک صاحب نے بسم اللہ کی تفسیر کی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اسم اللہ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ حالانکہ اسم اللہ سے اللہ کا نام مراد ہے۔ اور اللہ کا نام بیکہ ہی شروع کرنا چاہیے۔ مگر انہوں نے اس کا معنی تبدیل کر دیا۔ خود پر و فیسر ہیں، محکم ہیں، مگر تفسیر یہ کی ہے کہ مرزا قادیانی نے بھی تو یہی کہا۔ کہ میرا نام سورۃ فتح میں محمد رکھا گیا ہے اور رسول اللہ بھی لکھا ہے (العیاذ باللہ) یعنی لفظ

بطور دم قربان کرنا ہوگی۔ اسی طرح احرام کی حالت میں کوئی مرد سلا ہوا کپڑا حتیٰ کہ موزہ تک نہیں پہن سکتا۔ خوشبو نہیں لگا سکتا۔ سر اور منہ کو ڈھانپ نہیں سکتا۔ عورتیں پہلے ہوئے کپڑے پہن سکتی ہیں مگر خوشبو نہیں لگا سکتیں۔ سر کو ڈھانپ لیں گی مگر چہرہ کھلا رہے گا اس کپڑا نہیں آنا چاہیئے۔ اگر کوئی عورت پردہ کرنا چاہے تو چہرہ پر کوئی نکرٹری وغیرہ رکھ کر اوپر نقاب ڈال سکتی ہے۔ جس سے کپڑا چہرے کو نہ لگے۔ احرام کی حالت میں نیکار کرنا بھی منع ہے اس کے متعلق واضح حکم ہے: ”حُرِّمَ عَلَيْكَ هَيْئَةُ التَّيَمُّمِ مَا دُمْتَ حُرِّمًا“ جب تک تم احرام میں ہو، نضحیٰ کا شکار نہیں کر سکتے بلکہ کسی جانور کو ذبح بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کرو گے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ لہذا اس کو کوئی دوسرا شخص بھی نہیں کھا سکتا گویا یہ سب چیزیں احرام کی حالت میں ممنوع ہیں۔

بے محابی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے آپ پر حج کو لازم سمجھے، تو فَلَا رَفْثَ حج میں رفث نہیں ہے۔ لفظ رفث عام ہے۔ اس کا اطلاق معمولی بے پردگی سے لے کر مباشرت تک ہوتا ہے۔ عورت کے ساتھ بوس و کنار شہوانی باتیں اور مباشرت سب رفث میں آجاتا ہے غیر عورت کے ساتھ قریہ چیزیں ہر وقت حرام ہیں مگر احرام کی حالت میں یہ افعال اپنی بیوی کے ساتھ بھی جائز نہیں ہوتے۔

نافرمانی

وَلَا فُسُوقَ احرام کی حالت میں فسق بھی جائز نہیں۔ اس سے مراد اطاعت سے باہر نکل جانا یا نافرمانی ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں عام حالت میں بھی منع ہیں مگر جب کوئی حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھ لیتا ہے۔ تو ان کی ممانعت میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے حرم کے اندر کوئی گناہ کرنا عام جگہ کی نسبت زیادہ جرم ہے۔ یا جس طرح حرمت کے میوؤں میں کسی گناہ کا ارتکاب دیگر میوؤں کی نسبت زیادہ باعث وبال ہے۔ الغرض احرام کی حالت میں نافرمانی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ فسق کا لفظ نفاق اور اعتقاد پر بھی بولا جاتا ہے۔ عمل پر بھی اس کا اطلاق

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

اِلٰی عَمْرٰن ۳

درس بست و ہفت ۲۴

آیت ۷۹، ۸۰

مَا كَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يُوْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ
وَالنَّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّيْ
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّكُمْ بَيْنَ يَمَای
كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ
تَدْرُسُونَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا
الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّنَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ
بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۸۰﴾

۷۹

ترجمہ: کسی انسان کے لیے یہ بات (ماسب) نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو
کتاب، حکم اور نبوت عطا فرمائے۔ پھر وہ شخص لوگوں سے کہے کہ ہو جاؤ تم میرے
بندے اللہ کے سوا۔ لیکن وہ یوں کہے گا کہ ہو جاؤ رب ہمارے۔ اس وجہ سے
کہ تم کتاب کھلاتے ہو، اور اس وجہ سے تم اس کو پڑھتے ہو ﴿۷۹﴾ اور وہ تم کو
اس بات کا حکم نہیں دے گا، کہ تم اللہ کے فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تم کو کفر
کا حکم دے گا، بعد اس کے کہ تم فرمانبردار ہو چکے ہو ﴿۸۰﴾

اہل کتاب کی مختلف خیانتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہ لوگ دینی، دنیوی اور مالی
لحاظ سے غائن تھے۔ جھوٹ بولتے تھے۔ اللہ کی کتاب کے احکام کو تبدیل کرتے
اور حق کو چھپاتے تھے۔ الفاظ و معانی میں تعریف کے مرکب ہوتے تھے، خود
مسائل گھڑ کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے اور کہتے کہ یہ کتاب کا حصہ ہے
حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں صریح جھوٹ بولتے احسری

حالت تھی حضور علیہ السلام نے دیکھا تو فرمایا کہ اس احرام والے آدمی کا حال دیکھو کہ اس حال میں بھی تو کہہ کر رہا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ احرام کی حالت میں لڑائی جھگڑا، لڑائی لڑائی گالی گلوچ کا تو امکان تک نہیں ہونا چاہیے۔ لَا رَفَثَ لَا فُسُوقَ اور لَحْجَالٍ کا یہی معنی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ مَنْ سَجَّ جَسْنَ شَخْصٍ نَسَجَ كَيْتَا فَلَمْ يَسْرِفَتْ وَلَمْ يَفْسُقْ اور اس لے دوران حج نہ بے حجابی کی بات کی اور نہ نافرمانی کی، تو اس کی حالت ایسی ہے رَجَعَ كَقَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ گویا آج ہی ماں لے اُسے جنا ہے۔ جس طرح نوزائیدہ بچہ گناہ سے بالکل پاک ہوتا ہے اسی طرح ان بُری باتوں سے بچنے والا حاجی گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی حج کو حج مبرور کہا جاتا ہے۔ خود حضور علیہ السلام نے حج مبرور کی دعا کی اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُورًا وَ ذَنْبًا مَغْفُورًا اے اللہ میرے حج کو حج مبرور بنائے اور میری غلطیوں کو معاف فرمائے ایسا حج نصیب فرما جس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہو اور نہ ساتھیوں سے کوئی جھگڑا واقع ہو۔

شیخ سعدیؒ نے اپنی کتاب گلستان میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حاجیوں کا قافلہ جا رہا تھا۔ اور اس میں شامل لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ہم فلاں جگہ خوب لڑے۔ گویا انہوں نے دُورِ فُت دیا تو کسی شریف آدمی نے کہا: اے زین بگو حاجی ہر دم توڑا! حاجی تو نیستی شتر اسف! یعنی میری طرف سے آدمیوں کو کاٹنے والے حاجی سے کہ دیں کہ تو تو حاجی نہیں ہو سکتا، البتہ تیرا دنٹ حاجی ہو سکتا ہے جس پر تو سوار ہے۔ تیرے اندر حاجیوں والی کوئی خصلت نہیں کیونکہ تو نے فُت و جدال کا ارتکاب کیا ہے! اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سخت تنبیہ کے انداز میں فرمایا کہ حج کے دوران بے پردگی گناہ اور جھگڑا قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں بٹھے احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہیں حج میں نقص نہ واقع ہو جائے۔

وَمَا تَفْعَلُوا لِمَنْ خَيْرٌ يَهْتَكُمُ اللّٰهُ اور تم جو بھی نیکی کا کام کر دو گے اللہ تعالیٰ اُسے جانتے ہیں۔ یہاں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ حج کے

نہیں ہونا۔ حالانکہ حدیث شریف میں صریح الفاظ آئے ہیں۔ کسی نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضور علیہ السلام کے اخلاق کے متعلق سوال کیا۔ کواہل نے کہا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ بَشَرًا مِثْلِي عَنِ الْبَشَرِ یعنی حضور علیہ السلام انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ پوچھنے والے نے دریافت کیا تھا۔ کہ حضور علیہ السلام کی گھر پر زندگی کیسی ہے۔ آپ کا اخلاق کیسا ہے۔ آپ گھر میں کیا کیا کام کرتے ہیں تو جواب یہ تھا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں سے ایک انسان ہیں۔ جو کام عام آدمی گھر میں کرتے ہیں، وہ کام اللہ کا نبی بھی کرتا ہے۔ حدیث شریف میں بَشَرًا مِثْلِي عَنِ الْبَشَرِ کا لفظ آتا ہے۔ ثُمَّ مِنْ نَوْبِ اللَّهِ نَبِيٌّ آتَا۔ یہ تو عیسائیوں والا عقیدہ ہے۔ انہوں نے بھی مسیح علیہ السلام کو خدا کا جزو بنادیا۔ اور آج کے مسلمان بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ الغرض! حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا، آنحضرت علیہ السلام گھر میں بچری کا دودھ دودھ لیتے، اپنے کپڑے صاف کر لیتے۔ جوتے کا ٹانکا لگا لیتے، گویا اپنا کام اپنے دست مبارک سے انجام دے لیتے تھے۔

بخاری، مسلم، ترمذی اور دیگر کتب احادیث میں یہ حدیث موجود ہے۔ کہ کچھ لوگ آپ کی خدمت میں ایک مقدمہ لائے تاکہ آپ اس کا فیصلہ فرمائیں۔ حضور علیہ السلام نے اُن سے فرمایا اِنْعَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ بَیْ اَمِنْ اِنْسَانٍ ہوں اور انسان عالم الغیب نہیں ہوتا۔ میں ظاہر میں تمہارا معاملہ سنوں گا۔ اور اس کے مطابق فیصلہ دوں گا۔ ہو سکتا ہے ایک فریق اپنا مقدمہ پیش کرنے میں بڑا چرب زبان ہو اور دوسرا فریق اتنا فصیح نہ ہو۔ فرمایا فَلَعَلَّكُمْ بَعْضُكُمْ اَلْمَنْ مِثْلُكُمْ اِیْمَانٌ ہو کہ میں اس کی دلیل سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ یاد رکھو! جو شخص کسی چیز کا مستحق نہیں ہے۔ وہ اس چیز کو مست لے۔ کیونکہ اس کے حق میں وہ دوزخ کی آگ کا ٹکڑا ہو گا۔ فرمایا میں انسان ہوں۔ باطنی حالات تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ جب وحی نازل ہوتی ہے۔ ملک الملک کی جانب سے علم دیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے۔ فرمایا تمام انبیاء علیہم السلام انسان ہیں اور انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

اسی لیے فرمایا وَتَزَوَّدُوا زادِ راہ سے لیا کرو۔ توشہ بنا کر حج کا سفر اختیار کرو
 آدمی کو چاہیے کہ وہ برائی اور سوال سے بچے۔ توشہ بنانا اور اس کے لیے جائز ذرائع
 اختیار کرنا بالکل درست ہے۔ اسباب کو ترک کرنا درست نہیں۔ البتہ ان ذرائع
 اور اسباب پر بھروسہ رکھنا توکل کے خلاف ہے۔ بھروسہ صرف اللہ کی ذات
 پر ہونا چاہیے۔ وہی ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والا ہے۔ بیماری کی صورت
 میں علاج کرنا درست ہے۔ مگر ڈاکٹر پر بھروسہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ شفا تو جس
 اللہ ہے۔ اگر اللہ چاہے گا تو دوائی میں تاثیر پیدا کر دے گا اور مریض صحت یاب
 ہو جائے گا، ورنہ لاکھ دوائیں استعمال کریں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اللہ چاہے تو پانی
 میں پیاس بجھانے کی تاثیر پیدا کر دے، اور اگر وہ نہ چاہے تو پوری نہر کا پانی پی کر
 بھی استفادہ کے مریض کی پیاس نہ بجھے۔ یہ اُس کے قبضہ قدرت میں ہے
 معلوم ہوا کہ اسباب پر کنٹرول ذاتِ خداوندی کا ہے مگر اسباب کو ترک کرنا
 روا نہیں ہے۔ لہذا حج کا ارادہ کیا ہے۔ تو سواری کا انتظام کرو، سامان ساتھ لو
 اخراجات کے لیے روپیہ پیسہ لے لو اور پھر توکل بر خدا روا ہو جاوے بغیر زادِ راہ
 سفر پر نکلنا تو ایسے ہی عزت نفس اور شرافت کے خلاف ہے۔ اس میں قباحتیں
 پیدا ہوتی ہیں انسان دوسروں پر بوجھ بنتا ہے جو کہ بالکل جائز نہیں۔ لہذا فسریا کہ
 زادِ راہ سے لیا کرو۔

گداگری حرام

جو شخص خالی ہاتھ سفر پر روانہ ہوگا، ظاہر ہے کہ اُسے ضروریاتِ زندگی کے لیے
 ہاتھ پھیلا کر پڑے گا۔ حالانکہ گداگری اسلام میں حرام ہے اس میں شک نہیں کہ آج آدمی
 دنیا کے مسلمان دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ مگر یہ گداگری بہر حال حرام ہے
 شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ چوری، ڈاکہ وغیرہ کی طرح گداگری بھی ایک مضرت پیشہ ہے
 اور حرام ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کسی آدمی کو سوال کرنا دانا نہیں،
 سوائے خاص پریشانی کی حالت میں۔ آپ نے چند آدمیوں کو کچھ وقت کے لیے سوال
 کرنے کی اجازت دی مگر اُس وقت تک جب تک اُن کی حالت درست ہو

نبی کا فہم عقل اور دکاوت تمام انسانوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ نبی عقل انہی ہوتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ ذکی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں کمال درجے کی صلاحیت و دیوت کر رہا ہے۔ آگے فرمایا وَالْمُتَّبِعُونَ یعنی ایسا شخص جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکم کے علاوہ نبوت بھی عطا فرمائے۔ اس کی یہ شان نہیں ہے ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَنَاسِكِ کہ وہ لوگوں سے کہے کو لَوْ اَعْبَادًا اَتَى مِنْ دُونِ اللّٰهِ، اللہ کے علاوہ میرے بندے بن جاؤ۔ یہ بات ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تو نبوت اور رسالت عطا فرمائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلانے کی بجائے اپنی بندگی کی طرف دعوت دے۔ یا کسی دوسرے انسان یا کسی بھی مخلوق کی عبادت کی تلقین کرے، یہ نہیں ہو سکتا اگر ایسی بات ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نعوذ باللہ، اللہ کا انتخاب ہی درست نہیں تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ پر جہالت لازم آئے گی (نعوذ باللہ) کہ اس نے ایسے شخص کو نبی بنایا جو اس نبوت کا اہل نہیں تھا۔ نبی کا منصب تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کار بند ہو اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دے۔ دنیا کے معاملات میں بھی جیسے کسی شخص کو وزارت یا گورنری کے عہدہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ تو اس سے توقع ہوتی ہے کہ وہ حکومت کی پالیسی کے مطابق کام کرے گا۔ اگر کوئی شخص خلاف کرے تو اسے ایک منسٹ کے لیے کسی اعلیٰ عہدے پر بدمذمت نہیں کیا جاتا۔ اللہ کا نبی تو اللہ کا کامل وفادار ہوتا ہے۔ دنیا میں منشا ئے ایزدی کی تکمیل اس کا فرض ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے علاوہ اپنی یا کسی دوسری مخلوق کی عبادت کی دعوت کیسے دے سکتا ہے۔

انبیاء کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان میں موجود بشریت کے تمام تعلقے بہترین طور پر سنور جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربیت ہی ایسی کرتا ہے۔ جس سے ان کے تمام قوی درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ان سے ایسی بات کا منہ نہ ہوتا جو منشا ئے الہی کے خلاف ہو، ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا، ہم نے تم پر احسان کیا۔ تمہاری پرورش ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی

ہونی چاہیئے۔ وہاں جا کر ضروریات کی اشیاء خرید لے تو منع نہیں۔ اور اگر نیت ہی خرید و فروخت کی ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں۔ بعض لوگ جاتے ہی سامان خریدنے کے لیے ہیں۔ بعض سیر و تفریح کی غرض سے جاتے ہیں بعض لوگوں سے سنا کہ بھائی اس سال لندن جانا ہے۔ یا اس سال حجاز کی سیر کرنی ہے۔ یہ باطل نظریات ہیں۔ جب نیت ہی سامان خریدنے کی ہے، تو پھر سونا بھی خریدیں گے اور کپڑے پہننے کے لیے طرح طرح کے جیلے پہننے بھی بنائیں گے اور اس طرح گناہ پر گناہ کے مرتکب ہوں گے۔ اگر حج کرنا ہے۔ تو نیت خالص حج کی ہونی چاہیئے اس کے باوجود اگر ضرورت کی چیزیں خرید لی ہیں تو کوئی ممانعت نہیں۔

اس ضمن میں قرآن پاک نے دو اصطلاحیں پیش کی ہیں۔ ایک اصطلاح ”رضوان“ ہے۔ جس سے مراد امور آخرت کی طلب ہے۔ اور دوسری اصطلاح ”فضل“ ہے جس سے مقصود رزق معلل ہے۔ یہ دونوں چیزیں جائز ہیں۔

ہوں گے وہ خدا سے ڈرنے والے ہوں گے۔

فرمایا اللہ کا نبی تو کہے گا، اللہ والے ہو جاؤ، رب والے ہو جاؤ، لِمَا كُنْتُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الْكِتَابِ اس وجہ سے کہ تم کتاب سکھلاتے ہو۔ اور کتاب سکھلانے والے کی لانا اصلاح ہونی چاہیے۔ اس میں خالص توحید اور جذبہ عبادت ہونا چاہیے۔ بلکہ اُسے دوسروں کی اصلاح بھی کرنی چاہیے۔ وَلِمَا كُنْتُمْ تَخْذُسُونَ اور اس وجہ سے کہ تم خدا کی کتاب پڑھتے ہو۔ اس کا بھی تقاضا ہے کہ تم اللہ والے بن جاؤ۔

عبدیت
کی غلط
نسبت

کل ذکر کیا تھا کہ کتاب اللہ میں نفعی یا مہنوی تحریر کرنا اہل کتاب کا کام تھا۔ مگر اس زمانے میں یہ کام خود مسلمان بھی انجام دے رہے ہیں۔ بلکہ یہ تو ان سے بھی بدتر کام کر رہے ہیں۔ کلام اللہ کے ایسے غلط معانی و مطالب بیان کرتے ہیں جو نہ اللہ کی مراد ہے اور نہ رسول اللہ کی تشریح ہے۔ نہ غنائے راشدین نے ایسے معنی کیے اور نہ ائمہ دین نے یہ مطلب سمجھا مگر آج کا پرہیز اور مرزا قادیانی عجیب و غریب تاویلات کرتے ہیں۔ اب دیکھئے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے اس آیت قُلْ لِيَعْبَادِيَ الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلَىٰ اَنْفُسِهِمْ کیا مطلب نکالا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہے ہیں آپ اپنی طرف سے لہہ دیں اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ گویا حضور علیہ السلام اپنی امت کو میرے بندو کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں (نعوذ باللہ) اسی سے مولوی احمد رضا خاں یہ نکالتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے نام رکھنا جائز ہے۔ جیسے عبدالرسول، عبدالمصطفیٰ، عبدالنبی وغیرہ، حالانکہ یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی! آپ اللہ کی طرف سے کہہ دیں یعنی اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے بالورس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرما دیگا، اس کی مثال سورۃ مریم میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو حضرت مریم کی طرف یہ آیت دے کر بھیجا۔

ارشاد گرامی ہے اَلْحُجَّةُ عَرَفَةَ حج دراصل نام ہی وقوف عرفہ کا ہے۔ لہذا جو شخص
نوذی الحج کو بعد از زوال سے لے کر دس تاریخ کی صبح صادق طلوع ہونے تک ایک
لحہ کے لیے بھی میدان عرفات پہنچ گیا اُس نے حج کو پایا۔ اور جو شخص ان ایات
میں وہاں نہیں پہنچ سکا۔ وہ حج سے محروم رہا۔ اُسے اگلے سال قضاء کرنا ہوگا۔ کیونکہ
وقوف عرفہ کا کوئی بدل نہیں۔ حج کے دیگر ارکان مثلاً طواف، قربانی، رمی جمرات
وغیرہ میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے اور کوئی جھوٹ بھی سکتا ہے۔ پھر اسکی تلافی دم، صدقہ
یا درز سے کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ مگر وقوف عرفہ ایک ایسا اہم رکن ہے جس کی
کوئی تلافی نہیں۔ میدان عرفات مکہ مکرمہ سے نو دس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ میدان
تین اطراف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر جبل رحمت نامی پہاڑ ہے
جس کے دامن میں حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر وقوف فرمایا تھا۔ ہم آپ
نے واضح فرمادیا کہ رَفَعْتُ هُفَّتَنَا وَكُنَّا عَلَى عَرَفَةَ مَوْقِفٍ یعنی میں نے یہاں
قیام کیا ہے۔ مگر سارا عرفات موقوف ہے۔ جہاں کسی کو جگہ ملے وقوف کر سکتا ہے
سرائے بطن عمرہ کے جو مسجد نمروہ کی پچھلی طرف ہے، وہاں وقوف جائز نہیں۔ چنانچہ
آجکل پورا میدان عرفات حایوں سے بھر جاتا ہے۔ وقوف عرفہ حضرت ابراہیم علیہ
السلام کے زمانہ سے حج کا رکن چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح وہابی پر مزولعہ کا وقوف اور
پھر منی میں ٹھہرنا سب حج کے لوازمات ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔

فَقُومُوا عَلَى مَشَا عِرْكُمْ پانے مشاعر پر ٹھہرو۔ اور پھر بتائے گئے طریقے کے مطابق
اللہ کا ذکر کرو فَإِنَّكُمْ أَرْتُمْ مِنْ أَرْتِ آبَيْكُمْ اَبوہیم کی راست میں سے ایک درشہ ہے۔

وقوف عرفات کے لیے آدمی کا احرام میں ہونا لازمی ہے۔ اگر بغیر احرام کے
وقوف کیا ہے۔ تو وہ وقوف نہیں ہوگا اور حج باطل ہو جائے گا۔ احرام کی تعویض
میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اُسے رکن کہتے ہیں اور بعض شرط کہتے ہیں۔
بہر حال جس طرح وضو نماز کے لیے شرط ہے۔ اور اسکے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

مترکوف ہے۔ کسی کو سجدہ کیا جائے، اندر نیاز پیش کی جائے، حاضر و ناظر سمجھا جائے
 عظیم کل سمجھا جائے، مافوق الاسباب، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، یہی شرک
 ہے۔ اس قسم کا جو بھی عقیدہ اللہ کے علاوہ غیر کی طرف منسوب کیا جائے گا شرک ہوگا،
 فرمایا پیغمبر کبھی یہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں یا انبیاء کو رب بناؤ۔ اَیَا مَرِکُمْ
 بِاللّٰهِ فَرَّی کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے سکتا ہے؟ بَلَدَاؤُ اَنْتُمْ
 مُّحْسِلِمُوْنَ باوجود اس کے کہ تم فرمانبرداری اختیار کر چکے ہو اللہ کی وحدانیت
 کو اپنا چکے ہو۔ جب تم اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آچکے ہو تو پھر وہ تمہیں
 ایسا حکم کیسے دیگا جس سے تم پھر کفر و شرک کی تاریکیوں میں غرق ہو جاؤ ایسا نہیں ہو
 سکتا۔ اللہ کے نبی سے یہ توقع ہرگز نہیں ہو سکتی۔

اہل کتاب نے نبی علیہ السلام سے کہا تھا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ
 آپ کی عبادت کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ قانون بتلادیا
 کہ اللہ کا نبی نہ اپنی عبدیت کی طرف دعوت دیتا ہے اور نہ کسی غیر اللہ کی۔
 مسیح علیہ السلام نے بھی ربوبیت کی نسبت اللہ ہی کی طرف کرتے ہوئے
 فرمایا اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ سَمِیْرٌ اور تمہارا سب کا رب
 اللہ ہے۔ میں بھی اسی کی عبادت کرتا ہوتا تم بھی اسی کی عبادت کرو اللہ کا ہر نبی
 یہی دعوت دے گا کہ اللہ والے بن جاؤ۔ رب والے بن جاؤ۔ اس کے سوا کسی
 انسان کی پوجا نہ کرو۔

لیے ہی کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس مقام کو عرفہ کہا جاتا ہے۔

میدانِ عرفات ایک کسنان میدان ہے۔ جو سارا سال غیر آباد رہتا ہے۔
آہم ذی الحج کی نویں تاریخ کو سائے سال کی کسرتکل جاتی ہے۔ جب پورا میدان چوڑ
سے بھر جاتا ہے۔ ہر طرف مخلوق خدا نظر آتی ہے۔ عجیب منظر ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام
کافران ہے کہ شیطان جس قدر عرفہ کے دن ذلیل ہوتا ہے۔ اور کسی دین نہیں ہوتا۔ یہ
اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارانِ رحمت کو اترتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے

یومِ عرفہ کی بعض خصوصیات ہیں۔ کہ ذی الحج کی نویں تاریخ ہو اور انسان احرام
کی حالت میں ہو۔ اہم حج کے پیچھے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی ظہر کے وقت میں ادا
کی جاتی ہیں زوال کے فوراً بعد اہم حج کا خطبہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اذان ہوتی
ہے۔ پھر اقامت ہوتی ہے۔ اور ظہر کے دو فرض ادا کئے جاتے ہیں۔ پھر اقامت
ہوتی ہے اور عصر کی نماز دو رکعت ادا کی جاتی ہے۔ دونوں نمازوں کے درمیان کوئی
وقفہ نہیں ہوتا۔ نیز دو دو فرضوں کے علاوہ سنن نوافل وغیرہ بھی ادا نہیں کیے جاتے
اس کے بعد جلِ رحمت کے قریب وقوف ہوتا ہے۔ یہ بڑی قیمتی وقت ہوتا ہے
غروب آفتاب تک انسان کھڑے ہو کر دعائیں کرتے ہیں۔ ذکر و تلاوت میں مشغول
ہوتے ہیں۔ روبرو کر اللہ مالک الملک سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے
ہیں۔ یہ وقوفِ عرفات ہے۔ پھر غروب آفتاب کے بعد یہاں سے نکل جانے کا
حکم ہے۔ _____ مغرب سے پہلے میدان سے نکل جانا درست نہیں

_____ مشرکین مکہ کی بعض خرابیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ سورج ابھی کھڑا
ہوتا تھا اور وہ عرفات سے نکل جاتے تھے۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس
کے علاوہ میدانِ عرفات یا مزدلفہ کے راستے میں نماز مغرب ادا کرنے کا حکم نہیں ہے
بلکہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ خواہ رات کا
آخری حصہ ہی کیوں نہ ہو۔

الغرض! میدانِ عرفات سے حاجیوں کی دلچسپی بعد غروب شمس مزدلفہ

کہ ہم لوگ آپ کی پرستش شروع کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ جس انسان کو نبوت سے سرفراز فرمائے، اس کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اللہ کی بجائے لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے یہ اہل بات ہے کہ نبی ہمیشہ خدا تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ وہ لو کہتا ہے کہ اللہ بلائے ہو جاؤ۔ وہ ملائکہ یا انبیاء کی عبادت کا حکم نہیں دیتا۔ اس معاملہ میں انبیاء کی برکت واضح کرنے کے بعد آمدہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے میثاق النبیین کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یعنی اس عہد کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی جماعت سے لیا تھا۔ کہ جب تمہارے پاس اللہ کا رسول آجائے۔ جو تمہارے پاس موجود چیز کی تصدیق کئے، تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

میثاق الست

قرآن پاک میں مختلف میثاقوں کا ذکر ہے۔ مجلہ ان کے میثاق الست ہے یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے لیا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ قُلْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلٰی اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا ہونے والی نسل آدم کو عالم ارواح میں متمثل فرما کر ان سے سوال کیا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، گویا یہ عہد اللہ نے اپنی الوہیت اور ربوبیت کے اقرار کے لیے اس دنیا میں آنے سے پہلے لیا تھا۔ پھر جوں جوں بنی آدم کو پیدا فرمایا اس عہد کی یاد دہانی کے لیے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اور کتابیں نازل فرمیں۔ دوسرا عہد میثاق انبیاء ہے جس کا ذکر آیت زیر درس میں آیا ہے۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے لیا۔ اس میثاق کی شرح میں دو قول ہیں۔ پہلا قول حضرت علیؑ کا ہے جسے امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور سیّد محمود الوسی نے روح المعانی میں نقل کیا ہے۔ دوسرا قول امام طاہرؒ کا ہے۔ آپ تابعین میں سے ہیں اور مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ بلند پایہ فقیہ اور محدث تھے۔ امام صاحب کا یہ قول مصنف مجلہ لہذا میں درج ہے۔ جو کہ علم حدیث کی معتبر کتاب

تمام انبیاء سے میثاق

ہے کہ رات مزدلفہ میں قیام کریں۔ فجر کی نماز وہیں ادا کریں۔ اور پھر ذکر الہی میں مصروف ہو جائیں۔ اس کے بعد طلوع آفتاب سے قبل ہی مٹی کو روانہ ہو جائیں۔ اہم البوصیضہ و کے مطابق جو شخص مزدلفہ میں وقوف نہیں کرے گا اسے دم دینا ہوگا۔ کیونکہ یہ واجب کا درجہ رکھتا ہے۔ البتہ بیمار اور ضعیف حاجیوں کو اجازت ہے کہ وہ مزدلفہ میں تھوڑی دیر قیام کے بعد رات کو ہی مٹی کو چلے جائیں۔ اور صبح کی نماز مٹی میں جا کر ادا کر لیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت سودہؓ جو بیمار تھیں ان کو اور بعض دوسرے ضعیف اہل خاندان اور بچوں کو اجازت دیدی تھی کہ وہ مزدلفہ میں راستے وقت تھوڑی دیر وقوف کریں دعائیں کریں اور پھر مٹی کے لیے روانہ ہو جائیں تاکہ وہ عام لوگوں کے پہنچنے سے پہلے پہلے آسانی کے ساتھ رمی کر لیں کیونکہ رمی کرنا بھی بہت کٹھن کام ہے آپ نے ضعیف اور بیماروں کو اول وقت میں رمی کی اجازت مرحمت فرمادی۔

بہر حال حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مزدلفہ کے اُٹھا صَوَفَ یعنی سارا مزدلفہ سوقوف ہے۔ جہاں کسی کو جگہ میسر آئے ٹھہر جائے البتہ وادی محسر جو مٹی کی طرف ہے۔ وہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ باقی ہر جگہ قیام کر سکتا ہے۔

ذکر الہی فرمایا اشہد انکرم کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کَمَا هَدَاکُمْ جس طرح اُس نے تمہیں ہدایت دی۔ لفظ کَمَا مشبہ بھی بن سکتا ہے اور تعلیل بھی۔ اور زائد بھی بن سکتا ہے۔ جیسے یاد کرو اللہ کو لَا تَنْتَ هَدَاکُمْ اس لیے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔ یہ کَمَا تعلیل ہے۔ اللہ نے تمہیں ایمان کی دولت بخشی ہے اس لیے اُس کو یاد کرو۔ اسی قسم کا کاف تعلیل حضور علیہ السلام کی لعشت کے ضمن میں پہلے گزر چکا ہے۔ نیا کپڑا پہننے کی دُعا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی سکھائی ہے اللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا کَسَوْتُ نِیَّ اے اللہ میں تیری حمد بیان کرتا ہوں اس لیے کہ تو نے مجھے کپڑا پہنایا ہے۔ تیری عطا کردہ اس نعمت پر تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔ اسی طرح بیاں بھی کاف علت استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اس لیے کہ اُس نے تمہیں ہدایت بخشی ہے۔

مگر حضور علیہ السلام کے متعلق اس سے عید یا لَیْلَیْنِ بُعِثَ وَهُوَ حَیٌّ لَیْسَ مِنْ دُنْیَاہِ وَلَیْسَ مُصْنُوعٌ کہ اگر تمہاری زندگی میں نبی آخر الزمان آجائیں تو ان پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کر دے گے۔ لہذا یہ عید خاص طور پر حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تھا۔ یہ قول بھی صحیح ہے۔

حضور علیہ السلام کے متعلق اس خاص عید سے آپ کی ختم نبوت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ کسی نبی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نہیں پایا، جو اس میثاق کی رو سے آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی مدد کرتے۔ البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب قرب قیامت میں نازل ہوں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پائیں گے۔ اُس وقت وہ حضور علیہ السلام کے نائب کی حیثیت سے جلوہ افروز ہوں گے اور آپ کی شریعت کے مطابق دنیا میں قرآن و سنت کا نظام جاری کریں گے۔ اس عید سے حضور علیہ السلام کی خاص فضیلت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شرب مخرج میں اللہ نے تمام انبیاء کو بیت المقدس میں جمع کیا۔ قَامَتْهُمْ جِبْرِائِلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا اور آپ نے تمام انبیاء کو نماز پڑھائی۔

سید آوسی بغدادی جنہوں نے حضرت علیؑ کا یہ قول نقل کیا ہے، بلند پایہ مفسر قرآن ہوئے ہیں۔ آپ تیرہ سو صدی ہجری میں ہوئے ہیں مسئلہ میں آپ کی وفات ہوئی جتنی ملک رکھتے تھے۔ آپ نے تین سو جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ ہر پائے کی الگ جلد ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ یہ تفسیر آپ نے آغاز جوانی میں لکھی۔ اس تفسیر میں تمام علوم منجملہ صرف، نحو، علم عقائد اور قرأت وغیرہ موجود ہیں۔

دیگر مفسرین کی طرح آپ نے بھی اپنے زمانے کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن پاک کی عظیم تفسیر کی ہے۔

میثاق انبیاء کا تذکرہ کر کے امتیوں کو بات سمجھائی جا رہی ہے کہ جس چیز

بہنوں کی
خلوت درزی

مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ چونکہ ایک نبی دوسرے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے انبیاء کے متبعین کا فرض ہے کہ اپنے نبی کے اتباع میں وہ بھی دوسرے راہنما کی تصدیق کریں۔ اس سے شاہ صاحب ایہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ مشائخ کو مشائخ سے ہی حاکم کرنا چاہیے۔ کوئی شیخ وقت، نیک بندہ یا درویش اپنے برابر بڑے شیخ یا اپنے سے اپنے درجے والے کی تصدیق کرے۔ اس سے دغا کرانے اور اس کی حمایت کرنے سے گریز نہ کرے۔ شاہ رفیع الدین تو یوں فرماتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندے اور اولیاء ایک دوسرے کی کبھی مخالفت نہیں کرتے۔ اَلْفَقْدَ رَأَى كَلْفُفْسٍ وَاحِدَةً تَمَامَ فَقْرٍ اِشْشَالِ اِیْکَ جَسَدٍ وَاحِدَ کِی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بزرگ نے دوسرے کی تکذیب نہیں کی کہ فلاں غلط ہے یا جھوٹا ہے۔ بلکہ اس کی تصدیق کی ہے۔ یہ انبیاء کی تعلیم کا نتیجہ ہے جس طرح ایک نبی دوسرے نبی کی تنقیص نہیں کرتا اسی طرح ایک اللہ والا دوسرے ولی اللہ کو اپنی تنقید کا نشانہ نہیں بناتا بلکہ اس کی حمایت کرتا ہے۔ مگر اس وقت جو ایک دوسرے کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ یہ نہ تو درویشی اور نہ فقر کا سلسلہ ہے۔ یہ کچھ اور ہی ہے۔ بزرگی محض قبریں بنالینے، ان پر گنبد کھڑے کر لینے اور بدعات، جاری کرنے کا نام نہیں ہے۔ اصل بزرگوں کا ہرگز یہ مشن نہیں ہو سکتا۔ جو اللہ کے نیک بندے ہیں وہ ہمیشہ نیکی کا حکم کرتے ہیں۔

حضرت یحییٰ انصاریؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید اور بڑے بزرگ مرد تھے۔ مشرقی ہندوستان میں قیام تھا۔ لوگوں نے ان کے لیے خانقاہ تیار کی اور لاکھ روپے بٹھا دیا۔ فرمانے لگے اے دوستو! بڑا افسوس ہے، تم نے میرے لیے ایک منبر سا بنادیا۔ ہمارے ساتھ تو اس کا تعلق ہی قائم نہیں ہوتا۔ خواجہ فرید الدینؒ کو بادشاہ وقت فیروز تغلق نے جاگیر کی پیشکش کی۔ آپ نے فرمایا کہ میرا اور میرے بزرگوں کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اس جاگیر کو مستحقین میں تقسیم کر دو۔ یہی بات حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے صدر ہند راجندر پرشاد کو کہی تھی۔ حکومت نے

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس ہشادوسرہ (۸۳)

آیت ۲۰، ۲۱، ۲۲

فَإِذَا قُضِيَتْ مَنَاسِكُكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۚ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَمِنْهُمْ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۚ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۚ وَآتَقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تَحْشَرُونَ ۚ

ترجمہ :- جب تم ارکان حج کو پورا کر چکو، پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ تم یاد کرتے ہو اپنے باپ دادا کو۔ بلکہ اس سے زیادہ یاد کرنا چاہیئے۔ پس لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اے اے ہم کو اس دنیا کی زندگی میں۔ اور اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے (۲۰) اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے دے اور آخرت میں بھلائی دے دے۔ اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا (۲۱) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے حصہ ہے اُس سے جو انہوں نے کمال کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ (۲۲) اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کو گنتی کے چند دنوں میں۔ پس جس شخص نے دو دنوں میں جلدی کی، اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جس نے آخر کی

تھا۔ اس نے تورات میں سے کچھ اچھی اچھی باتیں لکھ کر آپ کو دیں حضرت عمرؓ وہ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور عرض کیا کہ میرے ایک یہودی دوست نے تورات کی بعض اچھی چیزیں لکھ کر دی ہیں۔ کیا میں ان کو پڑھ لیا کروں۔ یہ سن کر ناراضگی کی وجہ سے حضور علیہ السلام کا چہرہ مبارک سُرخ ہو گیا۔ فرمایا اَنَّهُوَ كُتْمٌ كَمَا تَهْوٰكُمُ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ کیا تم بھی اسی طرح سرگردان ہونا چاہتے ہو جس طرح یہود و نصاریٰ ہوئے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا، قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ یہ تو تم تحریر شدہ کورات کا ورق لائے ہو اگر موسیٰ علیہ السلام بنفس نفیس آجاتے اور تم مجھے چھوڑ کر اُن کا اتباع کرتے تو تم گمراہ ہو جاتے اَنَا آخِرُ النَّبِيِّينَ میں آخری نبی ہوں جو تمہارے حصے میں آیا ہوں۔ لہذا تم پر میری ہی اطاعت لازم ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِاِمْحَمَدٍ نَّبِيًّا وَرَسُوْلًا میں راضی ہو گیا اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور رسول ہونے پر۔ اس پر حضور علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

الغرض! جب تمام انبیاء نے اپنے عہد کا اقرار کر لیا۔ قَالَ تَوَلَّيْتُ لَكَ نے فرمایا فَاشْهَدُوْا اَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّهِيْدِيْنَ گواہ بن جاؤ۔ کہ تم نے یہ اقرار کر لیا ہے۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔ کہ جب نبی آخر الزمان علیہ السلام آئے گا تو اُس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی تائید کرو گے۔ اور دیکھو! میں بھی تمہارے ساتھ اس بات پر گواہ ہوں۔

فرمایا کہ بچتہ عہد کرنے کے بعد فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذٰلِكَ جس نے اعراض کیا اس کے بعد یعنی عہد کی پابندی نہ کی۔ فَالْاِيْلَکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ تو ایسے لوگ فاسق اور نافرمان ہوں گے۔ فاسق نافرمان، منافق اور کافر کو بھی کہا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکاری ہے تو یہ بنیادی فسق ہے۔ انسان کافر

عہد شکنی پر عہد

تمام حاجی وہیں پر قربانی کرتے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے۔ جہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی کی تھی۔ آج کل وہاں پر ہر قسم کے قربانی کے جانور بل جلتے ہیں۔ لوگ وہیں سے جانور خریدتے ہیں اور وہیں ذبح کر دیتے ہیں۔ تو انا آدمی قربانی گاہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور ضعیف حاجی اور عورتیں اس کام کے لیے دوسروں کو مامور کر دیتے ہیں۔

قربانی کے بعد اگلا کام حجامت بنوانا ہے۔ رش کی وجہ سے یہ کام بھی بڑی مشکل سے انجام پاتا ہے۔ بال منڈائے یا کترائے جاتے ہیں۔ اور پھر احرام کھول دیا جاتا ہے (لیکن عورت کے پاس جانا منع ہو تا ہے طواف تک)

طواف زید

حج کا اگلا رکن بیت اللہ شریف کا طواف ہے۔ اسے طواف زیارت کہا جاتا ہے اور یہ فرض ہے۔ اسی طواف کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّہٗ لَیَقْضُوْا تَفَہُّمُہُمْ وَلَیُؤَفِّیْنَہٗ ذُفْرَہُمْ وَ لَیَطَوُّوْا بِاَلْبَیْتِ الْعَتِیْقِ۔ پھر چاہیے کہ اپنا سیل کچل صاف کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور تہنیم گھر (بیت اللہ شریف) کا طواف کریں۔ یہ طواف بھی دس تاریخ کو ہی کیا جاتا ہے اگر کسی وجہ سے کوئی شخص کج کے دن طواف زیارت کے لیے مکہ مکرمہ نہ جاسکے تو گیارہ تاریخ کو کرے۔ اسے بارہ تاریخ تک بھی بوجہ مؤخر کیا جاسکتا ہے۔ اگر بارہ تاریخ کے بعد طواف کر لیا تو اسے ساتھ دم دینا پڑے گا۔ اور یہ فرض ادا ہو جائے گا یہ طواف چونکہ عازمین حج نے مقرر اوقات میں لازمی کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر بھی بڑا سخت ہجوم ہوتا ہے۔ طواف کے بعد صفا و مروہ کی سعی بھی ہے۔ اس کے بعد مکہ میں بٹھرنے کی اجازت نہیں بلکہ واپس منیٰ آنا ہوتا ہے۔ گیارہ بارہ اور تیرہ ذی الحجہ ایام منیٰ کہلاتے ہیں۔ ان ایام میں منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے۔ البتہ معذور لوگوں کو استثناء حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ تمام مناسک حج جو مختلف مقامات پر پورے کئے جاتے ہیں

خانہ الی تھانہ

زمانہ جاہلیت میں ایام منیٰ کے دوران بیت بڑی منڈھی یا میلہ لگتا تھا جس میں خرید و فروخت کے علاوہ مختلف قبیلے اپنے اپنے خانہ ان کی مدح سرائی کرتے اپنی اپنی خوبیاں بیان کرتے، بڑوں کے کارنامے دہراتے اور اس طرح اپنے

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

اِلٰی عَمْرٰن ۲

درس بست و نر ۲۹

آیت ۸۳ ۸۵

أَفَقِيرَ دِينَ اللَّهِ يَكْفُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ
 فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَآلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٨٣﴾
 قُلْ أَمَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى
 إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ
 وَالْإِسْبٰطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَالنَّبِيُّونَ
 مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ
 وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٨٤﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ
 غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ
 فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴿٨٥﴾

ترجمہ: یہ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے واسطے اور دین کو تلاش کرتے ہیں، حالانکہ اسی اللہ
 کے لیے فرمانبرداری کرتے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں۔ اور جو زمین میں ہیں خوشی اور خوشی
 سے۔ اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے ﴿۸۳﴾ اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ
 کہہ دیجئے، ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر جو اتاری گئی ہے۔ ہمارے اوپر اور
 اس چیز پر جو اتاری گئی ہے، حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام
 اور ان کی اولاد پر اور جو چیز دی گئی ہے۔ موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کہ اور جو چیز دی گئی
 ہے سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم تفریق نہیں کرتے کسی ایک
 کے درمیان۔ اور ہم اسی اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں ﴿۸۴﴾ اور جو شخص
 اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا۔ پس اُس سے ہرگز نہ قبول کیا جائیگا
 اور وہ شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ ﴿۸۵﴾

بیک اللہم لیک تو ذکر الہی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔
 آگے اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے
 جو اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا کی خواہش رکھتے ہیں فَجَنَّ النَّاسُ مَنِ يَقُولُ رَبَّنَا
اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں جو کچھ دینا ہے
 دنیا میں ہی عطا کر دے۔ ایسے لوگ آخرت کے طلبکار نہیں ہوتے۔ دوسرے مقام
 پر اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا کہ وہ کہتے ہیں عَجِّلْ لَنَا قِطْعًا
قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ یعنی جو کچھ ہمارا حصہ ہے وہ ہمیں یوم حساب سے پہلے
 ہی مل جائے۔ ہمیں آخرت کی کوئی فکر نہیں۔ مطلب یہ کہ ہمیں دنیا کا مال و دولت
 جاہ و مرتبہ، آرام و آسائش، صحت اور تندرستی حاصل ہو جائے تو کافی ہے۔ اس قسم
 کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ جو حج پر جا کر بھی دنیا ہی طلب کرتے ہیں۔ بیماری سے
 نجات، قحط سالی سے پناہ، اولاد اور کاروبار ہی چاہتے ہیں۔ اور آخرت کی کوئی پروا
 نہیں کرتے۔

فرمایا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ دنیا کے طالبوں کے لیے آخرت
 میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ جنت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ انہوں نے
 آخرت کی خواہش ہی نہیں کی۔

فرمایا وَمِنْهُمْ مَّنْ هُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ اور میں سے بعض ایسے بھی ہیں مَنِ يَقُولُ رَبَّنَا
اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر
 وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً اور ہمیں آخرت میں بھی بھلائی نصیب فرما۔ اور پھر
 دوزخ سے پناہ بھی مانگتے ہیں۔ وَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ اَرْسَلْتَهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً
 عَذَابٌ سَعِيدٌ لِّمَنْ هُوَ مُسِيءٌ۔ دوزخ سے بچنے کا مطلب یہ ہے۔ دنیا میں گناہ اور
 بُرائی سے بچ جائے۔ اگر اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو آخرت میں دوزخ سے
 بھی بچ جائے گا۔ غرضیکہ جو نیک لوگ ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت
 دونوں کے طلبکار ہوتے ہیں۔

کھڑو شرک والے ادیان کو تسلیم کریں۔ اللہ کے علاوہ کوئی ذات ہے۔ جس کی اطاعت تمام مخلوق پر لازم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا وَلَکُمْ اَسْلَمَ مِنْ فِی السَّمٰوٰتِ کُلَّهَا وَفِی الْاَرْضِ اَسْمٰی اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ اسی خدا سے وحدہ لاشریک کی فرمانبرداری کرتی ہے۔ ہاں! طُغُوْا وَکُفُّوْا کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ اس کی اطاعت خوشی سے کرتے ہیں اور بعض مدسکے مجبوری اور لاچارگی کی بنا پر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے احکام دو قسم کے ہیں۔ تحکیمی احکام وہ احکام ہیں جو انسان کو اپنی خواہش اور اختیار کے بغیر کرنے پڑتے ہیں۔ جیسے زندگی، موت، بیماری، حادثات، بارش، خشک سالی، سیلاب، زلزلہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان پر بغیر خواہش اور بغیر اختیار کے وارد ہوتی ہیں۔ انسان کو ان احکام پر مجبوراً عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ یہ تحکیمی احکام ہیں۔ دوسری قسم کے احکام شرعی احکام کہلاتے ہیں۔ یہ احکام اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ ان پر عمل انسان اپنی خواہش اور اختیار سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کئی مخلوق ہے۔ جو ان احکام کو احکام الہی سمجھ کر خوشی سے تسلیم کرتی ہے۔ اور بعض بد بخت ایسے بھی ہیں جو انہیں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ تو فرمایا کہ ایسی ہستی جس کے تمام تحکیمی اور شرعی احکام ماننے جائیں وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ اور ماننے والے آسمان میں بھی ہیں۔ اور زمین میں بھی ہیں۔ آسمانی مخلوق میں فرشتے ہیں۔ یہ اللہ کی مطیع اور فرمانبردار مخلوق ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ آسمان میں چار بالشت بھی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ اپنے مالک کی عبادت میں مصروف نہ ہو۔ زمینی مخلوق میں انسانوں کے علاوہ شجر، حجر، چرند، پرند، نباتات، جمادات سب اللہ کے تحکیمی احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ سب انسان تو ان میں بہت سے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے شرعی احکام قبول کرتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں وَکُتِبَ عَلَیْکُمُ الْعَقَدُ الْاَوَّلُ اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی سننا ثابت ہو چکی ہے تحکیمی احکام تو وہ بھی مجبوراً مانتے ہیں مگر شرعی

سے سعادت مندی ہے۔ منہ احمد کی روایت میں ہے۔ کہ اچھی بیوی، اچھی ساری، اچھا مکان دنیا کے اعتبار سے انسان کی نیند بخشتی ہے۔ انسان کے لیے صحت بھی ضروری ہے۔ کہ عبادت اور دیگر امور کا مدار اسی پر ہے۔ یہ سب چیزیں حسنیہ ہیں۔ مگر بالیقین مقصود بالذات ایمان باللہ، خدا کی عبادت اور اعمال صالحہ ہیں جو چیز ان کے تابع ہو کر آئینگی وہ حسنیہ ہی کہلائے گی۔

ذخیرہ آخرت

فَرِیَا اُولَٰئِكَ لَہُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا اِنْ لَّوْکُمْ فِیْہِ سَہْمٌ
چیز میں سے حصہ ہے۔ جو انہوں نے کمایا۔ دنیا کی کھائی کے متعلق تو دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ذٰلِکَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِنَّ کَافِرًا فِیْہِ“
تو دنیا میں ہی ختم ہو گیا، آگے اُن کے لیے کچھ نہیں۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اُن کے اعمال آخرت کا ذخیرہ بنتے ہیں فرمایا اُن کے لیے حصہ ہے۔ جو انہوں نے کمایا، وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے جب قیامت برپا ہوگی۔ حساب کی منزل شروع ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کو طے کر دیں گے۔

ایام تشریق

مِنَیْ کے احکام کے ساتھ فرمایا تھا فَادْعُوْا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اَآلَہُکُمْ
پہننے آبا و اجداد کی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ اور غزور و محجور کو چھوڑ دو۔ اب آگے ارشاد ہوتا ہے۔ وَادْعُوْا اللّٰہَ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْدُوْۤتٍ ط۔ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو چند گنتی کے دنوں میں۔ ان چند ایام سے مراد ایام تشریق ہیں اور یہ چار دن ہوتے ہیں یعنی ذی الحجہ کی دسویں تا تیرہویں تاریخ۔ تشریق کا لفظی معنی اگرشت کو خشک کرنا ہے ان ایام میں قربانی کا گوشت دافتر مقدار میں میسر آتا ہے۔ اور لوگ آئندہ استعمال کے لیے خشک کر کے رکھ لیتے ہیں۔ اس لیے ان دنوں کو ایام تشریق کہتے ہیں۔ سورۃ حج میں فِیْ اَیَّامٍ مَّعْلُوْۤتٍ آیا ہے۔ اور اس سے مراد قربانی کے تین دن یعنی ذی الحجہ کی دسویں، اکیارہویں اور بارہویں تاریخ ہیں۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ وغیرہم سے منقول ہے کہ یہ دن یَوْمُ التَّحَدُّدِ وَ

نازل کی گئی ہے۔ لوگوں کے سامنے اس کی تشریح بیان کرے۔ تاہم یہ تشریح بھی منجانب اللہ ہوتی ہے۔ قرآن پاک وحی جلی ہے اور جو تشریح پیغمبر کی زبان سے ہوتی ہے۔ وہ وحی حقیقی ہے مسلم شریف کی روایت میں ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ایمان وہ چیز ہے مَلَجُثٌ بَلَمَ جو کچھ میں لے کر آیا ہوں۔ یعنی جو بھی چیز اللہ کی طرف سے بنی لایا ہے اس پر ہم ایمان لائے ہیں۔

فرمایا وَمَا أُنْزِلَ عَلَیْكَ إِلَّا حَقٌّ ہم اُس چیز پر بھی ایمان لائے
ابراہیم علیہ السلام پر اتاری گئی ہے۔ قرآن میں موجود ہے کہ اللہ جل جلالہ نے حضرت
ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے نازل فرمائے۔ جیسا کہ سورۃ اعلیٰ میں آتا ہے صُحُفٌ اِنْشِیْئَہُ
وَمُوسٰی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین دیا، شریعت دی، احکام دیے اور تمام مخلوق کا امام
بنایا۔ فرمایا وَلَقَدْ سُلِّیْتُ لَکَ فَارَاسُحُوقَ وَیَعْقُوبَ وَالْاِسْحٰقَ ہم اُس
چیز پر بھی ایمان لائے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام،
حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
دو بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ پہلے حضرت
عاجزہ کے بطن سے اور دوسرے حضرت سارہ سے۔ دونوں اللہ کے نبی اور رسول
ہیں۔ اللہ نے اُن کو مستقل شریعت دی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم
کے پوتے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ وہ بھی اللہ کے صاحب شریعت
نبی ہیں۔ اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اسباط یعنی اولاد ہے۔ اُس میں سے
اللہ نے جس کو نبوت دی، ان پر وحی نازل فرمائی اور ان کو شریعت بھی دی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے اللہ نے
چار تہذیبی اور رسول مبعوث فرمائے۔ یہ اتنا عظیم خاندان ہے۔ اسباط سے یہی
انبیاء اور رسل مراد ہیں جن میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے
عظیم پیغمبر مبعوث ہوئے۔ حضرت الیاس علیہ السلام بھی آپ کی اولاد میں سے ہیں
تاہم بعض انبیاء کا ذکر قرآن میں موجود ہے، اکثر کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ ان تمام

قانون خداوندی کی کس حد تک پابندی کرنا ہے۔ قانون شکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اسی لیے فرمایا کہ جس عازم حج میں تقویٰ یعنی قانون کی پابندی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ دو دن ٹھہر کر بھی چلا جائے۔ اگر اس کا حج صحیح ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

تقویٰ کیا ہے

فرمایا وَاتَّقُوا اللَّهَ اللہ سے ڈرتے رہو۔ چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو بھی خاطر میں لاؤ، کیوں ایسا نہ ہو کہ امتحان میں فیل ہو جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تقویٰ وہ ہے جو کفر، شرک اور محصیت سے بچ جائے، حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کرے۔ اللہ نے چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی فک کرنا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو جائے۔ وَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ كُنتُمْ آيَةً مَحْشُورُونَ یاد رکھو! ایک وقت آنے والا ہے۔ جب تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے اکٹھے جاؤ گے بخاری شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ ایک دن انسان کو اپنے رب کے حضور حاضر ہو کر جواب دینا ہے۔ اُس وقت حالت یہ ہوگی کہ مَابَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَدْبِجَانِ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان بھی نہیں ہوگا۔ تَدْبِجَانِ کُلُّ لَفْظٍ مُّجَادِلٌ ہر شخص کو اپنی طرف سے اللہ کے سامنے براہ راست جواب دینا پڑے گا۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے حج کے احکام بیان فرمادیئے ہیں اس کے بعد منافعتین کا تذکرہ اور بعض دوسری باتیں آئیں گی۔ حج کے تمام ضروری اجزاء اسی دروع میں مکمل طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔

کی گئی ہے۔ وہاں پر عَلَيْنَا کی جگہ عَلَيْنَا اور وَالسَّابِقُونَ سے پہلے وَمَا
 اَوْفَتْ کے الفاظ زیادہ ہیں بمقصد یہی ہے کہ جو کچھ اللہ نے نبیوں پر نازل
 کیا ہے وہ حق ہے اور ان سب پر ہمارا ایمان ہے۔ گویا اس اصل ہدایت
 پر ہمارا مکمل ایمان ہے اگرچہ بعد میں آنے والوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا
 تاہم اس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہیں اور اللہ کے ہاں جواب دہ ہیں۔

ایمان
 بالرسول

اور آخر میں تمام انبیاء پر ایمان لانے کی وضاحت اس طرح فرمائی
 لَا تَقْرَئُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ اَمْرًا اَوْ رِسَالًا مِنْ رِسَالِهِمْ
 درمیان تفریق نہیں کرتے، تفریق کرنے کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح
 بعض انبیاء پر ایمان لائے اور بعض پر نہ لائے۔ اس قسم کی تفریق صریح کلمہ ہے
 کیونکہ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے
 کر حضور خاتم النبیین علیہ السلام تک جتنے بھی نبی اور رسول آئے ہیں۔ وہ سب
 اللہ کے کامل بندے اور برحق نبی ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دور میں مخلوق خدا
 کو حق کا پیغام پہنچایا۔ اللہ نے اپنے انبیاء کو کتابیں اور شرائع عطا فرمائیں۔ ان سب
 پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر یہود و نصاریٰ اللہ کے تمام انبیاء پر ایمان نہیں رکھتے۔
 مثال کے طور پر دونوں گمراہ حضور خاتم المرسلین علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتے۔
 لہذا یہ تفریق بین الرسل کے مرتکب ہو کر کافر ٹھہرے۔ اسی طرح یہودی مسیح علیہ السلام
 کو نہیں مانتے۔ بلکہ انہیں دجال کہتے ہیں اور ان کی تذلیل و تحقیر کرتے ہیں۔ مگر ہم
 بحیثیت مسلمان کسی نبی کے درمیان تفریق نہیں کرتے وَفَعَلْنَا لِكُلِّ مَسْلُومٍ
 ہم اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ یہی اسلام ہے۔ یہی حقیقت ہے اور
 یہی مکتبہ ابراہیمی ہے جسکی تعلیم سائے نبی جیتے آئے ہیں۔

غیر قرآن کی
 سازشیں

ارشاد ہوتا ہے۔ يٰۤاٰدِرْكُمْ! وَمَنْ يَنْتَفِعْ عَنِ الْاِسْلَامِ دِينِنَا
 جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین تلاش کرے گا۔ اور یہ سمجھے گا کہ ایسا
 کفر کے وہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے فَ لَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ اس سے

جو کچھ دینا ہے، اس دنیا میں ہی عطا کر دے۔ یہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔ کیونکہ آخرت پر یہ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو دنیا اور آخرت ہر دو کے طالب ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی دُنویٰ زندگی بھی خوشحالی میں بسر ہو، اور آخرت میں بھی نجات حاصل ہو جائے۔ اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ سے یوں سوال کرتے ہیں۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ یہ ایماندار لوگ ہیں۔ گزشتہ آیات میں ان دو قسم کے لوگوں کا بیان آیا۔

مخلص اور منافق

اب ان آیات میں بھی دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں پر مومن اور کافر کا تقابل نہیں، بلکہ مخلص اور منافق کا حال ہے۔ بظاہر یہ دونوں گروہ ایماندار ہیں۔ مگر ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ مخلص وہ لوگ ہیں جو انتہائی سچے کے پکے سچے اور مخلص ہیں اور دوسرے گروہ ہیں جو ظاہر میں تو ایمان والے ہیں مگر ان کے باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ وَمِنَ الْمُنَافِقِينَ مَنْ يَخُذُ بِالْإِيمَانِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لَعَنَ اللَّهُ الْفٰكِرِينَ یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جن کی بات دُنویٰ زندگی میں آپ کو پسند آتی ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو بڑے سچے کی الیا محسوس ہوتا ہے۔ کہ اپنے سچے کے لوگ ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ ان کی چرب زبانی اور مکاری ہوتی ہے۔ محض زبان سے آپ کے رد و بد و مٹھی میٹھی اور آپ کے لیے خوش کُن باتیں کرتے ہیں۔ اور آپ کو وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ وَلَيَسْهَلْ عَلَىٰ مَنِ افْتَرٰهُ اور جو کچھ اُس کے دل میں ہے، اُس پر اللہ کو گواہ بنانا ہے۔ اور قسمیں کھا کر کہتا ہے۔ خدا گواہ ہے۔ کہ مجھے آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ وَهُوَ الَّذِي خَصَّكُم بِلِقَائِهِ کہ وہ سخت جھگڑا کرنے والا ہے ایسے ہی لوگوں کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ اَلْغٰصُ الْمُرْتَجِلُ اِلَى اللّٰهِ الَّذِي خَصَّكُمُ بِلِقَائِهِ اللّٰهُ تَعَالٰی کے نزدیک بغرض ترین وہ لوگ ہیں جو سخت جھگڑا کر رہتے ہیں۔

بعض مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ یہ آیت اخس بن شریق کے متعلق نازل

پتہ جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لہذا اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کو تلاش نہ کرو۔
جو ایسا کرے گا، اُس کا دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ
الْخَسِرِينَ ایسا شخص آخرت میں نقصان میں پڑے گا۔ اسلام کے علاوہ کوئی دین
 بھی کامیابی کی طرف نہیں لے جائے گا۔ بلکہ اُس کے متبعین سراسر خسارے کا
 سودا کریں گے۔

مسلمانوں کی
 قیمتی

یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی تو قابلِ فہم ہے، وہ تو دوسرے دین ہی تلاش
 کریں گے مگر یہ قیمتی یہ ہے کہ کج کامیابان بھی اپنے دین پر اعتقاد نہیں کرتے۔
 آج کے مسلمان بھی یہی سمجھتے ہیں۔ کہ جب تک غیر اقوام کی شاگردی اختیار نہیں کریں
 گے، ترقی نصیب نہیں ہوگی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب مسلمان اپنے دین
 پر یقین کرتے تھے، عروج کی بلندیوں پر تھے، کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ مگر
 اب خود مسلمان انگریزوں سے مرعوب ہیں۔ ان کی مذہب اختیار کر رہے ہیں۔
 انہی کے لہو و لعب میں مشغول ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت
 یہ ہے کہ پیر و ان اسلام کے سوا کسی کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ آخرت میں تو نعمت،
 نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے

اسلامی
 قوانین

تہذیب و تمدن کے علاوہ آج کا مسلمان اسلامی قوانین سے بھی مطمئن نظر نہیں
 آتا۔ اسی لیے وہ غیر اسلامی قوانین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسلام ایک
 فرسودہ دین بن چکا ہے۔ لہذا وہ اقتصادی نظام کے لیے روس، جرمنی، امریکہ اور
 فرانس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس تعزیرات کا کوئی قانون موجود نہیں
 ان کے تمام قوانین بناوٹی ہیں۔ برخلاف اس کے کہ اسلام کے پاس اپنے قوانین
 موجود ہیں۔ صحابہ کرامؓ کا دستور العمل مشعلِ راہ ہے۔ مگر اب قوانین اُس مجلس
 شورٰی سے بنائے جا رہے ہیں جس میں ہندو اور عیسائی بھی شامل ہیں۔ کیا اسلام کا
 قانون یہ لوگ بنائیں گے؟ ممبرانِ شورٰی کے لیے تو خصوصی اہلیت مقرر ہونی چاہیے
 تھی جس سے پتہ چلتا کہ واقعی یہ لوگ اسلامی قانون سازی کے قابل ہیں۔ حضرت عائشہؓ

اور فساد سے مراد مسلمانوں کے خلاف سازش کرنا اور انہیں مالی و جانی نقصان پہنچانا ہے
مزید برآں یہ شخص وَكُفَّالْتَ الْحَدِثَ كَقِيَّتِي كَرِهَكَ كَرْتَابَةً۔ اور وَالنَّسْلَ اور نسل کو
ضائع کرتا ہے۔ کھیتی کر ہلاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تیار فصل نقصان
پہنچایا جائے۔ پکی ہوئی کھیتی کو آگ لگا دی جائے۔ درختوں کا پھل خالص کر دیا جائے۔
یا سرے سے درخت ہی کاٹ دیے جائیں۔ اور نسل کشی سے مراد مطلق نسل کشی بھی ہے
جیسا کہ منافقین کا طریقہ ہے۔ اور اس سے مراد موشی بھی ہو سکتے ہیں۔ جنہیں ہلاک کر دیا
جائے یا انہیں معذور بنا دیا جائے۔

فساد اصلاح کے مقابلے میں آتا ہے۔ اصلاح کا معنی درستگی اور فساد سے مراد
بگاڑ ہے۔ اس کا بیان پہلے بھی آچکا ہے۔ "وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا
فِي الْأَرْضِ قَبْلَ مَنَافِقِمْ" کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے
ہیں إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہم کافروں سے محض اس
لیے ملتے ہیں تاکہ صلح صفائی کا پہلو نکل سکے مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ
مجھے فساد بالکل پسند نہیں۔ یہ منافق تو ادھر کی بات ادھر اور ادھر کی بات ادھر کر کے آپس
میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا مقصد تو لڑائی جھگڑا کرنا ہے۔

فساد کی ایک اور صورت لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بغض کرنا ہے۔ اور سب
سے بڑا فساد شرک اور کفر ہے۔ جہان کے دلوں میں موجود ہے کفر اور شرک سے بگاڑ
پیدا ہوتا ہے جب کہ ایمان اور نیکی سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہے۔ شرک و بدعات
اور منکرات کے ذریعے ضمیر کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ شرائع الہیہ کو توڑنا فساد
ہے۔ لوگوں کو غلط باتوں میں تقنین کرنا فساد ہے۔ اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ سب
چیزیں فساد ہی کا حصہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور بعض دوسرے مفسرین
کرام فرماتے ہیں کہ توئی کا ایک معنی پشت پھیرنا ہے۔ اور دوسرا معنی والی یعنی حاکم
بن جانا بھی ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے۔ تو مطلب ہوگا کہ جب منافق آدمی حاکم بن

توئی بمعنی حاکم

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

الْعَمُرَانِ ۳

درس سی ۳۰

آیت ۸۶ تا ۹۱

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ
وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٦﴾ أُولَٰئِكَ
جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ
الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا
مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَمْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزْدَادُوا

كُفْرًا لَّنْ تَقْبَلَ تَوْبَتَهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾
لََّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ
مِنْ أَحَدِهِمْ مِّلُّ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوْ أَفْتَدَى
بِهِ ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ
مِّنْ نَّصِيرِينَ ﴿٩١﴾

ترجمہ :- اللہ کس طرح راہ بتلانے کا اس قوم کو جنہوں نے کفر کیا ایمان کے پیچھے ۔

اور انہوں نے گواہی دی کہ بیشک رسول برحق ہے ۔ اور اُن کے پاس کھلی نشانیاں

آئیں اور اللہ نہیں دیکھاتا اس قوم کو جو ظلم کرنے والی ہو ﴿۸۶﴾ یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ

یہ ہے کہ بیشک اُن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ﴿۸۷﴾

منکوحہ عورت کے متعلق اللہ نے فرمایا۔ **وَمَا كَانَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرْمٍ لِّمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ**۔ اور جب دنیا کی عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ انہیں سے فصل یعنی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اور جب دنیا کی جاتا ہے۔ تو کھیتی کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اپنی منکوحہ بیوی یا لونڈی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے تمتع کی اجازت نہیں دی۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے متعلق فرمایا **أُولَٰئِكَ هُمُ الْعَذَابُونَ**۔ یہ لوگ زیادتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لہذا اٹھے ہر لحاظ سے ناپسندیدہ فصل قرار دیا گیا ہے۔ باقی **رَمِیْ بِهِنَّ فِي النَّارِ النَّارُ** تو اس سے مراد لواط (SODOMY) بھی ہو سکتی ہے جس سے نسل ضائع ہوتی ہے۔ ایسا فعل جانوروں سے بھی حرام ہے حتیٰ کہ جلیج (MASTURBATION) کو بھی ملعون فعل قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو دین اخلاق اور ہر چیز کو تباہ کر دیتی ہیں۔

برطانیہ میں زنا کی وہ صورت حرام ہے جو باجبر (RAPE) کیا گیا ہو۔ اور اگر کوئی مرد اور عورت باہمی رضامندی سے اس فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تو قانون کی نظر میں کوئی جرم نہیں۔ ایسے امور میں پولیس کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح امریکہ میں برہنہ رقص بھی جائز ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب منافعی برسرِ تقدیر آئیں گے۔ تو یہی کچھ ہوگا۔ اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔

آگے ارشاد فرمایا **وَاذْأَقْبِلْ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ** اور جب ایسے منافع کو کہا جائے کہ اللہ سے ڈر جاؤ، ایسی باتیں نہ کرو، کسی کو ناحق قتل نہ کرو۔ گندے قانون جاری نہ کرو۔ جس سے لوگوں کے اخلاق بگڑتے ہوں تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں۔ **أَخَذْتُمُ الْعِصَّةَ بِآيَاتِهِ** تو اسی گناہ پر مجبور کرتے ہیں۔ اتراتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ہمارا تو قانون ہی یہ ہے۔ اور فخر یہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہم تو اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری اسمبلی کا ہماری اکثریت کا بنایا ہوا قانون ہے فرمایا ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا **فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ** کہ ان کے لیے جہنم کافی

اللہ اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو رضائے الہی کی تلاش میں اپنی جان کو بیچتا ہے
 شراب کا معنی بیچنا اور خریدنا دونوں طرح آتا ہے، مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ
 میں حضرت صہیب رضی کی طرف اشارہ ہے آپ جب ہجرت پر روانہ ہونے لگے
 تو مشرکین نے راستہ روک لیا۔ آپ نے کہاں کو درست کیا۔ ترکش سے تیر نکالے اور
 فرارنے لگے۔ اُسے قریش! تم مجھ سے واقف ہو کہ میں تیر انداز ہوں۔ جب تک میرے
 پاس ایک بھی تیر ہے۔ تم میرے قریب نہیں آ سکتے۔ اور تلوار بھی میرے پاس موجود
 ہے۔ میں تمہارا ڈٹ کر مقابلہ کر دوں گا۔ بہتر ہے کہ تم میرا راستہ نہ روکو۔ میرا اتنا مال فدا
 جگر موجود ہے۔ جاؤ وہ لے لو، تمہارے لیے مباح کر لیا ہوں۔ چنانچہ مشرکین نے
 اس پر اکتفا کرتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ جب مدینہ پہنچے تو حضور علیہ السلام نے
 فرمایا اے ابوبکر! تیری تجارت نفع مند ہے۔ وہ لوگ نہ مال کی پروا کرتے تھے۔
 نہ جان کی۔ انہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب تھی۔ کہ کسی طرح ایمان بچ جائے۔ یہی وہ
 لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں اپنی جان کو بیچتے تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان ضغائنے بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں۔
 عمارؓ کی والدہ میسرہ نے ایک عورت ذات ہوتے ہوئے اتنی بڑی قربانی دی عمارؓ
 کا باپ یا سر بھی شہید ہوا۔ اور مال بھی تھید ہوئی۔ ظالم ابوجہل نے حضرت میسرہ کی دلوں
 مانگیں مختلف اونٹوں سے باندھ کر مخالفت سموتوں میں چلا دیا اور اس طرح انہیں بے رحمی
 سے شہید کیا۔ حضرت خباب بن ارتؓ، حضرت بلالؓ اور اس قسم کے کتنے ضغائنے تھے
 جنہوں نے بڑی سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ جان اور مال قربان کر دیے۔ مگر ایمان کو
 بچا لگئے تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔

فرمایا واللہ رَعُوْهُ بِالْعِبَادِ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ شفقت
 کرنے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اور جان اللہ کی رضا کی تلاش میں صرف کر دیتے ہیں
 تو اللہ بھی ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ وہ تو بڑا ہی مہربان ہے۔ یہ بھی اُس
 کی خاص مہربانی ہے۔ کہ اُن کے دلوں کو نیکی کی طرف پھیر دیا۔ اور وہ ہر قربانی

کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ان کے حق میں یہ تجربہ بھی خوب ہی نکلے گا۔ وہ لوگ
یقیناً مرتبہ عالیہ پر فائز ہو سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ خاص مہربانی کرنے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا
 خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۲۰۸﴾ فَإِنْ
 زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ
 اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ
 اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالسَّلاَكَةِ وَفُضِيَ الْأَمْرُ
 وَلِلَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۱۰﴾

۲۵

ترجمہ ۱۰۔ اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ پس اگر تم پھسل گئے بعد اس کے کہ تمہارے پاس واضح باتیں آگئی ہیں۔ پس جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۲۰۹﴾ یہ لوگ نہیں انتظار کر رہے مگر اس بات کا کہ آئے اللہ تعالیٰ ان کے پاس آئے بادلوں کے سائناؤں میں اور فرشتے بھی۔ اور فیصلہ کر دیا جائے معاملے کا۔ اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے جائیں گے سب کا ہم ﴿۲۱۰﴾

مکمل اسلام

گزشتہ آیات میں منافقین کی مذمت اور مخلص ایمان والوں کی تعریف بیان کی گئی تھی کہ وہ اپنی جان اور مال ہر چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ اب ان مخلص مومنین کے خطاب ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ کافہ کا معنی اجمیعاً ہو رہا ہے۔ یعنی انسان اپنے جسم کے لحاظ سے اور اُدھر احکام شریعت کے لحاظ سے پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں۔ وفاداری صرف اور صرف اسلام سے ہو، باقی تمام ادیان، بدعات، رسومات باطلہ

وغیرہ سے مکمل طور پر علیحدگی ہو کر چونکہ یہ چیزیں اسلام کے منافی ہیں۔ اگر اسلام کے ساتھ ساتھ ایسی قبیح چیزوں کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھیے گا تو اس کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ ایسا شخص مکمل طور پر اسلام میں داخل نہیں ہوا۔ کافہ کا دوسرا معنی یہ بھی ہے۔ کہ ان کے ظاہر و باطن اور عقیدے اور عمل میں کسی قسم کا تضاد نہ ہو۔ جو کچھ دل کے اندر ہے زبان پر بھی وہی آنا چاہیے۔ اور جو عقیدہ ہے عمل بھی اُس کے مطابق ہو۔ زبانی دعویٰ کچھ ہو۔ اور عملی طور پر اُسکی تردید ہوتی ہو۔ تو یہ اسلام میں مکمل طور پر داخل نہیں ہو گا۔ اگر عقیدہ توحید کا ہو اور عمل میں شرک پایا جائے۔ زبان پر اتباع سنت کا دعویٰ ہو مگر دل میں بدعت کو دیا جا رہا ہے۔ تو یہ چیز کافہ کے منافی ہوگی۔

شیخ الحداد
ترجمہ قرآن

حضرت مولانا شیخ الحداد محمد الحسن برصغیر کے بلند پایہ مفسر قرآن ہوئے ہیں انہوں نے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ قرآن پاک کو آسان بنایا۔ اُن کے زمانے میں جو الفاظ متروک زبان ہو چکے تھے انہیں آسان اور عام فہم الفاظ کے ساتھ بدل دیا۔ یہ بامعاورہ ترجمہ آپسے امیری کے دوران مالٹا جیل میں مکمل کیا۔ اور ساتھ دودھوں کا حاشیہ بھی لکھا مگر زندگی نے وفانہ کی۔ چنانچہ بقیہ قرآن پاک کا حاشیہ آپسے شاگرد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے مکمل کیا۔ اس وقت برصغیر میں اردو زبان کا سب سے بہتر حاشیہ یہی ہے۔ جو مختصر اور صحیح ہے۔ تفسیریں اور حاشیے تو اد بھی بہت سے ہیں۔ کوئی لمبا کوئی مختصر عربی اور فارسی زبانوں میں بھی بے شمار حواشی موجود ہیں مگر یہ ترجمہ اور حاشیہ سب سے بہتر ہے۔ جو تمام عالمانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں بدعات کا خاص طور پر رد کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب شیخ الحداد مالٹا سے بذریعہ بحری جہاز واپس آ رہے تھے۔ تو سمندر میں طوفان آگیا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب جہاز کے بچ نکلنے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ تو آپسے ایک شاگرد کو جو ہمراہ تھا فرمایا کہ اس ترجمہ کو اپنے سینہ سے باندھ لو۔ اگر جہاز کی تباہی کی صورت میں تیرنا بھی پڑے تو اس ترجمہ کو ساتھ لے جانا۔ یہ مولانا عزیز گل سنا کر رٹ پٹا اور کہے بہنے لگے تھے۔ اور تیرنا جانتے تھے۔ حضرت

شیخ الہندؒ کے ہمراہی پانچ شاگردوں میں سے مولانا عزیز گل، ماسٹر اللہ آج بھی بقید حیات ہیں۔ سمندری طوفان کے دوران اگر آپ کو کسی چیز کی فکر لاحق ہوئی تو وہ ترجمہ قرآن پاک تھا۔ جو آپ نے نہایت عرق ریزی سے لکھا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور جہاز صحیح سلامت طوفان سے بچ نکلا۔ الغرض حضرت شیخ الہندؒ کو اس ترجمہ قرآن پاک کی اتنی فکر تھی کہ اگر کسی چیز کی پروا نہ کی۔ آپ کو صرف اسی گویہ نایاب کی فکر لاحق ہوئی۔ شیخ الہندؒ بڑے خدا پرست انسان تھے۔ محدث اور فقیہ تھے۔ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ انہیں ایک آنکھ دیکھنا بھی پسند نہ فرماتے آپ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے دین، مذہب اور قوم کو خراب کرنے والے انگریز ہی ہیں۔ مسئلہ کشمیر، فلسطین، قبرص، شام اور لبنان سب انگریز کے پیدا کردہ مسائل ہیں۔ یہ امریکہ تو کل کی پیداوار ہے۔ اصل فتنہ پرواز انگلینڈ والے ہیں۔ جو یہاں سے بھاگ کر امریکہ چلے گئے اور وہاں حکومت قائم کر لی۔ عیسائی خواہ امریکی ہوں یا برطانوی یا روسی انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت کی۔ انہوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے ساتھ سازشیں کیں۔ ان کو ذلیل و خوار کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں سب پیروں اور مولویوں نے ترکی کے خلاف کھڑا فتویٰ دے دیا۔ یہ صرف حضرت مولانا شیخ الہندؒ تھے جنہوں نے انگریز کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔

بشاکی ترویج

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمہ قرآن میں کافہ کاغذی سی لکھا ہے کہ اسلام میں اس طرح داخل ہو جاؤ کہ تمہارا کوئی عمل احکام اسلام کے خلاف نہ ہو۔ اپنی عقل یا دور رس کے کہنے سے دین میں کوئی چیز داخل نہ کرو کہ یہ بدعت ہے۔ مگر لوگ اسے اسلام کے نام کا رٹا ب سمجھ کر کرتے ہیں۔ کیونکہ بدعت نام ہی اس عمل کا ہے۔ جسے اچھا سمجھ کر دین میں اپنی طرف سے شامل کر لیا جائے۔ حالانکہ دین کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسے ہے۔ بیسے غناز اور روزہ افضل ترین عبادات میں سے ہیں۔ لیکن جب کوئی شریعت کی مقررہ نماز کے علاوہ

اب دعوات پانچے ہیں۔ فیاض

اپنی طرف سے کوئی نماز ایجا دکریگا تو وہ بدعت ہوگی مثلاً عید کے روز عید گاہ میں نوافل ادا کرنا اگرچہ نماز ہے مگر اسے بدعت کہیں گے۔ کیونکہ دین میں اسکی اہل نہیں ہے۔ اسی طرح ہزار روزہ رکھنا بھی بدعت میں شمار ہوگا۔ کیونکہ اپنی طرف سے دین میں شامل کیا گیا ہے۔

ایصال ثواب کی تمام رسوم بھی اسی قبیل سے ہیں۔ عیسرا، دسواں چلم وغیرہ کا ثواب اور مزدے کے لیے باعث اجر سمجھ کر کیا جاتا ہے مگر شریعت میں اس کی کوئی اہل نہیں۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کی مرج سرائی کے لیے نعت خوانی اور محافل میلاد منعقد کی جاتی ہیں۔ اور مختلف مقامات پر مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں مگر یہ سب کچھ شریعت کی منشا اور اس کے حکم کے بغیر ہوتا ہے۔ ملا علی قاریؒ اور دیگر فقہائے کرام لکھتے ہیں۔ کہ نماز جنازہ کی سلام پھیرنے کے بعد دعا نہیں کہنی چاہیے۔ کیونکہ یہ جنازہ میں اپنی طرف سے اضافہ تصور ہوگا۔ یہ چیز شارع علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح جب اقامت صلوٰۃ کے آخری کلمات لا الہ الا اللہ کے جاتے ہیں۔ تو دوسرے لوگ محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی بہت بڑی نیکی اور ثواب کی خاطر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام سے قطعاً ثابت نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے مسلمان کو حضور علیہ السلام کے طریقے پر یقین نہیں آیا۔ لہذا ان میں اضافہ کر لیا ہے۔ اذان سے پہلے درود شریف بہت بڑی سعادت سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ اس قسم کی بدعت کا ارتکاب محض اپنی عقل کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔

نوافل کی ادائیگی بلاشبہ خیر کثیر ہے۔ مگر اسکی جماعت ثابت نہیں۔ فقہائے کرام نے اسے بھی بدعت سے تعبیر کیا ہے۔ اہل جن نمازوں کی جماعت حضور علیہ السلام سے ثابت ہے، وہ درست ہے۔ اہل میں نماز تراویح، صلوٰۃ کوف اور نماز استسحار وغیرہ ہیں مگر صلوٰۃ التیمم کی جماعت کہاں سے آگئی۔ علمائے احناف اسے بھی بدعت قرار دیتے ہیں۔ اہم اگر خلیفہ کے مسلک میں درست نہیں ہے۔

حالانکہ یہ نماز سہ ہے اور اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔

الغرض! خلاصہ ان آیات کا یہ ہے۔ کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ، اور بدعات سے بچتے رہو اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی بعض لوگ مکمل طور پر اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں اہل کتاب کی مثال موجود ہے۔ یہودی علماء میں سے حضرت عبداللہ بن سلام کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی اور وہ اسلام لائے۔ بعض دوسرے یہودی بھی مشرف بہ اسلام ہوئے حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں کہ اگرچہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ مگر ان کا خیال تھا کہ قرآنی احکام کے ساتھ ساتھ تورات کے احکام کی بھی رعایت ہونی چاہیے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس خیال کی تردید فرمادی کہ اسلام کے ساتھ ساتھ کسی اور شریعت یا دین کی رعایت اسلام میں مکمل داخلے کی نفی ہوگی۔ لہذا باقی تمام شرائع اور ادیان کو چھوڑ کر اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

تورات میں حکم موجود ہے کہ ہفتہ کے روز سوائے عبادت الہی کے اور کوئی کام نہ کرو۔ گویا اس دن دینی کاروبار مکمل طور پر بند کرنے کا حکم تھا۔ حتیٰ کہ چولہا بھی گرم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ زراعت، نہ کاٹاری اور نہ کوئی اور کام کرنے کی اجازت تھی۔ اسی طرح یہودیوں کے دین میں اونٹ کا گوشت کھانا اور دودھ پینا ممنوع تھا۔ تو نہ مسلم یہودیوں نے خیال کیا کہ اسلام میں جمعہ کو افضل دن قرار دیا گیا ہے۔ ہم کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پُرانے طریقے پر اگر ہفتہ کی تعظیم بھی رواد رکھی جائے۔ اور ممنوعات کی پابندی کی جائے تو کیا صرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی بات سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اب اسلامی احکام کے ساتھ دوسری شریعت کی پابندی رواد نہیں ہے اگر اب بھی ایسا کیا جائے تو یہ خلل بدعت شمار ہوگا۔ کیونکہ شریعت محمدیؐ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔

أَدْخُلُوا فِي السِّلَاحِ أَفْئَةً اِیْکَ جَامِعِ اَیْتِہِے۔ اسلام میں مکمل داخلہ صرف ظاہری اعمال تک ہی موقوف نہیں۔ بلکہ باطنی طور پر بھی اسلام کے احکام

ظاہر و باطن
میں یکساں

پر پورا پورا یقین ہونا چاہیے۔ ظاہر تمام اعضا مثلاً ہاتھ، پاؤں، کان اور آنکھ احکام اسلام پر کاربند ہوں جس طرح بعض روایات میں آتے ہیں کہ روزہ صرف مجھ کو اور پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں بلکہ آنکھ، کان، زبان اور دیگر تمام اعضا و جوارح کا روزہ ہونا چاہیے اسی طرح باطن دل میں بھی پورا ایمان و یقین ہو کہ ان احکام کو پورے قلوب و نیت کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اگر ایسی کیفیت پیدا ہو جائے، تو کچھ لیجئے کہ آپ نے کَافَّةً کا مضمون پایا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے۔ ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کچھ حصہ اسلام کا لے لیا۔ اور کچھ بدعات کو بھی اپنا لیا۔ یا کوئی عبادت اسلام سے لے لی اور کچھ چیزیں کسی اور شریعت یا مقامی رسم و رواج سے حاصل کر لیں تو اسلام میں مکمل داخلہ تصور نہیں ہو گا۔ آپ کو یاد ہے سابقہ حکومت نے نعرہ لگایا تھا کہ دین تو ہمارا اسلام ہے۔ مگر معیشت ہماری، شغل و کم اور سیاست ہماری جمہوریت ہو گی۔ تو بتائیے یہ اسلام کی مکمل اتباع کیونکر ہو گی یہ تو تثلیث بنا کر رکھ دی۔ یقیناً یہ اس آیت کریمہ کی نفی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو حکم دیتا ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک کھائی اسلام کالیں گے اور باقی دو تہائی کے لیے دوسروں کے دروازے پر جائیں گے، ہم نے اُسی وقت کو دیا تھا کہ یہ نعرہ اسلام کے سرسرنما فی ہے۔ اگر دین اسلام ہے تو پھر معیشت اور سیاست بھی اسلام ہی سے کرنا ہو گی۔ ورنہ یہ قول دخل میں تضاد اور ظاہر و باطن میں عدم یکسانیت ہو گی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد عالیہ کتب اعدادیث بخاری و مسلم وغیرہ میں مرتب شکل میں دستیاب ہیں ان میں نظام حکومت کا مکمل خاکہ موجود ہے۔ خلفاء راشدین کے نظام حکومت کی تفصیلات موجود ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی ازالۃ الخفاء اور دیگر کتب میں دستور مملکت موجود ہے۔ مگر آپ اس کو چھوڑ کر غیروں کے نظام تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسلام کے نام پر قائم ہونے والے کسی ملک میں بھی اس نثریہ کاتالون

نافذ ہے۔ قوانین دیوانی و فوجداری، تجارت و حیثیت وغیرہ سب انگریزی قانون میں انگریز کے زمانہ میں ان قوانین کو قبول کرنا تو ہماری مجبوری تھی، اب کیا تکلیف ہے ہم اسلامی نظام کیونکر نافذ نہیں کر سکتے۔ کیا کارپوریشن حکومت کو اسلام کے قوانین و نظریات پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر اعتماد ہوتا تو انگریزی قوانین پہلے دن سے تبدیل کر دیے جاتے۔

اسلام انقلابی
مذہب ہے

اصل بات یہ ہے کہ اس وقت اسلام کو انقلابی مذہب ہم خود اور ہمارے حکمران تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ اسلام کا نفاذ بتدریج چاہتے ہیں نتیجہ یہ ہو گا کہ جس طرح پہلے حکمران نفاذ اسلام کے بغیر چلے گئے۔ اسی طرح موجودہ حکومت بھی شخصیت ہو جائیگی مگر اسلام نافذ نہیں ہو گا۔ اور اس کے بعد تیسرا آجائے گا وہ اپنا طور طریقہ اپنائیگا۔ یہ ہر کہ آمد تجارت و ساخت مگر لوگ اسلام کی برکات سے محروم ہی رہیں گے۔ جب تک اسلام کو انقلابی اقدام کے طور پر نافذ نہیں کیا جائے گا، کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ دیکھیے۔ فتح مکہ کے روز حضور نے انقلابی اعلان فرمایا تھا کہ جاہلیت کی ہر رسم آج میرے پاؤں کے نیچے روند دی گئی ہے آج کے بعد کسی مشرک کو برہنہ حالت میں طواف کعبہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ کسی غیر مسلم کو مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ آج کے بعد تمام سودی کاروبار بند کیے جاتے ہیں۔ یہ سب انقلابی مذہب کے انقلابی پروگرام تھے جو غلط پروگرام کی جگہ فی الفور نافذ کر دیے گئے۔ مقصد یہ کہ اگر عقیدہ اسلام کا ہے۔ تو پھر قوانین بھی اسلامی نافذ ہونے چاہئیں۔ جو ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہوں۔ ملکی مسائل معاشی ہوں یا معاشرتی عبادات ہوں یا رسم و رواج ہر معاملہ میں اسلام سے رہنمائی حاصل کرنا ہو گا۔ آدھا تیرا اور آدھا بیسرا سے کام نہیں چلے گا۔ پہلے پاس ہر ہر شعبہ کے لیے قوانین موجود ہیں، ضرورت صرف عمل کی ہے۔ اسلام کی عملداری میں انگریز کی مجبوریت چلے گی، نہ سوشلزم کی اقتصادیات ہوں گی اور نہ کمارل مارکس کی اشتراکیت کا کوئی حصہ ہو گا۔ بلکہ پورے کا پورا نظام اسلامی ہو گا۔ حتیٰ کہ دیوانی اور فوجداری قوانین

بھی وہی نافذ ہوں گے جو اسلام نے عطا کیے ہیں۔ حق دار کی حق رسی اسنی قوانین کے ذریعے ممکن ہے۔ اور ظالم کو ظلم کا بدلہ ہی قوانین دلا سکتے ہیں۔ یہی وہ قوانین ہیں جن کے ذریعے دنیا میں امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ اَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً کا یہی مطلب ہے۔

یہودیوں میں بھی یہی خصلت پائی جاتی ہے۔ کہ وہ بھی اپنی کتاب پر کھل ایمان نہیں رکھتے تھے۔ کسی حکم کو مانتے تھے اور کسی کا انکار کر دیتے تھے۔ جیسی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتلایا اَفَتَوْهِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ اِيَّاكُمْ كُنَّا نَسِيكُمْ اَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ عَذَابٌ مُّبِينٌ۔ یہ تو اسے منافقت ہے۔ اس روش کو چھوڑ کر پورے کے پورے ایمان میں داخل ہو جاؤ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ گویا بدعات پر چنا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے بہکاوے میں نہ آجانا مطلب یہ کہ جو کوئی دین اسلام کا راستہ چھوڑ کر ہندو یا زرتشتی کو اپنا سنے گا۔ انگریزوں اور مشرکوں کا قانون اختیار کرے گا۔ وہ شیطان کے نقش قدم پر چلے گا۔ اور ظاہر ہے کہ دشمن ہمیشہ دشمنی کرتا ہے۔ وہ کبھی خیر خواہی کی بات نہیں کرتا۔ وہ تمہیں ہستی کی طرف لے جائے گا۔ شیطان کا تو کام ہی یہ ہے۔ يَكْذِبُوا حَسْبُكَ رَبِّكَ كُوْنُوا مِنْ اَصْحَابِ السَّعِيدِ وہ تو اپنا بڑے سے بڑا گمراہی کر جہنم کی طرف رواں ہے۔ اور اپنے نقش قدم پر چلنے والوں کو اسکی طرف دعوت دے رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کے مکمل نفاذ کی ترغیب دینے کے بعد اس سے روگردانی کرنے والوں کو وعید بھی سنائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ عَنْ وَجْهِ رَبِّكُمْ فَاَعْلَمُوْا تَرِيْدُوْنَ اَنْ تَكُوْنُوْا كَالْاَشْجَارِ اَمْ كَالْاَنْثٰثِ۔ اور اگر تم پھسل گئے بعد اس کے کہ تمہارے پاس نشانیاں آگئیں۔ فَاَعْلَمُوْا تَرِيْدُوْنَ اَنْ تَكُوْنُوْا كَالْاَشْجَارِ اَمْ كَالْاَنْثٰثِ

بیک اللہ تعالیٰ زبردست ہے۔ اور حکمت والا ہے وہ کمال قدرت کا مالک ہے اس کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔ اسکی حکمت کے مطابق دیر ہو سکتی ہے مگر گرفت سے بچاؤ ممکن نہیں۔ وہ تمہارے کئے کا ضرور بدلے گا۔ دوکے مقام پر منبر آیا قَدْ شَبَّكَ مِنَ الرَّشْدِ مِنَ الْغَيِّ نَكِي اور بدی کی واضح نشان دہی ہو چکی۔ اب تمہارا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان واضح ہدایات کے بعد نیکی یا بدی کا اختیار کرنا تمہارے بس میں ہے۔ اور اس پر جزا یا سزا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام نہ ماننے والوں کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ انہیں کس چیز کا انتظار ہے۔ جسے دیکھ کر ایمان لائیں گے۔ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ بِهَذَا لَوْ كَانُوا يَحْشُرُونَ۔

ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اُن کے پاس بادلوں کے سائے میں آئیں مطلب یہ کہ محرمین کی خواہش یہ ہے کہ جو چیز قیامت کو ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ آج ہی ہو جائے۔ بادلوں کے سائبانوں میں نزول اجلال تو قیامت کے روز ہو گا جب اللہ تعالیٰ خود نزول اجلال فرمائیں گے اور سائبان جو ہوں گے، وہ تار، نور اور پانی کے ہوں گے۔ ستر ہزار حجاب میں اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائے گا۔ ارد گرد فرشتے بیس پڑھ رہے ہوں گے۔ اُس وقت عدالت قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کا فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں۔ کہ یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے۔ مہل قبل از وقت یہ کیسے ممکن ہے۔ دوسری جگہ فرمایا قَبَّحَ بِهٖ يَوْمَئِذٍ الْفٰسِقُوْنَ قرآن پاک اللہ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے آجانے کے بعد یہ اور کس کتاب کے منتظر ہیں۔ جس پر ایمان لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر خاتم النبیین تشریف لاپچکے۔ اب ان کی راہنمائی کے لیے اور کون سا نبی آئے گا۔ جس کا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں اب کوئی شریعت، کوئی پروگرام نہیں جو باقی ہے۔ اور جس کا انتظار کیا جائے۔

الغرض فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بادلوں کے سائبانوں میں نزول اجلال تو قیامت

اللہ تعالیٰ
کا فیصلہ

کے روز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی تعالیٰ ستر ہزار پندوں کے اندر ظاہر ہوگی۔ کائنات کی ہر چیز درہم
 برہم ہو جائے گی۔ اور سخت ناراضگی کا طور ہوگا۔ چنانچہ اس وقت وَقُضِيَ الْأَمْرُ
 فیصلہ کر دیا جائے گا مگر یاد رکھو وَلِكِ اللَّهُ تَرْجِعُ الْأُمُورَ تمام کام اللہ ہی کی طرف
 لوٹائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے۔ اس کا مقرر کردہ ہر کام وقت پر
 ہوگا۔ اُسی کے قانون کے مطابق انسانوں کو اس دنیا پر مہلت دی جاتی ہے۔ مگر
 آخری فیصلہ اور نزول اجلال قیامت کے روز ہی ہوں گے۔ یہ چیزیں قبل از وقت
 وقوع پذیر نہیں ہوں گی۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و شش (۸۶)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۱۱ تا ۲۱۴

كُلُّ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَآ اتَّخَذْتَهُمْ مِن آيَةٍ بَيِّنَةٍ ط
وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ زَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَوةُ الدُّنْيَا
وَيَسْحَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ
يَوْمَ الْقِيَمَةِ ط وَاللَّهُ يَزُوقُ مَن لَّشَاءَ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ: آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دیں۔ اور جو
کوئی اللہ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ اس کے بعد کہ وہ نعمت اُس کے پاس پہنچ
چکی۔ پس جیسا کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے (۲۱۱) مزین کی گئی ہے۔ دنیا کی
زندگی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا۔ اور وہ مشا کر رہے ہیں ان لوگوں کے ساتھ
جو ایمان لائے۔ اور وہ لوگ جو بدترتے رہے۔ وہ ان کے اوپر (بلکہ) ہوں گے قیامت

کے دن۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے (۲۱۲)
گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا تھا کہ اُس کے واضح احکامات آسمانے
کے بعد ان کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ احکام الہی کی تعمیل ہونی چاہیے
واضح نشانات کے بعد بھی اگر کوئی شخص پھسل جائے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں
آسکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے بطور مثال ارشاد فرمایا ہے۔ كُلُّ بَنِي إِسْرَءِيلَ
آپ ذرا بنی اسرائیل سے دریافت تو کریں کہ اتَّخَذْتَهُمْ مِن آيَةٍ بَيِّنَةٍ ط
ایہ بے شک ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں عطا کیں۔ واضح یا کھلی نشانیاں ہیں تعلیم
بھی آتی ہے۔ اور معجزات بھی آتے ہیں مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام
کے توسط سے تمہیں کس قدر واضح معجزات عطا کیے۔ ان کی تفصیل پہلے اچھی ہے

واضح نشانیاں

منجملہ اُن کے ابر کا سایہ کرنا، پتھروں سے بارہ چشمے جاری کر کے بنی اسرائیل کو سیراب کرنا، اُن کے لیے من و سلوئی کی خوراک مہیا کرنا، دشمن کو آنکھوں کے سامنے ہلاک کرنا، بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں راستے بنا دینا وغیرہ ایسے واضح نشانِ الہ معجزات ہیں جو بنی اسرائیل کو عطا کیے گئے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کا انکار کیا۔ اور پے پے غلطیاں اور کوتاہیاں کیں جن کا ذکر اس سورۃ مبارکہ میں آچکا ہے۔ اور جن کی تعداد کم و بیش چالیس ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر بار معاف فرمایا۔ بنی اسرائیل بہت بڑی قوم تھی۔ دنیا میں جاہ و وقار کی مالک تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو اللہ نے علم و حکمت اور بادشاہی عطا کی۔ تمام رنیوی نعمتوں سے مالا مال کیا مگر اس کے باوجود جب ان کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو اللہ تعالیٰ نے ذلیل و خوار کر کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے۔

وَمَنْ يَسْتَبْذِلْ فَنَحْنُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ اللَّهُ تَعَالَى كِي نَعْتَمَ كِي
بہیج جانے کے بعد جو بڑے بدلے ڈالے فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ اَللّٰهُ تَعَالٰی

نعمت سزا دینے والا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا وجود بھی خدا تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور عام لوگوں کے لیے معیار اور نمونہ ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر لوگ اپنے ظاہر و باطن کو درست کر سکتے ہیں۔ انبیاء کا وجود انسانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو اسی نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بَدَّلَ لَوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا مِّمَّا كَانَتْ فِيْ قُلُوْبِهِمْ لَمَنْ يَرْجُوْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ اس نعمت سے مراد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ آپ پر ایمان لانے اور آپ کا اسوہ اختیار کرنے سے اعراض کیا۔ لہذا خود بھی جہنم میں گئے اور قوم کو بھی جہنم رسید کیا۔

علم اور عمل انسان کے لیے لازمی چیزیں ہیں۔ ان کے بغیر کامیابی ممکن نہیں علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے۔ اور عمل انبیاء سے ملتا

ہے۔ انبیاء معیار ہوتے ہیں انہیں دیکھ کر اعمال درست کیے جلتے ہیں۔ قرآن پاک نے فرمایا کہ لَوْ كَانَ لَكُمُ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْغَبُ فِيهِ لَآتَىٰ بِهَا خَيْرًا مِّنْ كُلِّ مَنَاصِلٍ مِّنْ دُونِهَا وَلَوْ لَمْ يَلِدْ وَلَوْ لَمْ يَبْتَغِ الْوَسِيلَةَ لَأَتَىٰ بِهَا خَيْرًا مِّنْ كُلِّ مَنَاصِلٍ مِّنْ دُونِهَا وَلَوْ لَمْ يَنْصَرِفْ لَأَتَىٰ بِهَا خَيْرًا مِّنْ كُلِّ مَنَاصِلٍ مِّنْ دُونِهَا

انعامات کی
ناقدری

جس طرح پیغمبر علیہ السلام کی ذات بابرکات انعام خداوندی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس نعمت کی بھی قدر نہیں کی۔ آپ ہر خطبہ میں سنتے ہیں خَيْرُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللَّهِ تَمَامُ الْكَلَامِ بَشَرُ اللَّهِ تَمَامُ الْكَلَامِ وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور بہترین طریقہ حضور علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ مگر آج کون بے جوہران دونوں انعامات سے مستفیض ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے لیے راہ ہدایت ہیں بلکہ جب کسی خوشی ملی، قومی و ملکی، سیاسی و معاشرتی معاملات میں اہمائی کی ضرورت پیش آتی ہے، تو ان سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے رسم و رواج کا سہارا لیتے ہیں۔ یاد رکھو غیر اسلام ازموں کی طرف دیکھتے ہیں۔ کیا یہ انعامات کی ناقدری نہیں۔

گزشتہ چوبیس سال میں ہمارے پاس صرف ایک آدمی آیا ہے جس نے طلاق کے مسئلہ میں صحیح راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہنے لگا کہ ہمارے بچے اور بیوی میں تنازعہ ہے۔ دو سال سے مصاحبت کی کوشش کر رہے ہیں، مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ زہبت طلاق تک پہنچ چکی ہے۔ لہذا آپ ہمیں طلاق کا شرعی طریقہ بتائیں تاکہ ہم عند اللہ ماخوذ نہ ہوں۔ اس ایک کیس کے علاوہ ہمیشہ لڑل ہوتا ہے کہ از خود تین طلاقیں ملے دیں اس کے بعد جب عیالمت

ہوتی تو ہمارے پاس آگئے کہ جلدی میں طلاق دیدی ہے۔ اب کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے مطلقہ دوبارہ حلال ہو جائے۔ اللہ کے بندو! بغیر سوچے سمجھے، بغیر مسئلہ دریافت کیے ایسا کام کیوں کرتے ہو، جس سے خود تمہیں تکلیف ہو، اور جو تمہارے والدین اور پرے خاندان کے لیے باعث ازیت ہو چاروں مذاہب میں تیسری طلاق کے بعد بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ اگر زبردستی حلال کرنے کی کوشش کرو گے، تو حلال نہیں ہوگی۔ اولاد بھی مشکوک اور حرام ہوگی۔ پھر جا کر شیعوں اور اہل حدیثوں سے مسئلہ دریافت کرتے ہیں کہ کسی طرح حلت کا فتویٰ مل جائے۔ یہ سب انعامات خداوندی کی ناقدری ہے۔ اس نعمت کو بر دقت استعمال کرنا چاہیے۔ اور شیطان کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہیے۔ جس قوم کے پاس قرآن و حدیث جیسی نعمت موجود ہو، اُسے کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کبھی امر بیکہ کی طرف درڑتے ہیں کبھی برہانہ اور فرائض کی طرف دیکھتے ہیں۔ کہ ہمیں حکم دو۔ کوئی ایڈوائز نہ بھیجو۔ جو ہماری رہنمائی کریں یہ کس قدر کفران نعمت کی بات ہے فکر اور عقیدہ فاسد ہے۔ جس کی وجہ سے روبرو تیسرے سنیں آرہا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو سخت سزا دینے والا ہے۔ اس کی نعمتوں سے روگردانی کر کے، قرآن و سنت کا دامن چھوڑ کر عزت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تو عذاب و سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اپنے ارد گرد نظر مار کر دیکھ لیں، کوئی قوم مملکت کے چھین جانے کے عذاب میں مبتلا ہے کہیں بدعات اور رسوم باطلہ کا دور دورہ ہے۔ محتاجی ہے۔ دین مجبوس ہو گیا ہے۔ نیکی سے محرومی ہے۔ بدی کا چرچا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی سزا ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا جس بادیر میں جس کنویں پر تین آدمی موجود ہوں اور وہ نماز باجماعت ادا نہ کریں۔ اس کو خود علیہ السلام الشیطان اُن پر شیطان قابو پا لیتا ہے بمقصد یہ کہ جب بھی کوئی قوم اسلام کے خلاف چلے گی، اُس پر شیطان قابو پائے گا۔ اور یہی عذاب ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے انعامات کی قدر کرنا چاہیے۔ بنی اسرائیل نے ان

نعمتوں کی قدر نہ کی، معجزات کو ٹھکرایا، نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے اپنی سازشی، تخریبی اور گندی دہشت کی بناء پر بدترین قوم بن کر رہ گئے۔ اسی طرح جو بھی قوم اللہ تعالیٰ کے انعامات کی ناقدری کریگی ذلیل و خوار ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کو مبعوث فرمایا۔ آپ کے ساتھ ایک معیاری جماعت کو پیدا کیا، خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ تھے۔ ان کی پیروی کرنے والے دنیا اور آخرت میں سرفراز ہوئے۔ دنیا میں عروج حاصل ہوا فتوحات نصیب ہوئیں اور آخرت میں بھی بہترین اجر و ثواب کے مستحق ہوئے۔

حُبِّ دُنْیَا

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو واضح فرمایا کہ کفار کے نزدیک دنیا کی کیفیت یہ ہے۔ اور اہل ایمان کی حالت دنیا میں کیا ہے۔ اور آخرت میں ان کے لیے کون سے انعامات تیار کیے گئے ہیں۔ فرمایا **لَّذِینَ کَفَرُوا الْحَیْوَةُ الدُّنْیَا** جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، ان کے لیے دنیا کی زندگی مڑن کی گئی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو سائے شر و فساد کی جڑ ہے۔ جب کوئی شخص دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہو جائے کہ صرف اسی کو اپنا مقصد حیات بنائے تو پھر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ دوسروں کی حق تلفی، قتل و غارت، عیش و عشرت یہ سب دنیا سے غیر معمولی محبت کا ثمرہ ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ **حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ كُلِّ خَطِئَةٍ** دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ محبت سے مڑاویں محبت ہے۔ جس سے آخرت بھی فراموش ہو جائے۔ دین ختم ہو جائے عبادت رو جائے خدا پرستی کے طور طریقے ناپید ہو جائیں۔ اور حالت یہ ہو جائے کہ **یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیْوَةِ الدُّنْیَا** وہ دنیا کی تمام ظاہری چیزوں کو جانتے ہیں وہ **مِّنَ الْآخِرَةِ غَافِلُونَ** مگر آخرت کے بارے میں بالکل غافل ہیں، کچھ نہیں جانتے بظاہر بڑے عقل و دانش کے مالک ہیں۔ مگر معاد کے متعلق ذرہ بھر بصیرت نہیں رکھتے۔ اسی کا نام گمراہی ہے انسان جس قدر دنیوی محبت میں گرفتار ہوگا نیکی سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کے متعلق فرمایا کہ کافروں کے لیے دنیا کی زندگی کو مڑن

کیا گیا ہے۔

فرمایا جو لوگ دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی ایک قبیح حرکت یہ ہے۔ کہ
وَلَيْسَ خَيْرُ دُنْيَا مِنَ الدِّينِ اَمْشَوْا وَه اہل ایمان کو تسخیر کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایمان
والوں کی ظاہری کمزوری، ان کا فقر و فاقہ دنیا داروں کے لیے ٹھٹھا بن جاتا ہے ان
پر آواز سے کہتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وَاِذَا هُمْ يَنْتَعِمُ مَزُونٌ
کافر لوگ غریب مسلمانوں کو دیکھ کر اشلے کرتے ہیں کہ دیکھو جنت کے وارث جا
ہے ہیں۔ پھٹے پڑنے کے پٹے، انہ زمین نہ باغات، انہ سہنے کو مکان، مگر دعویٰ جنت
کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن کے دل میں محض دنیا کی محبت گھر کر چکی ہے۔ ان کے
لیے دنیا کے لوازمات اور آسائش ہی معیار ہے۔ ان کے نزدیک ایسا شخص حقیر
ہے جس کے پاس دنیا کا مال و دولت نہیں ہے اور اس ساری خرابی کی بنیادی
وجہ یہی ہے۔

فرمایا اہل دنیا کے برخلاف فَلَاذِينَ اتَّقُوا جو لوگ اہل تقویٰ ہیں جو دنیا
سے بے رغبت اور آخرت پر نظر رکھتے ہیں۔ فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
وہ قیامت کے دن اہل دنیا سے بلند تر درجات پر فائز ہوں گے۔ تقویٰ۔ کفر
شرک اور معصیت پر ہیز گاری کا نام ہے یعنی التَّقْوَى عَنِ الشِّرْكِ وَالْكَفْرِ
وَالْمُنَاقَا وَالْعَصْيَانِ عرفیہ کہ عقائد و اعمال کی ہر بُرائی سے بچ جانا ہی تقویٰ ہے
شیخ عبد القادر جیلانیؒ آیت پاک اِنَّ اللّٰهَ يَافِضُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ
کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ متقی وہ لوگ ہیں جو عدل و انصاف پر قائم ہیں۔ اور جو لوگ
ظالم ہیں، عدل و انصاف سے عاری ہیں۔ وہ متقی نہیں ہو سکتے۔

الغرض! فرمایا کہ دنیا میں تو یہ لوگ اہل ایمان سے ٹھٹھا کرتے ہیں مگر قیامت
کے دن اہل ایمان ان سے بالا ہوں گے۔ حضرت علیؑ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ
جو شخص کسی مومن سے اُس کی ناداری کی بنا پر ٹھٹھا کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت
کے دن ایسے شخص کو تمام اولین اور آخرین کے سامنے ذلیل و رسوا کرے گا۔ جو کوئی

شخص کسی مومن پر ایسا عیب لگا رہے۔ جو اس میں نہیں پایا جاتا، توقیامت کے روز عیب نکلنے والے کو آگ کے ٹیلے پر کھڑا کیا جائیگا اور کہا جائے گا کہ سب سے بدست خود اپنی تکذیب کرو۔ میں نے اس پر جھوٹ کہا تھا۔ درحقیقت اس ہر مومن میں یہ عیب نہیں پایا جاتا تھا۔ آج تریہ لوگ طرح طرح کے مذاق کرتے ہیں، عیب جوئی کرتے ہیں اور ہستان لگاتے ہیں۔ مگر انہیں قیامت کے دن پتہ چلے گا۔ جب دینی زندگی میں کمزور ناتواں مومن ان پر حاوی ہوں گے اور بلند مراتب پر فائز ہوں گے۔ یہ مقام انہیں تقویٰ کی وجہ سے حاصل ہوگا۔

قرآن پاک میں متقین کا ذکر بار بار ہے۔ جیسے هٰذِهِ اُمَّةٌ رَّحِمْنَا لَمْ يَلْبِسْ غَيْرُهَا قَوْلًا شَبِيهًا لِّقَوْلِ الْكَافِرِ۔ دوسری جگہ فرمایا اُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا وَلَمْ يُبَيِّنْ لَهُمْ اَلْمُتَّقِيْنَ اَيْ عَنِ الَّذِيْنَ لَوْ كَانُوا اَعْمَالًا، اور اخلاق اچھا ہے۔ جن میں تہذیب نفس پایا جاتا ہے، وہی لوگ سچے ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ دنیا میں اگر ظاہری اسباب نے لحاظ سے کوئی شخص نادار اور کمزور ہے تو اس کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ مہارکار دولت مندی اور نلکاری نہیں، بلکہ ایمان، تقویٰ اور نیکی ہے۔ کیونکہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اللہ کے نزدیک قدر و منزلت کا معیار تقویٰ ہے۔ ایک مزدور بڑی محنت و مشقت سے اپنی روزی کما رہا ہے۔ اس کا عقیدہ بھی درست ہے۔ فرائض کو ادا کر رہا ہے، تو ایک بڑے سے بڑا دولت مند اس کے خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ایک مالدار ایک مزدور کو حقیر سمجھے۔ یہ تو باعث لعنت ہے ایسا شخص عذاب کا مستحق ہے۔

فرمایا وَاللّٰهُ يَبْدُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ رزق کی فراوانی اللہ تعالیٰ کے مقرب ہونے کی دلیل نہیں۔ اور نہ ہی یہ اللہ کی رضا کا معیار ہے۔ رزق کا بستر و کشادہ مالک الملک کی مصلحت پر موقوف ہے۔ اللہ يَبْسُطُ الرِّزْقَ

رزق کی فراوانی

لَعَنَ يَسَّاءُ وَيَقْدِرُ اللہ تعالیٰ جس کا پاس ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کا پاس ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اس کی مصلحت کو انسان نہیں جان سکتا۔ یہ اُس کا اپنا پروگرام ہے۔ چاہے تو کافر دنیا میں رہنا چاہے پھر مومن کمزور محض ہو کر رہ جائے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر نافرمان دنیا میں خوشحال ہو اور ہر مومن تنگ دست ہو۔ بلکہ کُلُّ نَفْسٍ - ہر نفس کو وہ سب کو دیتا ہے۔ مومن کو بھی، کافر کو بھی مگر حقیقی کمال یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام اور سلف صالحین کو بلند کیسے نصیب ہوئی ہے۔ یہ چیز صرف اور صرف تقویٰ کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ اے ابن آدم تیری زبان میرا مال میرا مال کہتے نہیں تھکتی۔ تو ہمیشہ مکالی مکالی کہتا رہتا ہے۔ کبھی میری دکان کبھی میری زمین، میرا کاروبار، میرا باغ تیرے در در زبان رہتا ہے۔ مَا لَكُمْ هَلْ مَا لَكُمْ إِلَّا مَا أَكَلْتُمْ تیرا مال وہ ہے جو تر لے کھایا۔ اَوْ لَبَسْتُمْ یا تو نے پہن لیا اور بوسیدہ کر لیا۔ اَوْ قَذَفْتُمْ یا آگے بھیج دیا۔ اس کے علاوہ تیرا اور کوئی مال نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے۔ الدُّنْيَا دَارٌ - مَنْ لَا دَارَ لَهُ - یعنی دنیا تو اُس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو۔ اُس کا مال ہے، جس کا مال نہ ہو، اور صرف دنیا کی خاطر وہی انسان جمع کر رہا ہے۔ جس کی عقل نہ ہو۔ کیونکہ صاحب عقل آخرت کی بھی فکر کرے گا۔ ایمان دار تو یہ فکر دامن گیر ہوگی۔ کہ آخرت کا سامان ہو جائے۔ وہاں پہنچ کر کیس غالی ہاتھ نہ رہ جائیں۔ کیونکہ بعد میں وہاں کون سے کرے آئیگا۔ لہذا آخرت کے لیے ترشہ پہلے ہی بھیج دے۔

کس نیار نہ پس تو پیش فرست

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ جسے چاہتا ہے۔ بغیر حساب کے روزی عطا کر دیتا ہے۔ اور کمال مدار ایمان اور تقویٰ ہے۔ سلف صالحین کو اسی چیز سے عروج حاصل ہوا۔ کافر لوگ حُب دُنْیَا کی وجہ سے اہل ایمان سے ٹھٹھا کرتے ہیں حالانکہ یہی چیز خرابی کی اصل جڑ ہے۔ دنیا کو استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہے

مگر اس کو معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کر دینا۔ اور اس کی وجہ سے فرانس اور
امور آخرت سے غافل ہو جانا باعث وبال ہے۔

سَيَقُولُ

درس ہفتاد و ہفت (۸۷)

الْبَقَّةُ ۲

آیت ۲۱۳

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ
وَمُنْذِرِينَ ۖ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُخْطَبُ
بَيْنَ النَّاسِ فِيهِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ
إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا
أَبْيَنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ
مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ
مُسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾

ترجمہ : سب لوگ ایک ہی امت (دین ملت) پر تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے ۔
خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان نبیوں کے ساتھ ہی کتاب اتاری تاکہ
وہ لوگوں کے درمیان اُس بات میں فیصلہ کریں، جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور
انہیں اختلاف کیا اس میں مگر ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی بعد اس کے کہ ان کے
پاس واضح باتیں ابھی تھیں (یہ اختلاف کیا انہوں نے) آپس میں سرکشی کرتے ہوئے ۔
پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت دی اپنے حکم سے جو ایمان لائے اُس بات میں
جس میں وہ اختلاف کرتے تھے حتیٰ سے اور اللہ تعالیٰ جن کو پاسے پر سے راستے

کی ہدایت دیتا ہے ﴿۲۱۳﴾

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی، کہ جو شخص نعمت الہی کے حصول کے لئے کوشش کرے
بعد اسکی تکذیب کرتا ہے، وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ جل جلالہ نے بنی اسرائیل
کا بطور مثال ذکر فرمایا، کہ ہم نے انہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا مگر اس قوم نے

ہاشم گزاری کی اور طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہوئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی نادرستی کا سبب بنی۔ گذشتہ درس میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ فتنہ و فساد کی اصل جڑ مہمبت، دنیا ہے۔ دنیا کی محبت میں گرفتار افراد اہل ایمان سے ٹٹا کر تے ہیں اور ان کو حقیر مانتے ہیں۔ حالانکہ کامیابی کا اصل دار و مدار مال و دولت پر نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیزگاری پر ہے۔ اہل تقویٰ قیامت کے دن اہل دنیا پر برتری حاصل کر لیں گے۔

امت واحدہ

آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے دین و ملت کی وحدت کا تذکرہ فرمایا ہے ارشاد ہوا ہے **حَكَانَ الْمَنَاسُ اُمَّةً وَاحِدَةً** سب لوگ ایک ہی ملت پر تھے۔ ملت، اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد کے افکار و خیالات ایک جیسے ہوں۔ ملت حق بھی ہوتی ہے اور ملت باطل بھی۔ مگر اس آیت میں جس ملت کا ذکر ہو رہا ہے اُس سے مراد ملت حق ہے۔

تمام لوگ ایک ہی ملت پر کب تھے۔ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق عالم ارواح سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کو حاضر کر کے اُن سے سوال کیا تھا۔ **اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ** کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔ **قَالُوا بَلٰی** "ہاں مولانا کہیں نہیں، تو ہی ہمارا رب ہے۔ اُس وقت تمام لوگ امت واحدہ تھے یعنی ایک ہی ملت پر قائم تھے۔ اس قسم کے اشارات سورۃ اعراف اور بعض دوسری سورتوں میں بھی ملتے ہیں مقصد یہ کہ اُس وقت تمام روحوں نے ملت واحدہ پہ ہونے کا اقرار کیا تھا تو اس دنیا میں اس سے انکار کی کیا وجہ ہے۔ یہ تو بڑی نا انصافی کی بات ہے۔

اس ضمن میں مشورۃ تشریح جو اکثر مفسرین کرام نے بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ملت واحدہ کا زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک کا ہے اس عرصہ میں تمام لوگ ایک ہی امت تھے اور وہ ملت واحدہ پر قائم تھے۔ اُن کا دین بعینہ وہی تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کا تھا۔ ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اس کے بعد اختلافات پیدا ہونے لگے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک ان کا دائرہ

بہت وسیع ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے زمانے میں لوگوں کی وسیع پیمانے پر تطہیر ہوئی ان کی اکثریت ہلاک ہوئی اور صرف گنتی کے وہ افراد بچ گئے جو دینِ حق پر قائم تھے۔ کہ کشتی میں سوار ہو کر بچ جانے والوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹا مکمل شامل نہیں تھے کیونکہ وہ دینِ حق سے دو گردانی کر چکے تھے۔ کشتی کے ذریعے ہلاکت سے محفوظ رہنے والے لوگ کافی عرصہ تک دینِ توحید اور ایمان خالص پر کاربند رہے۔ حتیٰ کہ ایک زمانہ ایسا آیا، جب اختلاف، نے پھر زور پکڑ لیا اور امت میں غلط مطہقہ سے پیدا ہو گئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ امت واحدہ کا زمانہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کا زمانہ ہے۔ آپ کے بعد ڈیڑھ ہزار سال تک لوگ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے پکے دین پر قائم رہے۔ تا آنکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پہلے عمر دینِ حق جیسے عمر و ان قیمہ بھی کہتے ہیں۔ اُس نے عربوں میں بت پرستی کو رواج دیا۔ اس کے بعد چند صدیوں میں بت پرستی کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ اللہ کا پاک گھر بیت اللہ شریف بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جب نبی کریم نے مکہ کو فتح کیا۔ تو اس پاک گھر کو بتوں سے پاک کیا۔ اور پھر حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ ہی میں عرب کا ہر حصہ کفر و شرک کی نجاست سے پاک ہو گیا۔ یہ سب تفسیریں ملتی ہیں مگر زیادہ مشہور تفسیر وہ ہے۔ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے۔

امت واحدہ کے تذکرے کے بعد فرمایا **فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ**۔ پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اب آیت کے ان دونوں حصوں کا ترجمہ یوں ہو گا کہ تمام لوگ ایک ہی ملت پر تھے، پھر اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ملت کا دینِ حق پر کاربند ہونا بعثت کی علت نہیں بنتا۔ اس سلسلہ میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آیت کے ان دو جملوں کے درمیان لفظ **فَاخْتَلَفُوا** مخدود ہے اس لفظ کو درمیان میں لانے سے اشکال دور ہو جائے گا کیونکہ اب پورا جملہ اس طرح ہو گا کہ سب لوگ ایک ہی دینِ حق پر تھے۔ پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا، تو اللہ تعالیٰ

نے انبیاء کو وقتاً فوقتاً مبعوث فرمایا۔ جب لوگ اختلاف کی بنا پر دین سے ہٹ جاتے تھے تو اصل دین کی نشاندہی کے لیے انبیاء کو بھیجا گیا۔ وہ لوگوں کو سناتے تھے کہ تم اصل دین سے ہٹ چکے ہو، صحیح راستہ یہ ہے، اس کی طرف آؤ۔ اس بات کی مزید وضاحت سورۃ انبیاء میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے فرمایا اِنَّ هٰذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ اور میں تم سب کا رب ہوں۔ شبِ معراج میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء سے دریافت فرمایا کہ آپ کی بعثت کا مقصد کیا ہے۔ تو سب نے یہی جواب دیا۔ بُعِثْنَا بِالشَّوْحِیْدِ جہیں توحید کی بعثت کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ لوگوں کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کر سکیں۔

فرمایا ان تمام انبیاء کی ایک صفت یہ ہے بُشِّرِیْنِ کہ یہ مبشرین ہیں۔ ایمان اور نیکی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ انہیں بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تم اعلیٰ مقام پر فائز کیے جاؤ گے۔ خدا تعالیٰ تم پر راضی ہو گا اور پھر ہمیشہ ہوشیہ کے لیے آرام و سکون حاصل ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے جو لوگ کفر و شرک اور عصیت کا راستہ پھریں گے۔ ان کے لیے یہی پیغمبر مُنذِرِیْنِ ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی ندامت اور اس کے دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہیں سورۃ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے یہی حکم حضور خاتم النبیین کو دیا قُمْ فَانْذِرْ اَکْبَکْھُ طے ہو جائیں اور ان کا دوزخ کن کو ان کے برے انجام سے ڈرائیں۔ ان کو اچھی طرح خبر دے کہ دیں تاکہ کل کو یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہمارے پاس کوئی بشیر یا نذیر نہیں آیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیج کر یہ حجت پروری کر دی ہے۔ لَنْ یَّکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ انبیاء کے آنے کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہا کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ نبی کا فرض منصبی ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام امت تک پہنچا دے۔ علمِ عطاء والوں نے نبی کی تعریف یوں کی ہے۔

هو انسان بعثه الله لتبلیغ ما اوحاه الله الیه۔ یعنی نبی ایک انسان

ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ شرعی احکام کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ مطلب یہ کہ چونکہ تبلیغ انسانوں کو کرنا مقصود ہوتی ہے۔ لہذا نبی بھی انسانوں میں سے بھیجا جاتا ہے کوئی فرشتہ یا کسی دوسری نوع سے نہیں ہوتا۔ اہم نبی کا یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نزول وحی کے لیے اُسے منتخب فرماتا ہے۔ نبی معصوم عن الخطایعی غلطیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کرتا ہے۔

فرمایا انبیاء کی بعثت کے علاوہ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ أَنْتَ كِتَابُ سچی کتاب بھی نازل فرمائی۔ اہم شافعی فرشتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور پیغمبر بھیجے اور ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں۔ ان میں چار بڑی کتابیں ہیں۔ زبور، تورات، انجیل، اور قرآن پاک اور ایک سو چھوٹے چھوٹے صحیفے ہیں جو مختلف انبیاء پر نازل ہوئے۔ اہم تمام کتب کا مادہ کا موضوع ایک ہی تھا یعنی سچے دین کی تبلیغ اور لوگوں کو ان کی غلطیوں پر آگاہ کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری اور پھر آپ کے پیچھے آنے والے کئی ہزار پیغمبر اس کی تبلیغ و تبلیغ کرتے رہے۔ انبیاء کے ساتھ کتابوں کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ نبی تو انسان ہوتا ہے، جسے دوام حاصل نہیں۔ لہذا جب نبی اپنا کام ختم کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کی لائی ہوئی کتاب آلے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ نبی کا لایا ہوا علم اور اس کی شریعت کتاب کی صورت میں موجود رہتا ہے۔

فرمایا انبیاء کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد یہ ہے لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اُس بات کا فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ دیکھ کتب کا مادہ کی طرح قرآن پاک کے نزول کا مقصد بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بَمَا أَرْسَلَ اللَّهُ جُوزِ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھائی ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ گویا نبی کتاب کے ذریعے اللہ کی وحی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

اہل ایمان کو اپنے حکم سے حق سے مختلف فیہ امور میں ہدایت بخشتی۔ اختلافی معاملات میں ہدایت کی تلاش حضور نبی کریم ﷺ رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ طور و اتیان رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نازل کے دوران سجدے کی حالت میں دعا فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ قَابِلًا لِّالسُّعُوْدِ وَالْاَرْضِ مِنَ عَالَمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ ۝

اے خالق ارض و سما، اے عالم ظاہر و باطن! اگر ہی مختلف فیہ امور میں اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔ حق سے اختلافی معاملات میں اپنے حکم سے میری راہنمائی فرما۔ تجسے چاہتا ہے، راہِ راست کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ ایک دعا میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں اَللّٰهُمَّ اِنَّا الْحَقُّ حَقًّا ۝ اے اللہ! ہمیں حق بات سچ کر کے دکھا اور اس کا اتباع بھی نصیب فرما۔ وَالْبَاطِلُ بَاطِلٌ ۝ اور باطل کو باطل کی صورت میں ہی دکھا۔ وَانْزُقْنَا اِجْتِنَابًا ۝ اور ہمیں اس سے اجتناب کرنے کی توفیق بھی عطا کر۔ وَلَا تَجْعَلْهُ مُلْتَبِسًا ۝ اور طے غلط طعن نہ بنا کر کہیں ہمارے لیے حق و باطل کی تمیز ہی نہ اٹھ جائے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے یہاں پر بڑا عمدہ نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک ایک ہی سچا دین یعنی دینِ توحید قائم رہا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، جو اہل ایمان کو اطاعت اور نواب کی بشارت دیتے تھے۔ اور اہل کفر و باطل کو عذاب سے ڈراتے تھے۔ اُن انبیاء کے ساتھ کچھ کتاب بھی نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والا نزاع دور ہو سکے۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ محض ضد اور حسد کی بنا پر اختلاف کیا۔ حالانکہ وہ حق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اہل حق کی راہنمائی فرمائی اور انہیں گمراہی اور اختلاف سے بچایا جیسا کہ آپ کی امت کو عقیدہ و عمل میں امرِ حق کی تعلیم فرمائی اور اہل کتاب جیسی لوگوں کو

تفریط سے محفوظ رکھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی بات یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جو متعدد دینی اور کتابیں بھیجیں تو ان کا مقصد لوگوں کو ہر نبی کے علیحدہ علیحدہ فرقہ میں تبدیل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ایک ہی راستہ کی طرف راہنمائی کرنا مقصود رہا ہے جب لوگ اصل دین کو چھوڑ کر مگر اہی کی طرف راغب ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ ایک اور نبی اور کتاب بھیج کر اصل راستہ کی پہچان کر دیتا تاکہ لوگ اسی صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ آئیں۔ اس کی مثال آپ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسانی جسم کے لیے صحت فقط ایک چیز ہے مگر بیماریاں لاقعدہ ہیں۔ جب کسی انسان کے جسم میں کوئی ایک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ تو معالج اُس بیماری کے مطابق دروائی اور پھر تہذیب کرنا ہے۔ پھر دوسرا مرض پیدا ہوتا ہے تو اس کے مطابق دوسرا علاج اور پھر تہذیب کرنا ہے۔ یہی حال امتوں کا ہے۔ جب کسی قوم میں کوئی روحانی بیماری پیدا ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور کتاب بھیج کر اس بیماری کا علاج کیا۔ پھر دوسری بیماری پیدا ہوئی تو اس کے حسبِ حال نبی اور کتاب آئی۔ اور پھر آخر میں نبی آخر الزماں اور آخری کتاب قرآن پاک بھیج کر تمام روحانی بیماریوں کا شافی علاج کر دیا۔ تاکہ لوگ قیامت تک پیدا ہونے والی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔

صبرِ رستقا

حضرت مولانا شیخ الحداد فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی۔ کہ اہل حق کو صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ سنت اللہ ابتداء سے جاری ہے۔ کہ ہر نبی اور ہر کتاب آسمانی کی مخالفت بڑے لوگ کرتے ہیں۔ کیونکہ حق تو تسلیم کر لینے کی زد اُن ہی کے اقتدار پر پڑتی ہے نبی اور کتاب اللہ کی مخالفت ہمیشہ انہی لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ لہذا اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے۔ کہ ان لوگوں کے ٹھٹھا کرنے، ایسٹوکی اور ایذا رسانی سے گھبرائیں نہیں۔ بلکہ صبر و استقامت سے ہر تکلیف کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

فرمایا انبیاء علیہم السلام اور کتابوں کو بھیجنے کے باوجود ہم اسیت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ

ہدایت نامی

میں ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صَوَابٍ مُّسْتَقِيْمٍ وجسے چاہتا ہے
 راہِ راست کی طرف رہنمائی فرما دیتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت اُسی کو نصیب کرتا
 ہے جس کے اندر حصول ہدایت کی طلب اور صلاحیت ہوتی ہے۔ اور جو کوئی ظلم و جفا
 پر اڑا رہتا ہے اسی کے متعلق درجہ مقام پر فرمایا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ
 ایسے لوگوں کی قسمت میں ہدایت نہیں ہوتی۔ نہر مال لِيَمْنُ يَشَاءُ مے واضح ہے
 کہ ہدایت ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت اہل حق کو ہی مائل
 ہوتی ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس ہفتاد و ہشت (۸۸)

آیت ۲۴ تا ۲۵

أَفَحَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ
الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ
وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى
نَصْرُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۲۴﴾ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا
يُنْفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ وَالَّذِينَ
وَالَيْتُهُ وَالْمَلَائِكَةِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا أَنْفَعُوا
مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تمہارے پاس
پہلے لوگوں کے سے حالات نہیں آئے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ مٹر لزل
کیے گئے، یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والے کہنے لگے، اللہ
کی مدد کب آئے گی۔ فرمایا اگاہ ہو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے ﴿۲۴﴾ آپ سے
لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم جو کچھ بھی مال سے خرچ کرو۔ پس
والدین کے لیے، قربت داروں کے لیے، یتیموں اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں
کے لیے۔ اور تم جو کچھ بھی بھلائی کرو گے بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے

والا ہے۔ ﴿۲۵﴾

گزشتہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ابتداء میں سب لوگ ایک
ہی مذہب و ملت پر تھے۔ پھر جب انہوں نے دین حق سے اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ
نے سچا دین واضح کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ اور یہ اختلاف

گذشتہ پیچہ

کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ واضح دلائل آنے کے بعد محض حسد اور بغض اور مفاد پرستی کی وجہ سے تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہ حق کی طرف راہنمائی فرمادی اور اُن پر حق واضح کر دیا۔ کیونکہ صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے جسے چاہتے ہیں کرتے ہیں

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ کافر لوگ دنیا کی محبت اور غرور کی وجہ سے کمزور و ناتواں مسلمانوں کو استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچتی ہے۔ ان دونوں آیات کا آیت زیر درس کے ساتھ ربط ہے۔ ان کو ذہن میں رکھنے سے اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اہل ایمان کو پشیمانی آنے والی مشکلات کی طرف اشارہ کر کے ارشاد ہو رہا ہے

اَوْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ كَمَا تَمْلِكُنَّ كَرْتُمْ ہرگز بغیر کوئی مشقت اٹھائے اور بغیر کسی تکلیف کے تم جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ مسلمانوں کو یاد ہونا چاہیے کہ اُن کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے واسطہ ہے منافقین ہر حالت میں اُن کے نقصان کے درپے ہیں۔ اُن پر آواز سے کہے جاتے ہیں، جہانی تکالیف دی جاتی ہیں ممکن فقر و افلاس کے شکار ہیں۔ امراض اور دیگر پریشانیوں میں مبتلا ہیں فرمایا جو کوئی ان تمام مشکلات کو عبور کر کے اپنے ایمان کو سلامت رکھنے میں کامیاب ہوگا۔ وہی جنت میں داخلے کا حق دار ہوگا۔ محض کلمہ پڑھ لینے سے کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا، بلکہ اُس پر طرح طرح کی آزمائشیں آئیں گی، جن پر اُسے پورا اتمہ ہونا ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ "تَبْلُوْا كُفُّوا الشَّرَّ وَالْخَيْرُ فِشْنُهُ" تم خیر اور شر کے ذریعے تمہیں آزمائیں گے ایک اور مقام پر فرمایا "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَلَا فَنَسٍ وَالشَّعَارِ" تم ہمیں ہر طرح سے آزمائیں گے یعنی خوف، بھوک، جان و مال اور پھلوں میں کمی کر کے آزمائش کریں گے۔ کہ ہمارا بندہ کس حد تک مشکلات کو برداشت کر سکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام کافر مان ہے حُفَّتِ الْجَنَّةُ

بِالْمَعْكَارِ یعنی جنت کی باڑ مشکلات ہیں۔ ان کو عبور کر کے ہی کوئی شخص جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ جہنم کی باڑ خواہشات ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے لیے لوگ دوڑ دوڑ کر ان کی طرف جلتے ہیں۔ اور انہیں عبور کر کے جہنم میں داخل ہو جلتے ہیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! کیا تم سمجھتے ہو کہ بغیر کسی مشقت کے آسانی کے ساتھ جنت میں مقام حاصل کر لو گے۔ ایسا نہیں ہے۔

سابقہ کی
مثالیں

اس حقیقت کی مزید وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔
وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ كَمَا تَمَّ بِكُمْ يَوْمَ الْفَتْكِ مَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ
کے حالات نہیں پہنچے۔ اگر نہیں پہنچے تو ذرا ان کے حالات معلوم کر لو۔ تاکہ تمہیں ہر پل جانے کہ مَثَلُهمُ الْمَسَاءُ وَالضُّكُورُ وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْغَنَىٰ
اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہلائیے گئے۔ ان کو ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا کہ تم گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ان تمام تر دشواریوں کو برداشت کرنے کے بعد وہ جنت کے حقدار ہوئے
مثلاً حضرت جناب بن اریط کی تکالیف کو دیکھو۔ بخاری شریف اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہے۔ کہ حضرت جناب نے ان مشکلات کو کس طرح برداشت کیا۔ اور پھر
کفار مکہ کی ان مزاؤں سے تنگ آکر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں
عرض کیا۔ حضور! اَلَا تَدْعُو لَنَا کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے۔ کہ
اللہ تعالیٰ ہمیں ان مصائب سے نجات دلائے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا
افسوس کا مقام ہے۔ کہ تم بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ حالانکہ تم سے پہلے ایسے
اہل ایمان بھی گزرے ہیں جن کے سروں پر آوارہ کھ کبیرہ دیا گیا۔ مگر وہ اپنے دین پر
قائم رہے۔ پھر ایسے لوگ بھی تھے جنہیں لوہے کے گنڈھوں سے فوج دیا گیا
مگر ان کے پاس استقلال میں لغزش نہ آئی۔ میں تم کو بتلا دینا چاہتا ہوں۔ وَاللَّهِ
لَيُجِزَنَّ هَذَا لَكُمْ اللہ کی قسم یہ معاملہ پورا ہو کر رہے گا۔ تب اسلام کو غلبہ
حاصل ہو گا۔ اور پھر امن و امان کا وہ دور دورہ ہو گا۔ کہ ایک عورت صغاء سے تنہا حضرت
نیکو کر لگی۔ مگر اُسے سوائے خدا تعالیٰ کے کسی چیز کا خوف نہیں ہو گا۔ انسان تو گنجا

کسی بھی بیسے کو بھی یہ جزا نہ ہوگی کہ کسی بھیڑ کو کھا جائے۔
 بآسآد سے مراد سختی ہے۔ اور یہ اندرونی اور بیرونی ہر دو طریقے سے ہو
 سکتی ہے۔ جیسے تجارت میں نقصان ہو گیا۔ فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اس کی تفصیل
 آگے آئیگی اور صَلَّوْا وَجْهًا مِّنْ تَحْتِیْ کو سمجھنا کہ جسے بیماری آگئی۔ کوئی حادثہ پیش
 آگیا لِّزَلَزَلَتْ کا معنی ہلائیے گئے ہے۔ یعنی پریشانی کے عالم میں اُن پر لرزہ طاری
 ہو گیا۔ گھبراہٹ پیدا ہوگئی یا اُن کی عزت نفس کو متزلزل کر دیا گیا، یہ سب آزمائش کی مختلف
 قسمیں ہیں۔ جن سے پہلے لوگوں کو گزرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور اہل ایمان پکڑ
 اٹھے۔ حَتّٰی یَقُولَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُۥ مَتٰی نَحْضُرُ اللّٰہُ کہ اللہ
 کی مدد کب آئیگی۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ بشریت کے تقاضے اللہ کے
 کامل بندوں پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اُن پر بھی دشواریاں آتی ہیں، اُن پر بھی اضطراری حالت
 آتی ہے۔ مگر یہ چیز اُن کے مرتبہ کمال کے منافی نہیں ہے۔ بعض اوقات انبار بھی
 پکڑ اٹھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کب آئیگی۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان
 ہوتا ہے اِنَّ نَّصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ اے میرے بند و فکر نہ کرو، اللہ کی مدد
 بالکل قریب ہے اور وہ پہنچنے ہی والی ہے۔ تاہم اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ
 ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ صافات میں اہل ایمان کو خطاب
 فرمایا کہ اللہ کے عذاب غلامی مہل کہنا چاہتے ہو تو تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
 اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وَتُحِبُّوْا مَا هُوَ دُوْنَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ
وَاَنْفُسِکُمْ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جہاد کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں
 بہترین نعمتوں والی جنت میں داخل کر دے گا۔ وَاُخْرٰی تَحِبُّوْا نَفْسَکُمْ اس کے علاوہ
 تمہاری پسندیدہ ایک اور نعمت عطا کر دے گا، وہ کیا؟ نَحْضُرُ مِنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ
 وہ اللہ کی مدد اور قریبی فتح ہوگی، جس سے تم نوازے جاؤ گے۔ غرضیکہ اللہ کی یہی وہ
 مدد ہے جس کے لیے اللہ کے رسول بھی ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور اللہ کا ارشاد ہوتا

کہ اس کی مدد قریب ہے۔

اشاعتِ دین
جہاد کی مختلف اقسام میں سے معروف قسم جہاد با انسان یعنی تلوار و تیر کے ساتھ جہاد ہے۔ آج کے زمانہ میں ترقی یافتہ آلاتِ حربِ بندوق، پستول، بم، میزائل، ٹینک، توپ وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ جن کے ذریعے دشمن سے جنگ کی جاتی ہے۔ تاہم جہاد کی ایک نہایت اعلیٰ قسم اشاعتِ دین ہے۔ جسے جَاهِدُہُمْ بِہِجْمَادٍ صَبِیْرًا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ ان کے ساتھ بڑا جہاد کریں۔ اور وہ جہادِ نیکی کو پھیلا اور بُرائی کو روکنا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اشاعتِ دین جیسے اہم فریضہ جہاد پر مامور کیا ہے۔ جس کے لیے میں شبِ دروزِ مصروف کار ہوں۔

اشاعتِ علم دین کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ ان میں ایک معروف صورت تالیف و تصلیف ہے۔ ائمہ دین نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش اور محنت کی ہے۔ ام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح کی تدوین پر سولہ سال صرف کر کے جہاد فی اشاعتِ علم کا حق ادا کر دیا۔ اہم مسلم نے ہندوستان کے عرصہ میں نیزہ و حدیث میں صحیح مسلم کو جمع کیا مفسر بن کر اہم نے قرآن پاک کی تفاسیر لکھ کر جہاد میں حصہ لیا۔ اہم ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ نے اپنے اپنے شعبہ میں دین کی خدمت انجام دی۔ الغرض تبلیغِ دین کے کسی بھی شعبہ کو حقیر نہیں جانا چاہیے۔ اشاعتِ دین کے ہر کارکن کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ اہل ایمان کے لیے تبلیغِ دین نہایت اہم فریضہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" تم میں ایک جماعت ایسی ہوئی چاہیے جو تبلیغِ دین کا کام کرے، لوگوں کو نیکی کا حکم کرے اور بُرائی سے روکے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے: "بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ" اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ حکم آپ آگے پہنچا دیں۔ "فَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ" اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو سمجھا جائے گا

کر آپ نے جی رسالت ادا نہیں کیا۔

ساتویں صدی ہجری تک کا زمانہ مسلمانوں کا سفری زمانہ شمار ہوتا ہے۔ تبلیغ دین، فتوحات، سیاسیات، معاشیات سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ علمی کام جس قدر انجام پایا ہے۔ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے محدثین، مفسرین، حفاظ اور فقہاء پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اشاعت دین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے بعد مسلمانوں پر انحطاط کا دور شروع ہو گیا۔ اور اب تک جاری ہے۔ اس عرصہ میں خال خال ہی لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے کبھی حق اشاعت دین کا کام کیا۔ لہذا اس زمانے میں اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

جانی اور
مالی جہاد

جہاد میں مال اور جان دونوں چیزیں لگانا پڑتی ہیں۔ پہلے ذکر آچکا ہے۔ کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو یا مَوَالِکُکُمْ وَأَنْفُسُکُمْ، ہم نیت اصلاح کی ہونی چاہیے۔ آگے اصلاح کے دو پہلو ہیں یعنی اصلاح نفس اور اصلاح عالم۔ اپنے نفس کی اصلاح اس لیے ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر انسان خطیۃ القدس کا ممبر بن کر علیین میں نہیں پہنچ سکتا۔ اور اصلاح عالم بدیں وجہ لازم ہے۔ کہ اس کے بغیر فتنہ و فساد کو ختم نہیں کیا جاسکتا؟ لہذا یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

مال کا ایک بہترین مصرف اشاعت اسلام ہے۔ انحطاط کے اس زمانہ میں اہل ثروت اس میں کتنا خرچ کر رہے ہیں۔ اس کام کے لیے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک فیصد بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کی دولت آج عیش پرستی پر خرچ ہو رہی ہے۔ حضور علیہ السلام نے ممانعت فرمائی ہے۔ فرمایا فَإِنَّ عِبَادَ اللَّهِ يَكُونُوا بِالْمَتَّعَةِ عَمِينَ یعنی اللہ کے بندے عیش پسند نہیں ہو سکتے۔ عیش پرستی تو کفار کا شیوہ ہے۔ مسلمان کی دولت تو امور خیر پر خرچ ہونی چاہیے۔ مگر اندرس کا مقام ہے۔ آج مسلمان عمارات اور ان کی زمین پر بے دریغ نو پیہ صرف کر رہا ہے۔ کھیل تماشے اور لہو لعب کو اولیت دی جا رہی ہے۔ مگر جہاد کی مدت سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔ اشاعت دین کا حقوڑا بہت کام جو

ہو رہا ہے۔ وہ بزرگانِ دین کے غلوں کا نتیجہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ ورنہ موجودہ زمانے میں کتنے لوگ ہیں جو اس طرف توجہ دے رہے ہیں اَللّٰہُ شَاءَ اللّٰہُ۔

مجاہد ضروری

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوں گے، جنہیں بغیر حساب کتاب کے بخش دیا جائے گا۔ تو یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں آزمائشوں میں پورا اُترنا کس حد تک ضروری رہ جائے گا۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ کہ مجاہدہ کے بغیر بخشش نہیں ہے۔ البتہ اعلیٰ درجہ جہل کھنسنے کے لیے تو مجاہدہ اور بھی ضروری ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے قریب تر سب لوگوں کو استقامت سے گزرنا پڑا، تب ان کو بلند مرتبہ حاصل ہوئے۔ مگر کوئی عام مسلمان بھی مجاہدہ سے خالی نہیں ہے۔ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی جب ایمان لا آ ہے، تو اُسے کم از کم اپنے نفس اور شیطان کے خلاف تو مجاہدہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ ایمان کا تقاضا ہے۔ کہ نیکی کی طرف راغب ہو اور بُرائی سے اجتناب کرے۔ اور یہی چیز شیطان پر شاق گذرتی ہے۔ جب شیطان اُس مومن کی نیکی میں آ رہے آتا ہے۔ تو اُس کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے "وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِّمَّا عَمِلُوا" ہر شخص کے لیے اُس کے عمل کے مطابق درجات ہیں۔ مگر مجاہدہ سے ہر کوئی بھی نہیں محروم علیہ السلام نے فرمایا کہ وضو کرنے اور نماز ادا کرنے کے لیے بھی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے، یہی مجاہدہ ہے۔ پھر جتنا بڑا مجاہدہ کوئی کرے گا، اتنا بڑا اعزاز پائے گا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومن یہ نہ سمجھیں کہ بغیر آزمائش کے جنت میں چلے جائیں گے حالانکہ پہلے لوگوں کو بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں تب جا کر وہ جنت کے حقدار ہوئے۔

خرچ کی مدد
والدین

یہاں پر دوسرا مسئلہ خرچ کی مختلف مدت کے متعلق ہے۔ یہ مسئلہ قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پر بیان ہوا ہے۔ اور اپنی نوعیت کے مطابق ایک ہی سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں۔ یہاں پر بھی سوال عام نوعیت کا ہے

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ اے نبی علیہ السلام! یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی اس بات کا جواب دیتے ہیں قُلْ اَبِ مِمَّا رَزَاہُ رَبِّیْ، مَا اَنْفَقْتُ مِنْ خَیْرٍ قَدْ رَزَاہُ رَبِّیْ مِمَّا رَزَاہُنِیْ ۚ فَلَیْلُوْا الَّذِیْنَ یَرْزَاہُوْنَ یہ تمہارے والدین کے لیے ہے۔ خیر کا لفظ نیکی اور بھلائی پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں اس سے مراد مال ہے۔ جیسا دوسری جگہ فرمایا اِنَّ ذَٰلِکَ لَیْۤنْزِلُ شَیْءٌ ۚ النَّاسُ مَالٌ کِیۡ مَّجْتٍ مِّیۡنَ بَہْتٍ سَخَتْ بِہٖ ۚ قُرْآنٌ وَّسُنَّتٌ مِّیۡنَ وَالدِّیۡنُ کَیۡ سَاۡتَہٗ حَسَنٌ سُلُوْکٌ کِیۡ بَہْتٍ تَاکِیۡدَ اٰتِیۡ ہُہُ۔ ترمذی شریعت کی روایت میں ہے کہ کسی پر چھنے والے نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اَبَیْتُ مِّنْ کَسِّ کَیۡ سَاۡتَہٗ نِیۡکَیۡ کَرُوۡنَ۔ رحمت العلّٰمِیْنَ نے فرمایا اَهْلَکَ یعنی اپنی ماں کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔ سوال کمنے والے نے تین دفعہ دریافت کیا اور آپ نے ہر بار یہی جواب دیا پوچھتی دفعہ پر چھنے پر فرمایا اَبَاکَ یعنی اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ مقصد یہ کہ مال خرچ کرنے کے معاملہ میں والدین کو اولیت دو۔ ان کی خدمت کرو۔ وہ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ زکوٰۃ کا مال نہ اولاد والدین پر خرچ کر سکتی ہے۔ اور نہ والدین اولاد کو سب سے سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ الگ ہے۔ اس کے علاوہ جو مال ہے۔ اس کے سب سے زیادہ مستحق والدین ہیں۔ البتہ یہ استحقاق مشروط ہے۔ اگر والدین محتاج ہیں۔ تو پھر ان پر خرچ کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خود صاحب مال ہیں۔ تو پھر مالی خدمت فرض نہیں رہتی۔ البتہ ان کی جانی خدمت کرے۔ مٹھی چا پی کے ذریعے اُن کی خدمت پہنچائے یا اچھی بات کر کے اُن کا دل بھلائے۔ تمام سابقہ شرائع اور خود ہماری شریعت مطہرہ کا قانون یہی ہے کہ بِاِلْوَالِدَیۡنِ اِحْسَانًا وَالِدَیۡنَ کَیۡ سَاۡتَہٗ اِحْسَانٌ کَرُوۡ

۴۱) خرچ کی دوسری مفرمایا وَلَا تَقْرَبِیۡنِ قَرٰبَتِیۡ دَارُوۡنَ پَرِ خَرِجِ کَرُوۡ۔ اگر کسی صاحب ثروت آدمی کے قریبی عزیز رشتہ دار امداد کے مستحق ہیں، تو ان کی امداد کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ فرمایا وَالْوَالِدَیۡنِ ذَا۔ الْقُرْبٰی حَقُّہٗ پُتے قریب داروں

کو ان کا حق ادا کرو۔ اس کا فلسفہ یہ بیان فرمایا اَتَوْهُم مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْ اَنۡزَلَهُمْ جَوَالِ تَمِیۡنِ اللّٰہ نے عطا کیا ہے۔ اُس میں سے دو۔ اور یہ اسی طرح مختلف ذرائع سے حاصل ہوا کرتا ہے، جیسے کسی کو دراشت میں حصہ مل گیا کسی کو تجارت میں نفع حاصل ہوا، کسی کا ذریعہ ملازمت بن گیا، کسی کو کھیتی باڑی کسی کو محنت مزدوری کے ذریعے مال حاصل ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مختلف ذرائع سے جو مال تمہیں دیا ہے، اس میں سے اپنے قربتِ داروں پر خرچ کرو۔ اتفاقِ مال کی یہ بھی ایک درس ہے۔

(۳۱)
تیم و تمکین

وَالۡیَتٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ اور یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرو۔ اس مادی جہاں میں تیم وہ ہے جسے سر پر اس کا سر پرست نہ ہو۔ والد فوت ہو جائے ذرائع آمدن نہ ہوں انسان بے سہارا ہو جائے ایسے فرد کی دیکھ بھال ضروری ہے اور مسکین وہ ہے جو محنت اور کوشش کے باوجود اپنے ضروری اخراجات پورے کرنے کے قابل نہ ہو۔ ایسے شخص زکوٰۃ کے حقدار بھی ہیں۔ اِنَّهَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرٰۤی وَالۡمَسٰکِیۡنِ۔ لہذا صدقات و خیرات کا حقدار وہ شخص ہے، جو محنت مزدوری کرنے کے باوجود اپنے بچوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتا۔ وہ بچائے مناسب لباس اور معقول خوراک سے محروم ہیں۔ اُن کی صحت اور تعلیم کی ضروریات ہیں۔ سر چھپانے کے لیے انہیں بھی مکان درکار ہے۔ مگر اُن کا سر پرست یہ ضروریات کا حصہ پوری نہیں کر پاتا۔ اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ یہی وہ بنیادی ضروریات ہیں۔ جن کو پیش کرنے میں یورپ و امریکہ ملے فخر کرتے ہیں۔ اور ان کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔ دراصل یہ چارٹر تو قرآن و سنت کا مقرر کردہ ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تعلیم تو یہاں سے ملتی ہے۔ یہ منظر ہمیں بتاتا ہے کہ ہر انسان کو کم از کم اتنی تعلیم تو حاصل ہونی چاہیے جس کے ذریعے وہ اپنے حقوق و فرائض سے واقف ہو سکے اور پھر اُن کی ادائیگی کے لیے کوشش کرے

وَابۡنِ السَّبۡیۡلِ اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے مسافروں کی خدمت کا بھی حکم دیا مسافروں پر خرچ کرنا بھی تھلے مال کے مصارف میں ایک سے یہاں پر یہ بات اچھی طرح جان لی جاوے کہ اس معاملہ میں کسی پارٹی یا گروہ کی تخصیص نہیں ہے۔ کہ یہ ہماری پارٹی کا ہے۔

(۳۲)
مسافر

اور وہ قبلے گروہ کا ہے بلکہ ہمارا تو شمار یہ ہے۔ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَلْيُكْرِمْ
 ضَيْفَهُ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت
 کرے۔ اور مسافر مہمان ہو جائے۔ اور مہمان کے متعلق حکم ہے کہ ایک دن تک
 اسکی خوب خاطر تواضع کرو۔ اور تین دن تک ضیافت۔ اگر تین دن کے بعد بھی اُسکی
 خدمت کرو گے تو وہ صدقہ میں شمار ہو گا۔

الغرض! اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ کمزوروں اور محتاجوں
 کی اعانت کی جائے تاکہ وہ سوسائٹی میں باعزت مقام حاصل کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے
 ان مدت پر مال صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔ برخلاف اس کے غیر ضروری اور بجا نثر
 کاموں پر خرچ کر لے سے منع فرمایا ہے۔ اور طے اسراف سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ
 نے دیواروں پر پرے لٹکانے اور تصاویر اویزاں کرنے کا حکم تو نہیں دیا۔ بلکہ گبنے
 اور عیاشی و فحاشی سے منع فرمایا ہے۔ بلکہ محتاج و اقاواں کی دست گیری کا حکم دیا ہے۔
 صحابہ کرام اور سلف صالحین کے دور کا مطالعہ کریں کہ وہ غریب طبقوں کی کس طرح
 مدد کرتے تھے۔ اُن کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ اُن کے احساس تک کو مجروح
 ہونے سے بچاتے تھے۔ اُن کی ضرورت خفیہ طریقے سے اُن کے گھروں پر پہنچا
 دیتے تھے۔ اسلامی سوسائٹی کا معیار تو یہ ہے۔ انسانیت کا مقام تو اس طرح بلند ہوتا ہے
 مگر آج ہمارا شیوہ یہ ہے کہ گھرے پڑے کو اٹھانے کی بجائے اُسے بالکل ختم کرنے
 کے پیلے ہیں۔ امیر سے امیر تر اور غریب سے غریب تر ہو رہا ہے۔ یہ اسلامی سوسائٹی
 کے اصولوں سے لاعلمی ہے۔ کفر و شرک اور بدعت پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہسل
 رسومات پر بے دریغ صرف ہو رہا ہے۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر دوسروں کا خون
 چوسا جا رہا ہے۔ مگر اسلامی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے مستحقین کی ضرورت نہیں دی جا رہی ہے
 والدین کو گھر سے نکالا جا رہا ہے۔ قرابت داروں سے عداوت ہے۔ پڑوسی بھوکا ہے
 ترکہ کی پر دانیوں پر انٹرکامیونٹیل میں دُور عیش وے ہے ہیں۔ غریب کے پاس دوائی لانے
 کے لیے پیسے نہیں مگر امیر بلا ضرورت اپنے نفس پر خرچ کر رہا ہے۔

فَرِيًّا وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ تَمَنَّى كَاجَرِ كَامِ بَهِ
 كَرَدِ، اللّٰهُ تَعَالٰی اُس سے خُوب واقف ہے۔ وہ تمہاری نیت تک کو جانتا ہے۔
 لہٰذا وہ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کا پورا پورا اجر عطا کرتا ہے۔ لہٰذا لازم ہے
 کہ اُسی کے عطا کردہ مال کو اس کی رضا کی خاطر خرچ کر کے اس کی خوشنودی حاصل کر لو۔
 اس سے بہتر سودا کیا ہو سکتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ
تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ
تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ
لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٠﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ
قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ
بِأَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ
وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى
يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ
مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ
حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١١﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ
هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ
رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٢﴾

ترجمہ: تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے۔ اور وہ تمہیں ناگوار گذرتی ہے۔ اور شاید کہ
تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور شاید کہ تم کسی چیز کو پسند کرو،
اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جاننا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۱۱﴾
آپ سے حرمت والے میٹھے میں لڑائی سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے
حرمت کے میٹھے میں لڑائی لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے
ردگن اور اُس کے ساتھ کفر کرنا، اور مسجد حرام سے روکنا۔ اور اُس کے اہل کو

دلوں سے نکالنا اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔ اور فقہ قتل سے زیادہ بڑا ہے۔ یہ کافر لوگ ہمیشہ تمہارے ساتھ لڑتے رہیں گے حتیٰ کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کو طاقت ہو۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور پھر مر جائے گا، اس حال میں کہ وہ کفر کرنے والا ہے۔ پس یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے۔ اور یہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۲۱۷) بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کے راستے میں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۱۸)

گزشتہ سے
پیوستہ

گزشتہ دروس میں مال کے مصارف کا بیان تھا۔ حضور علیہ السلام سے سوال ہوا کہ لوگ اپنا مال کن امور پر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھیجا کہ مال خرچ کرتے وقت سب سے پہلے والدین، پھر قرابت داروں پھر یتیموں اور مسکینوں اور اس کے بعد مسافروں کو پیش نظر رکھیں۔ تاہم کھد کے طور پر اس بات کی وضاحت فرمادی کہ نیکو کا جو بھی کام انجام دیا جائے، اللہ تعالیٰ اسکو جانتا ہے اگر کوئی شخص صاحب نصاب ہے تو اسے سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ پھر صدقات واجبہ کا حکم آئے۔ اس کے بعد نفعی صدقات۔ پر خرچ کئے جانے چکے لیے صاحب نصاب ہونا ضروری نہیں۔ البتہ اجر و ثواب کی خاطر اچھی سے اچھی چیز خرچ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ جب تم اپنی پسندیدہ چیز راہ خدا میں صرف نہ کرو نیکی کا اعلیٰ درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ سے دو باتیں مقصود ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا نفس بھل جیسی رذیل خصلت سے پاک ہوتا ہے۔ اور یہ شخص بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس

سے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان بنی نوع انسان کی خدمت کر سکتا ہے۔ غرابو
مساکین کی اعانت، بحیثیت مجموعی انسانیت کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔
لہذا کسی مستحق کی مالی مدد سے بنی نوع انسان کی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔

جہاد اور قتال
میں فرق

دین کی خاطر بعض اوقات مال سے بڑھ کر جان کی بازی بھی لگانی پڑتی
ہے۔ اس کو قتال کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاد عام لفظ ہے۔ اور اس سے
مراد اقامتِ دین کے لیے ہر قسم کی جدوجہد ہے۔ جس میں قتال بھی شامل
ہے۔ مگر قتال سے مراد راہِ خدا میں لڑائی کے ذریعے جان پیش کرنا ہے
جب کوئی شخص دشمن کے مقابلہ میں آتا ہے۔ تو پھر اس بات کی پروا
نہیں کرتا کہ اس کی جان سلامت رہتی ہے یا نہیں۔ یہ قتال ہے۔ اسی لیے
فرمایا جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ جہاد کرو۔

مال بھی صرف کرو اور بنفسِ نفیس خود بھی میدانِ جنگ میں کود پڑو۔ ابوداؤد شریف
کی روایت میں تین چیزوں کا ذکر آتا ہے۔ جَاهِدُوا أَنْفُسَكُمْ بِأَمْوَالِكُمْ
وَأَنْفُسَكُمْ وَاللَّيْلَتِ كُمْ یعنی مال جانی اور زبان کے ساتھ جہاد کرو واللہ
کے دین کو زبانی طور پر لوگوں تک پہنچانا، ان کے شکوک و شبہات، کوزبان
کے ذریعے دُور کرنا دین کی خوبیوں کو زبان کے ساتھ اجاگر کرنا یہ بھی جہاد میں
شامل ہے۔ چنانچہ یہاں پر ارشاد ہوتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَالدِّينُ
ساتھ لڑائی تم پر فرض کی گئی ہے۔ قتال کی فرضیت بعض دوسرے مقامات پر بھی
بیان ہوئی ہے۔ سورۃ حج میں فرمایا اِذْنِ لِلَّذِينَ يُفْتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا
مظلوم مسلمان جن کے ساتھ کفار لڑائی کرتے ہیں۔ اب انہیں بھی اجازت ہے
کہ وہ کفار کے خلاف ہتھیار اٹھالیں۔

فرض عینِ اح
فرض کفایہ

یہاں پر لفظ کُتِبَ سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال ہر شخص پر لازم ہے
جیسے رمضان المبارک کے متعلق آیا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تم پر روزے
فرض کیے گئے ہیں ظاہر ہے کہ روزوں کی فرضیت ہر مرد و زن کے لیے

ہے اسی طرح یہاں پر ہے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ فَمَا لَمْ يَكُنْ لَكُمْ جَاهِدٌ فَتَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ مگر قرآن پاک کے بعض دوسرے مقامات سے اور خود حضور علیہ السلام کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد اور قتال کے فرض ہونے کی دو صورتیں ہیں یعنی فرض عین اور فرض کفایہ۔ فرض عین، فرض کی وہ صورت ہوتی ہے جس سے کوئی مسلمان مرد و زن مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ حالات و واقعات پر منحصر ہے اگر دشمن کا اس قدر غلبہ ہو کہ ہر مرد، عورت، چھوٹے بڑے، آزاد اور غلام کی خدمات کی ضرورت ہے۔ تو پھر ہر ایک پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ سب کو شامل ہونا ہوگا۔ اگر کوئی اعراض کرے گا، تو گنہگار ہوگا۔ ایسی حالت میں اولاد کے لیے والدین کی اجازت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہر فرد بلا چون و چرا جنگ میں کود پڑے گا۔ البتہ عام حالات میں قتال کا فریضہ فرض کفایہ کے طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ جب جنگ کے لیے فوجی جوان کافی ہوں۔ اور وہ اپنا دفاع کر سکتے ہوں اور بوقت ضرورت دشمن پر کاری ضرب لگا سکتے ہوں۔ تو ایسی صورت میں صرف ان خاص مجاہدین کا شریک جنگ ہونا ہی تمام مسلمانوں کے لیے کفایت کرے گا۔ اور یہ فرض کفایہ ہوگا۔ ہر ایک کا قتال میں شامل ہونا ضروری نہیں ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح میت کا جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے۔ جب بعض لوگ جنازے میں شامل ہو جائیں۔ تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی بھی شریک نہ ب کے سب لوگ گنہگار ہوں گے۔

عام حالات میں اگر جہاد کے لیے جانا ہو، تو والدین کی اجازت ضروری ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ماں باپ کی خدمت کرنا فرض عین ہوتا ہے جبکہ جہاد میں شمولیت فرض کفایہ ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور! میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا، کیا تیرے ماں باپ موجود ہیں۔ عرض کی ہاں فرمایا پھر والدین کی خدمت کرو۔ تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ یاد ہے کہ

والدین کی خدمت اُس وقت فرض عین ہو جاتی ہے۔ جب کوئی دوسرا ان کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہ ہو۔

یہاں پر ارشاد ہوتا ہے۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے وَهُوَ كَفَرٌ لَّكُمْ اور وہ تمہیں ناگوار گذرتی ہے۔ یہاں پر ناگوار گزرنے یا بردلگنے سے مراد طبعاً بُرا لگنا ہے۔ کیونکہ عقلاً تو کسی بھی حکم الہی کو کوئی مومن بُرا نہیں کہہ سکتا۔ البتہ طبیعت کے لحاظ سے ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ انسان کو کوئی چیز اچھی محسوس نہ ہو کیونکہ خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا انسان پیدا ہی کمزور کیا گیا ہے۔ اور یہ بعض اوجہ برداشت نہیں کر سکتا۔ عقل کے لحاظ سے ہر مسلمان ہر حکم الہی پر اہتمام و صدقاً ہی کہے گا۔ چاہے اُس کا فائدہ ہو یا نقصان۔ کتنا مشقت والی چیز کو کہتے ہیں جو شائی گزرنے۔ دوسرے مقام پر عورت کے حمل کے متعلق آتا ہے۔ حَمَلَةَ أُمِّهِ كُنْهًا وَوَضَعَتْهُ كُنْهًا ماں بچے کو بیٹ میں بڑی شقت سے اٹھاتی ہے۔ اور پھر اُسے بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ جنم دیتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے ماں کا بڑا حق رکھا ہے۔

فرمایا بعض چیزوں کا ناگوار گزرنا انسان کی ظاہر طبیعت پر منحصر ہے۔ مَنْ حَقِيقَتِ الشَّرَّيْ کے علم میں ہے۔ کیونکہ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ شاید کہ تم کسی چیز کو ناگوار جانو مگر وہ تمہارے لیے بہتر ہو وَعَسَى أَنْ تَحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ اور شاید کہ تم کسی چیز کو پسند کر دو اور وہ تمہارے لیے بُری ہو۔

جان کی بازی لگا کر دشمن کے ساتھ جنگ لڑنا کوئی معمولی بات نہیں اور اس کا طبیعت پر ناگوار گزرنا بھی طبعی ہے۔ مگر اس کے نتائج و عواقب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا جو قومیں اتنی آرام طلب ہو جائیں کہ وہ اپنا دفاع بھی نہ کر سکیں، وہ جلد یا بدیر مغلوب ہو جاتی ہیں ظاہر ہے کہ دشمن غالب آئے اور پھر جان مال، عزت و آبرو ہر چیز چھن جائے گی۔ حتیٰ کہ زن و فرزند کی

ہجرت تک ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہوگا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے جہاد فرض کر کے مسلمان کو مشقت میں نہیں ڈالا۔ بلکہ اسے بدترین نتائج سے بچایا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کوئی قوم غالب آتی ہے۔ تو مغلوب قوم کو کس طرح پامال کرتی ہے۔ جب تاناری غالب آئے تو انہوں نے ایک کروڑ مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ تمام کتب خانے جلا دیے، عورتوں اور بچوں تک کو معاف نہیں کیا۔ اسی طرح جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا، تو کون سا ظلم ہے جو یہاں کے باشندوں پر نہیں کیا۔ جی ٹی روڈ پر ہزاروں کی تعداد میں نعشوں کو درختوں پر لٹکایا گیا۔ ان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ جب عیسائیوں نے اندلس (سپین) پر حملہ کیا تو وہاں دو کروڑ کی تعداد میں مسلمان تھے۔ مگر جب وہ غالب آئے تو مسلمانوں کی تعداد صرف گیارہ ہزار رہ گئی تھی۔ باقیوں کو یا تو قتل کر دیا گیا تھا۔ یا مرہ کر لیا گیا۔ یہ بلخ اور بخارا کا زمانہ تو قریب کا زمانہ ہے۔ صرف بخارا شہر میں چار سو مسجدیں تھیں۔ بے شمار دینی مدارس تھے۔ مگر اب وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ فرمایا جنگ کے حکم کو خوش دلی سے قبول کرو۔ تمہاری نظر صرف ظاہر پر ہے۔ مگر درحقیقت وَاللّٰهُ يَكْفُوْا اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ہر کام کے نتیجے سے وہی واقف ہے تم اس کی اصلیت کو نہیں جانتے۔ یہ بات تو واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر لڑائی فرض کی ہے۔ مگر اگلی آیت میں حُرْمَتُ دَائِمِيْنَ کے دوران جنگ کے جواز یا عدم جواز کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ يَسْأَلُكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ یعنی اے نبی علیہ السلام! یہ لوگ آپ سے حرمت دَائِمِيْنَ میں جنگ کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہ اِنْ مَيْمُونٍ مِّنْكُمْ جَاهِلٌ بِمَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ فَقَاتِلْ فِيْهِ كَمَا يُطِيعُ یعنی ان مہینوں میں لڑائی کرنا ہر سخت گناہ ہے۔ اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حرمت دَائِمِيْنَ کون سے ہیں جن کے دوران لڑائی ممنوع ہے۔ اس ضمن میں سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد

حرمت دَائِمِيْنَ

فرمایا ہے۔ ”إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا یعنی اللہ کے ہاں مہینوں کی تعداد بارہ ہے مِّنْهُمَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ“ ان میں چار مہینے حرمت ملے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں، رجب، ذی قعد، ذی الحج اور محرم۔ ملت ابراہیمی میں یہ بات مسلم تھی کہ ان چار مہینوں میں لڑائی قطعاً جائز نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین بھی اس کی پابندی کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ان مہینوں میں ہتھیار ڈال دیتے تھے کوئی لڑائی نہیں کرتے تھے۔ کسی قافلے کو نہیں لوٹتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی شریعت میں یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور بعض اصحاب کہتے ہیں کہ یہ حکم مطلقاً منسوخ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی تاکید میں کمی ہو گئی ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان مہینوں میں مسلمان خود لڑائی کی ابتداء نہ کریں اور اگر دشمن جنگ شروع کرے، تو پھر اس کا جواب دیا جائے۔

دوسرا سوال شان نزول کا ہے۔ کہ یہ آیت کس موقع پر نازل ہوئی۔ اور لوگوں نے یہ سوال کیوں اٹھایا۔ محمد بن اسحاقؒ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے غزوہ بدر سے پہلے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں کفار کے ایک تجارتی قافلے کو پکڑنے کے لیے ایک جماعت کو بھیجا۔ آپ نے امیر جماعت کو ایک خط لکھ دیا۔ اور ساتھ حکم دیا کہ مسلسل دو دن سفر کرنے کے بعد اس خط کو کھول کر پڑھنا اور پھر اس میں مندرج ہدایت کے مطابق عمل کرنا۔ اس حکم کی تعمیل میں دو دن بعد جب خط کھول کر پڑھا گیا۔ تو اس میں لکھا تھا کہ قافلہ قافلہ کو گرفتار کر لو۔ اس کو کسی صورت میں جلے نہیں دینا۔ یہ دن جہادی الاخریٰ کے آخری دن تھا۔ امیر لشکر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ رجب حرمت والا مہینہ شروع ہونے والا ہے لہذا اس سے پہلے پہلے قافلے کو پکڑ لینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے حساب سے انہوں نے جہادی الاخریٰ کی تیس تاریخ کو کفار کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ ایک آدمی مارا گیا۔ باقی قید ہوئے۔ سامان بھی ہاتھ آ گیا۔ لہذا الشکر واپس آ گیا۔

درحقیقت حملہ کرنے کی تاریخ جمادی الاخریٰ کی تیسری تاریخ نہیں تھی، بلکہ جب کی پہلی تھی، جو کہ حرمت والا مہینہ ہے۔ لہذا مشرکوں کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ کہ دیکھو مسلمانوں کے پیغمبر اپنے آپ کو قت ابراہیم کے متبع کہتے ہیں، مگر حرمت والے مہینہ کا بھی خیال نہیں کیا۔ قتلے پر حملہ کیا ہے۔ آدمی مارا گیا ہے اور قاتلے کو بیع سامان گرفتار کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واقعہ جس کی وجہ سے حرمت والے مہینوں کے متعلق سوال پیدا ہوا کہ ان مہینوں میں لڑائی کرنا کیسا ہے۔

حرام فعل اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ یہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ تو آپ فرمادیجئے کہ ان مہینوں میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے تاہم جس واقعہ کو بنیاد بنا کر یہ سوال کیا گیا تھا۔ وہ تو غلطی سے ہوا تھا۔ مسلمان سمجھے کہ ابھی رجب کا مہینہ شروع نہیں ہوا۔ لہذا حملہ آور ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا مزید جواب یہ دیا۔ کہ مسلمانوں سے تو یہ خلاف ورزی خطا ہوئی۔ مگر کفار و مشرکین اپنے گمراہی میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ خود کیا کچھ کر رہے ہیں۔ فرمایا ہے شک حرمت والے مہینوں میں لڑائی حرام ہے مگر وَ صَدَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَلَقَدْ آتَاهُ اللَّهُ كَيْفَ يُنَزِّلُ السَّمْنَ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا بھی تو سخت گناہ ہے وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور مسجد حرام سے روکنا بھی بڑا گناہ ہے۔ وَاحْزَرَجَ أَهْلُهُ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ اور وہاں کے سنے والوں کو مسجد حرام سے نکلنا بھی اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے فرمایا ہے کفار و مشرکین تم یہ لوگ مسلمانوں سے کہتے ہو کیا یہ کوئی گناہ ہے جو تم جان بوجھ کر کر رہے ہو تم جس مسجد سے مسلمانوں کو نکال رہے ہو تم خود اس کے اہل نہیں ہو إِنْ أُولَئِكَ إِلَّا الْمُتَفَوِّحُونَ اس کے اہل تو صرف متقی ہیں اور وہ مسلمان ہیں فرمایا یہ دیکھو، وَأَفْتَنَهُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ یہ فتنہ بڑا کتلے سے بھی بڑا گناہ ہے مسلمانوں سے تو بھول کر ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے مگر تم انہیں بیت اللہ شریف سے روک کر اور انہیں ہجرت پر مجبور کر کے فتنہ پیدا کر رہے ہو، تمہارا کفار و مشرک پر اڑنے رہنا بھانے خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی غلطی معمولی چیز ہے

مرتا اور اس
کی سزا

اس کے بعد فرمایا کہ مسلمانوں کا یہ واقعہ ترک کفار کو بہانہ کے طور پر مل گیا حقیقت یہ ہے کہ وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے حتیٰ يُكَلِّفُكُمْ عَنْ دِينِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوا یہاں تک کہ اگر استطاعت رکھیں تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ اُن کا مقصد تمہیں اپنے سابقہ دین پر واپس لانا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق بھی درجہ کے مقام پر فرمایا کہ اُن کا بھی یہی مقصد ہے وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے حتیٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ جب تک کہ آپ کا دین اختیار نہ کر لیں (محلوظ) گویا کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو مرتد بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یاد رکھو۔ وَمَنْ يُسَلِّدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا۔ فَيَمُوتْ وَهُوَ كَافِرٌ اور کفر کی حالت میں مر جائے گا وَالْوَالِدُ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ سو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت دونوں جگہ پر ضائع ہو جائیں گے جو کوئی سچے دین اسلام کو چھوڑ کر یہودی یا عیسائی ہو گیا۔ کافر یا مرتد بنائی ہو گیا۔ اس کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہو گئیں۔

دنیا میں اعمال ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اہم ابو حنیفہ کے نزدیک مرتد شخص کی سابقہ نمازیں، روزے، زکوٰۃ، حج وغیرہ سب ضائع ہو گئے۔ اُسے ان نیکیوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا سب ضائع ہو گئیں۔ جب تک کہ وہ دوبارہ ایمان نہ لے آئے۔ علاوہ ازیں مرتد آدمی قوم و ملت کا غدار ہے۔ اور غدار کی سزا قتل ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے مَنْ بَدَّلَ دِينَ فَاقْتُلُوْهُ جو دین تبدیل کرے اسے۔ وہ واجب القتل ہے۔ البتہ اس کا طریق کار یہ ہے۔ کہ تین دن تک اس کے شکوک و شبہات دور کر لے کی کوشش کی جائے اور اس سے توبہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور اگر یہ کوشش بار آور نہ ہو سکے۔ اور مرتد دوبارہ مسلمان ہو لے پر آمادہ نہ ہو۔ تو اُسے سزائے موت دے دی جائے یہ شخص دین کی ترمیم کا مستحق نہیں ہے۔ اور معافی کا حقدار نہیں۔

اشتراکی ممالک میں ان کے آئین کی قرین کرنے والا شخص موت کی سزا پا جا ہے۔ برطانوی قانون کے مطابق جیب ایمری کے بیٹے نے جنگ کے دوران غداری کی کرے سولی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ کسی نے اولاد نہیں اٹھائی کہ ان کے وزیر کے بیٹے کو سزائے موت کیوں دی گئی۔

موت کے بعد مرتد کی سزا یہ ہے۔ کہ نہ اُس کا جنازہ پڑھا جائے اور نہ اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ مرتد اپنے مسلمان مورث کی وراثت کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ تو دنیا میں اس کے اعمال کا ضیاع ہے۔ اور آخرت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ابدی جہنمی ہے۔ اُسے کبھی دوزخ سے رہائی نہیں ہوگی مرتد اصل کافر سے بھی بڑا مجرم ہے۔ کافر سے تو جزیہ قبول کر لیا جاتا ہے۔ مگر مرتد سے جزیہ بھی نہیں لیا جاتا۔ اہم اعظم کے فتویٰ کے مطابق اگر عورت مرتد ہو جائے تو اُسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ تاسرگ قید میں ڈال دیا جائے گا۔ اگر توبہ کر لے تو آزاد ہو جائے گی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ۔ یہ لوگ جہنمی ہیں۔ اور هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ ان کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

اہل ایمان کے لیے خوشخبری

کفار و مشرکین اور مرتدین کی مذمت کے بعد اہل ایمان کو خوشخبری دی جا رہی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَبَلَّغُوا حُرَّتَهُمْ۔ اے اللہ کے پیغمبر! ان لوگوں کی خبر دے جنہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر ہجرت کی۔ نہ صرف وطن کو چھوڑا بلکہ مَنْ هَاجَرَ مَآ نَهِيَ اللَّهُ عَنْهُ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چیزوں سے منہ موڑ لیا کہ یہ ہجرت بہت بڑا عمل ہے۔ إِنَّ شَانَ الْهَاجِرَةِ لَعَظِيمٌ ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے دین کی خاطر سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے جس نے ایسا کر لیا وَجَهْدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَةَ اللَّهِ یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ وَاللَّهُ عَفْوٌ غَفُورٌ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے وہ نیچو کاروں کو پورا پورا اجر دیگا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس نذر (۹۰)

آیت ۲۱۹ تا ۲۲۰

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمِنْ مَنَافِعِ النَّاسِ زَوَائِدُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الذُّنُوبِ وَالْأَخْذَةِ

ترجمہ :- لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ کہ دیجئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپ کہ دیجئے جو زائد ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آیات بیان کر رہا ہے۔ تاکہ تم فکرمند (۲۱۹) دنیا اور آخرت کے بارے میں

گزشتہ درس میں جہاد کی مشروعیت اور اس کی حکمت بیان کی گئی تھی۔ حرم گزشتہ سیرت والے مہینوں میں لڑائی سے منع کیا گیا تھا۔ کفار کی خصلت بیان ہوئی کہ وہ مسلمانوں کو بہکا کر دین اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرتے رہیں گے نیز فرمایا کہ جو شخص مرتد ہو گیا، اس کی دنیا اور آخرت ہر دو برباد ہو گئیں۔ اس کے بعد ایمان، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم دی گئی کہ ایسے ہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور ان کی غلطیوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔

اس سے پہلے درس میں مال خرچ کر لے کا قانون بیان ہوا تھا۔ اور اتفاق کی اہمیت بیان ہوئی تھی۔ اس کا بیان آگے بھی آئے گا۔ گویا یہ حصول مال کے ذرائع اور خرچ کی مدت کا مفصل تذکرہ ہے۔

اس آیت میں شراب اور جوئے کے فوائد و نقصانات اور ان کی حرمت کا موضوع آیات

کم تر خیال کرتے تھے۔ غرضیکہ شراب اور جوا عام تھے۔ کوئی خال خال ہی ان سے بچتا تھا۔ وگرنہ جس طرح اونٹ، گھوڑا، تلواریں، لڑائی عربوں کی گٹھی میں پڑے تھے اسی طرح شراب اور جوا بھی ان کا عام مشغلہ تھا۔

میسر، جوا یا قمار بازی کو کہتے ہیں۔ اس کا مادہ میسر ہے اور میسر آسانی کو کہتے ہیں۔ قمار بازی کے ذریعے کوئی شخص بغیر محنت و مشقت، صنعت و تجارت یا مزدوری و ملازمت دوسرے کے مال پر قبضہ کر لیتا، اس لیے اس کو میسر کہتے ہیں جوئے کی یہی خباثت ہے۔ کہ اس میں ایک دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے۔ جس شخص کا دائرہ چل گیا۔ اُسے بغیر کچھ کیے کرائے مال حاصل ہو گیا۔ اور دوسرا شخص نیٹے بٹھائے بلا درجہ محروم ہو گیا پھر جس شخص کو مال مل جاتا ہے۔ وہ اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور سٹے عیش و عشرت اور برائی کے کاموں میں صرف کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے معصیت کا شکار ہوتا ہے۔ دولت بھی ضائع کرتا ہے۔ اور گنہگار بھی ہوتا ہے۔ عربوں میں باقی خباثت کی طرح جوئے کی وجہ بھی عام تھی۔ وہ قمار بازی کو اچھا فصل سمجھتے تھے۔ خاص طور پر قحط کے زمانے میں جوئے میں شدت پید ہوجاتی تھی۔ اور قمار بازی سے حاصل کردہ مال غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

نزدول قرآن کے زمانہ میں قمار بازی اس قدر عروج پر تھی۔ کہ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مجسموں کے ہاتھوں میں جوئے کے تیر بچڑائے ہوئے تھے۔ جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ یہ جلیل القدر پیغمبر بھی جوا کھیل کر تے تھے (العیاذ باللہ) بھاری شریعت کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام ان مجسموں کے قریب سے گزرتے تو فرمایا ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہو، اللہ کے پاک بندوں کی نسبت کیسی ناپاک چیزوں کی طرف کرتے ہیں۔ حضرات ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو ایسے شنیع کام سے کیا سروکار۔

جوئے کے مختلف طریقے رائج تھے۔ قحط کے زمانے میں عموماً یہ طریقہ

اختیار کرتے تھے۔ کہ دس آدمی مل کر مساوی حصہ سے ایک اونٹ خرید لیتے تھے ان کے پاس دس تیر ہوتے تھے۔ جن پر ایک سے لے کر سات تک نمبر لکھے ہوتے تھے۔ اور باقی تین تیر خالی ہوتے تھے۔ اب ان دس تیروں میں سے کسی ایک حصہ دار کے نام سے تیر نکالتے تھے۔ اور پھر جس نمبر والا تیر اُس نام پر نکلتا تھا۔ اونٹ کے گوشت کے اتنے ہی حصے وہ اکیلا لے جاتا تھا۔ اُس کے بعد حسب ضرورت دوسرا اور تیسرا تیر نکالا جاتا، حتیٰ کہ اونٹ کا سارا گوشت ختم ہو جاتا۔ اور جو حصے دار باقی بچ جاتے وہ اپنے حصے سے محروم رہ جاتے۔ اسی طرح اگر چند لوگ کسی کے نام خالی تیر نکل آنا، تو وہ بھی اپنے حصے سے محروم رہ جاتا اور اگلے نمبر والا اپنا حصہ وصول کرنا علیٰ ہذا القیاس۔ جب ایک اونٹ کا گوشت تقسیم ہو جاتا تو محروم رہنے والے دعوت دیتے کہ ایک اور اونٹ خریداجائے اور اس کے پھر اسی طرح حصے بکھرے کر لیے جاتے۔ یہ گوشت چونکہ غربائیں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس لیے اس قمار بازی کو بھی وہ لوگ باعث فضیلت سمجھتے۔ موجودہ زمانے میں گھڑ دوڑ لائٹ می، انعامی یکمیں وغیرہ سب جوئے کی مختلف اقسام ہیں۔ جو مختلف ناموں سے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ہر قسم کی قمار بازی حرام ہے۔

حرم شراب
کے مراحل

شراب بیک حکم حرام نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی حرمت آہستہ آہستہ بتدریج ہوئی ہے۔ اس کے احکام مختلف مواقع پر نازل ہوئے ہیں، حتیٰ کہ چوتھے مرحلہ پر اس کو قطعی حرام قرار دے دیا گیا ابتداءً اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں اشارتاً پھلوں کا ذکر کیا اور فرمایا تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا تم ان سے نشہ آور اشیاء مثلاً شراب وغیرہ بناتے ہو اور اچھا رزق یعنی چٹنی، لہار، مربے وغیرہ بھی بنالیتے ہو۔ یہاں پر حلت و حرمت کا ذکر تو نہیں ہے۔ بلکہ نشہ آور اشیاء کو رِزْقًا حَسَنًا (اچھی روزی) سے علیحدہ کر کے اُسے کم تر قرار دیا۔

دوسرے نمبر پر اس درس والی آیت نازل ہوئی۔ کہ آپ سے شراب اور

جوائے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدہ بھی ہیں۔ مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔ یہاں پر حرمت شراب کا قطعی حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ فائدہ کی نسبت اس کا نقصان بہت بڑا ہے۔ ابو علی ابن سینا کے قول کے مطابق شراب میں نقصان اس کے فائدے سے ڈبل ہے۔ یعنی اس کے ذریعے فائدہ تو ایک حصہ ہوتا ہے۔ مگر نقصان دوحصے کے برابر ہے۔

حرمت شراب سے متعلق تیسرے حکم کے پس منظر میں ایک واقعہ پیش آیا ایک انصاری کے ہاں بعض صحابہ کرام کی دعوت تھی۔ ان میں حضرت سعد بھی تھے۔ جو عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔ صحابہ نے کھانا کھایا۔ چونکہ اس وقت تک شراب قطعی حرام نہیں ہوئی تھی، لہذا اس کا دور بھی چلا۔ آپس میں کسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ انصار زیادہ اچھے ہیں۔ دوسرا گروہ مہاجرین کے حق میں تھا۔ آپس میں دوست اور رشتہ تھے، محض ایک دوسرے کی برتری کا ذکر ہو رہا تھا۔ اتنے میں ایک نوجوان کو غصہ آیا، اس نے طیش میں آکر ایک جبراً حضرت سعد کے سر پر مے مارا جس سے وہ زخمی ہو گئے۔

ترمذی شریف کی روایت میں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ کہ ایک دعوت میں جلیل القدر صحابہ کرام موجود تھے۔ جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف بھی شامل تھے۔ چونکہ ابھی تک شراب قطعی حرام نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اکثر لوگ پیتے تھے، مگر بعض نہیں بھی پیتے تھے۔ جیسے حضور علیہ السلام نے کبھی شراب نہیں پی۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور عثمانؓ بھی اس کے قریب نہیں جاتے تھے، ایسے اصحاب اے وفار کے منافی سمجھتے تھے۔ ایسے استعمال کرنے والوں میں حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہم تھے۔ کہ ایک چیز مباح ہے لہذا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ نماز کا وقت ہو گیا۔ لوگوں نے شراب پی رکھی تھی۔ ایک صحابی کو امامت کے لیے آگے کر دیا گیا۔ نشے کی حالت میں

قرآن پاک غلط پڑھا۔ اسی طرح مسلم شریعت کی روایت میں آنا ہے۔ کہ صبح کی نماز کا وقت تھا۔ حضرت عثمانؓ کے سامنے حضرت ولیدؓ امامت کرا رہے تھے۔ نئے کا زور تھا دو رکعت پڑھا کر کہنے لگے اور پڑھا دوں۔ ایسے ہی واقعات کے پیش نظر سورۃ ناز کی آیت نازل ہوئی۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ" یعنی اے اہل ایمان! نہش کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تمہارے ہوش و حواس بجال ہو جائیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ گریا تیسرے نمبر پر نہش کی حالت میں نماز سے روک دیا گیا۔

روایات میں آنا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ کو اس معاملے میں اکثر تلویش رہتی تھی۔ اور وہ دُعا کیا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيِّنَاتًا شَافِيَةً یعنی اے مولا کریم! اشارے کنایے سے قریش کی قباحت محسوس ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے لیے کوئی واضح حکم نازل فرما، چنانچہ اب چوتھے مرحلے میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی، جس میں شراب اور بعض دیگر اشیا کے قطعی حرام قرار دیدیا گیا۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ" اے ایمان والو! بیشک شراب، جوا، تھان اور پانے شیطان کے ناپاک کام ہیں۔ ان سے بچ جاؤ تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے بعد شراب قطعی حرام ہو گئی گو یہ چار مراحل تھے۔ جن کے ذریعے شراب کو بتدریج حرام قرار دیا گیا۔

بعض نئی روشنی کے لوگ شراب کی حرمت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض دوسری حرام چیزوں کی طرح اس پر حرمت کا واضح حکم نہیں لگایا گیا۔ جیسے مردار، خون وغیرہ کے متعلق فرمایا۔ "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اَلْمَيْتَةُ وَالدَّمُ" مگر اس آیت میں لفظ "فَاجْتَنِبُوهُ" آیا ہے۔ یعنی اس سے اجتناب کرو، بچ جاؤ حالانکہ اگلی ہی آیت میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔ کہ شیطان شراب اور جئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی

حرمت شراب پر ناوٹیں

اور بغضِ ڈالنا چاہتا ہے۔ فَانْتَهُوا پس ان چیزوں سے باز آ جاؤ۔ لہذا یہ بھی قطعی حرمت کا حکم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شراب اور خمر درمختف چیزیں ہیں۔ شراب ہر پینے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ سورۃ دھر میں موجود ہے ”وَسَقُفُهُمْ وَتَبَهُمُ شَرَابًا طَهُودًا جَنَّتِیوں کو ان کا رب پاک شراب پلائے گا۔ مگر وہ نشہ سے غالی ہوگی اور خمر نشہ آور چیز کو کہتے ہیں۔ اور وہ حرام ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ ہر نشہ آور چیز شراب کے ذمے میں آتی ہے۔ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اس لحاظ سے بھنگ، چرس، گانجا اور شراب کی تمام اقسام حرام ہیں۔ خواہ وہ معمولی درجہ کی ہوں یا اعلیٰ درجہ کی۔ انکو رسے کشید کر دہ ہوں یا کھجور سے۔ شند سے بنی ہوں یا گندم یا جو سے وہ بہر حال حرام ہیں۔

صاحب تفسیر روح المعانی علامہ سید محمد آوسی بغدادیؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے عین جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ وہ اپنے زمانے کا حال سمجھتے ہیں کہ لوگوں نے عجیب روش اختیار کر لی۔ شراب کو مختلف ناموں سے پکار کر استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اس کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں۔ کسی نے عرق اکیر نام رکھ لیا ہے۔ اور کوئی اسے آب جو کہتا ہے۔ مگر نام بدلنے سے ایک حرام چیز حلال نہیں ہو سکتی۔

اس بات کو انگریزوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ حرمت شراب کے متعلق اگر کسی کو کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ تو وہ صرف مذہب اسلام ہے۔ سر ولیم میر ہندوستان میں صوبہات متحدہ کا گورنر رہا ہے۔ بڑا متعصب عیسائی پادری تھا اس نے دو جلدوں میں حضور علیہ السلام کی سوانح حیات لکھی ہے۔ جس کا نام ہے لائف آف محمد (LIFE OF MUHAMMAD) مسلمانوں کے خلاف تعصب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دو چیزیں انسانیت کی دشمن ہیں۔ ایک محمدؐ کی تلوار

اور دوسرے محمد کا قرآن۔ مگر اس کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ شراب کی حرمت کے متعلق اسلام کے
سوا کوئی مذہب کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے
باعث فخر ہے کہ انہوں نے شراب جیسی قبیح چیز کو واضح طور پر حرام قرار دیا اور طبی
حد تک اس سے محفوظ رہے۔

بہر حال سورۃ مائدہ کی مذکورہ آیت نازل ہونے پر شراب حرام ہو گئی۔ اور صحابہ کرامؓ
نے کلی طور پر اس کو ترک کر دیا۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ کہ
لَعَنَ اللَّهُ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ وَأَمْرَهَا الْخَمْرُ يَجْعَلُ شَرَابَ بَيْنِي وَالْأَلَا
پلانے والا، سچوڑنے والا، بنانے والا، اٹھا کر لے جانے والا، اس کو نیچنے والا
اور اس کی کھائی کھالے والا سب لعنتی ہیں۔ پھر آپ نے فتح مکہ کے دن اعلان
کیا کہ جس خداوند تعالیٰ نے شراب پینے سے منع فرمایا ہے۔ اُسی خدا نے اس
کی تجارت سے بھی منع کر دیا ہے گویا ہر حرام شے کی تجارت بھی حرام ہے۔ بود
حرام ہے اس کی لین دین بھی حرام ہے۔ اسی طرح بتوں کی تجارت حرام ہے
مردار کی چربی کا بھی یہی حکم ہے۔ مگر اس زمانے میں سوائے سعودی عرب کے تمام
اسلامی ممالک میں شراب استعمال ہوتی ہے۔ اس کی تجارت ہوتی ہے۔ لائسنس
جاری ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں پابندی کا نام سنتے ہیں۔ وہ بھی زبانی حکم تک ہے
عملی طور پر مختلف حیلوں بہانوں سے اس کے استعمال کی اجازت ہے۔

حرام چیز کی
تجارت بھی
حرام ہے

آگے خرچ کے متعلق سوال اور اس کا جواب ہے وَ يَسْأَلُونَكَ
مَاذَا يُنْفِقُونَ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کس قدر خرچ کریں۔ یہ سوال
گذشتہ سے ہیروستہ درس میں بھی آچکا ہے۔ دہاں پر اس کا جواب دیا گیا تھا۔ کہ
فلاں فلاں مد پر خرچ کریں۔ مگر اس آیت کے جواب میں ہے۔ قُلِ الْعَفْوَ
آپ کہہ دیجئے، جو اپنی ضرورت سے زائد ہے، وہ خرچ کر دیں۔ گویا اس سوال
کا تعلق خرچ کی مقدار سے ہے۔ یہاں یہ ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ حاجت
سے زائد سب کچھ خرچ کر دینا فرض، واجب وغیرہ کی کس مد میں آئے گا۔ تو

خرچ کی
مقدار

اس کا جواب یہ ہے کہ خرچ جس مذکے لیے کیا جائے گا، اس کا شمار اسی میں ہوگا مثلاً اگر زکوٰۃ ادا کی گئی ہے، تو اس مذکے خرچ فرض ہوگا۔ اگر صدقہ فطر ادا کیا ہے یا کسی اور واجب پر خرچ کیا ہوگا۔ تو واجب شمار ہوگا۔ اسی طرح نقلی امور کا خرچ نقل شمار ہوگا۔ اگر کسی مباح کام میں خرچ کیا گیا ہے تو ایسا خرچ بھی مباح ہوگا، اگر محض ثواب کی نیت ہے، تو خرچ کنندہ کو ثواب حاصل ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر کسی معصیت والے کام پر خرچ کر دیا ہے، تو ایسا خرچ حرام شمار ہوگا۔ اگر کسی مباح کام پر خرچ کیا ہے مگر ثواب کی نیت نہیں کی۔ تو ایسا خرچ جائز تصور ہوگا۔

چونکہ اس آیت میں ضرورت سے زائد چیز خرچ کرنے کا حکم ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرض واجب کے متعلق نہیں کیونکہ زکوٰۃ وغیرہ کی مقدار تو مقرر ہے۔ مگر یہاں ہر زائد چیز کے خرچ کرنے کا حکم ہے تو اس سے مراد صدقہ خیرات اور دیگر نقلی اخراجات ہیں۔ بہر حال اس آیت سے ایک بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اپنی ضرورت کو مقدم رکھتے ہوئے اس سے زائد مال کو خرچ کر دو۔ اگر خود اپنے لیے، اپنے بال بچوں کی جائز ضروریات موجود ہیں۔ اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچا، تو دست خرچ کر دو۔ پہلے اپنی ضروریات پوری کر دو، اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر حق تلفی نہ کرو۔ ہاں بعض خاص شخصیات ہیں۔ جیسے حضرت صدیق اکبرؓ جن میں صبر کا مادہ بذراجم موجود ہے تو ایسے شخص اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ مگر جو شخص صبر کے اس مرتبہ پر نہ ہو، اُسے اپنی ضروریات کو مقدم رکھ کر خرچ کرنا ہوگا۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ ذخیرہ اندوزی درست نہیں ہے مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ یا بَنِي آدَمَ إِنَّ تَقْصِدَ شَيْئًا لَّيْ آدَمَ كَيْ بَيْتٍ، اگر چیز کو روک رکھو گے تو یہ تمہارے لیے شر ہوگا۔ اور اگر زائد حصہ کو خرچ کر دو گے، تو یہ تمہارے لیے بستر ہوگا۔ وَكَوْنُكُمْ عَلَى كِفَافٍ اور اگر آمد و خرچ برابر ہیں۔ تو پھر زائد نہ

ذخیرہ اندوزی
کی ممانعت

خرج کرنے پر کوئی ملاہمت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص فرائض ادا نہیں کرتا تو وہ عند اللہ
ماخوذ ہوگا، اور اگر فرض کی ادائیگی کے بعد روک رکھا ہے۔ تو ثواب سے محروم ہو
گیا۔ اگر ضرورت سے زائد موجود ہے مگر خرچ نہیں کرتا، تو کھل کا مادہ پیدا ہوگا،
ثواب سے محروم ہوگا۔ اور شر بہر حال ہوگا۔

غزوہ عکبر کی دعوت

فرمایا کَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے
لیے احکام بیان کر رہا ہے۔ یہاں پر آیات سے مراد احکام ہیں لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُونَ تاکہ تم غور و فکر کرو، فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ دنیا اور آخرت
کے بارے میں۔ دنیا محل حوائج ہے۔ یہاں پر رہ کر انسان ضرورتوں اور حاجتوں پر
درماندہ ہوتا ہے۔ اس کا بھی لحاظ رکھو۔ اور آخرت تو ثواب دائمی کا محل ہے
اس کا بھی خیال رکھو۔ مقصد یہ ہے کہ دنیوی اور اخروی دونوں ضروریات کو
ذہن میں رکھو۔ نہ یہاں محروم رہو اور نہ وہاں، بلکہ ہر دو مقامات کے لیے لوازمات
میاں کرو۔ سورۃ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ نہ ہاتھ کو زیادہ کھلا رکھو کہ خود محتاج ہو
جاؤ اور نہ اتنا سیکڑ کر رکھو کہ بخیل شمار ہو۔ بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی جائز ضروریات
پوری کر دو، اور اس کے بعد مال کو روک کر نہ رکھو۔ بلکہ غریبوں اور محتاجوں کو بھی انکا حق ادا کرو۔
جائز ضروریات میں انسان کے بنیادی اخراجات ہیں، جیسے کھانا، پینا، لباس
صحت، تعلیم، رہائش وغیرہ ہیں۔ ان چیزوں پر خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ البتہ اگر
ریڈیو، ٹیلی ویژن، کھیل تماشہ کو بھی بنیادی ضروریات میں شمار کر لیا جائے، تو پھر انسان
کے پاس کبھی کچھ نہیں بچے گا۔ یہ سامان تعیش ہے اور اس کی کوئی حد نہیں۔ اس زمانہ
میں مکانوں کی بلا ضرورت زیبائش، ان میں قیمتی سے قیمتی فرنیچر، پرے اقالین، فرج
وغیرہ سب بلا ضرورت ہیں۔ اور ان اشیاء پر خرچ کرنا بلا جواز اور محتاجوں کی حق تکلیفی
کے مترادف ہے۔ اور اگر اس دنیا میں سب کچھ اپنی ذات پر ہی خرچ کر جاؤ، تو پھر آخرت
میں محرومی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ دنیا و آخرت ہر دو مقامات کا خیال رکھو
یہاں پر بھی جائز ضروریات سے محروم نہ رہو، اور آخرت کے لیے بھی توشہ تیار کر دو۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ

درس نوادیک (۹۱)

آیت ۲۲۰ بقیہ

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ
 خَفَاطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ
 وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَغْنَتْكُمُ الرِّبَا إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۰﴾

ترجمہ :- اور لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہ دیجئے، انکی
 اصلاح کرنی ان کے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملا لو، تو وہ تمہارے
 بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے خرابی پیدا کرنے والے کو کس نواز نے والے سے۔ اور
 اگر اللہ چاہتا، تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ بیشک اللہ کمال قوت کا مالک اور
 حکمت والا ہے۔ ﴿۲۲۰﴾

اس سے پہلی آیات میں شراب اور جوئے نیز خرچ کے متعلق سوالات
 اور ان کے جوابات تھے۔ پورے قرآن پاک میں کل بارہ یا تیرہ مقامات ایسے
 ہیں جن میں اس قسم کے سوالات کا ذکر ہے۔ یعنی لوگ آپ سے فلاں سوال کرتے
 ہیں۔ اور ایسے لوگ بالعموم اہل ایمان ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت میں
 آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے۔
 وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم سوال کرتے تھے۔ بکثرت سوال
 کرنے کی بجائے اصحاب رسول آپ کی بات کو نہایت غور سے سنتے تھے
 اور پھر اس پر عمل شروع کر دیتے تھے۔ حضور علیہ السلام دین کی ضروری باتیں خود بخود
 بیان فرما دیا کرتے تھے۔ اس لیے اس قسم کے سوالات کی بہت کم ضرورت
 پڑتی تھی۔

گذشتہ درس میں شراب کی حرمت کے مختلف مراحل کا تذکرہ ہو چکا ہے

کہ یہ غیث چیز کس طرح بدریج حرام قرار دی گئی۔ اس آیت میں تو شراب کے فوائد و نقصانات کا ذکر تھا۔ اس کی قطعی حرمت سورۃ مائدہ والی آیت کے ذریعہ ہوئی۔ اسی طرح جوئے کو بھی اسی آیت نے حرام قرار دیا۔ سابقہ آیت میں دوسرے سوال اخراجات کے متعلق تھا کہ لوگ آپسے سوال کرتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اس کا جواب یہ تھا ————— کہ چونکہ دنیا دار الحوائج ہے اس لیے اپنی جائز ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ہر باقی بچ جائے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ اگر زائد مال کو روک رکھو گے تو شرک کا باعث ہوگا۔ ایک شخص کو کہیں سے سونے کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ میں اسے صدقہ کرتا ہوں آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور سونے کو پھینک دیا۔ آپ نے تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ کوئی شخص ایسی حرکت کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے۔ صدقہ کر دیتا ہے۔ اور پھر محتاج ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ وہ صبر بھی نہیں کر سکتا مقصد یہ کہ اپنی ضروریات کو مقدم رکھ کر زائد مال خرچ کر دو گویا دنیا و آخرت ہر دو مقامات کو پیش نظر رکھ کر خرچ کرو۔ تاکہ تمہیں اس دنیا میں بھی تنگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور آخرت کے لیے بھی سامان کر سکو۔ عاصم ابن ابی الجوزہ کی روایت میں آتا ہے کہ مومن آدمی کو دونوں باتوں کی فکر ہوتی ہے۔ هم المعاد وهم المعاش اس کو آخرت کی بھی فکر ہوتی ہے اور دنیا میں رزق حلال کی جستجو بھی۔

شانِ نعل آیت زہرہ درس میں یہ تیسرا سوال یتیموں کے متعلق اٹھایا گیا ہے وَیَسْئَلُونَكَ
عَنِ الْيَتَامَىٰ اور یہ لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں دراصل یتیموں کے مال کی حفاظت کے متعلق قرآن پاک میں بہت سی آیات نازل ہوئیں۔ عرب کے لوگ عام طور پر یتیموں کا مال غصب کر جاتے تھے۔ ان کے متولی بن کر ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے اور پھر جیلے بیلنے سے ان کا مال ناجائز طور پر ختم کر جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ایک احکام نازل فرمائے بِشَلَا وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتَامَىٰ اِلَّا بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ تَعْنِي سَوَّلَ اَحْسَنُ طَرِيقَہ کے یتیم کے مال

کے قریب نہ جاؤ۔ دوسری جگہ فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ يٰكُفُّوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّهُمْ يٰكُفُّوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا يَتْنِيْ جَوَ لَوْ كَانَتْ اَعْيُنُكُمْ لَأَرٰىكُمْ اَنْتُمْ اِلٰهًا غٰفِلِيْنَ
یتیموں کا مال کھاتے ہیں، دراصل وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔

ان آیات کے نزول پر صحابہ کرام یتیموں کے مال کے متعلق بڑے محتاط ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے ان کی آمدنی اور خرچ اپنے سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ملا کر کھانے پینے سے کہیں یتیم کے مال کا کوئی لقمہ سوا بھی ہمارے پیٹ میں نہ چلا جائے۔ جس کی وجہ سے قابل مؤاخذہ ٹھہریں۔ ایسا کرنے سے دقت پیش آئی کہ بعض اوقات یتیم کا مال ضائع ہو جاتا تھا۔ مثلاً یتیم کے لیے علیحدہ سالن روٹی وغیرہ پکائی گئی ہے

اُس نے پورا کھانا

نہیں کھایا اور وہ بچ گیا ہے۔ تو یتیم کا بچا ہوا کھانا وعید خداوندی کے پیش نظر خود نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے وہ خراب ہو کر ضائع ہو جاتا تھا ایسی صورت میں صحابہ کرام یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئے، جو اس درس میں بیان ہوا ہے۔

یتیم کی سرپرستی

يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى يٰرَبُّ الْعَالَمِيْنَ
کرتے ہیں کہ ان کا مال آپس میں ملا کر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یادہ بالکل الگ تھک ہونے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا قُلْ اَبْ
يٰحٰجِبِ الْمَسٰحِ لَكُمْ خَيْرٌ اَنْ كُنْتُمْ اَصْلٰحَ كَاكُمْ هٰى بِهَرْ حَالٍ بَسْرَ
یعنی یتیموں کی بھلائی ہر حالت میں مقصود ہونی چاہیے۔ اگر ان کا آمد و خرچ بالکل علیحدہ رکھنا ان کے لیے بہتر ہے۔ تو ایسا کر لو۔ اور اگر اپنے ساتھ ملا لینا ان کے حق میں جاتا ہے۔ تو انہیں ساتھ ملا لینے کی بھی اجازت ہے۔ اس میں سہولت یہ ہوگی کہ اگر کسی یتیم نے کسی ایک وقت میں مشترک کھانے میں سے کھانا استعمال نہیں کیا۔ تو وہ اس کے سرپرست استعمال کر لیں گے۔ اور اگلے دن یتیم اپنے سرپرست کا کھانا کھائے گا۔ اور اس طرح یتیم کا مال ضائع نہیں ہوگا۔

اس ضمن میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں۔ کہ گلنے سڑنے والی یا خراب ہو جانے والی چیز کو یتیم کے مال کے ساتھ ملا لینا چاہیے۔ تاکہ اُس کا نقصان نہ ہو۔ اور جس چیز کے خراب ہونے کا احتمال نہیں۔ یتیم کی وہ چیز علیحدہ ہی رہنے دی جائے اسی لیے فرمایا کہ اگر کوئی چیز ملا لینے میں یتیم کی بہتری ہے۔ وَذَا نُنَحْنَالطُّوْهُمُ یعنی اگر تم اُن کو اپنے ساتھ لالو تو فَاِخْوَانُكُمْ تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ انہیں ساتھ لالو۔ یہاں پر بھائی سے مراد دینی بھائی ہیں۔ یا دینی بھائیوں کی اولاد ہے۔ لہذا اُن سے دینی بھائیوں کا سلوک ہونا چاہیے۔ اور اگر ایسی صورت ہو۔ کہ یتیم تمہارا دینی بھائی نہیں ہے۔ کسی غیر مسلم کا بیٹا ہے۔ تو اس صورت میں بھی اس آیت کی رُو سے اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا ہوگا، جو اس کے حق میں بہتر ہے اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا، جو ایک مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔

یتیموں سے متعلق اسلام کے اس زیریں اصول کو غیر مسلم انگریزوں نے بھی سراہا ہے ایک انگریز مصنف (ماسٹر تھمپسن) لکھتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یتیموں پر خاص نظر شفقت رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ خود بھی یتیمی کے دور سے گزر چکے تھے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یاد دلایا اَللّٰهُ يَجْذَلُكَ يَتِيْمًا فَارَوَيْ كَا هَم نے آپ کو یتیم نہ پایا اور پھر ٹھکانا میا کیا۔ فَالْمَا الْبَيْتِيْمَ فَزَلَا تَقْهَرُ لَٰمَ ۛ یتیم کو ڈانٹنا بھی نہیں۔ بلکہ فرمایا انکے حق میں اصلاح بہتر ہے۔ اس سے مفسرینِ کریم نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے۔ کہ اگر یتیم کی تعلیم و تربیت کے لیے اُس کو

ڈانٹ بھی دیا جائے

تو جائز ہے۔ کیونکہ اس کی اصلاح کے لیے ہے۔ البتہ یتیم کو مارنے یا دوسری ایذا پہنچانے سے نبی علیہ السلام نے سخت منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے۔ کہ جب یتیم رو رہا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کا عرش کانپ جاتا ہے۔ لہذا اُن کو مارنا پٹینا درست نہیں۔ البتہ ان کی اصلاح کی خاطر ڈانٹ ڈپٹ جائز ہے۔

ایک امریکی مصنف رابرٹس نے اپنی کتاب سوشل لاز آف دی قرآن
SOCIAL LAWS OF THE QURAN میں لکھا ہے کہ دیکھو حضرت محمد صلی
اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یتیموں کی پرورش، اُن کی نگرانی اور رعایت، کارکن قدر
خیال رکھا گیا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات

کی برتری کا ثبوت ہے۔ کمزوروں کی دلدرسی کی تاکید جس قدر اسلام نے کی ہے
کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ اسلام نے یتیم، مسکین، مسافر، یرہ، اور غیروہ کے ساتھ
حسن سلوک اور اُن کی خدمت کا زبردست حکم دیا ہے بلکہ اُس سوسائٹی کو ملعون قرار
دیا ہے جس سوسائٹی میں کمزور طبقوں پر ظلم و زیادتی کی جاتی ہو۔ جو لوگ بے کسوں
کی دستگیری کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف کھینچنے والے ہوتے ہیں
فرمایا یتیموں کی ہر حالت میں خیر خواہی چاہو۔ اور اس مقصد کے حصول کے
مقصد اور
مصلح
لیے انہیں الگ رکھو یا ساتھ ڈالو، یہ تم پر منحصر ہے۔ البتہ ایک بات یاد رکھو کہ تم جو
بھی فیصلہ کر دو گے، اللہ تعالیٰ تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔ کہ تم نے یہ فیصلہ نیک نیتی
سے کیا ہے۔ یا بد نیتی سے۔ اس فیصلہ سے فائدہ مراد ہے یا اصلاح کا پتہ۔ وَاللّٰهُ

يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اللہ تعالیٰ فادلوں اور اصلاح کنندگان سب
کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اُسے علم ہے کہ تم جو بھی یتیموں کے متعلق فیصلہ کرتے
ہو۔ وہ کس نیت کے ساتھ کرتے ہو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ اے مولا کریم
اِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِبَةً الْاَعْيُنَ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ تو آنکھوں کی خیانت
کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے پوشیدہ رازوں سے بھی واقف ہے۔ جو کوئی
یتیموں کے متعلق بُری نیت سے معاملہ کرے گا، اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہے
ایسا شخص اللہ کے غدا سے بچ نہیں سکتا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم تمہاری آسانی کے لیے دیا ہے۔ کہ چاہو تو الگ
رکھو یا چاہو تو ساتھ ڈالو۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَاعْتَبَكُمُ وَاَلَمْ يَكُنْ جَانِبًا لِّمَنْ تَعْبُدُونَ
مشقت میں ڈال دیا۔ اور حکم دیا کہ یتیموں کا خرچ لازماً ملحدہ رکھو، پھر تمہارے

یہ معیار پر پورا اترنا مشکل ہو جاتا اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے آسانی پیدا فرما دی ہے۔ کہ وہ کام کرو جس میں یتیموں کی بھلائی مقصود ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ“
 بیشک اللہ تعالیٰ زبردست اور کمال قوت کا مالک ہے۔ وہ حکم ہے۔ وہ انسانوں کی مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے۔ جو انسانوں کی مصلحت کے خلاف ہو۔ لہذا اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے یتیموں کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھو۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس نور دور (۹۲)

آیت ۲۲۱

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَةَ حَتَّىٰ تُؤْمِنَ وَلَا مَهْرٌ مُّؤْمِنَةٍ
خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ
حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ
أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى التَّارِخِ وَاللَّهُ يُدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾

ترجمہ: اور مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں
البتہ ایک ایماندار لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو کتنی اچھی معلوم
ہو۔ اور نہ نکاح کرو مسلمان عورتوں کا مشرکوں کے ساتھ، یہاں تک کہ وہ ایمان لے
آئیں۔ البتہ ایک ایماندار عکلم مشرک سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو اچھا معلوم ہو
یہ لوگ (مشرک) دوزخ کی طرف بلا تے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بلا تا ہے، جنت
اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بیان کرتا ہے اپنے احکام لوگوں کے
لیے، تاکہ وہ نصیحت قبول کر لیں ﴿۲۲۱﴾

گزشتہ آیت میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا بیان تھا۔ کہ ان کے
ساتھ وہ معاملہ کرنا چاہیے، جو ان کے حق میں بہتر ہو۔ اور ان کی اصلاح مقصود
ہو، ان کو کھانے میں شریک کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کے طور
پر فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہاری یتیموں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یتیموں
کے متعلق تمہارا فیصلہ اصلاح پر مبنی ہے یا فساد پر۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یتیموں
کو اپنے ساتھ ملائے کی اجازت دے کر تم پر مہربانی فرمائی ہے ورنہ تم متقت
میں پڑ جاتے۔

مشرکین سے
نکاح کی ممانعت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نکاح جیسے اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور حکم دیا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ نکاح محبت اور رافت کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں اور بیوی کے درمیان شفقت و محبت کو پیدا فرمایا ہے اگرچہ نفسانی تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں مگر اصل جوہر الفت و محبت ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا "وَجَعَلْ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً" ہم نے ان کے درمیان رافت و رحمت کے جذبے کو پیدا کیا۔ لہذا اس پاکیزہ رشتے کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ میاں بیوی ہم عقیدہ و ہم خیال ہوں و نہ اس رشتہ کا قائم رکھنا ممکن نہیں۔ اسی لیے فرمایا مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور پھر دلیل کے طور پر فرمایا وَلَا مَنَ الْمُؤْمِنَةُ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ ایک مومنہ لونڈی مشرکہ آزاد عورت سے بہتر ہے۔ وَكَوْنًا عَجَبْتَ كُمْ اگرچہ مشرکہ عورت تمہیں کتنی اچھی لگے۔ معاشرے میں لونڈی کی حیثیت آزاد عورت کی نسبت کم تر ہے۔ مشرکہ اگرچہ آزاد ہو، مالدار ہو، احسن و جمال میں بھی خوب ہو، اس کے باوجود ایک مومنہ لونڈی اللہ کے ہاں بہتر ہے۔ اگرچہ اس کے پاس مال و دولت اور حسن بھی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب مشرکہ کا دین الگ ہوگا، عقیدہ غلط ہوگا، تو میاں بیوی کی راہیں جدا جدا ہوں گی اور ان میں رافت و محبت کا وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکے گا۔ جو نکاح کی غرض و غایت ہے۔ لہذا مومنوں کو منع فرمادیا کہ مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کریں۔

آگے مومنہ عورتوں کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ان کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ جس طرح مومن مردوں سے مشرکہ عورتوں کا نکاح جائز نہیں، اسی طرح مومن عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح درست نہیں۔ آگے دلیل کے طور پر فرمایا وَكَوْنًا عَجَبْتَ كُمْ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ ایک مومن غلام مشرک

ہیں شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت یا اسکی کسی خاص صفت میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا علم محیط کا مالک ہے ہوگا کہ اللہ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ یعنی اس کا علم ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی ہستی کا علم بھی ہر شے پر محیط ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہو گیا۔ کیونکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کا عالم ہونا اللہ کی صفت مختصہ ہے۔ اور اس میں غیر اللہ کی شرکت شرک ہے۔ اس زمانہ میں یہ عام عقیدہ ہے کہ ہمارے پیر یا فلاں بزرگ یا پیغمبر علیہ السلام کو ذرہ ذرہ کا علم ہے۔ یہی شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت خاصہ قادر مطلق ہونا ہے۔ "وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ لہذا وہ جو چاہے کر سکتا ہے اب اگر یہی صفت کسی غیر اللہ میں ثابت کی جائے کہ فلاں بھی جو چاہے کر سکتا ہے تو ایسا اعتقاد رکھنے والا مشرک ہو گیا۔ کیونکہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی خاص صفت اُس کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ثابت کی۔ اسی طرح "وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ" ہے۔ ہر چیز اللہ کی نگہبانی میں ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر یہی صفت کسی دوسرے میں مانی جائے تو شرک کا ارتکاب ہو گیا۔ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت میں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی حلال و حرام کرنے کی مجاز ہے۔ تو ایسا شخص بھی خدا تعالیٰ کی صفت مختصہ میں شرک کا مرتکب ہوا۔ اس کی مثال اہل کتاب کی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ کہ اہل کتاب کے علماء جس چیز کو حلال قرار دیں وہ اُن کے نزدیک حلال ہے۔ اور جس کو حرام کہ دیں، اس کو حرام مان لیتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے۔ اسی طرح جو تعظیم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسا سجدہ کرنا، اگر ایسی ہی تعظیم یا سجدہ کسی غیر اللہ کے لیے کیا جائے، تو شرک میں داخل ہو گا۔ مولانا شیخ السبزواری فرماتے ہیں کہ علم یا قدرت یا کسی دیگر صفت خداوندی میں

کسی غیر کو خدا کا مماثل سمجھنا، خدا کے مثل کسی کی تعظیم کرنا، یا کسی کو ممتاز سمجھ کر اس سے حاجت طلب کرنا، ان تمام صورتوں میں ایسا عقیدہ رکھنے والا یا ایسا عمل کرنے والا مشرک تصور ہو گا۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین ایسا ہی کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے شرک کے متعلق فیصلہ کر دیا۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ جب تک مشرک اپنے دل سے توبہ نہ کرے، یہ گناہ معاف نہیں ہو گا۔ اسی لیے میاں یا بیوی میں کوئی ایک بھی شرک کا مرتکب ہو گا تو ان کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔

اہل کتب عورتوں
سے نکاح جائز ہے

البتہ ایک اور مسئلہ یہاں پر قابل بیان ہے بعض دوسری آیات سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے۔ ”وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَلَمْ يَلْحَقْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ اٰہل کتاب کی پاک و امن عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتا ہے۔ جب کہ زوجین اپنے اپنے دین پر قائم رہیں۔ اگرچہ یہ پسندیدہ کام نہیں ہے۔ تاہم اس کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے عیسائی عورت ناکہ تعلیہ سے نکاح کیا تھا بعد میں اللہ تعالیٰ نے اسے توفیق بخشی اور وہ اسلام لے آئی۔ حضرت خدیجہؓ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کو علم ہوا تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے پوچھا، کیا یہ نکاح ناجائز ہے۔ فرمایا، ناجائز تو نہیں مگر خطرناک ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے نکاح میں بدکار عورتیں آجائیں اور تمہارا اخلاق بگڑ جائے۔ اور یہ بھی خطر ہے کہ وہ تم پر اس قدر اثر انداز ہوں کہ تمہارے دین میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ نکاح میں پیار و محبت کو بڑا دخل ہے، اور محبت میں اگر انسان بہت کچھ کر بیٹھتا ہے۔ لہٰذا حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس بی بی کو جد کر دو یہ پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ بہر حال یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دین پر قائم رہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانستے ہوں اگرچہ وہ شرک بھی کرتے ہیں مگر محمد اور دہریہ نہ ہوں، جیسا کہ آجکل اکثر نصاریٰ ہیں۔ عام طور پر تمام انگریزوں کو عیسائی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ان میں بہت سے

دہریہ ہوتے ہیں، جو نہ کسی کتاب کو مانستے ہیں۔ اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ان کا ایمان ہے۔ ایسی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔

نکاح کی طرح اہل کتاب کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کریں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر ذبح کریں گے۔ تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا شیخ المنہ جب مالٹا میں نظر بند دس برس تھے تو وہ عیسائیوں کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں زندہ جانور مہیا کیا جائے، جسے وہ خود ذبح کریں گے آپ فرماتے تھے کہ اُن کی بچی ہوئی روٹی تو کھالیں گے مگر ان کا ذبیحہ نہیں کھائیں گے، کیونکہ ہماری تحقیق کے مطابق یہ لوگ عیسائی نہیں، بلکہ دہریہ ہیں۔ بہر حال کافی تک دود کے بعد انگریزوں نے حضرت شیخ المنہ کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

الغرض اس آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے درست نہیں تا وقتیکہ مسلمان نہ ہو جائے۔ اور اس آزاد مشرک سے ایک لڑکھڑی بہتر ہے گویا ایک ادٹے سے ادٹے مسلمان، اعلیٰ سے اعلیٰ مشرک سے بہتر ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ مِّنْ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، یعنی کمزور مسلمان طاقتور مشرک سے بہتر ہے۔ مشرکین سے جس قدر محبت کی جائیگی، اُسی قدر کفر و شرک سے نفرت میں کمی واقع ہو جائے گی اور یہ چیز اصل دین کو ضائع کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے۔ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى الْفِتْنِ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے۔ یعنی پسے کام کرتے ہیں۔ جو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی تحریک، باطل رسومات شرک وغیرہ ایسے افعال ہیں جن کی وجہ سے دوزخ لازم ہو جاتا ہے۔ البتہ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ نیکی اور توحید کی طرف بلا تے

دعوت اور
جنت کی طرف
دعوت

ہیں۔ اور اس طرف آجاء اور شرکیہ افعال سے بچ جاؤ۔ فرمایا وَيُخَوِّفُ اِيْتَهُمُ النَّاسُ
اللّٰهُ تَعَالٰی اپنے احکام لوگوں کے پاس کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ
 تاکہ وہ نصیحت پکڑ لیں، راہِ راست پر آجائیں اور دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس نور و سر (۹۳)

آیت ۲۲۲ تا ۲۲۴

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى لَا فَاعِلٌ خَلَقْنَا النِّسَاءَ فِي
 الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ
 فَأَتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ
 وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿۳۲﴾ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَانْمُوا
 حَرْثَكُمْ إِلَىٰ شِئْتُمْ وَقَدْ مَوْلَا نَفْسَكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَعَلِمُوا
 أَنَّكُمْ مُّسْلِمُونَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ کہ دیجئے وہ گندگی ہے۔ پس الگ
 رہو عورتوں سے حیض کے دوران۔ اور اُن کے قریب مت جاؤ، یہاں تک کہ وہ
 پاک ہو جائیں۔ جب وہ خوب اچھی طرح پاک ہو جائیں۔ پس جاؤ ان کے پاس جہاں سے
 اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ لوہ کرنے والوں کو اور
 پسند کرتا ہے طہارت حاصل کرنے والوں کو ﴿۳۲﴾ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی
 ہیں۔ تو جاؤ اپنی کھیتی میں جس طرح تم چاہتے ہو۔ اور اگے بھیجو اپنے نفسوں کے لیے
 اور اللہ تعالیٰ سے اور جان لو کہ بیشک تم اس سے ملنے والے ہو۔ اور
 خوشخبری سنو ایمان والوں کو ﴿۳۳﴾

رابطہ آیات
 پچھلے رکوع میں مختلف مسائل کا ذکر تھا۔ اور سوالات کے جوابات تھے۔ خصوصاً
 شراب اور جوئے سے متعلق سوال کا جواب تھا۔ پھر شراب اور جوئے کی قباحت
 کا ذکر ہوا۔ پھر مال میں سے خرچ کرنے کے متعلق سوال آیا۔ اس کے جواب میں
 بنیادی قانون سمجھایا گیا کہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بعد خرچ کرنا چاہیے۔ پھر
 یتیموں کی اصلاح اور اُن کے خرچ کو پانے ساتھ ملانے کے بارے میں سوال کیا گیا۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی۔ کہ یتیموں کے حق میں جو چیز بہتر ہو، وہ ہونی چاہیے۔ ان کی اصلاح اور ان کے مال کی حفاظت بہر صورت پیش نظر رہنی چاہیے۔ یتیموں کا مال کھانا، جوئے کی کائی کھانا، شراب کو استعمال کرنا یا اس کا کاروبار کرنا کسی کا حق ناجائز طور پر کھانا۔ یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ اسی طرح مومن مرد کا مشرک عورت کے ساتھ اور مومنہ عورت کا مشرک مرد کے ساتھ نکاح حرام قرار دیا گیا۔ ان تمام ناپاک افعال سے منع کیا گیا ہے۔ نکاح ہی کے ضمن میں عورتوں کے ایام ماہواری کا سوال پیدا ہوا۔ جس کا جواب اس آیت زیر درس میں دیا گیا ہے

فَمَنْ عَمِيَ كَرَامَ فَمَاتَ هِيَ الدَّمَاءُ الْمُخْتَصِمَةُ بِالْمَنَاءِ ثَلَاثَةَ عَوْرَتَيْنِ كَ مَخْصُوصِ خُونٍ تَيْنِ قِسْمِ هِيَ. اُن میں سے پہلی قسم حیض کا خون ہے۔ جو تندرست عورت کے رحم سے ہر ماہ چند دن تک خارج ہوتا ہے۔ اس کا اخراج لازمی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ خون بند ہو جائے۔ تو عورت طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ گویا یہ خون عورت کی تندرستی کی علامت ہے۔ جب تک عورت بالغ نہیں ہوتی۔ یہ خون شروع نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد جب حمل ٹھہر جاتا ہے۔ تو یہی خون بچکے کی خوراک بنتا ہے۔ لہذا حمل کے دوران بھی خارج نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب تک بچہ دودھ پیتا ہے۔ عموماً یہ خون رکار ہوتا ہے۔ اور پھر جب عورت کبر سن میں پہنچ جاتی ہے۔ یعنی تقریباً پچاس سال کی عمر میں جا کر یہ خون ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔

عورتوں کے
خون مختص

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حجۃ الوداع کے سفر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھیں۔ جب آپ کا قافلہ مکہ معظمہ کے قریب سرف کے مقام پر پہنچا، تو حضرت عائشہؓ کے ایام ماہواری شروع ہو گئے۔ ایام حج قریب تھے۔ اور آپ کو خدشہ پیدا ہوا کہ اس حالت کی وجہ سے وہ حج سے محروم نہ ہو جائیں۔ لہذا فرط غم سے رونے لگیں۔ حضور علیہ السلام تشریف لائے۔ تو فرمایا گھبراؤ نہیں ہَذَا شَيْءٌ كُنْتُمْ عَلَى بَنَاتِ آدَمَ يَكُونُ فِيهِمْ حَيْضٌ

جسے اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لیے نکھ دیا ہے۔ فرمایا حج کے ضیاع کا فخر
نہ کرو۔ تم احرام باندھ لو، حج کے تمام ارکان ادا کرو، اسولائے اس کے کطوات کو مؤخر
کر دو، کیونکہ اس کے لیے مسجد الحرام میں جانا ضروری ہے۔ اور وہاں ایسی حالت
میں نہیں جاسکتیں۔

عورت کے خون مختص کی دوسری قسم نفاس ہے یہ زچگی کے دوران آتا
ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد کم و بیش چالیس روز تک رہتا ہے۔ اس کے
بعد اسے نفاس نہیں شمار کیا جاتا۔ عموماً یہ خون دس بیس دن یا مہینہ تک ختم ہو جاتا
ہے۔ حیض اور نفاس کے خون کے احکام مشترک ہیں۔ البتہ تیسری قسم کا خون اتحاض
کہلاتا ہے۔ یہ بیماری کی وجہ سے آتا ہے۔ عورت کے رحم میں کوئی باریک سی رگ
پھٹنے سے خون رستارہتا ہے۔ اس کا حکم الگ ہے۔

حیض

حیض کی مدت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ
امام سفیان ثوریؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ حیض کی مدت کم سے کم تین دن
اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اگر تین دن سے کم خون آکر ختم ہو گیا۔ تو وہ
حیض شمار نہیں ہوگا، بلکہ کسی بیماری وغیرہ کا اثر ہوگا۔ اسی طرح اگر دس دن سے
زیادہ عرصہ تک خون آتا رہا، تو وہ بھی حیض کے زمرہ میں نہیں آئے گا۔ بلکہ اتحاض
ہوگا، برخلاف اس کے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حیض کی مدت ایک دن سے لے کر
پندرہ دن تک ہے۔ اور ان ایام میں حیض ہی کے احکام لاگو ہوں گے۔ عورت
نماز نہیں پڑھ سکے گی۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق تین دن سے دس دن
تک کی مدت کے علاوہ بھی اگر خون آتا ہے۔ تو عورت کو غسل کر کے نماز پڑھنا
ہوگی۔ ہندو مذہب میں بھی حیض کی مدت پندرہ دن تک ہے۔ البیرونی نے
کتاب السنن میں لکھا ہے۔ کہ ہندو لوگ بھی پندرہ دن تک حیض شمار کرتے ہیں۔

اس مسئلہ میں دیگر مذاہب میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ مثلاً عیسائی حیض
کی حالت میں عورت سے جماع کر لیتے تھے۔ برخلاف اس کے یہودی، مجوس

افراط و تفریط

اور ہندومت والے مائضہ سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ اُسے گھر سے نکال دیتے نہ وہ کسی چیز کو ہاتھ لگا سکتی اور نہ کھانا پکا سکتی۔ بلکہ یہودیوں کی خود ساختہ تورات میں موجود ہے کہ اگر مائضہ عورت کسی شخص کے کپڑے کو ہاتھ لگا دے تو وہ شخص چوبیس گھنٹے کے لیے ناپاک ہو جائے گا۔ جو کوئی ایسے کپڑے کو دھوئے گا وہ بھی پورے دن کے لیے پمید ہو جائے گا۔

افراط و تفریط کے اس دور میں صحابہ کرامؓ کو حیض کے متعلق احکام الہی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ اسی سوال کے متعلق فرمایا وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ يَنْفِصُ عَلَيْهَا فِي الْمَسْجِدِ وَالْمَسْجِدِ یہ لوگ آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ آیا ان ایام میں عورت کے قریب جانا چاہیے یا نہیں۔ یا اس سے تعلق بالکل ہی قطع کر لینا چاہیے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّلّٰهِ مَا يَشَاءُ کہ دیں، هُوَ اَذْهَبَ يَٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّلّٰهِ مَا يَشَاءُ یعنی اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے کہ دیں، هُوَ اَذْهَبَ يَٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّلّٰهِ مَا يَشَاءُ یعنی یہ گندگی ہے۔ اذی اس گندگی کو کہتے ہیں۔ جو تکلیف دہ ہو یعنی یہ سخت ناپاک کی حالت ہے فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ لَمَّا حیض کی حالت میں عورت کے قریب نہ جاؤ۔ مطلب یہ کہ ان ایام میں مباشرت کرنا حرام ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حیض کی حالت میں عورت سے جماع کرتا ہے اور اسے حلال بھی جانتا ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے قطعی حکم کو توڑ دیا ہے۔ اور اگر نسانی اور شیطانی غلبہ سے یہ کام کیا ہے۔ تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایسی غلطی کرنے والے کو توبہ کرنی چاہیے۔ استغفار کرے اور ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دے۔

طبی لحاظ سے بھی حیض کے دوران جماع کرنا مایاں بیوی کے لیے مضر صحت ہے۔ یہ خون بعض اوقات بدبودار بھی ہوتا ہے۔ اس کی رنگت بھی بے اوقات سیاہی مائل یا سفیدی ہوتی ہے۔ لہذا اس حالت میں عورت سے پرہیز

کرنا چاہیے۔ البتہ یہودیوں کی طرح یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ عورت کو بالکل ہی گھر سے الگ کر دیا جائے کہ کسی چیز کو ہاتھ بھی نہ لگا سکے۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس آیت میں عورتوں سے الگ رہنے کا مطلب یہ ہے اُن سے مباشرت نہ کرو۔ اس کے علاوہ عورتیں کھانا پکا سکتی ہیں۔ تم اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہو۔ ایک چارپائی پر لیٹ سکتے ہو، ان سے دیگر حضرات ملے سکتے ہو، تاہم ناف سے لیکر گھٹنے تک کے حصہ کو نہ ہاتھ لگا سکتے ہو اور نہ دیکھ سکتے ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حیض کی حالت میں ام المؤمنین حضور علیہ السلام کا سر مبارک دھو ڈالتی تھیں۔ الغرض! اسلام نے اس معاملہ میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے بہتر اور درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے۔

حائضہ کے احکام

حیض والی عورت کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اس حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتی، اُس کے لیے حرام ہے۔ اسی طرح روزہ بھی نہیں رکھ سکتی۔ اس کے لیے نماز کی قضا بھی نہیں ہے۔ البتہ روزے کی قضا لازم ہے۔ حائضہ عورت کا مسجد میں داخلہ منع ہے اسی لیے طواف بھی نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم کو ہاتھ نہیں لگا سکتی کیونکہ ناپاک ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حیض و نفاس والی عورت یا جنابت والی عورت یا مرد قرآن پاک نہ چھو سکتے ہیں اور نہ اس کی تلاوت کر سکتے ہیں۔ البتہ درود شریف پڑھ سکتے ہیں۔ دیگر وظائف استغفار بسم اللہ وغیرہ کا درود کر سکتے ہیں۔

فَرَمَا وَكَتَفَتْ بِيَوْمَئِذٍ حَتَّى يَطْهَرَنَّ اَنْ كَرِيبَ زَجَاوُجٍ تَكُ وَه

پاک نہ ہو جائیں فَإِذَا طَهُرْنَ اور جب وہ اچھی طرح پاکیزگی حاصل کر لیں۔ یہ بالغہ کا صیغہ ہے یعنی خوب طہارت حاصل کر لیں، غسل جنابت کے سلسلہ میں بھی یہی صیغہ استعمال ہوا ہے فَاطْهَرُوْا یعنی خوب اچھی طرح غسل کیا جائے۔ حتیٰ کہ بال برابر بلکہ بھی خشک نہ ہے۔ حیض و نفاس سے طہارت کا مطلب بھی یہی ہے۔ کہ خوب اچھی طرح غسل کیا جائے۔ کیونکہ حضور نے فرمایا کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہوئی۔ لہٰذا خوب مل مل کر بڑے اہتمام سے غسل کرنا چاہیے۔ جب یہ چیز حاصل ہو جائے۔

امتوں کے مشترکہ اصول ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ پاکیزگی کے اصول میں عھیدہ کی پاکیزگی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سورۃ مدثر میں آیت ہے "وَالْتَّجِبَ قَا هُجُبًا" یعنی دل و دماغ سے کفر و شرک اور بدعت کی گندگی کو نکال باہر کرو۔ جب تک عھیدہ پاک نہیں ہو گا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ کام نہ آئے گا۔ لہذا اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے ایک اور اہم طہارت مال کی طہارت ہے جس مال سے انسان خیر رکھتا ہے لباس پہنتا ہے، مکان بناتا ہے۔ وہ مال بھی پاک ہونا چاہیے۔ چوری، خیانت، رشوت، اور بلیک میل اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔ اسی طرح جس مال سے زکوٰۃ نہیں نکالی گئی وہ مال بھی پاک نہیں ہے۔ ایسے مال سے اللہ تعالیٰ صدقہ قبول نہیں کرتا ایسے شخص کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ ایسا شخص مرگیا تو اپنے پیچھے جہنم کے راستہ کا روشنہ چھوڑ گیا۔

عورت بمنزلہ
کھیتی

آگے ایک اور مسئلہ بیان فرمایا: عورت کو کھیتی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ارشاد ہوا: رَبَّنَا ذَاكَمُ حَنْتُ لَكُمْ تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی کے ہیں فَاتَّقُوا حَنْتَكُمْ اُن سے ڈرو پس جاؤ اپنی کھیتوں میں جس طرح چاہو۔ اس مقام پر عورت کو کھیتی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھا دی کہ مرد کا لطف بمنزلہ تخم کے ہے اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے۔ جس طرح زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے اور اس سے فصل پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کا یہ قطرہ آب عورت کے رحم میں جا کر بچے کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اولاد جمعی ہوگی جب لطف اصل مقام میں جائے گا۔ لہذا دوسرے مقام میں مباشرت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ فَرَمَا مِنْ آتَى امْرَاةً فِي ذُبِّيْهَا فَفَعَلَتْ كَفَعْلٍ بِمَا نَزَّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی جس شخص نے عورت کے ساتھ بیٹھ کے راستے مباشرت کی، اُس نے محمد کی شہرت کا انکار کر دیا۔ وہ باغی اور مجرم ٹھہرا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ آتَى شَتْمُ

سَبَقُورُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس نور چہار (۹۳)

آیت ۲۲۲ تا ۲۴۱

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا
وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۲﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ
اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَبَبْتُمْ
قُلُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۲۲۳﴾ لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ
نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ﴿۲۲۴﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ﴿۲۲۵﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ تم بھی نہیں کرو
گے۔ پر ہیز گاری اختیار نہیں کرو گے اور یہ کہ تم لوگوں کے درمیان صلح نہیں کرو
گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۳﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں
تمہاری بیسودہ قسموں میں نہیں پکڑے گا۔ لیکن ان قسموں پر پکڑے گا جس پر تمہارے
دل قصد کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بربار ہے ﴿۲۲۴﴾ ان لوگوں کے لیے
جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر
وہ اس دوران میں لوٹ آئیں، تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے ﴿۲۲۵﴾
اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۶﴾

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ حیض کی وضاحت فرمائی
کہ ایسی حالت میں عورت سے مباشرت حرام ہے۔ تاہم طہارت حاصل کر لینے
کے بعد عورتوں کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ اس سے گذشتہ آیت میں شرک

رابطہ آیت

مرد اور مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت فرمائی تھی۔ اُس سے پہلے یتیموں کے مال سے متعلق مسائل تھے۔ اور انہیں ساتھ ملائے کی اجازت دی تاہم فرمایا کہ ہر حال میں یتیموں کی اصلاح پیش نظر ہونی چاہیئے۔ محتاجوں کی اعانت کے متعلق بھی حکم آچکا ہے کہ اپنی جائز ضرورت سے زائد مال مستحقین پر خرچ کر دو۔ ضرورت سے زیادہ مال رکھنا شرک کا باعث ہے۔ اس سے پہلے شراب اور جوئے کی حرمت کا بیان بھی آچکا ہے۔ کہ یہ سب ناپاک چیزیں ہیں۔ اور ہر برائی کی جڑ ہیں۔

گزشتہ دروس کی آیات میں مذکورہ قبیح چیزوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے مسئلہ قسم کی آیات میں لوگوں میں پائی جانے والی ایک درجہ بری بات کا ذکر فرمایا ہے اور وہ ہے کسی کا کام نہ کرنے پر اللہ کی قسم اٹھانا۔ قسم کے متعلق احکام مختلف سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ بخلاف ان کے یہ آیات اور سورۃ مادہ کی آیات ہیں۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا ہو اور قسم اٹھائے بغیر چارہ بھی نہ ہو، تو ایسی صورت میں قسم اٹھانے کی اجازت ہے۔ اور اس میں شرط یہ ہے کہ قسم اللہ کے کسی نام یا اس کی صفت کے ساتھ اٹھائی جائے، کسی انسان، جن، نبی یا کسی اور چیز کی قسم نہیں اٹھانی چاہیئے۔ کیونکہ مَنْ أَقْسَمَ بِغَيْرِ اللَّهِ فَقَدْ أَشْرَكَ، جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ اور اگر ایسی قسم اٹھانے والا شخص اُس غیر اللہ کی ایسی ہی تعظیم کرتا ہے جیسی اللہ کی کرنی چاہیئے یا اس کی صفت کو ویسی ہی جانتا ہے۔ جیسی اللہ کی صفت، تو پھر ایسے شخص نے حقیقتاً شرک کیا۔ اور مشرک یا کافر ہو گیا۔ اور اگر حقیقی تعظیم غیر اللہ مراد نہ ہو پھر بھی غیر اللہ کی تعظیم میں شبہ ہوگا، اس کے مناسب نہیں کہ کسی حال میں کبھی غیر اللہ کی قسم اٹھائی جائے اور مطلقاً بھی قسم اٹھانی نہیں لہذا بہتر یہی ہے کہ حتی الامکان قسم اٹھانے سے گریز کیا جائے۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے پوری زندگی میں کبھی قسم نہیں اٹھائی اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جائز اور میں تو قسم اٹھانے کی اجازت ہے مگر بُری باتوں میں قسم مت اٹھاؤ۔ وَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَدُوًّا لَكُمْ

تجائز قسم
کی ممانعت

اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ ان امور میں اَنْ تَبْجُرُوا وَتَسْتَفْتُوا وَتَصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ کہ تم یہی نہیں کرو گے، پر ہنر گاری اختیار نہیں کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہیں کرنا دے گے۔ فرمایا یہ تو بہت بُری حرکت ہے کہ ایک اچھائی کے کام میں اللہ کی قسم کھاتے ہو کہ ہم یہ نیکی کا کام نہیں کریں گے۔ یہ تو بہت ہی بُری بات ہے، مثلاً کوئی اس بات کی قسم اٹھائے کہ میں اللہ کے کلام نہیں کروں گا۔ یا کسی محتاج کی امانت نہیں کروں گا یا کوئی فرض ادا نہیں کروں گا تو فرمایا ایسا نہ کرو۔ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ اللہ تعالیٰ سُننے والا ہے۔ لہذا کوئی ایسی بات زبان پر نہ لاؤ جو قابلِ مواخذہ ہو۔ اور وہ عَلِيٌّ بھی ہے۔ جو دلوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ وہ تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہے کہ کوئی کام تم اچھی نیت سے کر رہے ہو یا بُری نیت سے۔ لہذا اپنا دل قابو میں رکھو۔ اور اس میں کوئی بُرا خیال نہ آنے دو۔ زبان پر کنٹرول ہونا چاہیے۔ زبان سے کوئی بُری بات نہ نکلے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ تم اس کی پڑ سے بچ نہیں سکتے۔

قسم کی تین قسمیں

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ قسم کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم بین لغو ہے۔ جو بغیر ارادے کے زبان سے نکل جائے۔ ایسی قسم پر کوئی مواخذہ نہیں اور نہ ہی کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس پر آخرت میں بھی کوئی گرفت نہیں۔ ہاں اگر دل کے ارادے سے قسم اٹھائی جائے بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ایسی قسم پر یقیناً مواخذہ ہو گا۔

دوسری قسم بین غموس ہے۔ غموس کا معنی کسی گناہ میں غوطہ مارنا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گزشتہ واقعہ کے متعلق دیدہ وازہ غلط قسم اٹھاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص میرے پاس آیا تھا۔ مگر حقیقت میں وہ نہیں آیا تھا تو ایسی قسم غموس کہلاتی ہے۔ اس میں اگرچہ کفارہ نہیں ہے۔ مگر قسم اٹھانے والا گنہگار ہوتا ہے۔ اور آخرت میں قتلِ مواخذہ ہے۔

قسم کی تیسری قسم بین منقذہ ہے یعنی کوئی شخص آنے والے زمانہ کے لیے

کے سسل روزے رکھے۔ ان چاروں صورتوں سے قسم کا کفارہ ادا ہوتا ہے۔

الفرض! فرمایا لَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْبُرُوقِ أَیْمَانِكُمْ اللہ تعالیٰ تمہاری لغو قسموں پر مواخذہ نہیں کرنا وَلَٰكِنْ تَقُولُوا حَقَّ قَوْلُكُمْ بِمَا كَبَبْتُمْ فَلَقَبُوكُمْ بِمَا لَمْ تَفْعَلُوا بَلْ لَمْ تَكُنْ مِنْكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ تمہارے قسموں پر مواخذہ کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے اٹھاتے ہو۔ لہذا اگر تم سے قسمیں نہیں اٹھانا چاہیں جو کوئی ایسا کریگا، اُسے ان احکام کی پابندی کرنا ہوگی۔ ہاں! اگر کوئی شخص ایسی کوتاہی کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور مذکورہ احکام کے تحت کفارہ ادا کرے تو واللہ عَفْوٌ وَحَبِيبٌ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے مگر ایک بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی بردباری سے انسان کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ کہ کہیں اس کی گرفت میں نہ آجائے۔

اس سے پیشتر حیض کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ حیض کے دوران عورت کے قریب جانا حرام ہے۔ اب اسی نوعیت کا ایک اور مسئلہ بیان ہو رہا ہے جسے ایلاہ کہتے ہیں۔ ایلاہ کا لغوی معنی قسم اٹھانا ہے اور مراد اس سے یہ ہے کہ کوئی شخص اس امر کی قسم اٹھائے کہ وہ اپنی عورت کے قریب نہیں جائیگا۔ اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

- (۱) مطلقاً قسم اٹھانا کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔
- (۲) چار ماہ کی مدت مقرر کر کے کہ اتنا عرصہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔
- (۳) چار ماہ سے زیادہ مثلاً پانچ، چھ، آٹھ ماہ کے لیے قسم کھائے کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔
- (۴) چار ماہ سے کم مدت ایک، دو، تین ماہ تک کے لیے قسم کھائے کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

چوتھی صورت یعنی چار ماہ سے کم مدت کے ایلاہ کو شرعی ایلاہ نہیں کہا جاتا اگر مقررہ مدت تک ایسا شخص عورت کے قریب نہیں گیا تو قسم سے بری ہو جائے گا۔

اور اگر اس دوران عورت سے مقاربت کر لی۔ تو قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ باقی تین صورتوں میں حکم یہ ہے۔ کہ ایسے شخص کو قسم توڑ دینی چاہیے اور اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ اور اگر چار ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اور قسم کھانے والا شخص عورت کے پاس نہیں گیا، تو پھر ایلاؤٹو نہ ہوگا۔ البتہ اس کے حکم میں نعتائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا قول یہ ہے۔ کہ ایسی صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ اب اگر مرد دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اُسے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔ اگر رجوع کا کوئی ارادہ نہیں تو عورت آزاد ہے، عدت گزرنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

البتہ ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی، بلکہ حاکم وقت اُس شخص کو عدالت میں طلب کر کے اُسے مجبور کریگا۔ کہ یا تدرہ رجوع کر لے یا طلاق لے لے دونوں صورتوں میں جو بھی فیصلہ ہوگا۔ اُس کے مطابق عمل ہوگا۔

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ شرعی ایلاؤٹس صورت میں قائم ہوگا جب عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی گئی ہو۔ اگر قسم نہیں کھائی ویسے ہی کر دیا کہ بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ تو یہ ایلاؤٹ شمار نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین (جیسا صاحب تفسیر القرآن کو مغالطہ ہوا ہے اور اس نے غلط مسئلہ سمجھا ہے) کو مغالطہ ہوا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ بغیر قسم کے بھی ایلاؤٹ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے کہ ایلاؤٹ کے لیے قسم اٹھانا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص بے ہی ایک دو سال کے لیے علیحدہ ہے تو ایلاؤٹ قائم نہیں ہوگا۔ لغوی اعتبار سے بھی قسم ضروری ہے کیونکہ ایلاؤٹ کا معنی ہی قسم ہے۔ البتہ قسم کے بغیر ایسی بات کرنے سے انسان گنہگار ضرور ہوتا ہے۔ ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے اس سے عورت کو تنگ کرنا مقصود ہے جو کہ ناروا ہے۔ جس طرح میاں بیوی کے درمیان حقوق ہیں۔ اسی طرح نضائی خواہش کی تکمیل بھی دونوں کا حق ہے۔ اور کسی

فریق کر اس کے حق سے محروم کرنا محسن نہیں ہے۔ بلکہ بُری بات ہے۔
فَرَأَى الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَرَاءَوْا رُوحَ رَبِّكُمْ
أَمْ لَكُمْ أَعْيُنٌ كَالْأَبْصَارِ۔ جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی
تَمَنَّى كَمَا يَأْمُرُ اللَّهُ فَاسْتَجِيبُوا لَهُمْ نَحْوَ الَّذِي جَاءُوكُمْ۔ فَإِنَّ اللَّهَ عَفْوٌ
رَحِيمٌ تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے غلطی کو تا ہی معاف ہو جائے گی
وَلَا تُعْزَمُوا بِالْأَلْفِ اور اگر انہوں نے طلاق یا تفریق کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔
فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ تو اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ
 انکی ہر ہر ظاہر بات کو سمجھتا ہے۔ نیز ان کی نیت اور ارادے تک کو جانتا ہے۔

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۲۸

سَبَقُولُ ۲

درس نور و بیخ (۹۵)

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ
لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُنَّ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبِعُولَتِهِنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا
إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
وَاللرِّجَالُ عَلَيْهِمْ دَرَجَةٌ ۖ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۸﴾

۲۸

ترجمہ: اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ اور ان کے لیے
حلال نہیں ہے۔ کہ وہ اُس چیز کو چھپائیں، جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے۔ اگر
وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند زیادہ حق سمجھتے ہیں۔ انہیں
اس مدت میں لوٹانے کا۔ اگر وہ اصطلاح کا ارادہ کریں۔ اور ان عورتوں کے لیے بھی
اُسی طرح حق ہے جس طرح عورتوں پر مردوں کا حق ہے۔ دستور کے مطابق۔ اور
مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزیز ہے اور حکمت والا ﴿۲۲۸﴾
گزشتہ درس میں قسم کے متعلق بیان تھا۔ اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایلاہ کا مکمل بیان فرمایا
سے مراد عورت سے عدم مقاربت کی قسم کھانا ہے۔ اور اس کی مدت زیادہ سے زیادہ
چار ماہ رکھی گئی ہے۔ اگر خاوند اس دوران رجوع کر لے تو قسم کا کفارہ ادا کرے۔ اور
اگر چار ماہ کی مدت پوری ہو گئی۔ تو عورت پر ایک طلاق بائن پڑ جائیگی۔ تاہم بعض فقہائے
کرام فرماتے ہیں۔ کہ طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی بلکہ ایلاہ کرنے والے کو عدالت میں
طلب کر کے رجوع یا طلاق کا فیصلہ کیا جائے گا۔

نکاح اور طلاق کے مسائل اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں بیان
فرمائے ہیں، خصوصاً سورۃ احزاب، طلاق اور اس سورۃ بقرہ میں یہ مسائل آئے ہیں

نکاح میاں بیوی کے درمیان ایک دائمی اور اجتماعی معاہدہ ہے۔ جسے مرتے دم تک نبھانے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ جب تک نکاح کا معاہدہ طے نہیں پاتا، اس معاہدہ کے فریقین یعنی مرد اور عورت کے اخلاق کی چھان بین کی جاتی ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کو کس حد تک قابل قبول ہیں پھر جب نکاح طے پا جاتا ہے۔ تو زوجین پر معاہدہ نکاح کی قانونی پابندی عاید ہو جاتی ہے۔ جسے پورا کرنے کے وہ پابند ہوتے ہیں۔ شریعت نے مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں کچھ حقوق دیے ہیں اور کچھ فرائض سونپے ہیں۔ اگر فریقین ان کی پابندی کرتے ہیں تو ان کی ازدواجی زندگی نہایت پرسکون گزرتی ہے۔ تاہم بعض اوقات اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن میں اس معاہدہ کا منسک فریقین کا نباہ ممکن نہیں رہتا، تو ایسی صورت میں شریعت نے ان میں تفریق کا قانون بھی نافذ کر دیا ہے۔ تاکہ وہ ساری عمر کھٹن زندگی گزارنے کی بجائے اپنے لیے کوئی دوسرا بہتر ذریعہ تلاش کر سکیں۔

اس مسئلہ میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاشروں میں طرح طرح کی قباحتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بائبل کے باب استثنائیں موجود ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی پر کسی وجہ سے ناراض ہو جائے تو فوراً طلاق نامہ عورت کے ہاتھ میں دے کر گھر سے نکال دے، اس سلسلہ میں صفائی وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اُدھر مطلقہ کو حق حاصل ہے۔ کہ طلاق کے فوراً بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔ یہ تو یہودی مذہب ہے اب عیسائیوں کو کیجئے۔ ان میں طلاق کا تصور ہی نہیں ہے۔ جب ایک دفعہ نکاح ہو گیا۔ تو ساری عمر کے لیے میاں بیوی ایک دوسرے کے پابند ہو گئے۔ اب ان کو موت ہی علیحدہ کر سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب کسی جوڑے کا میلان طبع ایک سانہ ہوا اور ان میں ناچاقی پیدا ہوئی تو ساری عمر عذاب میں بسر کرنا پڑی۔ البتہ عیسائیوں کا دوسرا فرقہ جو صدیوں کی پیدوار ہے اُس نے عدالت کے ذریعے طلاق کو قانونی شکل دے دی ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ عدالت مجاز فریقین کو طلب کرے گی۔ اور اس بات کی تحقیق کرے گی، کہ

دوسرے مذہب سے تقابل

فریقین میں سے کسی نے دوسرے پر ظلم کیا ہے۔ یا کسی ایک نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اگر کوئی ایسا جرم ثابت ہو جائے۔ تو عدالت اُن کے درمیان تفریق ڈال دے گی۔ اور اس طرح طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح ہندومت میں بھی طلاق کا کوئی تصور نہیں مرتے دم تک میاں بیوی میں علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ رومیوں اور کونانیوں میں بھی طلاق نامی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ان مذاہب میں معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔

اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح اس لیے نہیں کیا جاتا کہ زوجین میں تفریق ڈال دی جائے۔ اس معاہدہ (AGREEMENT) کو نبھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود اگر میاں بیوی کے لیے اکٹھے زندگی گزارنا ممکن نہ ہو، تو پھر اسلام نے طلاق کے ذریعے ان کی علیحدگی کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ اگرچہ طلاق پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ یعنی مباح اشیا میں سے سب سے ناپسندیدہ چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ تاہم ضرورت کے تحت اس کی اجازت ہے۔ طلاق کی صورت میں اسلام نے ایک اور ضروری قانون عدت کا دیا ہے۔ جو دوسرے مذاہب میں نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت ایک خاص مدت تک دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کا مقصد تحفظِ نسب ہے تاکہ پیدا ہونے والی اولاد کا نسب مشکوک نہ ہو جائے۔ طلاق کے بعد اگر عورت فوراً دوسرا نکاح کر لے۔ تو بچے کے نسب پر شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ پہلے خاوند کا ہے یا دوسرے کا۔ اور اس طرح کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے اسلام نے عورت کے دو نکاحوں کے درمیان مختلف صورتوں میں مختلف مدتیں مقرر کر دی ہیں۔ تاکہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ آئندہ پیدا ہونے والا بچہ کس باپ کا ہے۔ نیز پہلے نکاح کے احترام کا تقاضا بھی ہے۔ کہ دوسرا نکاح سے پہلے کچھ وقفہ ہونا چاہیے۔

عدت اُس کم از کم مدت کا نام ہے۔ جو طلاق کی تاریخ یا شوہر کی فوتیگی کی تاریخ سے بیکر نکاح ثانی تک کے لیے عرصہ میں عورت دوسرا نکاح نہیں

کر سکتی۔ عدت مختلف صورتوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً فرتیدگی کی صورت میں عدت تاربخ و فوات سے چار ماہ دس دن ہے۔ اتنے عرصہ میں پتہ چل جاتا ہے۔ کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے۔ اگر حاملہ نہیں ہے۔ تو چار ماہ دس دن کی عدت گزار کر عورت نکاح کر سکتی ہے۔ اور اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ جس دن بچہ جننے لگی اُس کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔ بیوگی سے لے کر وضع حمل تک کی مدت کا کوئی تعین نہیں ہے۔ یہ عرصہ خواہ ایک دن کا ہو یا پورے نو ماہ کا۔ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔ لہذا بچہ جب بھی پیدا ہو عورت نکاح کر سکتی ہے۔ حجۃ الوداع کے سفر میں ایک صحابی اونٹنی سے گر کر فوت ہو گئے۔ اُن کی بیوی حاملہ تھی۔ ٹھیک بائیس دن بعد اُس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ یہ جب چلے نکاح ثانی کر سکتی ہے۔

اگر عورت عاقل، بالغ اور آزاد ہے، اور اُسے حیض آتے ہیں۔ کسی وجہ سے طلاق ہو گئی ہے۔ تو اس کی عدت تین حیض ہوگی۔ یہ تین حیض خواہ دو ماہ میں آجائیں یا ۱۹ ماہ میں، اُسے بہر حال تین حیض تک انتظار کرنا ہوگا۔ عام طور پر حیض ماہ بمابہ آتے ہیں۔ اس لیے ایسی عورت کے حیض کم و بیش تین ماہ میں پورے ہو جاتے ہیں۔ جس کے بعد اُسے نکاح کی اجازت ہوتی ہے۔

پاکستان میں نافذ عالمی قوانین میں ایسی عورت کی عدت نوے دن مقرر کی گئی ہے۔ جو کہ درست نہیں ہے۔ حیض والی عورت کو تین حیض کی عدت پوری کرنا ہوگی۔ خواہ اس میں کتنا عرصہ لگے۔ البتہ ایسی عورت جو ابھی بالغ نہیں ہوئی یا جو کمسنی میں بیچ چکی ہے اور اُس کے حیض بند ہو چکے ہیں۔ ایسی عورتوں کی عدت تین ماہ یا ۹۰ دن درست ہے۔ اس کی تفصیلات سورۃ احزاب میں موجود ہیں۔ ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ نکاح ہو گیا۔ مگر میاں بیوی کی خلوت صحیحہ نہیں ہوئی انہیں مباشرت کا موقع نہیں ملا۔ ایسی صورت میں اگر طلاق واقع ہو جائے، تو فرمایا **فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا** ایسی عورتوں کے لیے کوئی عدت

نہیں۔ وہ جب چاہیں دوسرا نکاح کر سکتی ہیں۔ اس معاملہ میں بھی عائلی قوانین درست نہیں کیونکہ وہاں سب کے لیے نوے دن کی عدت مقرر ہے حالانکہ یہاں کوئی عدت نہیں ہے ایسا ہی عدت کا ایک مسئلہ ہمارے نوٹس میں آیا تھا۔ کوہٹہ کے رہنے والے ایک شخص نے بتایا کہ کسی عورت کو طلاق ہو گئی۔ اُس کو حیض دیر سے آتا ہے۔ اور نوے دن میں اس کے تین حیض مکمل نہیں ہوئے مگر یونین کونسل والوں نے نوے دن کے بعد اس کا نکاح کر دیا۔ حالانکہ یہ نکاح ہر اہی نہیں ہے۔ کیونکہ عدت کے دوران نکاح ہونا نہیں سکتا۔ تو اس قسم کی خرابیاں ہیں جو عائلی قوانین میں خامی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس قسم کے نکاح قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ اور اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو ایسا حکم دیتے ہیں۔

الغرض فرمایا وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَكْنَ بَأْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۖ
مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ قُرُوءِ جمع ہے اور اس لفظ کے معانی میں فہم کے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل لغت بھی اس کے مختلف معانی بتاتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ دو معانی میں مشترک ہے یعنی اس کا معنی حیض بھی آتا ہے اور طہر بھی۔ طہر اُس وقفہ یا مدت کو کہتے ہیں جو دو حیضوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اہم ابوحنیفہؒ قرآن کا معنی حیض بتاتے ہیں۔ اسی لیے ان کے نزدیک بالغ مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے۔ وہ ابو داؤد و شریف کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ ایک عورت نے حضور علیہ السلام سے استحاضہ کے متعلق مسئلہ پوچھا، تو آپ نے فرمایا تَدَعِ الصَّلَاةَ اَيَّامًا اَقْرَبَ اَيَّامِ حَيْضِ کے دنوں میں نماز نہ پڑھے البتہ جب حیض کے عام ایام گزر جائیں تو پھر غسل کر کے نماز ادا کرے کیونکہ اس پر یہ حیض نہیں رہا، بلکہ استحاضہ کا خون شمار ہوگا۔ مقصد یہ کہ اس حدیث سے قرآن کا معنی حیض نکلتا ہے۔ البتہ اہم شافعی قُرُوءِ سے مراد طہر لیتے ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت تین طہر گزرنے تک دوسرا نکاح نہ کرے۔
اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں عورتوں کو متنبہ فرمایا ہے وَلَا يَحِلُّ لِهِنَّ

اَنْ يَكْتُسْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ كَاَنْ يَلِدْنَ حَلَالٌ نِّسْبٌ ہے۔ کہ وہ چھپائیں
اُس چیز کو جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے۔ مقصد یہ کہ طلاق یا بیوگی کے وقت
اگر عورت حمل سے ہے تو اسے وضع حمل تک انتظار کرنا چاہیے۔ محض نکل ثانی کے
لیے حمل کو چھپا یا ہرگز جائز نہیں۔ ایسا کرنے سے نسل میں گڑبڑ ہوگی۔ فرمایا ایسا ہرگز نہ
کریں اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ اِذْ رَدَّ اللّٰهُ تَعَالٰی اور قیامت کے
دن پر ایمان رکھتی ہیں۔ تو انہیں کتمان حمل کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ شریعت کے
مطابق صاف صاف بتلادینا چاہیے۔ اور پھر وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ جو جائز ہو۔
آگے رجوع عن الطلاق کا مسئلہ بیان فرمایا۔ کہ اگر طلاق سنت طریقہ کے مطابق
دی گئی ہو۔ تو یہی یا دوسری طلاق کے بعد خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ رجوع کر لے۔

طلاق رجعی

وَبَعُوْا لَنَّهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا ۚ اِذَا كُنَّ يَتَذَكَّرْنَ اَنْ يَّوْضَعُوْا ۚ وَرَدَّ اللّٰهُ تَعَالٰی
کی ہے تو مطلقہ عورتوں کے خاوندوں کو زیادہ حق حاصل ہے۔ کہ وہ ان عورتوں کو واپس
لوٹائیں اسے طلاق رجعی کہتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق صریح الفاظ
میں دے دی ہے۔ اور عدت شروع ہو گئی ہے۔ تو اس خاوند کو حق حاصل ہے۔ کہ
عدت پوری ہونے سے پہلے بغیر دوبارہ نکاح کیے عورت کی طرف رجوع کر لے
اس امر کا اظہار زبانی طور پر کرے یا لے ہی مباشرت کر لے تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔
کہ اس نے رجوع کر لیا۔ اسی طرح دوسری طلاق مینے کے بعد بھی بغیر نکاح کے رجوع
ہو سکتا ہے بشرطیکہ عدت کے اندر ہو۔ اور اگر عدت گزر گئی، تو عورت آزاد ہو جائیگی۔
اب بغیر نکاح کے رجوع نہیں کر سکتا۔ یہ رجعی طلاق کا مسئلہ ہے جو محض ڈالنے
دہمکانے کے لیے دی جائے۔

اگر طلاق بائن ہو، خواہ ایک ہو یا دو ہوں تو ایسی صورت میں بغیر نکاح کے رجوع
ممکن نہیں۔ رجوع کے لیے بہر صورت دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔ طلاق بائن کا مطلب
یہ ہے۔ کہ نیت جدا کرنے کی ہو۔ الفاظ صریح نہ ہوں محض اشارے کنائے سے
کہہ دیا جائے۔ کہ تو مجھ پر حرام ہے یا اپنے والدین کے ہاں چل جا وغیرہ وغیرہ۔

اور اگر تینوں طلاقیں مے دی ہیں تو پھر کسی صورت رجوع نہیں ہو سکتا۔ عورت عدت پوری کرنے کے بعد نکاح ثانی کرنے کی مجاز ہوگی، تو فرمایا کہ جب طلاق میں غاڑوں کا زیادہ حق ہے۔ کہ وہ رجوع کر لیں بشرطیکہ اُن کا ارادہ اصلاح کا ہو، محض تنگ کرنا مقصود نہ ہو۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوا تھا۔ کہ عورت کو تنگ کر نیکی غرض سے کبھی طلاق مے دی کبھی رجوع کر لیا۔ تاکہ وہ دوسری جگہ بھی نہ جاسکے یہ بات جائز نہیں ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے حقوق کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ مگر دستور کے مطابق عورتوں کا مردوں پر اُسی طرح حق ہے جس طرح مردوں کا عورتوں پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زوجین کے اپنے اپنے دائرہ عمل میں کچھ حقوق ہیں۔ لہذا اُن کی پاسداری ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مرد تو اپنے حقوق زبردستی عورت سے وصول کرے۔ مگر عورت کو اُس کا حق نہ دے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے عورت کا وراثت میں حق رکھا ہے۔ لہذا مرد پر لازم ہے کہ اُسے یہ حق ادا کیا جائے۔ زمانہ جاہلیت میں عورت کو وراثت میں حصہ دار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ بیماری عام معاشرتی حقوق سے بھی محروم تھی۔ جو کہ سرسبز زیادتی ہے۔ رومی اور یونانی بھی عورت کو ذلیل سمجھتے تھے اور اس کا حق تسلیم نہیں کرتے تھے۔ عیسائی بھی اسی قسم کے آثار کا شکار ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لے مردو! جس طرح تمہارے کچھ حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ انہیں ان سے محروم نہ کر دیر تو اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ کہ اُس نے کس فرد کو کس مقام پر رکھا ہے۔ خَلَقَ مِنْهُمْ سَرَوٰجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَشِدَاؤَ وَنِسَاءً یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک فرد سے سب کو پیدا کیا۔ پھر اُسی میں سے اس کا جڑ پایا کیا اور پھر بشمار مرد و زن بکھیر دیے۔ یہ اُس کی حکمت ہے کہ کسی کو مرد بنادیا اور کسی کو عورت بنادیا۔ اب تمہارا فرض یہ ہے۔ کہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھو۔ دوسرے کو حقیر نہ سمجھو۔ اور دستور کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے۔ کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں حقوق و فرائض کو بجالاؤ اور کسی دوسرے

کاح حق غصب نہ کرو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ تم پر یہ حق ہے۔ کہ بیوی کے لیے بھی دیسی ہی خوراک کا بندوبست کرو۔ جیسا کہ اپنے لیے کرتے ہو۔ جس معیار کا لباس پسند کرتے ہو، عورت کو بھی فسیا کرو۔ اُس کو بھی معقول ٹھکانہ بنا کر دو۔ اس کا حق حیراؤ کرو اور اُسے آزادی دو کہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے اس رقم کو خرچ کر سکے۔ یہ اُس کے حقوق ہیں۔ اُسے بلاوجہ مارنا پینا بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کسی جائز ضرورت کی بنا پر تنبیہ مقصود ہو۔ تو اتنی خفیف ضربات لگاؤ کہ ٹہی پسلی نہ ٹوٹے۔ اس کی اجازت ہے قاضی جوہنؒ: "نا جائز مار پیٹ درست نہیں۔ اُس سے قطع تعلقی بھی نہیں کرنی چاہیئے عورت پر بھی حق ہے۔ کہ وہ خاوند کی مرضی کے بغیر گھر سے باہر نہ جائے۔ سینما وغیرہ کے لیے جانا تو لیے ہی حرام ہے۔ جائز امور کے لیے بھی اجازت لینا چاہیئے۔ اس کی تفصیلات آگے سورۃ نسا میں آئیں گی۔

مرد کی فضیلت فرمایا ان حقوق کے باوجود وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے۔ اسی موضوع کو سورۃ نسا میں یوں بیان کیا ہے "الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ" مرد عورتوں پر نگران ہیں یا ان کے محافظ ہیں ان سے برتر ہیں اور یہ ایک فطرتی امر ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اور پھر مردوں کی برتری کی دلیل بھی بیان فرمائی۔ "وَبِمَا آفَقْتُمْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ" کہ مرد اپنی مالی عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ ان کے کفیل ہیں۔ اللہ نے انہیں برتری دی ہے۔ اور مشقت کے کام مرد کے سپرد کیے ہیں۔ کمانا اس کے ذمہ ہے۔ عورت کا کام گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنا ہیں۔ انہیں کم مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لہذا مرد کو برتری حاصل ہے اس کی مثال موجودہ دور میں بھی ملتی ہے کہ دنیا کی ڈیڑھ سو سے زیادہ اقوام میں سے صرف امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کو ریٹو پارڈر حاصل ہے ان میں سے کوئی ایک ملک باقی پوری دنیا کے متفقہ فیصلے کو رد کر سکتا ہے۔ کہ اس کو یہ طاقت حاصل ہے۔ اسی طرح گھر کی چار دیواری میں مرد کو ریٹو پارڈر حاصل ہے۔ یہ پارڈر عورت کو یا بچوں کو حاصل نہیں ایک باپ اپنے سارے بیٹوں کے متفقہ مطالبہ

کو رد کر سکتا ہے۔

اسی طرح طلاق کا حق بھی اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ عورت اس سے محروم ہے اس میں بھی مصلحت ہے "عُقْدَةُ النِّكَاحِ" نکاح کی گروہ چونکہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اس گروہ کو کھولنے کا اختیار بھی مرد کو حاصل ہے۔ مگر قدرت کے اس قانون کے خلاف جب برطانیہ میں عورت کو طلاق کا حق مل گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہاں پچاس فیصد سے زیادہ طلاقیں ہونے لگیں ہیں۔ ہر عورت معوی کر سکتی ہے کہ اُسے طلاق ملنی چاہیے؟ محض اس لیے کہ اس کا خاوند سوتے میں خڑٹے لینا ہے۔ اور اس کی نیند خراب ہوتی ہے۔ دوسری کسٹی ہے کہ میرا خاوند میرے بونٹو یا میرے گتے سے محبت نہیں کرتا۔ میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایسی ایسی معمولی باتوں پر طلاق روزمرہ کا کھیل بن کر رہ گیا ہے۔ حسب یہ ہے۔ کہ انٹرنل نے اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف اپنا قانون جاری کیا ہے۔ یہ اس مساوات کا نتیجہ ہے۔ جو عورت کو مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کہتا ہے۔ کہ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ اب اس مساوات کی بنا پر دفاتروں میں، فوج میں ہر جگہ عورتیں ملازمت کر رہی ہیں، حالانکہ فوجی خدمات عورت کے فرائض سے بالکل باہر ہیں۔ اسی غلط طے کی وجہ سے طرح طرح کی معاشرتی برائیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اکثر ادا سے بدکاری کے اوٹے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی صحیح نسل قائم نہیں رہ سکی۔ گزشتہ صدی میں ایک انگریز مصنف ڈاکٹر لکھتا ہے کہ یورپ کی پینتالیس کڑوں کی آبادی میں سے پینتالیس آدمی بھی ایسے نہیں نکالے جاسکتے جن کو یقین کے ساتھ نطفہ حلال تسلیم کیا جائے یہ اس کی اپنے قانون کے متعلق ٹٹے ہے۔ کہ اتنا گندہ قانون وضع کیا گیا ہے جب شاپنگ کے لیے عورتوں کو آزادی ہوگی اور غیر مردوں کے ساتھ میل جول کریں گی۔ انڈسٹری بن کر ساری دنیا کا سفر بغیر محرم کے کرے گی، دفاتروں میں مردوں کے ماتحت کام کریں گی، تو پھر اچھے نتائج کی توقع۔۔۔ کیسے کی جاسکتی ہے جہاں ایک فوجی خدمات کا متعلق ہے صرف غیر معمولی (AB NORMAL) حالات میں

عورت کو حصہ لینے کی اجازت ہے، وگرنہ عام حالات (NORMAL) میں عورت کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، کیونکہ مرد کا دائرہ کار اور ہے عورت کا اور ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے عورت پر جمعہ فرض نہیں کیا۔ اس کی نماز گھر میں بہتر ہے۔ تاہم وہ خاوند کی اجازت سے نماز کے لیے مسجد میں جا سکتی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کی فضیلت ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ نسا میں آئیگی۔ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ۔ اللہ تعالیٰ کمالِ قوت کا مالک اور حکیم ہے۔ اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ لہذا اس کے احکام پر عمل درآمد کرنا چاہیے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ -

درس نوروشش (۹۰)

آیت ۲۲۹

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ نَسِيحٌ بِاِحْسَانٍ ۚ
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِنْهَا اَنْتُمْ مُّوْهِنٌ شَيْئًا اِلَّا
اَنْ يَخَافَا اِلَّا يَفِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يَفِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۚ تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ فَلَا تَتَدَوَّهَنَّ وُهَآءُ ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: : طلاق تہی دومرتبہ ہے۔ پھر اس کے بعد یا تہ روک رکھنا ہے اس کو دستور
کے مطابق یا استوا زائد کر دینے کی کے ساتھ۔ اور تمہارے لیے حلال نہیں ہے
کہ تم ان عورتوں سے اس چیز میں سے کچھ لے لو جو تم نے ان کو دی ہے۔ سوائے
اس صورت کے کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اس بات سے خوف کھاتے ہوں کہ وہ
اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمہیں خطرہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی
حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ تو ان دونوں پر کوئی فائدہ نہیں اس چیز میں کہ وہ عورت
اپنی جان چھڑائی کا ذریعہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ پس ان سے آگے نہ
بڑھو۔ اور جو شخص بھی اللہ کی حدود سے آگے بڑھ گیا۔ پس وہی لوگ ظالم ہیں ﴿۲۲۹﴾

گزشتہ آیت کریمہ میں عدت کا منکر بیان ہوا تھا جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ
طلاق اور دوسرے نکاح کے درمیان عورت وقفہ کرے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ امید
سے ہے یا نہیں۔ پھر اگر امید سے ہے تو وضع حمل تک نکاح ثانی نہ کرے
اور امید سے نہیں تو تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھے۔ کم سن اور عمر عورتوں
کی عدت تین ماہ مقرر کی گئی ہے۔ اور بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن عدت ہے

یہ بھی گزشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے وہ اُن کے نگران اور کفیل ہیں۔ باقی حقوق میں مساوات ہے۔ کچھ حقوق مرد کے ہیں اور کچھ عورت کے، اپنے اپنے دائرہ کار میں زوجین حقوق و فرائض کے ذمہ دار ہیں۔ آج کے درس میں طلاق کی تعداد اور ان سے متعلق احکام کا ذکر ہے۔ کل بیان

نکاح سنت
انبیاء ہے

کیا تھا کہ نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی فریقین کے لیے ضروری ہے۔ تاہم عام معاہدات اور نکاح کے معاہدہ میں قدمے فرق ہے کسی دو پارٹیوں کے درمیان بین دین کے سلسلہ میں، کاروبار میں، یا شراکت کے متعلق معاہدہ ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ محض معاملہ کی حد تک ہوتا ہے۔ مگر نکاح کے معاہدہ میں معاملہ کے علاوہ عبادت اور سنت کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ آپ اکثر نکاح کے موقع پر خطبہ سنتے ہیں اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ یعنی نکاح کرنا میری سنت ہے، جو اس سے اعراض کئے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ اَوْ بَنِيَّ

نکاح سائے نبیوں کی سنت ہے قرآن پاک میں بھی انبیاء علیہم السلام کی حیثیت کے متعلق آتا ہے کہ سب نبیوں کی بیویاں تمہیں اور بچے تمہے۔ اُن میں سے ایسا کوئی نہیں جو کھانا پیتا نہ ہو۔ اور معاملہ نہ کرنا ہو۔ اس کو نکاح وغیرہ سے واسطہ نہ پڑتا ہو۔ البتہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جو ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے اُن کو نکاح کا موقعہ نہیں مل سکا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا۔ البتہ جب وہ قرب قیامت میں دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو پھر نکاح بھی کریں گے اور ان کی اولاد بھی ہوگی، اس کے بعد ان کی طبعی وفات بھی ہوگی اور وہ دفن بھی ہونگے بہر حال نکاح تمام انبیاء کی سنت ہے۔

نکاح اگرچہ ایک اجتماعی معاہدہ ہے مگر اس کی بھی کچھ حدود اور قیود ہیں۔ شریعت مطہرہ نے کوئی سے مرد و زن کے درمیان نکاح کو جائز قرار نہیں دیا۔ بلکہ

خبر انکاح

بعض صورتوں کو حرام قرار دیدیا ہے۔ آگے سورۃ نسا میں آئے گا، اَحْصَتْ عَلَیْكُمْ اَمْهَاتُكُمْ تمہارے لیے تمہاری مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بھتیجیاں، بھانجیاں اور غرض دامن وغیرہ حرام کر دی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا ماسی طرح ایک منکوحہ عورت کا نکاح دوسری جگہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ پہلے نکاح کی طلاق نہ ہو۔ اس کے علاوہ رضاعی نسل سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ سب محرمات ہیں۔ فسر مایہ ”وَاحِلَ لَكُمْ مَا وَاَدَّ ذٰلِكُمْ اَنْ كُمْ اَنْ کے علاوہ باقی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔

نکاح کے لیے گواہان بھی لازمی ہیں۔ کسی دیگر معاملہ میں گواہ کے بغیر بھی معاہدہ ہو سکتا ہے۔ مگر نکاح کا معاہدہ ایک ایسا معاہدہ ہے کہ گواہوں کے بغیر پائے تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ پھر نکاح کے لیے حق مقرر ہونا بھی اس کی شرائط میں سے ہے۔ مہر دینا پڑے گا مال خرچ کرنا ہو گا۔ اس کے بغیر نکاح درست نہیں۔

نکاح کے معاہدہ میں بعض حقوق کا تعین بھی ہے عورت اپنے حقوق طلب کر سکتی ہے، کھانا، کپڑا، رہائش عورت کے حقوق ہیں۔ جو مرد کے ذمے ہیں۔ البتہ عورت کو چاہیے کہ وہ خاوند کی حیثیت کے مطابق ان چیزوں کا مطالبہ کرے۔ اسکی حیثیت سے زیادہ طلب کر کے اُسے مشکل میں نہ ڈالے۔ پھر یہ بھی نکاح کی شرط ہے کہ اگر کسی وجہ سے میاں بیوی کا گزارہ نہ ہو سکے، تو خاص شرائط کے تحت اس معاہدہ کو ختم بھی کیا جاسکتا ہے۔ طلاق اور خلع کا قانون بھی شریعت میں موجود ہے زوجین کے درمیان تنازعہ کی صورت میں پہلے خود اسے حل کرنے کی کوشش کرو اگر ایسا نہیں ہو سکا۔ تو مرد و عورت کے خاوندوں میں سے ایک ایک نمائندہ لے لو، جو حل کر صلح و صفائی کی کوشش کریں۔ اگر پھر بھی مصالحت نہ ہو سکے۔ تو پھر معرفت طریقے سے میاں بیوی میں جدائی کرادو کہ اب اس کے بغیر کوئی اور چارہ کار نہیں رہا۔ لہذا دونوں کی بھلائی اس میں ہے کہ ان میں تفریق ڈال دی جائے۔ یہ سب نکاح کے اصول و قواعد ہیں۔

نکاح کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اور اگر آٹھ سے زیادہ سے طلاق دی ہے۔ اور نیت قطعی
 غلطی کی ہے تو یہ طلاق بائن ہو جائے گی۔ اس میں رجوع کے لیے دوبارہ نکاح کرنا
 ہوگا۔ خواہ ایک طلاق کے بعد رجوع مقصود ہے یا دوسری طلاق کے بعد۔ تیسری
 طلاق کا ذکر تو آگے آئے گا۔ یہاں فرمایا کہ رجوع کے لیے زیادہ سے زیادہ درملاقاتیں ہیں۔

غلطی کی
 طریق کار

فرمایا دوسری طلاق کے بعد **فَإِمَّا لَوْ كَانَ بَيْنَهُمَا مِصْرٌ** یا تو دستور کے
 مطابق روک لو۔ اور اس سے اچھا سلوک کرو۔ اس کا خیر چہ
 ادا کرو۔ بشرطیکہ ارادہ اصلاح کا ہو، تنگ کرنے کا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نہ تو عورت
 کا حق ادا کیا جاوے اور نہ اس کو آزاد کیا جائے۔ بلکہ دستور کے مطابق اس سے
 اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ شریعت مطہرہ نے عورت کے جو حقوق مقرر کیے ہیں،
 انہیں ادا کرو۔ اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر **أَوْ نَفْسٌ** یا **حَسَنٌ** سے بچی کے ساتھ
 جہاد کرو۔ لڑائی جھگڑے میں نہ پڑو بلکہ لین دین کا جو معاملہ ہے اسے احسن طریقے سے
 پنٹا کر مطلقہ کو رخصت کر دو۔ ہاں یاد رکھو **وَلَا يَحِلُّ لَكَمُورٌ** اور تمہارے لیے یہ
 چیز حلال نہیں ہے **أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَتْكُمْ هُنَّ شَيْئًا كَتَمْنَ أَنْ**
 عورتوں سے کوئی چیز واپس لے لو، جو تم نے انہیں دے رکھی ہے۔ مثلاً اگر مراد
 کر دیا تھا، تو طلاق کے وقت واپس لینے کی کوشش کی ہے یا کوئی تحفہ دیا تھا، تو
 اس کا مطالبہ کر دیا۔ یہ درست نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عظیم دے کر
 اس کو واپس لینا ایسا ہے۔ جیسے گناہ کرنے کے خود ہی چاٹ لیتا ہے۔ فرمایا
 ہمارے مسلمانوں کی مثال بڑی نہیں ہونی چاہیے۔ **لَيْسَ لَنَا مِثْلُ التَّوْبَةِ سِوَةَ نِسَاءٍ**
 میں آتا ہے کہ **وَأَتَيْتُمْ أَحَدَ الْهَنْ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا**
 اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر مال بھی دے رکھا ہے تو ان سے کوئی چیز واپس نہ لو۔ خاص طور
 پر کوئی ہتھان لگا کر مال واپس لینا اور بھی بُرا ہے۔ یہ چیز مسلمان کے شایان نہیں ہے۔
 لہذا اگر تم نے طلاق کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ تو پھر دستور کے مطابق اچھے طریقے سے
 رخصت کر دو۔

یہ بات گذشتہ درس میں بیان ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے۔ عورت کو نہیں دیا۔ اور اس میں بھی اس کی مصلحت کا فرما ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ حیض و نفاس یا حمل کے دوران عورت کے اعصاب پر خاص اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ جلد باز واقع ہوئی ہے۔ اگر طلاق کا حق عورت کو مل جاتا تو طلاق کے معاملات کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ جن ممالک میں عورت کو یہ حق دیا گیا ہے۔ وہاں کس قدر معاشرتی برائیاں پیدا ہوئی ہیں۔ تو بہر حال طلاق کا حق اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ اور اُسے عورت پر ایک درجہ فضیلت دی ہے۔ البتہ بعض غیر معمولی حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ اگر خاوند ظلم کرتا ہے۔ اور طلاق بھی نہیں دیتا۔ تو عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ عدالت مجاز کی طرف رجوع کر کے اپنا معاملہ پیش کرے۔ عدالت فریقین کے دلائل سننے کے بعد اگر مناسب سمجھے تو میاں بیوی میں علیحدگی کر سکتی ہے اس صورت میں طلاق کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ اگر فریقین رضامند ہو جائیں۔ کہ خاوند اتنے مال کے عوض خلع پر راضی ہوگا۔ تو عورت اتنا مال مرد کو ادا کر کے خلع حاصل کر لیتی۔ اسی چیز کے متعلق فرمایا کہ عام حالات میں تو مرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ ادا شدہ مال عورت سے واپس لے۔ إِلَّا أَنْ يَخَافَ أَنْ لَا يَفْقِيَهَا حُدُودَ اللَّهِ سوائے اس صورت کے کہ ان دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی ان کا بناء مشکل ہو گیا ہے۔ اور علیحدگی ضروری ہے۔ تو جب دونوں فریق خلع کے بدلے کسی مال کی ادائیگی پر رضامند ہو جائیں، تو ایسا مال خاوند لے سکتا ہے۔

اس قسم کا واقعہ خود حضور علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا۔ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی بنی جلیلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ثابت بن قیسؓ کے نکاح میں تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ کہ باپ دشمن اسلام ہے۔ اور اس کا بیٹا اور بیٹا جان شائد ان اسلام میں۔ حضرت ثابتؓ بڑے نیک آدمی تھے۔ مگر شکل و صورت کے لحاظ سے جلیلہ کو قابل قبول نہ تھے۔ انہیں احساس کمتری اس طرح پیدا ہوا کہ کسی

موقع پر حضرت جلیلۃ نے کسی مقام پر پردہ اٹھایا تو وہاں ایک جماعت موجود تھی جن میں حضرت ثابتؓ بھی موجود تھے۔ حضرت جلیلۃ نے محسوس کیا کہ اُن کا خاوند رنگ روپ اور شکل و صورت کے لحاظ سے سب سے کم تر ہے۔ چنانچہ اس نے اس بات کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کہ حضور ہم دونوں بطور میاں بیوی نہیں رہ سکتے۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا ثابتؓ میں کوئی اخلاقی کمزوری واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے تو متغیر ہو گئی ہے۔ تو اُس نے عرض کیا حضور! ایسی بات نہیں۔ وہ بڑا با اخلاق ہے۔ وَلَیْسَ بَیِّنَیْ اَکْثَرُہُ الْکُفْرِ فِی الْاِسْلَامِ مِکْثَرِہِ الْاِسْلَامِ میں رہ کر کفر کو پسند نہیں کرتی۔ مقصد یہ کہ وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں اس سے کلر خلاصی چاہتی ہوں۔ کیوں کہ اگر میں بادلِ سخنوار سے اس کے ساتھ رہوں گی تو اس کی فرمانبرداری میں فرق آئے گا۔ اور یہ جیسے اسلام کی تعلیمات کے منافی ہوگی۔ لہذا آپ ہماری علیحدگی کی کوئی صورت پیدا فرما دیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ثابتؓ نے آپ کو حق مہر میں یا تنہا کے طور پر جو باغ دیا تھا کیا تم وہ باغ واپس کرنے کے لیے تیار ہو۔ حضرت جلیلۃ نے کہا کہ ہاں میں ایسا کرنے پر رضامند ہوں۔ اس کے علاوہ اگر ثابتؓ کا اور بھی مطالبہ ہو تو میں پورا کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ باغ کی واپسی کی شرط پر حضور علیہ السلام نے خلع کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اُن دونوں کی علیحدگی کرادی۔

بہر حال خلع میں طلاق کے الفاظ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ طلاق بائن کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اور طلاق کی طرح اس میں بھی عدت کو عدت گزارنا ہوتی ہے۔ البتہ عدت کی مدت کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے بعض فقہائے کرام کا خیال ہے کہ خلع میں عدت ایک حیض ہے۔ تاہم جو فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ طلاق کی مانند خلع کی عدت بھی تین حیض یا تین ماہ ہے جیسی صورت بھی ہو۔

خلع کے علاوہ علیحدگی کی ایک اور صورت بھی ہے جسے طلاق بالمال کہتے ہیں۔ خاوند مال کا مطالبہ کرے کہ اتنا مال مجھے دو تو میں طلاق دیتا ہوں۔ اگر فریقین

رضامند ہو جائیں۔ تو مقرر مال کے عوض خاوند باقاعدہ طلاق دے دیگا۔ اور وہ طلاق کے حکم میں آئے گی۔ خلع نہیں ہوگا۔

آیت کے اگلے حصے میں رَبَّیْ سَخْنُ مُسْلِمَانٍ کی عام جماعت کی طرف ہے نہ فریاد فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُعْطِيَا حُدُودَ اللَّهِ اے لوگو! اگر تم کو ڈر ہے۔ کہ یہ میاں بیوی اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی ان میں اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ اب ان کا میاں بیوی کی حیثیت سے گزراوقات ممکن نہیں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تو ان درزوں پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ اپنی جان چھڑائی کا فدیہ دے۔ یعنی عورت فدیہ دے کہ مرد سے خلع حاصل کرے۔ ہاں یہ بات یاد ہے۔ کہ اگر خاوند بے قصور ہے۔ اور عورت اُس سے بلا وجہ طلاق پا رہی ہے۔ تو وہ گنہگار ہوگی اور اگر خاوند بلا وجہ عورت کو تنگ کر رہا ہے تو وہ گنہگار ہوگا۔ تاہم دونوں صورتوں میں خلع واقع ہو جائے گا۔

امام البرقیفر فرماتے ہیں۔ کہ اس قسم کا مالی لینا مکروہ ہے۔ بخیر بہ حال جائز ہے دوسرے فقہائے کرام کا کہنا ہے۔ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خاص حالات میں خلع کی اجازت دے دی ہے۔ اس لیے اس کے عوض مال وصول کرنا بالکل جائز ہے۔ اس میں کمی کڑھت نہیں

فرمایا ثَلَاثَ حُدُودَ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ یہ نکاح، طلاق، ایلا و خلع وغیرہ اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قوانین ہیں ان کی پاسداری کرو۔ اور ان کے خلاف کر کے اللہ کی حدود کو نہ توڑ بیٹھنا رمضان المبارک میں جہاں روزوں کی فرضیت کا ذکر تھا، وہاں فرمایا کہ روزہ رکھ کر کھانا پینا اور مباشرت حرام ہے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ فَلَا تَقْرَبُوهَا۔ اُن کے قریب بھی نہ جانا۔ اور یہاں فرمایا فَلَا تَعْتَدُوهَا ان کو عبور نہ کرنا۔ ظاہر ہے۔ کہ کھانا، پینا اور مباشرت کرنا انسان کی غایت درجہ کی خواہشات ہیں۔ اور انسان کسی وقت بھی ان کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لیے وہاں پر سخت حکم دیا۔ کہ ان حدود کے قریب بھی نہ جاؤ کہیں پھسل کر حدود اللہ کو مٹانے نہ کر بیٹھو۔ اور نکاح طلاق وغیرہ کے مسئلہ میں تنازعہ ہوتا ہے

حدود اللہ کا احترام

دو فریق طوٹ ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں پر حدود کی خلاف ورزی کا اتنا خطرہ نہیں
 ہوتا۔ جتنا روزہ کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں پر فرمایا کہ اللہ کی حد پارہ
 کر جانا۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اور یاد رکھو وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الظَّالِمُونَ، جو اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حد و رسے اُگے بڑھے گا۔ اسے
 ہی لوگ ظالم ہیں۔ ظاہر ہے۔ ظالم مستوجب سزا ہوتا ہے۔ اللہ کی گرفت میں آئے۔
 اس لیے فرمایا جو اللہ کی حد و رسے توڑے گا۔ وہ ظالموں میں شمار ہو کہ سزا کا مستحق ہو گا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقْرَةِ ۲

درس نوود و عنت (۹۷)

آیت ۲۳۰

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ
 فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ
 يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ
 يَعْلَمُونَ ③

ترجمہ: پھر اگر اُس نے طلاق دیدی عورت کو (یعنی تیسری مرتبہ) پس اس کے بعد اُس
 کے لیے حلال نہیں ہے یہاں تک وہ اس کے علاوہ کسی خاوند کے ساتھ نکاح نہ کرے۔
 پھر اگر اُس نے بھی طلاق دیدی اس عورت کو تو کوئی گناہ نہیں ہے اُن دونوں پر کہ رجوع
 کر لیں، اگر وہ گمان کریں کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں
 اللہ تعالیٰ اُس قوم کے لیے بیان کر رہا ہے جو علم رکھتے ہیں ③

حلالہ

گزشتہ درس میں طلاق کا مسئلہ بیان ہوا تھا اور اس کے بعد خلع کا بیان آیا۔ آج کی
 آیت کا تعلق بھی مسئلہ طلاق سے ہے۔ دہلی یہ بیان ہوا تھا کہ طلاق دو مرتبہ ہے جس
 کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ اس درس میں تیسری طلاق اور اس کے نتائج کا ذکر آ
 رہا ہے۔ فرمایا فَإِنْ طَلَّقَهَا یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تیسری مرتبہ طلاق دے
 دے۔ تو اب رجوع کا حق ختم ہو گیا۔ قَدْ تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ
 زَوْجًا غَيْرَهُ اب اُس مرد کے لیے عورت حلال نہیں ہے۔ جب تک
 کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔ اب یہ عورت پہلے خاوند کے لیے
 منعظ ہو گئی۔ اگرچہ یہاں پر عدت کا ذکر نہیں ہوا۔ تاہم یہ بات پہلے اچھی ہے کہ
 طلاق یا بیوگی کے بعد عورت کے لیے عدت کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اس کے
 بغیر نکاح نائی نہیں کر سکتی۔ یہاں پر بھی وہی صورت ہے۔ جب کوئی شخص تیسری
 طلاق دے دے، تو پھر وہ عورت عدت کے ایام پورے کرے گی۔ اور اس کے بعد

دوسری جگہ نکاح کرنے کی مجاز ہوگی۔ فَإِنْ طَلَّقَهَا اور اگر اب دوسرا خاوند بھی اس کو طلاق دے دے یا فوت ہو جائے۔ تو عورت کو پھر دوسری عدت گزارنا ہوگی۔ اس کے بغیر تیسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ جب یہ دوسری عدت بھی پوری ہو جائے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَّخِجَا تَرَپے خاوند اور عورت پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ پھر رجوع کر لیں بشرطیکہ اِنْ ظَنَّا اَنْ يُفِيْعَا حُدُودَ اللّٰهِ وہ گمان کریں کہ اللہ کی حدود کو قائم کریں گے مطلب یہ کہ اُن دونوں کو اس بات کا احساس ہو جائے۔ کہ انہوں نے علیحدگی اختیار کر کے سخت پریشانی اٹھائی ہے۔ لہذا آئندہ ایسی صورت نہیں پیدا ہونے دیں گے۔ تو وہ دوبارہ نکاح کر کے زوجین کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان آچکا ہے۔ اَنْطَلَقَ مَسْرُتْنِ طَلَاقِ دراصل دو ہی ہیں۔ جن میں رجوع کی گنجائش ہے۔ اور اس کی آخری حد تین ہے۔ جس کے بعد عدالتی لازمی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اہم ماہٹ تیسری طلاق کو پسند نہیں کرتے وہ کہتے ہیں۔ کہ تیسری طلاق دینی ہی نہیں چاہیے۔ تاہم طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے۔ کہ ایسے طہر میں ایک طلاق دی جائے جس میں مباشرت نہ کی ہو۔ جب تین حیض یا تین ماہ (جیسی بھی صورت ہو) گزر جائیں گے تو عورت آزاد ہو جائے گی۔ لہذا دوسری اور تیسری طلاق بیٹنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایک یا دو طلاق کی صورت میں عدت کے دوران بغیر دوبارہ نکاح کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اور اگر عدت گزر جائے۔ تو پھر بھی دوبارہ نکاح کر کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی دقت نہیں اور کوئی قباحت نہیں۔ اس طریقہ طلاق کے مطابق اگر ایک طلاق کے بعد رجوع کی کوئی صورت ممکن ہو تو دوسرے طہر میں دوسری طلاق دی جاسکتی ہے۔ اب بھی سوچنے سمجھنے کا موقع موجود ہے۔ انسان ٹھنڈے دل سے غور کر کے متنازعہ امور کا تصفیہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص تیسری طلاق ضرور ہی دینا چاہتا ہے۔ تو پھر تیسرے طہر میں تیسری طلاق دیجیے۔ بہر حال بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ تین طہر میں تین طلاق دے۔ حیض کی حالت میں طلاق بیٹنے سے اگرچہ

طلاق تو واقع ہو جاتی ہے۔ مگر انسان گناہ کا مرتکب ہو تا ہے۔ یہ طلاق بدعت کہلاتی ہے۔
بیک وقت تین طلاق دینا بھی بدعت ہے۔ آدمی گنہگار ہو تا ہے۔ سنت کے خلاف ہے

طلاق ثلاثہ
کی تحقیق

حیض کی حالت میں طلاق دینے، تین طلاقیں بیک وقت دینے یا ایک ہی طہر میں
تین طلاقیں دینے کے متعلق فقہائے کرام کے تین مختلف مسلک ہیں۔ شیعوہ حضرات کے
نزدیک حیض کی حالت میں تین طلاقیں اکٹھی دینے سے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی، اس قدر
ظاہر ہے جن میں اہل حدیث بھی شامل ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں ایک ہی
شمار ہوتی ہیں۔ انیس طلاق، عقلاً، نفعی وغیرہ شامل ہیں۔ اور غیر مسلک ائمہ اربعہ کہے جے آخر صحابہؓ
اور تقریباً تمام تابعینؓ اور جمہور ائمہ کی تائید حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین طلاق بیک وقت دینے
کا طریقہ تو بلاشبہ غلط ہے اور ایسا کرنے والا گنہگار بھی ہو تا ہے مگر تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔

جو حضرات تین طلاق کو ایک تصور کرتے ہیں وہ سلم شریف میں منقول حضرت
عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضور
علیہ السلام حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک تین طلاقیں ایک
ہی طلاق تصور ہوتی تھی۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا۔ جو شخص بیک وقت تین
طلاقیں دے گا، وہ تین ہی سمجھی جائیں گی۔ اس حدیث کے متعلق جمہور فقہاء اور ائمہ کرام
فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا
بیان ہے کہ فلاں فلاں زمانہ میں ایسا ہوا تھا، یہ خود حضور علیہ السلام کا فرمان نہیں ہے
اس استدلال میں کمزوری یہ ہے کہ اس حدیث کے برخلاف خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ
کا مذہب یہ ہے کہ تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں اور یہ اصول حدیث
کا کلیہ ہے۔ کہ جب کوئی رادی خود اپنی روایت کے خلاف فتویٰ دے یا عمل کرے تو وہ
روایت ناقابل عمل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال حضرت ابوبکرؓ والی حدیث ہے جس
میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کتابرتن میں منہ ڈال دے تو
برتن سات دفعہ دھونا چاہیے جس میں ایک مرتبہ مٹی مل کر دھونا بھی شامل ہو۔ اب حضرت
ابوبکرؓ کا اس فتویٰ برے کہ صرف تین دفعہ دھونے سے برتن پاک ہو جاتا ہے

چونکہ کہتے کہ دین کا لعاب جزائیم آلود ہوتا ہے۔ اس لیے ایک دفعہ مٹی بھی مل لی جائے تو بہتر ہے۔ در نہ تین دفعہ پانی کے ساتھ دھو لینا کافی ہے۔ لہذا سات مرتبہ دھونے والی حدیث ناقابل عمل ہو گئی۔ اتنی دفعہ دھونا ضروری نہ رہا۔ بلکہ اگر احتیاطاً کوئی سات دفعہ بھی دھو لے تو وہ استحباب کے درجہ میں آئیگا، لازم نہیں رہا۔ لہذا حضرت ابن عباسؓ کی تین طلاقوں کو ایک طلاق تصور کرنے والی روایت کے استدلال میں کمزوری واقع ہو گئی۔ اگرچہ حضرت ابن عباسؓ کے اکثر شاگرد مذکورہ روایت ہی بیان کرتے ہیں۔

جس میں تین طلاق کو ایک تصور کیا گیا ہے۔ مگر ابو داؤد شریف کی روایت کے مطابق آپ کے ایک شاگرد ایک دوسری روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں بیک وقت دے دی ہیں۔ آپ نے جربستہ فرمایا عَصَيْتَ رَبَّكَ وَبَايَنْتَ مِنْكَ اَمْرًا تَدْعِي تَرْتِیَ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور تیری عورت بھی تجھ سے جدا ہو گئی۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ خود حضرت ابن عباسؓ تین طلاق کو تین ہی تصور کرتے تھے۔ جبھی تو فرمایا۔ کہ اگرچہ تو گنہگار ہو سہے۔ مگر طلاق واقع ہو گئی۔ اور تیری بیوی تجھ سے علیحدہ ہو گئی۔

طحاوی شریف میں ایک اور روایت بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا اِنَّكَ عَصَيْتَ اللہ تیرے چچا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ وَأَطَاعَ الشَّيْطَانَ اور شیطان کی بات مانی۔ وَلَمْ يَحْصِلْ لَهُ مَخْرَجٌ مَّا مَكَرَابِ غُلَاصِي کی صورت بھی باقی نہیں رہی۔ عورت کو طلاق طلق ہو گئی۔

موطا امام مالکؓ میں محمود بن لبیدؓ سے روایت منقول ہے۔ آپ چھوٹی عمر کے صحابی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو تین طلاقیں اکٹھی دے دیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اللہ کی کتاب کو کھیل اور مشغلہ بنا مارست تیں۔

آپ سخت ناراض ہوئے۔ اتنے میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی، حضور! کیا میں اس کو مار نہ ڈالوں۔ مگر آپ خاموش رہے۔ آپ نے مزید کچھ نہیں فرمایا۔ مگر ناز و غی کا اظہار کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ بیک وقت طلاق ثلاثہ سے آدمی گناہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

موطا اہم مالک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا کَلَّطْتُ مَائَةً میں نے اپنی عورت کو سو طلاقیں دیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تین طلاقیں کے ساتھ تو عورت علیحدہ ہو گئی، باقی ستائیس طلاقیں دیگر تم نے اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ تین طلاقیں بیٹے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں۔

لہذا تین طلاقیں کے ایک طلاق واقع ہونے والی روایت قابل عمل نہیں رہی۔ البتہ اس کے متعلق فقہائے کرام یہ ترجیح بیان کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام، حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ابتدائی دور تک لوگ ایک ہی طلاق دیتے ہوں۔ تین کا رواج ہی نہ تھا۔ پھر جب لوگوں نے تین طلاقیں دینا شروع کیں تو حضرت عمرؓ نے حکم صادر کیا کہ جو شخص بیک وقت تین طلاقیں دے گا۔ وہ تین ہی شمار ہوں گی۔ لہذا کوئی غلط فہمی میں نہ رہے۔ کہ تین طلاق بیک وقت بیٹے سے ایک ہی واقع ہوگی اور وہ رجوع کر سکے گا۔ لہذا لوگ خبردار رہیں۔

ابوداؤد شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ تین طلاقیں کا ایک طلاق شمار کرنا اس عورت کے لیے ہے جس کا نکاح ہوا مگر خاندان سے غلوٹ نہیں ہوئی۔ وہ شخص اگر ایک وقت میں تین طلاق بدیں الفاظ دیتا ہے۔ کہ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تو ایسی عورت پہلی طلاق پر ہی جدا ہو جائے گی۔ اس کی دوسری اور تیسری طلاقیں لغو ہیں۔ کیونکہ عورت کے غیر مدخول ہونے کی وجہ سے اس کے لیے ایک طلاق ہی کافی ہے۔ یہاں دوسری اور تیسری طلاق کا کوئی موقع محل نہیں ہے۔ الغرض! تین طلاقیں کو ایک تصور کرنے کے متعلق صرف حضرت عبداللہ

بن عباسؓ والی روایت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص روایت نہیں۔ اس روایت کے متعلق معلوم ہو گیا۔ کہ یہ استدلال کمزور ہے اور روایت مؤول ہے البتہ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت آتی ہے۔ کہ کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ حضرت! اگر کوئی حیض کی حالت میں عورت کو طلاق دیدے تو اس کا کیا حکم ہے۔ فرمایا اگر کوئی ایسی بیوقوفی کرے تو عورت توجہ ہو جائیگی البتہ طلاق دینے والا گنہگار ہوگا۔ کہ اُس نے غلط موقع پر طلاق دی۔ ابن حزمؒ اور بعض دوسرے ائمہ یہ نکتہ بھی بیان کر کے ہیں۔ کہ پہلی آیت میں فرمایا الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ یعنی طلاق دوسرے بار ہے۔ جس میں رجوع ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا فَإِنْ طَلَّقَهَا پس اگر اس نے (تیسری) طلاق دیدی۔ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں پر فَإِنْ کی بجائے ثُمَّ کا لفظ بھی آسکتا تھا۔ مگر اس میں حکمت یہ ہے۔ کہ فَا التَّصَالُ کے لیے آتا ہے۔ جب کہ ثُمَّ میں یہ معنی انہیں پایا جاتا۔ تو یہاں پر فَإِنْ طَلَّقَهَا کا معنی یہ ہوگا کہ دو طلاق کے بعد اگر متصلاً تیسری طلاق دیدے یعنی بیک وقت تین طلاقیں دیدے۔ تو عورت حرام ہو جائے گی۔ جب تک وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کر کے طلاق حاصل نہ کرے۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ متصل تین طلاقیں تین ہی تصور ہوں گی۔

اس وقت ہر وجہ حلالہ کی جو صورت ہے وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہے۔۔۔ یہ مشروط نکاح حلالہ مشروط نکاح کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ جب دیکھتے ہیں۔ کہ اب رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ تو کسی دوسرے شخص کے ساتھ اس شرط پر نکاح کر دیا۔ کہ وہ طلاق دیدے گا۔ اور پھر پہلے خاوند سے نکاح ہو سکے گا۔ اگرچہ اس طرح قانونی جواز قبیح ہو جاتا ہے۔ مگر اس شرط کے تحت نکاح گناہ کبیرہ ہے۔ ایسے حلالے پر لعنت کی گئی ہے۔ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحِلَّ وَالْمُحَلَّ لَهُ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا حلالہ کر لے لے اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا۔ دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

بہر حال یہ حلال حرام کا مسئلہ ہے۔ اور اگر حلال و حرام میں اختلاف پیدا ہو جائے
 تو کلیہ یہ ہے کہ حرام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ لہذا اس مسئلہ میں تین طلاق پر عورت
 حرام ہو جائیگی، خواہ بیک وقت تین طلاق دی ہوں۔ ایک ہی طہر میں دی ہوں یا
 حیض کے دوران دی ہوں۔ اب عورت اُس مرد کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب
 تک کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔ پھر وہ خاوند فوت ہو جائے یا طلاق
 دے دے تو دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے۔

فَمَا وَتَلَّكَ حَدُّهُ اللَّهُ بِهِ اللَّهُ تَعَالَى كِي قَائِمٌ كَرَاهٍ مَدِينِ مِي۔ يَبَيِّنُهَا
لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ جو کہ اہل علم قوم کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ مسئلہ نکاح کا ہو،
 طلاق یا عدت کا ہو۔ ایلا یا ظہار کا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے واضح حدیں
 مقرر کر دی ہیں۔ ان حدود کا احترام کرنا چاہیے اور ان کو عبور نہیں کرنا چاہیے۔
 ورنہ انسان گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جائے گا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس نورد ہشت (۹۸)

آیت ۲۳۱ ۲۳۲

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَبِغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأُمِّكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ
 أَوْسَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْكُوهُنَّ ضُرًّا لِّلْعَتَدَةِ وَا
 وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا
 آيَةَ اللَّهِ هُزُوًا وَإِذَا كُورُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا
 أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ
 وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾
 وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَبِغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْصِلُوهُنَّ
 أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذَٰلِكَ
 يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
 ذَٰلِكُمْ أَنْكِ لَكُمْ وَأَظْهَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ
 لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾

﴿٢٣١﴾

ترجمہ :- اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت تک پہنچیں۔ پھر ان
 کو دستور کے مطابق رد کر رکھو، ان کو چھوڑ دو دستور کے مطابق۔ اور ان کو ضرر پہنچانے
 کے لیے زبرد کو، تاکہ تم ان پر زیادتی کرو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا۔ بیشک اس نے اپنی
 جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ ٹھہراؤ۔ اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو۔
 جو اس نے تم پر کی ہے۔ اور جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں
 کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ
 ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۳۱﴾ اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو، پھر جب وہ

عدت کو پہنچیں۔ تو تم ان عورتوں کو اس بات سے نڈر ہو کر کہ وہ پہلے خاوندوں سے نکاح کریں۔ جب کہ وہ آپس میں دستور کے موافق راضی ہو جائیں۔ یہ باتیں وہ ہیں کہ ان کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے۔ اس شخص کو جو تم میں سے اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہے۔ یہ بات تمہارے لیے زیادہ شائستہ ہے اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جاننے ہے۔ اور تم نہیں جانتے (۳۲۱)

طلاق برائے
ایثار رسانی

گزشتہ درس میں یہ مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ طلاق اصل میں دوہی ہیں۔ جب تیسری طلاق دیدی جائے تو پھر بغیر حلالہ کے پہلے خاوند کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے نکاح و طلاق اور عدت سے متعلقہ دو اور مسائل بیان فرمائے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری طلاق کے بعد جب عدت پوری ہو جائے تو پھر عورتوں کو بلا وجہ تنگ نہ کر دو۔ اگر انہیں روکنا ہے تو معروف طریقے سے اور اگر رخصت ہی کرنا ہے تو بھی اچھے طریقے سے انہیں رخصت کر دو۔ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی مطلقہ یا بیوہ کو نکاح ثانی کرنے سے منع نہ کر دو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے بلکہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق نکاح کی اجازت دو۔

زمانہ جاہلیت میں ایک غلط رسم جاری ہو گئی تھی کہ عورتوں کو تنگ کرتے تھے طلاق مے دیتے، جب عدت قریب الاعتام ہوتی تو رجوع کر لیتے۔ کچھ عرصہ بعد پھر طلاق مے دیتے اور جب عدت پوری ہونے کو آتی تو رجوع کرتے۔ مقصد یہ کہ نہ تو عورت کو معقول طریقے سے آباد کرتے اور نہ اُسے رخصت کرتے کہ وہ دوسری جگہ نکاح کر سکے۔ یہ سلسلہ سال ہا سال تک جاری رہتا۔ جس کی وجہ سے بے گناہ عورتوں کو سخت اذیت ہوتی۔ اس قسم کی قباحت کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنِ أَجَلَهُنَّ۔ جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور پھر ان کی عدت پوری ہو جائے۔ فَأُمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ پھر با انہیں دستور کے مطابق روک لو یعنی رجوع کر لو۔ یعنی اگر تمہیں اپنے سابقہ فعل پر واقعی ندامت ہوئی ہے تو اپنا گھر دوبارہ آباد کر لو اور اس میں نیت اصلاح کی ہوئی چاہیے

محض ایذا رسانی اور عورت کو حق سے محروم کرنے کے لیے ایسا مت کر دو۔ بالکل نیک نیتی سے رجوع کر لو۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو۔ صلح صفائی کی صورت نظر نہ آتی ہو۔ اَوْسَرْتُمْ حُجُوتًا بِمَعْرُوفٍ تو پھر انہیں معروف طریقے سے رخصت کر دو تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق دوسرے خاندان کے ساتھ نکاح کر سکیں سُرخ کا معنی چھوڑ دینا یا آزاد کر دینا ہے جانوروں کو جنگل میں چرنے کے لیے چھوڑ دینا تسبیح کہلاتا ہے۔ اور جب جانور شام کے وقت جنگل سے واپس پلٹتے ہیں۔ تو اس وقت تسبیح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ حَجِیْنٌ تُرْجُوْنَ وَحِیْنٌ تَسْرَحُوْنَ یعنی جب تم جانوروں کو واپس پلٹاتے ہو اور جب انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو۔ کنگھی کرنے کو بھی تسبیح کہتے ہیں۔ اس سے بالوں کی اکھن دور ہو جاتی ہے۔ بہر حال اگر علیحدگی کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ تو پھر مطلقہ عورتوں کو بلا وجہ رمت روکو بلکہ انہیں احسن طریقہ سے کچھ دے دلا کر رخصت کر دو۔ انہیں طعن تشنیع کا نشانہ نہ بناؤ۔ گالی گلوچ نہ کرو۔ بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدہ کر دو۔ فرمایا وَلَا تَقْصِبْ كُوْنَهُنَّ فَخْرًا لِتَقْتَدِرْنَ اور انہیں تکلیف پہنچانے کی خاطر مت روکو یہ زیادتی کی بات ہے۔ عورتوں پر زیادتی مت کرو۔ اس طریقہ سے انہیں روکنا حرام ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ جِوَالًا كَرِيْهًا فَقَدْ ظَلَمَ كَفْسًا كَآسٍ لِّاٰنِیْ جَانٍ پر ظلم کیا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ دوسری جگہ واضح طور پر آتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ۔ ہاں اللہ تعالیٰ بعض اوقات ظالموں کو مصلحت سے دیتا ہے۔ مگر بالآخر وہ گرفت میں آ جاتے ہیں۔ اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ فرمایا کہ اللہ کے احکام کی صریح خلاف ورزی کر کے وَلَا تَبْتَغُوا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُنَّ اللّٰهِ کی آیات کو تمسخر کا نشانہ نہ بناؤ۔ یہ بہت بڑی بات ہے تمسخر کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص غلام کو کہہ دے کہ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ اور پھر کہے کہ یہ تیرے لیے مذاق کہا تھا۔ میری نیت تو آزاد کرنے کی نہ تھی۔ یاد رکھو اگر کوئی دہل لگی کے لیے بھی غلام کی آزادی کا اعلان کرے تو غلام آزاد ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ٹھٹھا

کے طور پر کہتا ہے کہ میں نے طلاق دی۔ تو بھی طلاق ہو جائے گی۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ بناؤ۔ بلکہ ان پر سختی سے عمل کرو۔

تذکرہ احسان

فرمایا وَاذْكُرُوا فَاِتَعَصَمَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ کا وہ احسان یاد کرو۔ جو اُس نے تم پر کیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی دولت سے نوازا ہے۔ تمہارے درمیان عظیم الشان رسولِ مبعوث فرمایا ہے۔ جو تمہاری تربیت کرتا ہے۔ اجتماعی لحاظ سے تمہیں حکومت عطا کی ہے۔ مال و دولت دیا ہے۔ جاہ و اقتدار بخشا ہے۔ عزت و آبرو دی ہے۔ ان احسانات کو یاد کر کے اس کے شکر گزار بن جاؤ۔ اور پھر ایک خاص احسان یہ کیا وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ تم پر ایک عظیم الشان کتاب نازل فرمائی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آخری پروگرام ہے۔ جس کے بعد کوئی کتاب نہیں۔ کوئی نبی نہیں اور کوئی پروگرام نہیں۔ اور پھر اس کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی۔ قرآن پاک خود سراسر حکمت ہے۔ مگر اس کے ساتھ نبی کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ارشادات پُر از حکمت ہیں۔ حکمت کا لفظ حضور علیہ السلام کے ارشادات پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں دو جگہ پر موجود ہے، کہ اس انعام کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کتاب و حکمت کی صورت میں کیا ہے۔ اہم مالک فرماتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کی سنت اور اس کا اتباع حکمت ہے۔ اور یہ نہایت بصیرت افزا اور حکمت آمیز باتیں ہیں، دانش ور ہی کی باتیں ہیں اسی لیے فرمایا وَمَنْ يُّؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اَوْفَىٰ خَيْرًا كَثِيْرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی، وہ خیر کثیر یعنی بہت زیادہ بھلائی سے نوازا گیا۔ آگے اسی سورۃ میں اس کی مزید وضاحت آئی گی۔ فرمایا يَعْظُمُ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ کہ بُرے چیزوں کی طرف راغب نہ ہو۔ بلکہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔ کہیں اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھو۔ کسی کی حق تلفی نہ کرنا۔ اپنی نیت کو پاک صاف رکھو وَاَعْلَمُوْا اور یاد رکھو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لو اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں وہ تمہارے دلوں کے ارادے

اور نیتوں کو بھی جائز ہے تم خدا کی طرح دھوکہ نہیں دے سکتے۔

آگے دوسرے مسئلہ کا بیان ہے۔ وَإِذَا أَطْلَقْتُمُ النِّسَاءَ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں یعنی عدت ختم ہو جائے فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ تو انہیں اس بات سے مت روکو أَنْ يَكُنَّ حُرًّا آزاد وَأَجَلُهُنَّ کہ وہ اپنے خاندانوں سے نکاح کر لیں إِذَا تَرَاصُوا بَيْنَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ جب ان کے درمیان دستور کے مطابق راضی نامہ ہو جائے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسارؓ کی بہن کا نکاح ایک شخص سے ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اُس شخص نے طلاق دیدی۔ صحابی رسولؐ نے اُسے رجوع کیلئے کہا مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اور نہ پوری ہو گئی۔ تاہم یہ طلاق مغفلہ نہیں تھی دوبارہ نکاح ہو سکتا تھا۔ جب عورت آزاد ہو گئی۔ تو بعض دوسرے لوگوں نے بھی نکاح کے پیغام بھیجے۔ اتنے میں اُس شخص کو اپنے کئے پر ندامت ہوئی اور اس نے بھی دوبارہ نکاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ عورت بھی اس پر رضا مند ہو گئی۔ مگر چلو کسی غیر کا منہ نہ دیکھنا پڑیگا۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ آتے ہیں فَهَوَىٰ مَا هَوَيْتَ یعنی دونوں کی خواہش تھی۔ کہ ان کا دوبارہ نکاح ہو جائے۔ مگر حضرت معقلؓ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان کا استدلال یہ تھا۔ کہ جس شخص نے اُس کی بہن کو طلاق دی اور پھر کہنے کے باوجود رجوع نہیں کیا۔ ایسے کہنے شخص کے ساتھ دوبارہ نکاح نہیں ہونے دوں گا۔ اسی دورانِ یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضور علیہ السلام نے انہیں بلا کر اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا۔ کہ اگر مرد اور عورت نکاح پر رضا مند ہیں۔ تو پھر ولی کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے جب حضرت معقل بن یسارؓ نے یہ حکم سنا تو کہا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ہم اپنے رب کی بات سننے میں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہی منشاء ہے تو میں اپنے رب کی اطاعت کروں گا۔ چنانچہ ان دونوں کا دوبارہ نکاح ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر کوئی مرد اور عورت نکاح پر رضا مند ہوں۔ تو بلا وجہ انہیں اس کام سے نہ روکو۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ عورت صرف

پہلے خاوند سے ہی نکاح کر سکتی ہے بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عاقل بالغ عورت اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ درمیان میں بلاوجہ رکاوٹ نہیں بنانا چاہیے۔ بشرطیکہ وہ دونوں دستور کے مطابق صحیح طریقہ سے نکاح پر رضامند ہوں۔ اگر عورت کی رضامندی کے خلاف دوسری جگہ نکاح کر دیا جائے۔ تو کئی قسم کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ جن کی وجہ سے یہ گنہگار ہوں گے۔ لہذا اُسے اپنی مرضی سے نکاح کر لینی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ صرف ایک شرط ہے کہ عورت کا مجوزہ خاوند اُس کا کھو (بمسر) بھی ہو۔ اور اسے حق ہر بھی پورا میسر آتا ہو اور کور بھی کوئی چیز باعث تحقیر نہ ہو۔ تو انہیں نکاح کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

مکتوبیت

اس موقع پر مسئلہ ولایت کا مختصر بیان بھی ہو جائے۔ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا اختلاف ہے کہ آیا عاقل بالغ عورت بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اس کے حق میں ہیں۔ جب کہ امام شافعیؒ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے دونوں طرف دلائل موجود ہیں۔ تاہم امام عظیمؒ کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجتہ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ نابالغ عورت کا نکاح تو بغیر ولی کے نہیں ہو سکتا۔ البتہ عاقل بالغ عورت باکرہ ہو یا ثقیبہ بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے۔ فرمایا یہ نکاح تو ہو جائے گا۔ مگر یہ ناپسندیدہ فعل ہو گا۔ اس سلسلہ میں ایک چیز کی گنجائش ہے۔ اگر عورت نے اپنی مرضی سے غیر کفر کے ساتھ نکاح کیا ہے۔ تو دلی یا سرپرست ایسے معاملہ کو عدالت میں لے جا سکتا ہے۔ اور اگر عدالت مناسب سمجھے تو نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ شاہ صاحب کی یہ بات بڑی قیمتی ہے۔ اگر عورتیں خود بخود نکاح کر لے لگیں تو پھر تو یہ دھاندلی ہوگی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ نکاح سرپرست کی معرفت سے ہونا چاہیے۔ لڑکی کا باپ ہے یا بڑا بھائی یا چچا ہے، وہ خود دیکھ بھال کر نکاح کا فیصلہ کریں۔ تاہم نکاح کے لیے عورت کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ بہر حال اگر عورت اپنی مرضی سے نکاح کر لیتی ہے۔ تو نکاح جائز ہو گا۔ مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے۔ لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ یعنی ولی کے بغیر نکاح ہی نہیں ہو رہا ہے۔ بعض فقہائے کرام کہتے ہیں کہ اس روایت کی رو سے بغیر ولی کے نکاح باطل ہوگا۔ پوری روایت اس طرح ہے۔ لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَبِشَاهِدَتَيْنِ عَدْلٍ دُولِيٍّ أَوْ عَدْلٍ لَّغَوِيٍّ کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے لیے دو عادل گواہ ضروری ہیں۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ ولی کا ہونا لازمی نہیں۔ دو گواہ ضروری ہیں۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ ولی کی رضا مندی اور اس کی سرپرستی بہتر ہے اب آگے دو سر مسئلہ بیان ہو رہا ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ یا مطلقہ ہو جائے اور وہ دوسرے عقد کرنا چاہے۔ تو اسے اجازت ہے دینی چاہیے۔ نکاح میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ فرمایا وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ جَبَّ تَمَّ عَوْرَتُنَّ كَوَطْلَقْنَهُنَّ عَدَّتْ رَجْعُهُنَّ يَوْمَ يَأْتِيَنَّهِنَّ أُولَىٰ لَهُنَّ بِالْحَقِّ لَا يَحِلُّ لِهِنَّ رَجْعُهُنَّ يَوْمَ يَأْتِيَنَّهِنَّ إِلَّا أَنْ يَمُوتَ بَيْنَهُمَا بَعْضُهُمَا أَوْ يَخْتَفِرَ الْأُخْرَىٰ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَتِلْكَ الْأُمُورُ الْمُضْمَرَّةُ لَا تَحِلُّ فِيهَا لِلْأُخْرَىٰ

تم عورتوں کو طلاق سے دو اور وہ اپنی عدت کر پہنچ جائیں۔ فَلَا تَقْضُوهُنَّ أَنْ يَتَرَكَهُنَّ أَنْوَاجُهُنَّ اُنَّہیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے خاوند سے نکاح کریں۔ اِذَا اسْتَرْضَوْا بَيْنَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق راضی ہو جائیں۔ امام شافعی یہاں بھی پہلے لفظ تَقْضُوهُنَّ سے استدلال کرتے ہیں کہ یہ ولی کو کہا جا رہا ہے کہ نکاح میں رکاوٹ نہ بنیں۔ گویا ولی کا دخل ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہ لفظ يَتَرَكَهُنَّ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نکاح کرنا عورت کا حق ہے۔ یہ اسے اختیار ہے کہ وہ اپنی حسبِ فتنہ نکاح کرے۔ اس کی مثال حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ میں بھی ملتی ہے کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور پھر یہاں آگے آتا ہے ذَلِكُمْ يَوْعُظُ بِهِ اس بات کی نصیحت کی جاتی ہے مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ تم میں سے اُس شخص کو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے کہ وہ عورت کے معاملہ میں دخل نہ بنے۔ ذَلِكُمْ أَرْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ یہ چیز تمہارے لیے زیادہ شائستگی اور زیادہ پاکیزگی والی ہے۔ عورتوں کو نکاح ثانی سے مت روکو۔ ورنہ کسی طرح کی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اور اس کے ذمہ دُور تم ہو گے۔ یہاں

نکاح ثانی میں
رکاوٹ نہ بنو

پڑھارت سے مراد ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی پاکیزگی ہے۔ نکاح کر لینے سے ان کے دل بھی مطمئن ہو کر پاک ہو جائیں گے اور ظاہر کسی گناہ میں ملوث ہونے کا احتمال بھی نہیں ہوگا۔ فرمایا وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ اللہ تعالیٰ جو ایسے احکام نازل کرتا ہے۔ ان کی حکمت کو بھی وہی جانتا ہے۔ تم اس کی گہرائی سے واقف نہیں ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عورت کو نکاح ثانی کی اجازت دو، اس میں رکاوٹ نہ بنو۔

البقرة ۲

آیت ۲۳۳

سیقول ۲

درس نوروند (۹۹)

وَالْوَالِدَتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ
 أَرَادَ أَنْ يُنَسِّمَ الرِّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِوْنُهُنَّ
 بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارُّ وَالِدُهُ
 بِكَوْلِهِمَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِكَوْلِهِمَا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ
 فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ
 عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ نَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ
 عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ
 وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْلَمُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۳﴾

ترجمہ: اور ایسے بچے والی عورتیں اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں
 یہ اس شخص کے لیے ہے۔ جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اور والد کے
 ذمہ ہے۔ ان کا کھانا اور لباس دستور کے مطابق۔۔۔ نہیں تکلیف دی جائیگی کسی
 نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق، نہیں نقصان پہنچایا جائے گا والدہ کو اس کے بچے
 کی وجہ سے اور نہ والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔ اور وارث پر بھی اسی طرح لازم
 ہے۔ پس اگر بچے کے والدین دودھ چھڑانے کا ارادہ کریں آپس کی رضامندی اور
 مشورہ سے تو ان پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم ارادہ کرتے ہو اپنی اولادوں کو
 دودھ پلانے کا دوسری عورتوں سے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جب کہ تم دیدار
 وہ چیز جو مقرر کی ہے دستور کے مطابق۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک
 اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ﴿۲۳۳﴾

اس درس میں طلاق ہی کے ضمن میں مسئلہ رضاعت بیان ہو رہی ہے۔ مسئلہ رضاعت

یعنی طلاق کے بعد اگر عورت کی گردن میں بچہ ہو، تو اس کی پرورش کس طرح ہوگی۔ بچے کی ذاتی دیکھ بھال کرن کرینگا اور اس کا خرچہ کون برداشت کرینگا۔ رضاعت کا لفظی معنی 'دودھ پلانا' ہے۔ چونکہ بچہ مرد کا حق ہوتا ہے۔ اور دودھ عورت پلاتی ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد و زن کی علیحدگی کی صورت میں بچے کی پرورش کیسے ہوگی۔ جب کہ اصولاً بچے کو مرد کی تحویل میں چلے جانا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَبْتِمَّ الرِّضَاعَةَ یہ اس شخص کے لیے حکم ہے۔ جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے علیحدگی کی صورت میں اپنی ماں کا دودھ پلانے میں خاص حکمت کا فرما ہے۔ اگرچہ بچہ اپنی ماں کی بجائے کسی دوسری عورت کا دودھ پئے گا۔ تو وہ عورت اس کی رضاعتی ماں بن جائے گی۔ نکاح کے متعلق رضاعتی ماں کے بھی وہی احکام ہیں۔ جو حقیقی ماں کے ہیں۔ لہذا جب بچہ نکاح کے قابل ہو گا، تو جس طرح اس کا نکاح حقیقی ماں کی رشتہ داری کی وجہ سے بعض عورتوں سے حرام ہے، اسی طرح رضاعتی ماں کی وجہ سے جو رشتہ دار بہن، چچی، بھتیجی، خالہ، بھانجی وغیرہ ہوں گے۔ اُن سے بھی نکاح نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ترغیب دی کہ طلاق کی صورت میں جہاں تک ممکن ہو مطلقہ عورت کا بچہ اپنی ماں کا دودھ پئے۔ لہذا اس کے لیے احکام نازل فرمائے۔ اس کی تفصیل آگے سورۃ نسا میں آئیگی۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ۔

ت عت
مذہب رضا

رضاعت یعنی دودھ پلانے کی مدت کے متعلق فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ جن فقہائے کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ وہ رضاعت کی مدت دو سال بتاتے ہیں حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ مگر اہم ماہکے دو سال تین ماہ کے قائل ہیں۔ اہم ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت کی انتہائی مدت اڑھائی سال ہے۔ وہ سورۃ احقاف کی آیت وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا یعنی حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہے جو کہ اڑھائی سال

بنتے ہیں۔ اہم صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو دو سال کا ذکر آیا ہے، تو یہ قانونی مدت رضاعت ہے۔ قانونی حیثیت سے دو سال تک دودھ پلانا ضروری ہے تاہم زیادہ سے زیادہ مدت لڑھائی سال ہے۔ آہم کسی کو دو سال سے زیادہ عرصہ کے لیے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اخلاقی طور پر اگر ماں رضامند ہو تو ایسا ہو سکتا ہے

اس آیت کریمہ میں دودھ پلانے کا حکم سب سے پہلے حقیقی ماؤں کو دیا گیا وَالْأُمَّهَاتُ بِرَضَاعَتِهِمْ خَرِجَہِ کی ذمہ داری یُنْضِیْعُکَ اُولَادُہُنَّ۔ اور حقیقی ماں کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ عورت اپنے خاوند کے نکاح میں ہے۔ دودھ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ کوئی بیماری بھی لاحق نہیں۔ تو ایسی حالت میں دودھ پلانا مال پر واجب ہے۔ اور اس کے خرچہ کی ذمہ داری باپ پر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو چکی ہے مگر ابھی عدت میں ہے تو اس حالت میں بھی دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں پر ہے۔ البتہ ماں اور بچے کا خرچہ مرد کے ذمے ہے۔ جب تک عدت ختم نہ ہو ہر قسم کا خرچہ خوراک، لباس، رہائش علاج وغیرہ سب آدمی کی ذمہ داری ہے۔ اب تیسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو کر عدت ختم ہو چکی ہے۔ تو اس حالت میں عورت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے بچے کی پرورش کی ساری ذمہ داری اسکے باپ پر عائد ہوتی ہے اگر بچے کی حقیقی ماں دودھ پلانے پر رضامند ہو تو باپ کو چاہیے کہ اسے اولیت دے اور اس کا خرچہ معمول کے مطابق بلاشت کئے اہل اکثر عورت معمول سے زیادہ خرچہ طلب کئے تو پھر اسی کی خدمات حاصل کرنا ضروری نہیں۔ مرد کسی دوسری عورت کو اجرت دے کر بچے کو دودھ پلا سکتا ہے۔ بعض اوقات حقیقی ماں کا دودھ کسی عارضہ کی وجہ سے مضر صحت ہوتا ہے۔ یا دودھ اتنا کم ہے کہ بچے کی پرورش ٹھیک طور سے نہیں ہو سکتی۔ تو ایسی صورت میں بھی باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب معاوضہ ادا کر کے کسی دوسری عورت سے دودھ چواسجے

فَرَمَا وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ مِمَّا ذُفِّنَ وَكَسُوْنُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

جب یہ طے ہو جائے کہ ماں ہی بچے کو دودھ پلائے گی تو پھر ایسی ماؤں کی خوراک اور لباس کی ذمہ داری دستور کے مطابق بچے کے باپ پر ہوگی۔ عورت خواہ مرد کے

نکاح میں ہے یا مطلق ہو کر عدت گزار رہی ہے۔ اُس کے اخراجات مرد برداشت کرے گا۔ اور اگر عورت عدت پوری کر کے بالکل جدا ہو چکی ہے۔ تو پھر اُس کو اُسی طرح اجرت دی جائیگی جس طرح کسی غیر عورت کو دی جاتی ہے۔ معاوضہ دستور کے مطابق معقول ہونا چاہیے، ان کم نہ زیادہ اور اس معاملہ میں لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا دَلًّا وَشَعْمًا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائیگی۔ مثلاً عورت کو کوئی عذر ہے اور دودھ پلانے کے قابل نہیں ہے۔ یا دودھ پلانے سے اس کی صحت کو خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اُسے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر مرد کی مالی حالت کمزور ہے۔ تو اس کی حیثیت سے زیادہ اجرت طلب نہیں کی جائیگی اسی لیے فرمایا لَا تُضَارُّ وَالِدَةُ كُفْلًا والدہ کو اُس کا اپنا بچہ ہونے کی بنا پر نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ چونکہ اس کو بچے سے محبت ہے اور اُس کی مانتا کا اتفاق ہے۔ کہ اُسے خود دودھ پلانے تو اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مال کو کم اجرت پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ وَلَا مَوْلُوْكَ لَكَ بکودہ اور نہ باپ کو محض اس وجہ سے تکلیف دی جائیگی۔ کہ وہ بچے کا باپ ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کرنے پر مجبور ہے۔ مگر وہ اپنی حیثیت سے زیادہ اجرت نہیں مانے سکتا۔ لہذا مال کو اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بچے کے باپ کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ معاملہ افہام و تفہیم کے ذریعے دستور کے مطابق اور باپ کی مالی حالت کے پیش نظر طے کرنا چاہیے۔ اسلام میں یہ ایک عام قانون ہے۔ کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا دستور بھی یہ ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا دَلًّا وَشَعْمًا اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ عبادات میں دیکھ لیں۔ اگر کوئی شخص معذور ہے یا مجبور ہے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ جائے۔ لیٹ کر پڑھ سکتا ہے، اشاروں سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بیمار ہے یا مسافر ہے تو روزہ کو قضا کر سکتا ہے۔ دودھ پلانے کے معاملہ میں بھی فرمایا کہ کوئی فریق در سر فریق کو تنگ نہ کرے، بلکہ معمول کے مطابق احسن طریقہ

سے یہ کام انجام دیا جائے۔

یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بچے کا باپ فوت ہو چکا ہو، تو اس کی رضاعت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ فرمایا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ حَسْبَ طَرَحِ باپ بچے کی پرورش کا ذمہ دار تھا اُسی طرح اسکی عدم موجودگی میں وارث اس کی ذمہ داری قبول کرے گا۔ اب وارث سے کون سا وارث مراد ہے۔ اس ضمن میں مختلف اقوال ہیں۔ وارث اگر بطور اسم جنس لیا جائے۔ تو اس کے معنی تمام وارث ہوں گے۔ ہر وارث ترکہ سے جس قدر وارث کا حق دار ہے، اسی نسبت سے وہ یتیم بچے کی پرورش کا خرچ بھی برداشت کرے گا۔ اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ وارث سے مراد باپ کے وارث ہیں اور ان میں خود کچھ بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے بچے کی پرورش یعنی اس کی ماں کا نان نفقہ بچے کی جائیداد سے ادا کیا جائیگا۔ تفسیر روح البیان میں ہے کہ وارث سے مراد بچے کے وارث بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر بچہ فوت ہو جائے۔ تو اس کا ترکہ کن کن وارثوں کو پہنچتا ہے اس لحاظ سے جو وارث بنتے ہیں۔ وہی رشتہ دار بحساب حصہ رسدی وارث بچے کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ یعنی جس وارث کو بچے کی جائیداد سے آدھا حصہ مل سکتا ہے۔ وہ بچے کے نصف، خرچہ کا ذمہ دار ہوگا اور جس کو ایک تہائی، چھٹا حصہ یا آٹھواں حصہ پہنچتا ہے۔ وہ اُسی قدر بچے کا خرچہ برداشت کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ مولانا مختار لوی فرماتے ہیں کہ اگر بچے کی اپنی جائیداد نہ ہو، تو پھر اُس کے مالدار عزیزوں میں سے جو اس کے وارث اور محرم ہوں وہ اس کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ محرم سے مراد یہ ہے کہ اگر بچے اور اس کے عزیزوں میں سے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت فرض کر لیا جائے، تو دونوں کا نکاح درست نہ ہو اس لحاظ سے بچے کی ماں پر بھی ذمہ داری آتی ہے۔ مثلاً یتیم بچے کی ماں موجود ہے اور اس کا دادا بھی ہے۔ تو وارثت کے حصہ رسدی کے مطابق بچے کی کفالت ایک تہائی ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگی۔ اس لحاظ سے بچے کے بھائی، چچا، تایا وغیرہ بھی بحیثیت وارث اور محرم اس کی پرورش کے ذمہ دار ہیں

تفسیر روح البیان کے مطابق متوفی کے عصبیت بھی ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی چچا، تایا، دادا وغیرہ کو یہ ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔

یہاں پر مطلق وارث کا لفظ استعمال کرنے میں یہ حکمت کار فرما ہے کہ حالات کے مطابق شرعی عدالت یتیم بچے کی پرورش کی ذمہ داری کسی بھی وارث پر ڈال سکتی ہے تاہم عدالت کو یہ بات مدنظر رکھنا ہوگی کہ سب سے پہلے یہ ذمہ داری بچے کی اپنی جائیداد پر ڈالی جائے۔ پھر بچے کے قریبی وارثوں پر اور پھر متوفی کے عصبیات پر کوئی نوبت مسلمہ وصول ہے کہ حق ادا کرنے کا حق بھی اُسی پر عائد ہوتا ہے۔ جو حق وصول کرنے کا حق رکھتا ہے ایک صورت اور بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ نہ تو بچے کی اپنی کوئی جائیداد ہو اور نہ اس کا کوئی وارث ہو۔ ایسی صورت میں بچے کی پرورش کی ذمہ داری حکومت وقت پر ہوگی۔ اگر دین سے بے بہرہ حکومت یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔ تو پھر یہ ذمہ داری مسلمانوں کی عام جماعت کے سر پر ہے۔ کیونکہ اگر مناسب دیکھ بھال کے بغیر بچہ ضائع ہو گیا۔ تو مسلمانوں کی پوری جماعت عند اللہ مآخوذ ہوگی۔

فرمایا اگرچہ رضاعت کی مدت عام طور پر دو سال مقرر کی گئی ہے تاہم رسم فَإِنْ أَرَادَ فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اگر بچے کے ماں باپ باہمی رضامندی اور مشاورت سے بچے کو دو دو سال سے پہلے چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ بشرطیکہ بچے کی بہتری مطلوب ہو۔ اگر وہ دونوں سمجھتے ہیں کہ ایک سال بعد یا ڈیڑھ سال بعد بچہ ماں کے بغیر بخیر و خوبی پرورش پاسکتا ہے۔ تو اب کو حق ہے کہ وہ سُسے لے جائے۔

مرت خلعت
میں رعایت

فرمایا فَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تُنْكِرُوا صُعُوبًا أَوْلَادَكُمْ أَوْ تَنْكِحُوا نِكَاحَ حَقِيقَةٍ اَلْمَرْءُ عَلَى مَا أَلْفَظَ بِالْمَعْرُوفِ جو کچھ ان سے مقرر کیا ہے۔ اُسے دستور کے مطابق ادا کرو۔ اس میں کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ کرو۔ جو اجرت ملے کر لو، وہ ادا کرو۔

جہنی عورتوں
سے رضاعت

ماہم دودھ پلانے کا اولین حق ماں کو ہے۔ کیونکہ جو ماں حقیقی ماں کے دل میں ہوتی ہے۔ وہ دوسری کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ ماہم اگرچہ خاص مجبوری کی وجہ سے حقیقی ماں سے دودھ پلانا ممکن نہ ہو، تو دوسری عورت کو مقرر کیا جاسکتا ہے مثلاً ماں بیمار ہے۔ اور اس کا دودھ مضرت ہے۔ یا دودھ بالکل کم ہے جس سے بچہ کی خوراک پوری نہیں ہوتی۔ تو ایسی صورت میں غیر خواتین سے دودھ پلانا درست ہوگا۔

فرمایا اس معاملہ میں **وَاتَّقُوا اللَّهَ اللَّهَ سَعْدٌ** ڈرتے رہو کہیں اس کی نافرمانی نہ کر بیٹھنا، اس کے احکام بلاوجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس نے یہ احکام اپنی خاص ضرورت اور انسان کی بستی کے لیے دیے ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرو۔ اور پھر یہ نہ سمجھ لینا کہ کسی سیرا پھیری سے اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹال سکو گے۔ **وَأَعْلَمُوا خُرُوبًا** یاد رکھو اے اللہ **بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا** تم جو کچھ بھی عمل کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔ تم اُسے دسرا نہیں مے سکتے۔ لہذا اُس کے احکام کی نافرمانی کا ارادہ کرتے وقت، اس کے عذاب کو بھی نگاہ میں رکھ لینا۔

سَبَقُولُ ۲

درس صد (۱۰۰)

البَقَرَةُ ۲

آیت ۲۳۳ تا ۲۵۸

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ
بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۝
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (۲۳۳) وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا
عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنُتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ
عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تُؤَاعِدُوهُنَّ سِرًّا
إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عَقْدَةَ النِّكَاحِ
حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۝ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي
أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۝ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (۲۳۵)

۲۳۵

ترجمہ: اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ
اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں چار ماہ اور دس دن۔ اور جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں
اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جو کچھ وہ عورتیں اپنے بائے میں دستور کے مطابق کریں
اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کہتے ہو، اس کی خبر رکھنے والا ہے (۲۳۳) تم پر اس بات میں
کوئی گناہ نہیں ہے۔ کہ تم اشارہ کرو اس بات کے ساتھ عورتوں کے لیے پیغام
نکاح کا، یا پرشیدہ رکھو تم اس بات کو اپنے نفسوں میں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ کہ
بیشک تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے، لیکن ان سے وعدہ نہ کرو نکاح کا پرشیدہ
طرح پر۔ مگر یہ کہ تم دستور کے مطابق بات کہو۔ اور نہ ارادہ کرو نکاح کی گھر باز مہنی
کامیاں تک کہ کتاب اپنی مدت تک پہنچ جائے اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ
جانتا ہے، جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے اس سے ڈرتے رہو، اور جان لو

کہ بے شک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور بردبار ہے (۳۵)

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے رضاعت کا مسئلہ بیان فرمایا تھا کہ اگر ماں کو طلاق ہو جائے تو بچے کو دودھ کون پلائے گی۔ رضاعت کی مدت اور دودھ پلانے والی عورت کے حق کا بیان تھا۔ یہ بھی آچکا ہے کہ اگر بچے کا باپ موجود ہے تو رضاعت کا خرچہ وغیرہ اس کی ذمہ داری ہے۔ اور اگر باپ نہیں ہے تو یہ ذمہ داری ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے جو بچے کے وارث بن سکتے ہیں۔ اگر بچے کی اپنی ماں دودھ پلانے سے قاصر ہے، وہ خرابیاں ہے۔ یا اس کا دودھ مضرت ہے تو پھر کسی دوسری عورت سے دودھ پلانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ آج ہم ایسی عورت کے ساتھ جو اجرت ملے ہو جائے اُسے دستور کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ ماں کو مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ لازماً بچے کو دودھ پلائے، اگرچہ بغیر عذر بچے کو دودھ پلانا ماں ہی کے ذمہ واجب ہے۔ اسی طرح باپ کو بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ صرف بچے کی ماں سے ہی دودھ پلوائے۔ وہ کسی اور عورت کی طرف بھی رجوع کر سکتا ہے اور بلا وجہ بچے کو ماں سے چھیننا بھی درست نہیں۔ یہ ساری باتیں سابقہ آیت میں واضح کر دی گئی ہیں۔

دوسرا مسئلہ عدت کا ہے۔ بعض قسم کی صورتوں کی عدت پہلے بیان ہو چکی ہے مثلاً جن مطلقہ عورتوں کو ماہواری آتی ہے۔ ان کی عدت اللہ تعالیٰ نے تین حیض مقرر فرمائی ہے اور جن کو حیض نہیں آتا۔ ابھی چھوٹی عمر ہے۔ یا کبر سن کی وجہ سے خون آنا بند ہو گیا ہے۔ ایسی عورتوں کی عدت تین مہینے ہے۔ جس عورت کا نکاح ہو گیا مگر میاں بیوی میں خلوت نہیں ہوئی اور طلاق واقع ہو گئی۔ ایسی عورت کے لیے کوئی عدت نہیں۔ اس کا بیان سورۃ احزاب میں ہے۔ ایسی عورت طلاق کے بعد فوراً نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ طلاق میں اللہ نے حاملہ عورتوں کی عدت بھی بیان فرمائی ہے **وَأَنَّ كُنَّ أُولَاتٍ حَمْلٌ فَلَا تَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ** ایسی عورت کی عدت وضع حمل ہے۔ جب بچہ پیدا ہو گا۔ عدت ختم ہو جائے گی۔ اس

عقبات کی مختلف اقسام

جاہلیت کے زمانہ میں یہ سناں مجاہد ہو گیا تھا، یہ وہ عورت، ہم لوگوں کے ساتھ مکان میں
 نہیں رہ سکتی تھی۔ بلکہ اسے کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ نہ وہ غسل کر سکتی تھی
 اور نہ کپڑے تبدیل کرنے کی مجاز تھی۔ اس کو سخت خیال کیا جاتا تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کے
 ساتھ مل کر کھانا بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ ایک سال گزرنے کے بعد اسے کوٹھڑی سے نکالا جاتا اور
 گہبے یا اونٹ پر بٹا کر لایا جاتا۔ مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ مرغ یا کوئی دوسرا جانور ایسی
 عورت کو لا کر دیا جاتا ہے وہ اپنے اعضائے تناسل کے ساتھ لیتی۔ اکثر اوقات وہ جانور تعفن
 اور زہریلے جراثیم پیدا ہو جانے کی وجہ سے مر جاتے۔ نہ استنجہ نہ طہارت۔ پھر اس عورت کے
 ہاتھ میں اونٹ یا بکری کی میٹلیاں پکڑا دیتے، وہ اپنے ہاتھ سے میٹلیاں اٹھاتی ہے، تو اس کے
 راجھتیں کہتے کہ اب اس کی عدت پوری ہو گئی ہے، اب یہ نہاد ہو کر صاف لباس پہن سکتی
 ہے۔ خوشبو استعمال کر سکتی ہے۔ گویا جاہلیت کے زمانہ میں اس قسم کا برا دستور تھا۔

حضور علیہ السلام کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا، حضور! میری بیٹی کا غلہ فوت
 ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ کیا وہ سر نہ لگا سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا، بڑے
 افسوس کا مقام ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں تم سال جبرخت مشقت، اٹھاتی تھیں مگر اسلام کی
 عالمہ کردہ چار ماہ دس دن کی معمولی باندی برداشت نہیں کر سکتی بقصد کہ عورت حدت کے
 دوران سر نہ نہیں لگا سکتی، رنگین کپڑے نہیں پہن سکتی، خوشبو نہیں لگا سکتی، زیور نہیں پہن سکتی نہ زینت
 کا سامان استعمال نہیں کر سکتی۔ البتہ سات لباس پہن سکتی ہے غسل کر سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے
 دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک مکان میں رہ کر اکٹھا کھا پی سکتی ہے۔ یہ سب جائز ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جو عورت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت پر
 ایمان رکھتی ہے وہ کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ منے، مگر خاندان پر چار ماہ
 دس دن تک سوگ منانے کا حکم ہے۔ ام المؤمنین حضرت زینبؓ اور ام حبیبہؓ کے واقعات
 ملتے ہیں، ایک کے والد فوت ہو گئے اور دوسری کے بھائی انہوں نے تین دن گزرنے
 کے بعد خوشبو منگائی۔ اور کچھ بچی کے سر پر لگا دی اور کچھ اپنے ہاتھوں کو مل لی۔ عورتوں
 کے مجمع میں فرمایا۔ مجھے خوشبو کی حاجت نہ تھی۔ مگر میں تمہیں مسئلہ سمجھانا چاہتی تھی۔ کہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی عورت کے لیے روانہ نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوائے خاندن کی فرتیدگی پر جب کہ چار ماہ دس دن تک سوگ ہے۔

نکاح کی
اجازت

فرمایا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ حَبَسَ لَكُمُ الْعِدَّتُ بِرُؤْيَى جَاءَ فَلَجَّحَ حَ عَلَيَّكُمْ فَمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ تَوَابَ تَمَّ بِرُكْنِي حَرْجَ نہیں ہے کہ وہ عورتیں اپنے باسے میں دستور شریعت کے مطابق فیصلہ کریں یعنی اگر وہ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں کہیں نکاح کا پیغام بھیجنا چاہیں تو کر سکتی ہیں حرج نہیں وہ ایسا کر سکتی ہیں کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کو اس کام سے منع کرے یا ان کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالے۔ فرمایا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس کی خبر رکھتے ہیں۔

عہ میں اشارہ
کئے کی اجازت

اگر عورت مطلقہ ہے تو دورانِ عدت کسی دوسرے شخص کو اجازت نہیں کہ وہ اشارہ کنایہ سے بھی مطلقہ کے ساتھ بات کرے۔ صرف اس کے خاندن کو اجازت ہے وہ بھی اس صورت میں کہ طلاق مغلطہ نہ ہو۔ یہ وہ کے لیے حکم یہ ہے کہ عدت کے دوران نکاح کا وعدہ نہ کرنا حلال نہیں ہے۔ اگر اُسے کوئی ایسا پیغام بھی ملے تو وہ کہلا بھیجے کہ عدت کے اختتام کا انتظار کر۔ البتہ عدت کے دوران اشارے کنائے سے بات ہو سکتی ہے جبکہ اس میں صراحت نہ ہو۔ اس قسم کا ایک واقعہ ملتا ہے ایک عورت یہ وہ ہو گئی۔ ام جعفر صادقؑ کے فرزند نے اس سے کہا کہ تم جانتی ہو کہ میرا تعلق حضور علیہ السلام کے ساتھ کیا ہے۔ اور جو میری قرابت حضرت علیؑ سے ہے اس کو بھی جانتی ہو علم لوگوں میں میرا جو مقام ہے اس سے بھی تم واقف ہو۔ اس عورت نے کہا خدا کا خوف کھاؤ میں عدت میں ہوں اور تم مجھے نکاح کا پیغام دے رہے ہو۔ انہوں نے کہا۔

میں پیغام نکاح تو نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو صرف اپنی حیثیت واضح کر رہا ہوں کہ میرا فلاں فلاں ہستی سے کیا رشتہ ہے۔ اس کو کنایہ کہتے ہیں کہ صراحتاً نکاح کی بات نہ کرے۔ صرف اشارے سے دل کی بات

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اگر دل میں بھی قانون کی خلاف ورزی کا خیال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے۔ فَاَحْذَرُوْهُ لَعَلَّاهُ اَنْ يَّسَّ اس کے قانون کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا۔ وَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ خَفُوْزٌ حَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ غفور یعنی بخشنے والا بھی ہے۔ اور بردبار بھی ہے۔ تحمل کرنے والا ہے۔ بسا اوقات وہ گرفت نہیں کرتا مگر جب مجرموں کو پکڑتا ہے۔ تو پھر خوب پکڑتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کے تحمل کی وجہ سے لاپرواہ نہیں ہو جانا چاہیے، کہ ایک دفعہ بچ گیا۔ تو ہمیشہ ہی ہمتا رہیگا بلکہ وہ اپنے وقت پر غرور چلا جائیگا۔ اگر خدا کے قانون کو توڑ دے گا تو اسکی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد و یک (۱۱۱)

آیت ۲۳۶ تا ۲۴۱

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمْ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ
تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَ مَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ
قَدْرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدْرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا
عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾ وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ
تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا
فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ
النِّكَاحِ ۖ وَإِنْ تَعَفَّوْا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ
بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

ترجمہ: ہم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب کہ تم نے ان کو ہاتھ نہیں
لگایا۔ یا ان کے لیے مهر مقرر نہیں کیا۔ اور ان کو فائدہ پہنچاؤ طاقیت رکھنے پر اس کی طاقت
کے مطابق اور تنگ دست پر اس کی طاقت کے مطابق فائدہ پہنچانا دستور کے مطابق یہ
لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ﴿۲۳۶﴾ اور اگر تم عورتوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ تم نے
ان کو چھوا ہو۔ اور بیشک تم نے ان کے لیے مهر مقرر کیا ہے۔ پس اودھا ضرور ہو گا۔
جو تم نے مقرر کیا ہے۔ الا یہ کہ وہ عورتیں ہی درگزر کر لیں یا درگزر کر سے وہ شخص جس
کے ہاتھ میں نکاح کی گمراہ ہے۔ اور یہ کہ تم درگزر کر دو یہ تقریبی کے زیادہ قریب ہے
اور اس فضیلت کو نہ بھلاؤ، جو تمہارے درمیان ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوب دیکھتا
ہے جو کچھ تم کام کرتے ہو ﴿۲۳۷﴾

گدہ ششترے دروس میں عدت کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی کہ دوران
عدت نکاح نہیں ہو سکتا۔ گدہ ششترے آیات میں اللہ تعالیٰ نے دریاہی عدت عورت سے

نکاح کا وعدہ لینے سے بھی منع فرمایا ہے۔ البتہ اثاثے کنایت سے بات کرنے کی اجازت دے دی۔ مقصد یہ کہ جس طرح عدت میں نکاح کنا حرام ہے اسی طرح نکاح کا وعدہ لینا بھی حرام ہے۔ طلاق کے دوران اور اس کے بعد بچے کی رضاعت کا مسئلہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ طلاق کے وقت اگر دودھ پیا کچھ ہو، تو اس کی پرورش کا ذمہ دار کرن ہوگا۔ اگر بچے کا باپ بھی نہیں ہے، تو پھر اس کا بار کرن اٹھائے گا۔ نیز یہ کہ دودھ کس عورت سے پلانا چاہیے۔ یہ سب مسائل بیان ہو چکے ہیں۔

حق مہر لانے کا

آج کے درس میں حق مہر اور اس کی ادائیگی سے متعلق مسئلہ بیان ہوا ہے۔ حق مہر نکاح کے لازم میں سے ہے۔ سورۃ احزاب میں ہے "قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْكُمْ فِي أَنْوَاعِهِمْ" ہم اُس چیز کو جانتے ہیں جو ہم نے عورتوں کے متعلق مردوں پر ضروری قرار دی ہے۔ اس میں حق مہر اور عورت کے دیگر اخراجات، روٹی، کپڑا، رہائش، علاج وغیرہ سب غارز کے ذمہ ہیں۔ سورۃ نسا میں ہے "وَأَجَلٌ لَكُمْ مِمَّا وَرَدَ ذَلِكَ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ" یعنی جن محرمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کے علاوہ تم باقی عورتوں سے مال صرف کر کے نکاح کر سکتے ہو۔ مال خرچ کرنے کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلے نمبر پر حق مہر آتا ہے۔ سب سے پہلے اُس کا خرچ ہے جو مرد ادا کرے گا۔ پھر عورت کی باقی ضروریات پر اخراجات ہیں۔ وہ بھی مرد کے ذمہ ہیں۔ سورۃ نسا، ہی میں مزید وضاحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے "وَالنِّسَاءُ كَوْنَهُنَّ يَخْلَعْنَ عَوْرَتَهُنَّ" عورتوں کے حق مہر خوشی خوشی ادا کیا کرو۔ اس میں پس و پیش نہ کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیا ہے۔ الغرض! حق مہر نکاح کے لیے لازمی ہے۔

حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ کی تفسیر ربیع میں ہے کہ مہر نکاح کا لازم جزو ہے۔ لہذا اس کے بغیر نکاح کیسے درست ہو سکتا ہے مگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر نہ کرنا ضروری نہیں ہے اگر اس کا اجمالی تذکرہ بھی ہو جائے تو کافی ہے۔ مثلاً صرف اتنا کہ دیا جائے کہ ہم بعد میں آپس میں طے کر لیں گے۔ اگر نکاح کرتے وقت، مہر کا تقرر مبھولے سے رہ گیا۔ تو بھی نکاح درست ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص سرے

حق مہر کا انکار ہی کر دے، تو نکاح نہیں ہوگا۔

خلۃ از حضرت
شاہ ولی اللہؒ

ہندوستان میں خاندان شاد ولی اللہؒ کی دینی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ آپ کا خاندان ہی ہے۔ جس نے قرآن پاک کے علم کو مقامی زبان میں پھیلایا۔ خود شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے فتح الرحمنؒ کے نام سے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا۔ اور اس کے ساتھ مختصر ماشیہ بھی تحریر کیا۔ اس کے علاوہ اس کا مقدمہ بھی لکھا۔ اصول تفسیر پر آپ کی کتاب الفوز الکبیرؒ بے نظیر چیز ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے راہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور آج بھی تمام دینی مدارس اور یونیورسٹیوں میں ایم اے (اسلامیات) کی جانتوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ فہم قرآن سے متعلق آپ نے نہایت بلند پایہ اصول مرتب کیے ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے قرآن پاک کے آخری دو پاروں اور سورۃ بقرہ کے نصف تک کی تفسیر فارسی زبان میں بنی۔ آپ نابینا ہو گئے تھے اس لیے بولتے جاتے تھے اور آپ کے شاگردان رشید اُس کو قلمبند کرتے تھے۔ اپنی وفات تک اس سے زیادہ تفسیر کا کام نہیں کر سکے۔ آپ ہفتہ میں ایک روز قرآن پاک کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ یہ درس بھی لوگوں نے سیکھے۔ آج کل طبع شدہ نسخے نہیں ملتے۔ تاہم قلمی نسخے کہیں موجود ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے درستی بیٹے شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن پاک کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا۔ یہ تحت اللفظ ترجمہ ہے جو عام پڑھا جاتا ہے مختلف اشاعتی اداروں مثلاً امجد کمپنی، انجمن حمایت اسلام وغیرہ نے اس ترجمہ کے بیشمار ایڈیشن شائع کیے ہیں۔ آپ قرآن پاک کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ جس کو آپ کے شاگردان نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے چالیس پچاس سال بعد یعنی آج سے سو سال پہلے صرف سورۃ بقرہ والا حصہ شائع ہوا، جو کہ تفسیر رفیعی کہلاتا ہے۔

آپ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن پاک کا با محاورہ اردو ترجمہ کیا ہے اس میں بعض مشکل الفاظ بھی آئے ہیں جو محاورہ استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری فرمایا کرتے تھے کہ اسیری کے دوران میں شاہ عبدالقادر

کا اردو ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ کہ اللہ الصّٰحِدُ کا ترجمہ نزاد حارہ نظر سے گزرا۔ چونکہ یہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس لیے میں اسے سمجھ نہ سکا۔ جیل میں موجود ایک بست بڑے پنڈت سے میں نے اس لفظ کا معنی دریافت کیا۔ تو وہ کہنے لگا۔ تم کیوں پوچھتے ہو، پہلے یہ بتاؤ کہ یہ لفظ کہاں آیا ہے۔ میں نے کہا پہلے تم اس کا معنی بتاؤ۔ چنانچہ اُس پنڈت نے بتایا کہ نزاد حارہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اور یہ اُس ذات کے لیے بولا جاتا ہے جس کی طرف سب چیزیں محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ایسے ایسے عجیب و غریب منکر بالکل صحیح الفاظ اپنے ترجمہ میں استعمال کیے ہیں۔ آپ نے دہلی کی گنگ ایڈورڈ رڈ پر واقع اکبری مسجد میں بارہ سال اعلیٰ کیا تھا۔ بعد میں اس مسجد کو انگریزوں نے نیست و نابود کر دیا۔ یہ ترجمہ آپ نے اسی اعلیٰ کے دوران لکھا تھا، ساتھ تھوڑا تھوڑا حاشیہ بھی ہے۔ اس ترجمہ کو شیخ المذہب حضرت مولانا محمد الحسن نے نسبتاً آسان زبان میں منتقل کیا ہے۔ اور یہ کام آپ نے مائٹا جیل میں امیری کے زمانہ میں انجام دیا۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں اردو زبان ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اور اس میں بھی اتنا تسلسل نہیں تھا۔ دوسروں کے عرصہ میں اردو زبان کافی ترقی کر چکی تھی۔ لہذا شیخ المذہب نے شاہ صاحب کے اردو ترجمہ کو آسان بنا دیا۔ اور آہل اس کی اشاعت عام ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے اور چوتھے بیٹے شاہ عبد الغنی ہیں۔ آپ نے درس و تدریس کے ذریعے تو دین کی بہت خدمت کی ہے مگر آپ کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ البتہ آپ کے صاحبزائے شاہ اسماعیل شہید نے قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ آپ کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ اور آپ نے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف عملی جہاد میں بھی حصہ لیا۔ اور پھر بالاکوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش فرمایا۔

مولانا محمد علی گیلانی شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے جب کہ اورنگ زیب عالمگیر ۱۷۰۷ء میں وفات پانگئے۔ یہ اپنے خاندان کے داماد شاہ تھے جنہوں نے پچاس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ کابل سے لیکر برہمانک کا وسیع علاقہ ان کی سلطنت میں شامل تھا

عالمگیر کے انچاس سال تو لڑائیوں میں گزر گئے۔ انہیں صرف ایک سال امن و امان کا ملا۔ انہوں نے مغلیہ سلطنت کو مستحکم کرنے کی ازمہ کو کشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ تخت نشین ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دس بادشاہوں کو مسند اقتدار پر آتے دیکھا، مگر ان میں سے کوئی بھی لائق ثابت نہ ہوا۔ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی اور انگریزوں کو مداخلت کا موقع مل گیا اور آخر انہوں نے ہندوستان میں پاؤں جمالیے۔

اورنگ زیب عالمگیر بڑے تدبیر آدمی تھے، مگر انگریزوں نے انہیں خوب بنام کیا۔ انہوں نے عالمگیر کو ایک ظالم بادشاہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور یہاں تک شہر کیا کہ عالمگیر اس وقت تک ناشتہ نہیں کرتا تھا جب تک ہزاروں ہندوؤں کو قتل نہیں کروادیتا تھا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ خدا نخواستہ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستان میں کوئی ہندو باقی نہ رہتا۔ آپ نے پچاس سال حکومت کی۔ اور ہندو دارالسلطنت دہلی میں بھی موجود تھے۔ آپ نے بعض سکھوں اور مرہٹوں کے ساتھ لڑائی کی۔ کیونکہ شورش پسند تھے مگر آپ نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ شریعت کا پابند کا سچا مسلمان تھا۔ جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہوا اپنے بھائی تک کو معاف نہیں کیا۔ آپ کے بھائی نے شہزادگی کے زمانہ میں ایک غریب شخص کے بچے کو ناحق قتل کر دیا تھا۔ وہ شہزادہ ہونے کی وجہ سے گرفت میں نہ آسکا۔ جب عالمگیر کا دور آیا تو اس بچے کے باپ نے مقدمہ دائر کر دیا اور دوسری چاہی۔ باقاعدہ مقدمہ چلا۔ قتل کا ثبوت فراہم ہوا۔ اور پھر قصاص میں شہزادے کو سزائے موت ہوئی۔ عالمگیر اس کردار کا آدمی تھا۔

حق خبر کا
عمدہ فقرہ

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نکاح کے لیے حق ضروری ہے۔ البتہ بوقت نکاح اس کا تقرر ضروری نہیں ہے۔ یہ بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایسی ہی صورت کا تذکرہ ہے۔ فَرَمَا لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمْ نِسَاءَكُمْ مَا لَكُمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تُفَرْضُوهُنَّ فَرِيضَةً تَمْ جُكُونِ لَهَا نہیں ایسی صورت میں کہ تم طلاق دے دو عورتوں کو اس حالت میں کہ تم نے ان کو چھوا

نہیں اور اُن کا مہر بھی مقرر نہیں کیا۔ فرمایا بغیر مہر مقرر کیے نکاح بھی ہو گیا تھا اور اب خلاق بھی واقع ہو گئی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم عورتوں کو اُن کے حق سے بالکل محروم کرو۔ بلکہ وَمَتَّعُوهُنَّ اَنْ كُفَاً مَّوَدَّہٖ بِنِكَاحٍ یعنی کچھ دے دلا دو۔ مگر کس قدر فرمایا عَلَى الْمُؤْتَبِعِ قَدَرُهُ صاحب حیثیت پر اسکی حیثیت کے مطابق۔ اگر کوئی طاقت والا ہے۔ تو وہ اس کے مطابق ادا کرے وَعَلَى الْمُقْتَبِرِ قَدَرُهُ اور اگر کوئی مالی لحاظ سے کمزور ہے۔ تنگ دست ہے۔ تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق مطلقہ کو ادا کرے۔ اس مقام پر فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ عورت کو کم از کم ایک جوڑا کپڑے دینا ضروری ہے۔ جس میں تین کپڑے شامل ہوں ایک بڑی چادر ایک دوپٹہ اور ایک کرتہ۔ جو جسم کو ڈھانپ لیں۔ تاہم یہ ہے۔ کہ مالدار اچھا قیمتی جوڑے دے اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے یہ تو ایسی عورت کیلئے ہے جس کا مہر مقرر نہیں ہو سکا اور طلاق واقع ہو گئی۔ البتہ جن کے مہر مقرر ہوں ان کو حق مہر تو ادا ہو گا، اس کے علاوہ کپڑے دینا بھی مستحب ہے، اسی کو فرمایا مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ یہ متاع دستور کے مطابق دو۔ مطلقہ عورت کا حق غصب نہ کرو۔ فرمایا حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ یہ چیز صاحب ایمان نیکو کاروں پر لازم ہے۔ لہذا اس میں کوتاہی نہ کریں۔ بلکہ مطلقہ کو ضرور اس کا حق ادا کریں۔

مہر مثل

طلاق کے علاوہ ایک صورت بیوگی کی بھی ہے۔ اگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر نہیں ہوا اور میاں بیوی کی خلوت بھی نہیں ہوئی اور خاوند مگر گیا تو اب عورت کس چیز کی حقدار ہے۔ ایسی صورت میں عورت مہر مثل کی حقدار ہوگی۔ شریعت میں مہر مثل سے مراد ایسا مہر ہے۔ جو ایسی عورت کے خاندان کی دوسری عورتوں کا عاظم پر مقرر ہوتا ہے۔ جب ایسی صورت پیش آجائے تو پھر دیکھا جائے کہ اس خاندان یا بلوری میں اس حیثیت کی عورتوں کا کیا مہر مقرر ہوتا ہے۔ اس کے مطابق اس عورت کو بھی مہر ادا ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ عورت خاوند کی وراثت کی بھی حق دار ہوگی۔ اور اسے چار ماہ دس دن کی مقررہ عدت بھی گزارنا ہوگی۔

آج کے درس کی دوسری آیت کریمہ نصف مہر کے متعلق ہے۔ یہ کس حالت میں ادا کیا جاتا ہے۔ فرمایا: وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً لَوَ أَنْتُمْ ایسی حالت میں عورتوں کو طلاق دو کہ ان کے قریب نہیں گئے۔ مگر نکل کر نے وقت مہر مقرر کیا تھا۔ اور وہ طلاق ہونے سے قبل ادا نہیں ہوا۔ فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ آپس نصف ہے جو تم نے مقرر کیا تھا یعنی اگر بغیر مقادیرت کے طلاق ہو گئی ہے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہو گا۔ یہ تو کم از کم ہے۔ کہ اتنا ضرور ادا کرو۔ البتہ سلف میں یلے واقعات بھی ملتے ہیں۔ کہ انہوں نے واجب الادا مہر سے زیادہ بھی دیا۔ مثلاً حضرت حسن بن علی بن ابی طالب کے متعلق آتا ہے کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آگیا۔ بغیر مجامعت کے عورت کو طلاق دے دی۔ تو ایک روایت کے مطابق انہوں نے دس ہزار درہم اولیہ کے اور دوسری کے مطابق بیس ہزار درہم کی رقم حق مہر کے طور پر ادا کی۔ مقصد یہ تھا کہ جدا ہونے والی عورت کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو۔ لہذا اُسے احسن طریقے سے رخصت کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کر دیا۔ کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو اور طلاق واقع ہو گئی تو عورت کو کم از کم کپڑوں کا ایک جوڑا دیے دو۔ اور اگر مہر مقرر ہوا تھا۔ تو کم از کم اس کا نصف ادا کرو۔

لَا أَنْ يَعْفُوَنَّ البتہ ایک صورت میں ادائیگی مہر سے بچ سکتے ہو کہ وہ عورتیں خود مہر معاف کر دیں۔ کہ ٹھیک ہے ہم نہیں لیتیں جاؤ معاف ہے۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بَيْنَهُ عَقْدَةُ النِّكَاحِ یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے یعنی طلاق ٹینے والا مرد معاف کر دے۔ مردوں کا معاف کر دینا بدین معنی ہے۔ کہ وہ نصف کی بجائے پورا حق مراد کر دیں۔ یا اگر پورا ادا کر چکے ہیں۔ تو نصف واپس نہ لیں بَيْنَهُ عَقْدَةُ النِّكَاحِ سے اکثر مفسرین نے خاندن مرد لیا ہے۔ جس کے ہاتھ میں طلاق کی گرہ ہے۔ یعنی طلاق ٹینے کا حق صرف مرد کو ہے۔ عورت تو زیادہ سے زیادہ عدالت سے نفع حاصل کر سکتی ہے مگر طلاق مرد کا ہی حق ہے۔ بعض نے اس سے مراد عورت کا ولی بھی لیا ہے۔ مگر

لہ قرطبی ج ۲۰ (فیانی)

راج قول پہلا ہی ہے۔ فرمایا اے مردو! اِنْ تَقَعُوا اِذَا كُنْتُمْ مَعًا كَرِهَ لَكُمْ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی
یہ بات تقویٰ سے قریب تر ہے لہذا اگر پرہیزگاری اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو معاف ہی
کر دیا کرو۔

فضیلت کی
پامٹری

پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کے قوام یعنی قوی بنایا۔ نیز یہ
بھی بیان ہو چکا ہے کہ لِّلرِّجَالِ حِلٌّ مِّمَّا يَمْلِكْنَ الْمَرٰٓئِمُ وَلَا لِّلْمَرٰٓئِمِ حِلٌّ مِّمَّا يَمْلِكْنَ الرِّجَالُ وَكَانَ اَوَّلُ بَرَاءَةٍ مِّنَ الْفِجَارِ اِنَّ الْفِجَارَ
فَضِيْلَتِ مائل ہے۔ لہذا اے مردو! تمہاری اس فضیلت کا تقاضا ہے۔ کہ
وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ تہاے درمیان اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت
رکھی ہے۔ اس کو مت بھولو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عورتوں پر برتری عطا کی ہے تو اس
برتری کا تقاضا ہے کہ تم عورتوں پر زیادہ احسان کرو۔ اور طلاق کی صورت میں اُدسے
کی بجائے پورا مہر ادا کرو یا اگر پورا ادا کر چکے ہو، تو اُدھا واپس نہ لو۔ بلکہ معاف کر دو۔
فَرَمٰ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ بیشک تمہاے سب کام اللہ تعالیٰ کی نگاہ
میں ہیں۔ وہ تمہاے ہر خیر و شر کو دیکھ رہا ہے۔ لہذا اس کے احکام کی پابندی کرو گے
تو اُس کے مقرب بن جاؤ گے۔ اگر خلاف ورزی کرو گے، تو پھر اس کی گرفت بھی
زیادہ دہریس ہے۔

سَبَقُولُ ۲

درس یکصد و دو (۱۰۲)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۳۸-۲۴۲

حُفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ
 قَنِتِينَ ۚ ﴿۲۳۸﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا
 أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا
 تَعْلَمُونَ ۚ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِينَ يَتُوفُونَ مِنْكُمْ وَبِذُرُونِ
 أَرْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ
 إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ
 فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ ﴿۲۴۰﴾
 وَلِلْمُطَلَّقاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّفِقِينَ ۚ ﴿۲۴۱﴾
 كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ ﴿۲۴۲﴾

۵۷۱۵

ترجمہ: حفاظت کرو سب نمازوں کی اور خصوصاً درمیانی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے
 سامنے عاجزی سے ﴿۲۳۸﴾ پس اگر تم خوف کی حالت میں ہو، پس پیدل یا سواری پر نڈ
 ادا کرو۔ پھر جب تم امن کی حالت میں ہو۔ پس اللہ کو یاد کرو جیسا کہ اُس نے تم کو تعلیم کی
 جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۲۳۹﴾ اور وہ لوگ جو تم میں وفات پائے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی
 بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی عورتوں کے بارے میں وصیت کر جائیں ایک سال تک۔
 فائدہ اٹھانے کی بغیر نکالے۔ اور اگر وہ عورتیں خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں اُس
 بات میں جو وہ اپنے حق میں کریں دستور کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کمال قریب مالک
 اور حکمت والا ہے ﴿۲۴۰﴾ اور طلاق والی عورتوں کے لیے فائدہ اٹھانا ہے۔ دستور کے
 مطابق۔ یہ بات لازم ہے متقیوں پر ﴿۲۴۱﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے

یہ بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ (۴۳)

رابطات

گزشتہ آیات میں طلاق، عدت اور حتیٰ مهر کے مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ اب درمیان میں در آیتیں نماز کے متعلق ہیں۔ اور اس کے بعد پھر طلاق اور عدت کے مسائل ہیں۔ لہٰذا ہر ایک ہی نوعیت کے مسائل کے درمیان نماز کی یہ آیتیں بے ربط معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور بعض دیگر بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہاں پر یہ بات سمجھانا چاہتا ہے کہ دیکھو، نکاح، طلاق، عدت کے مسائل میں مشغول ہو کر کیا میں نماز سے غافل نہ ہو جانا۔ نکاح طلاق کے مسائل ہی ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ بعض اوقات گفتگو طول پکڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تمہاری نماز نہیں چھوٹنی چاہیے۔ اس کا ہر حال میں خیال رکھو۔ اس طرح گویا نماز والی آیات دوسری آیات سے مربوط ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہؒ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ نماز کی آیات کو دیگر آیات سے اس طور ربط ہے کہ گزشتہ اور آئندہ آیات میں نکاح، طلاق، عدت وغیرہ جیسے معاشرتی مسائل کا تذکرہ ہے۔ اور یہ مسائل تدبیر منزل کے مسائل کہلاتے ہیں۔ حقیقت ان مسائل پر عدل کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یعنی احکام کی پابندی کرو۔ تقویٰ اختیار کرو۔ ظلم و زیادتی نہ کرو، بچوں والی اور مطلقہ عورتوں کا حق ضائع نہ کرو۔ بیویوں کے حقوق ادا کرو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا حکم دیا ہے یعنی عدل اور احسان اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ یعنی معاشرے میں عدل و انصاف کو قائم کرو اور احسان بھی کرو۔ تو یہ معاشرتی مسائل عدل کے تحت آتے ہیں۔ جب کہ نماز کی ادائیگی احسان کی تعریف میں آتی ہے کہ نماز ادا کرنے سے انسان محسن بنتا ہے، انجھوکاری اختیار کرتا ہے تو یہاں پر دونوں طرح کے مسائل کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ عدل و احسان کے تقاضے بیک جا پورے کیے جا سکیں۔ اس طرح یہ آیات آپس میں مربوط ہیں۔

عدل کے مسائل تو گزشتہ کئی دروسوں میں آئے ہیں۔ اور آئندہ بھی آئیں گے۔

سلاۃ و علی

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے احسان کا مسئلہ بیان فرمایا حَافِظُوا عَلَی الصَّلَٰتِ وَالصَّلَٰةِ
الْمَوْحُطِ ساری نمازوں کی حفاظت کرو۔ اور خاص طور پر صلوٰۃ وسطیٰ کی۔ درمیان میں نماز
 کے متعلق بہت سے اقوال ہیں۔ کسی نے اُسے فجر کی نماز بتایا ہے۔ کسی نے ظہر کی کسی
 نے مغرب کی اور بعض نے عشاء کی، مگر رائج قول یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی
 نماز ہے۔ اور یہ نبی علیہ السلام سے ثابت ہے۔ اس نماز کی اہمیت اس وجہ سے ہے
 کہ یہ نماز دو رات کی (مغرب اور عشاء) اور دو دن کی (فجر اور ظہر) کے درمیان واقع ہے
 اور یہ وقت نسبتاً زیادہ مشغولیت کا ہوتا ہے۔ کاروبار کی وجہ سے اس نماز کے ضائع
 ہونے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی حفاظت کی زیادہ تاکید فرمائی گئی
 ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فجر کی نماز کے وقت اور پھر عصر کی نماز کے وقت اُن
 فرشتوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ جو بندوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں لے جاتے
 ہیں۔ لہذا یہ وقت بڑا اہم ہے، ترمذی شریفین کی روایت میں آتا ہے۔ مَنْ قَامَتْهُ
صَلٰوةُ الْعَصْرِ فَكَأَنَّهُ وَشَرَّ اَهْلِهِ وَمَالِهِ یعنی جس کی عصر کی نماز فوت ہو گئی گویا
 اس کا اہل اور مال سب کچھ ہلاک کر دیا گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمام نمازوں کی حفاظت کرو
 مگر خاص طور پر درمیانی نماز کی حفاظت کرو۔ وَقُوْهُمُوْا لِلّٰہِ قَبِيْثٰتٍ اور اللہ تعالیٰ کے
 سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ گویا نماز میں پوری توجہ اسی طرف لگا دو۔ ادھر
 ادھر کا خیال دل میں نہ لاؤ۔ بلکہ یہ تصور کر دو کہ تم احکم الحاکمین کے حضور دست بستہ کھڑے
 ہو، لہذا پوری توجہ کے ساتھ نماز کو ادا کرو۔ ایسی ہی حالت کے متعلق حضور علیہ السلام نے
 فرمایا تھا کہ احسان اس بات کا نام ہے۔ اَنَّ قُبْدَ اللّٰہِ کَانَکَ تَسْرَہُ یعنی عبادت
 کے وقت تیری کیفیت یہ ہونی چاہیے گویا کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ جب
 اس کے حضور میں نماز کے لیے کھڑا ہے تو اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا
 ہے۔ فرمایا اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے۔ تو کم از کم اتنا تو ہے۔ فَاِنَّہٗ یَسْرِکُ
 کہ وہ تو مجھے بہر حال دیکھ رہا ہے۔ لہذا نماز کے لیے نہایت موزوں طریقے سے
 کھڑے ہو کہ تمہارے دل میں خشیت الہی ہو۔ اور تمہاری حرکات و سکنات عاجزی کا اظہار ہو۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ دُكْبَاءَ إِنْ لَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ خُفُوفُ أَلْبُسِكُمْ فَخَلُّوا سَبِيلَكُمْ فَإِذَا تَوَلَّوْا فَانْصِبُوا كَأَن لَّمْ تُوَفَّقُوا عَلَى الْبَرِّ فَإِنْ لَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ خُفُوفُ أَلْبُسِكُمْ فَخَلُّوا سَبِيلَكُمْ فَإِذَا تَوَلَّوْا فَانْصِبُوا كَأَن لَّمْ تُوَفَّقُوا عَلَى الْبَرِّ

یا ساری پر نماز ادا کر لو۔ خوف سے سر اور دشمن کا خوف ہے۔ جب دشمن کے ساتھ حالت جنگ ہو۔ اور میدان کارزار میں نماز کا وقت آجائے تو جنگ سے فارغ ہو لے۔ ایک نماز کو مؤخر نہ کرو۔ بلکہ اُس وقت اگر تم پیدل چل رہے ہو یا سواری پر ہو اور دشمن کا ہر آن خطرہ ہے۔ تو سواری کے اوپر بیٹھتے پلٹتے ہی نماز ادا کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ وہ قبول کر لیا ہے۔ بغیر سواری کے پیدل امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز درست نہیں ہے۔

عین جنگ کی حالت میں مجاہدین کے دو گروپ بنا کر نماز کی ادائیگی کا ذکر آتا ہے۔ ایک گروپ دشمن سے لڑتا ہے اور دوسرا نماز ادا کر لے۔ پھر دوسرا دشمن کے مقابلے پر ہو اور پہلا نماز ادا کر لے۔ اور اگر مجاہدین ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں جیسا کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ کی خواہش ہوتی تھی۔ تو پھر دونوں گروپ آدمی آدمی نماز امام کے ساتھ پڑھیں گے اور باقی آدمی آدمی خود پوری کریں گے۔ اگر دو رکعت نماز ادا کرنا ہے تو ایک گروپ امام کے پیچھے کھڑا ہوگا اور دوسرا دشمن کے مقابلے میں رہے گا۔ جب امام کے ساتھ ایک رکعت مکمل ہو جائے گی تو پہلا گروپ پیچھے ہٹ کر سوچے سنبھال لے گا اور حفاظت پر مامور دوسرا گروپ امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شامل ہو جائے گا۔ اس طرح دونوں گروپ ایک ایک رکعت امام کے ساتھ ادا کریں گے اور دوسری رکعت خود پوری کریں گے۔ اگر نماز چار رکعت والی ہے۔ تو ہر گروپ دو دو رکعت امام کے ساتھ پڑھے گا۔ اور باقی دو دو رکعت خود مکمل کر لے گا۔ یہ اسی صورت میں ہے کہ مجاہدین کسی خاص نیک آدمی کے ساتھ جماعت میں شامل ہونا چاہیں۔ ورنہ ہر گروپ اپنی اپنی پوری نماز بیک وقت ادا کر لے گا۔

حضور علیہ السلام نے سفر اور اقامت ہر دو حالتوں میں چھ یا دس دفعہ صحابہ کرامؓ کو صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ آپ نے سفر کی حالت میں دو رکعت اور اقامت کی حالت میں چار رکعت نماز پڑھائی۔

فَرِيًّا فَإِذَا أَصْنَعْتُمْ جَبْتُمْ اِمْنًا كَالْمَالِ فِي مِصْرَ عَدُوٍّ دُوْرٍ هُوَ بَائِسٌ -

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمُوْهُ لَا تَنْسَوْنَ اللّٰهَ كَمَا نَسِيَ اِبْرٰهِيْمُ وَنَحْلُوْهُ اِذْ كَانَ مِنَ الْبٰرِئِيْنَ
 تمہیں تعلیم دی ہے۔ یعنی رکوع، سجود، قعدہ وغیرہ جو بھی شرائط ہیں، انرا نسی، واجبات بنیں
 اور استحبات ہیں سب کی رعایت رکھو۔ اللہ نے تمہیں ایسی تعلیم دی ہے۔ مَا لَكُمْ
 تَكُوْنُوْنَ تَعْلَمُوْنَ جو تم نہیں جانتے تھے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی
 ہے کہ اُس نے اپنی عبادت کا وہ طریقہ بھی بتلادیا ہے۔ جسے وہ پسند کرتا ہے۔ پس
 اس طریقے کے مطابق اللہ کا ذکر کرو۔

نماز کے تذکرے کے بعد اب پھر عورتوں کے مسائل کا بیان ہے فرمایا
 وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا۔ تم میں سے جو
 لوگ وفات پئے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وَرِصَّةٌ
 اَزْوَاجِهِمْ وہ اپنی بیویوں کے حق میں وصیت کر جائیں مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
 عَنِ الْخُرَاجِ کہ وہ ایک سال تک فائدہ اٹھائیں بغیر گھر سے نکلنے کے فَإِنْ
 خَرَجْنَ اور اگر وہ خود بخود نکل جائیں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ يَّكُوْنَا لِهِنَّ
 نہیں فِی مَا فَعَلْنَ فِیْ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ کہ جو کچھ وہ اپنے معاملہ میں
 دستور کے مطابق کرنا چاہیں۔ بقصد یہ ہے کہ مردوں پر یہ لازم ہے کہ عورتوں
 کیلئے وصیت کریں کہ کم از کم ایک سال تک اُن کے گھر میں معمول کے مطابق بیٹھی رہیں۔ اُن کے
 تمام اخراجات بھی پورے کیے جائیں۔ اِن اگر عورتیں خود اپنے متعلق کوئی دوسرا
 فیصلہ کر لیں۔ یعنی دوسرا نکاح کرنا چاہیں۔ تو پھر وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ تم پر اس
 کا کچھ گناہ نہیں۔ انہیں اپنا فیصلہ خود کرنے دیں۔ اس میں رکاوٹ بھی نہیں۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایک سال کی وصیت کا قانون اُس وقت
 تک تھا جب تک بیواؤں کے لیے چار ماہ دس دن کی عدت مقرر نہیں ہوئی تھی
 اس وقت عورتیں سال بھر خاندان کے گھر رہ سکتی تھیں۔ پھر جب اللہ نے عدت کی
 آیات نازل فرمائیں۔ تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ بعض دوسرے مفسرین کرام کا قول ہے

کہ کوئی بھی حکم منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ اصل عدت تو چار ماہ دس دن ہی ہے۔ مگر ایک سال کی وصیت عورت کے ساتھ مزید احسان ہے۔ کہ اُسے عدت کے فوراً بعد گھر سے نہ نکال دیا جائے۔ بعض اوقات عورت کے مال باپ بھی نہیں ہوتے جن کے پاس چلی جائے اور نکاح ثانی کا بھی فری بند و بست نہیں ہو سکتا، لہذا ایک سال تک انہیں گھر سے نہیں نکالنا چاہیے۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے اُن کے ساتھ احسان کا برتاؤ ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ بیوہ ہو چکی ہے وہ پہلے ہی غم و اندوہ سے نڈھال ہے۔ اس کے ساتھ مزید سختی نہایت ہی ناپسندیدہ فعل ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں کہ ایک سال بٹھرنے کی رعایت عورت کو اُس وقت تک حاصل تھی جس وقت تک وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ پھر سورۃ نسا میں مذکور تمام شتے داروں کے حصے مقرر کر دیے گئے۔ اگر خاندن مر جائے تو بیوی کا حصہ بھی مقرر ہوا۔ یعنی اگر اولاد موجود ہے تو کل وراثت کا اٹھواں حصہ اور اگر اولاد نہیں ہے تو چوتھا حصہ مقرر ہوا۔ لہذا اب سال بھر کی رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عورت کو وراثت میں حصہ مل گیا ہے۔ فرمایا وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ یہ احکام خداوند تعالیٰ نازل کر رہا ہے جو کمال قوت کا مالک ہے۔ اور حکمت والا ہے۔ نہ کوئی کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اور نہ ہی کوئی کام حکمت سے خالی ہے اس لیے اِن احکام پر پورا پورا عمل کرنا چاہیئے۔

فرمایا وَلِلْمُطَلَّقاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْدُوْنِ مطلقہ عورتوں کو فائدہ پہنچانا ہے دستور کے مطابق۔ یعنی طلاق کی مختلف صورتوں کی نسبت سے ان کے حقوق

مطلقہ کے
حقوق

ادا کرو۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ایسی عورت جسے مقاربت سے پہلے طلاق ہو گئی اور اس کا مہر بھی مقرر نہیں ہوا، اُس کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق ایک جرّاء کپڑے دو جس میں ایک قمیص، ایک دوپٹہ اور ایک بڑی چادر ہو۔ یا ایک دوپٹہ اور دو چادریں ہوں۔ یہ واجب ہے۔ ایسی عورت جس کا مہر مقرر ہو چکا ہے۔ مگر بغیر مقاربت کے طلاق ہو گئی۔ اس کو نصف مہر ملے گا۔ یہاں پر جن عورتوں کا ذکر ہے

وہ عام طلاق یافتہ ہیں۔ جو ہر مثل یا پوسے ہر کی حقدار ہیں۔ فرمایا کہ اُن کو بھی کچھ نہ کچھ
 فائدہ پہنچاؤ۔ یہ مستحب ہے۔ اُن کو کچھ دے دلا کر رخصت کر دو۔ وہ طلاق کے غم میں
 مغموم ہیں۔ اُن کی دل جوئی ہوئی چاہیے ران کے لیے بھی ایک جوڑا کپڑے تو
 ضرور ہونے چاہئیں۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ یہ بات متقیوں پر لازم ہے۔

فرمایا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ اللہ تعالیٰ اسی طرح
 تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے۔ آیت کے مختلف معانی آتے ہیں
 مثلاً دلیل، معجزہ، نشانہ وغیرہ تاہم یہاں پر آیت سے مراد اس کے احکام ہیں۔
 جنہیں اللہ تعالیٰ تمہارے لیے نازل کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ تاکہ
 تم انہیں اچھی طرح سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اگر احکام پر چلتے رہو گے تو سعادتمند
 کی منزل پاؤ گے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکمہ سرہ (۱۰۳)

آیت ۲۳۳ تا ۲۴۵

لَمْ تَرَالِيَ الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ
 حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا فَهُمْ أَحْيَاهُمْ
 إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا
 يَشْكُرُونَ ﴿۲۳۳﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
 سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۳۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا
 حَسَنًا فَيُضْعِفُهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۖ وَاللَّهُ يَفِضُ وَيَمْصُطُ
 وَلِيَهُ تُرْجَعُونَ ﴿۲۳۵﴾

ترجمہ: کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن لوگوں کو جو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ
 ہزاروں کی تعداد میں تھے موت کے ڈر سے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرمایا جاؤ
 پھر اُن کو زندہ کیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر
 لوگ شکریہ ادا نہیں کرتے ﴿۲۳۳﴾ اور اللہ کے راستے میں لڑو اور جان لو کہ
 اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے ﴿۲۳۴﴾ کون ہے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ
 کو قرض دے، اچھا قرض۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے لیے دگنا کر دے گا۔ کئی گنا
 اور اللہ تعالیٰ تنگی کرتا ہے۔ اور کشائش کرتا ہے۔ اور تم سب اُن کی طرف سے جاؤ ﴿۲۳۵﴾

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا ۖ سَلِّ عَلَىٰ رَسُولِ اللَّهِ ۚ

ربطیات

نے بہت سے احکام بیان فرمائے ہیں جن کا تعلق پر یعنی نبی کے ساتھ ہے۔ ان میں
 نکلج، طلاق، عدت اور ان کے تعلقات بیان ہوئے ہیں۔ حلت اور حرمت کا
 مسئلہ بھی آیا ہے۔ اس کے علاوہ عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق مسائل
 کا بیان ہوا ہے۔ اب یہاں سے جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا تذکرہ شروع ہو

ہو رہا ہے۔ پہلی آیت مسئلہ جہاد فی سبیل اللہ میں تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد حاکم کے انتخاب اور اس کے تحت جہاد میں حصہ لینے کا تذکرہ ہے کسی پہلی امت کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ کہ وہ لوگ جہاد سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے راستے میں اُن پر موت طاری کر دی۔ پھر انہیں عجیب و غریب طریقہ سے دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔

اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اَلَمْ تَرَ کَیۡۤا تُوۡنَہٗۤنَ لَیۡسَ دِیۡکَیۡکُمۡ اِلَیَّ مُخَاطَبٌ۔ تَرَ کا لفظ روایت سے مشتق ہے جس کے معنی دیکھنے کے ہیں مگر روایت بھی دو قسم کی ہے۔ ایک روایت بصری یعنی اس ظاہری آنکھ سے دیکھنا اور دوسری قسم ہے روایت قلبی یعنی علم کے ذریعے کسی چیز کو جان لینا۔ جیسے کسی کو کہا جائے اَلَمْ تَعْلَمُوۡا کیا تو نہیں جانتا۔ تجھے یہ بات معلوم نہیں۔ دوسرے لفظوں میں بتجھے یہ بات ضرور معلوم ہے۔ چنانچہ موقع محل کے مطابق بعض اوقات روایت کے معنی آنکھ سے دیکھنا ہوتا ہے اور بعض اوقات علم سے جانتا۔ مفسرین کہ ام بیان فرماتے ہیں کہ یہاں پر اَلَمْ تَرَ سے مراد علم کے ذریعے جانتا ہے، نہ کہ ظاہری آنکھ سے ظاہر ہے کہ اب جو واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ وہ پہلی امتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا اس زمانہ میں اس واقعہ کو آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں، البتہ بعد میں اس کا علم ہوا ہے۔ یہ واقعہ حضور علیہ السلام کے زمانہ یعنی نزول قرآن سے بھی پہلے کا ہے اس لیے اُس وقت بھی یہ روایت بصری نہیں تھی۔ بلکہ روایت قلبی یا روایت علمی تھی۔ اس طرح کا اسلوب بیان بعض دوسری آیات میں بھی ملتا ہے۔ جیسے اَلَمْ تَرَ اِلَیَّ الَّذِیۡۤیۡ حَآجَّ اِنۡدِہِمۡ فِیۡ رَیۡۤتِہٖ کیا تو نے اُس شخص کی طرف نہیں دیکھا۔ جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اُس کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔ سورۃ فیل میں فرمایا اَلَمْ تَرَ کَیۡفَۤا فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الْفِیۡلِ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ واقعات خود حضور علیہ السلام کے زمانے سے بہت پہلے کے ہیں۔ مگر لفظ اَلَمْ تَرَ ہی لایا گیا ہے مقصد یہ

مرض میں مبتلا ہو جائیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی روایت میں بھی آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دبا کی مرض دس خطے سے باہر نکلے اور نہ دباں جانے کی کوشش کرے۔ ہر حال یہ احتیاطی تدبیریں ہونگی جس کی موت لکھی جا چکی ہے۔ وہ رک نہیں سکتی۔ وہ جہاں بھی ہوگا، اُس پر موت، طاری ہو جائے گی، اور پھر یہی حال ان بھاگنے والوں کا ہوا۔ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا اَللّٰهُ تَعَالٰی نے اُن سے کہا کہ مر جاؤ۔ وہ جس وجہ سے بھی بھاگ کر پہاڑوں میں پہنچے اللہ نے اُن پر وہی موت طاری کر دی، اور ان کا اپنے گھروں سے بھاگ نکلنا کچھ کام نہ آیا۔

ان لوگوں کی دوبارہ زندگی کے متعلق کئی ایک روایتیں ہیں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اُس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے بنی حزیل علیہ السلام موجود تھے، جن پہاڑی دروں میں یہ لوگ پناہ گزین ہوئے وہاں حزیل علیہ السلام بھی کبھی عبادت کے لیے آتے تھے ان لوگوں کی موت کے بعد جب اللہ کے بنی حسب معمول عبادت کیلئے گئے، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُن دروں میں ہر طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں، انہیں علم نہیں تھا کہ کونسا واقعہ پیش آیا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اُن مردوں کو دوبارہ زندگی عطا کر دی۔ ثُمَّ اَحْيَاہُمْ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ کر دیا۔

اس مقام پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دوبارہ زندگی ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور معجزانہ طور پر عطا ہوئی وگرنہ موت کے بعد دوبارہ میل ملاپ کی زندگی تو قیامت کو ہی ملے گی تاہم اس قسم کے غیر معمولی واقعات، کچھ اور بھی ملتے ہیں۔ جیسے اسی سورۃ بقرہ میں عایل کا واقعہ ہے۔ جسے اُس کے عزیزوں نے قتل کر دیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت اللہ تعالیٰ نے درمیانے مقتول کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور گوشت کا ٹکڑا مرے کو لگانے سے وہ زندہ ہو گیا۔

یہ سوال کہ یہ لوگ کتنا عرصہ موت کی آغوش میں بہنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے۔ اس بات میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اُن کی موت کے آٹھ دن بعد حضرت حزیل علیہ السلام آئے تو اُنکی دُعا سے اُن لوگوں کو دوبارہ زندگی

ملی۔ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن لوگوں کو جسے اللہ نے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اور ان کے جسم گل سٹر پکے تھے صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جب کہ اللہ نے انہیں زندہ کیا۔

اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں امام ابو جبر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ عذاب قبر کا انکار کرنے والے باطل پر ہیں۔ جس طرح اس قوم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد پھر زندہ کر دیا تھا۔ اسی طرح ہر مرنے والے کو برزخی زندگی عطا کرنا ہے۔ نیکو کاروں پر انعام ہوتے ہیں۔ اور گنہگاروں کے سخت ٹھہرتے ہیں۔ بعض دوسری آیات اور احادیث مبارکہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے۔ کہ برزخ میں بھی لوگوں کو سزا و جزا جھلکتا پڑتی ہے۔ اگرچہ حقیقی جزا و سزا تو قیامت کو ہی ہوگی، تاہم قبر میں بھی سکون و راحت یا سزا و عذاب ہوتا ہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَدْ أَحْيَا هُمْ پھر اللہ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا۔ بائبل کی روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت و زندگی کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد وہ حقیقت حال کو سمجھ گئے۔ اللہ سے معافی مانگی، جہاد میں حصہ لیا۔ فلسطینیوں کے خلاف جہادِ مردی کے جوہر دکھائے اور آخر اُن کو فتح حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا کیا۔

موت و حیات قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کی جتنی زندگی مختار کی ہے۔ اس سے پہلے انسان کی موت واقع نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے زیادہ زندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا اس خوف سے جہاد سے گریز نہ کرنا کہ موت آجائیگی ایہ حرام ہے۔ حضور کا فرمان ہے لَنْ تَمُوتَ نَفْسٌ حَتَّى تَسْكُمَلَ بِرِزْقِهَا جب تک انسان اپنی روزی پر بی نہیں کر لیتا، اس کی موت نہیں آتی۔ لہذا حرام روزی تلاش نہیں کرنی چاہیے۔ اسی لیے فرمایا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَجْمِلُوا أَمْرَكُمْ اور اچھے راستے پر چلو۔ چاہے کتنے بڑے حادثات پیش آجائیں موت قبل از وقت نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس کے لیے وقت متعین ہے۔ انسان کو اپنا فرض ادا کرتے

جہادِ حُر
حرام ہے

رہنا چاہیے خواہ جہاد میں سر و سرِ مکر کی بازی لگانا پڑے۔ جب تک اللہ کو منظور ہے اُسے موت نہیں آسکتی۔ نہ دشمن اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی موت بستر پر واقع ہوئی، حالانکہ آپؓ نے زندگی میں جی بھر کر جہاد کیا۔ بڑی بڑی جنگوں میں شہر کی کمانڈ کی۔ آپؓ کما کرتے تھے، خدا تعالیٰ بذول کی آنکھ کو ٹھنڈا نہ کرے، میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں، جس پر تبر، تلوار یا نیزے کا زخم نہ ہو آرزو تھی کہ میدان جہاد میں شہادت نصیب ہو، مگر افسوس کہ آج بستر پر موت آرہی ہے بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی ساری زندگی بھی جہاد میں گزری، اُن کے جسم کا کوئی حصہ بھی زخموں سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ اعضا مستورہ پر بھی نیزے کا زخم تھا، مگر اُن کو بھی میدان جہاد میں شہادت کی موت نہ مل سکی۔ لہذا انسان کا فرض ہے کہ موت کے خوف کو دل سے نکال دے اور فریضہ جہاد کو انجام دیتا ہے۔

فَرَمَا إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، اللَّهُ تَعَالَى بَرُّ الْفَضْلِ كَرَمُ الْوَالِدِ
وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ مگر اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یعنی اس کی قدرت پر یقین نہیں رکھتے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بیان کئے کہ موت و حیات کی حقیقت کو سمجھا دیا۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ شیطان لوگوں کو بھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی مال خرچ کرنا چاہے تو شیطان کہتا ہے دیکھتا تھا اُسے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اور اگر کوئی جہاد میں شرکت کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اس کے کان میں کہتا ہے سوچ سمجھ لو، تمہارے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ حالانکہ موت و حیات ایک اہل حقیقت ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید کردہ فریضہ کو انجام دیتا ہے اور موت کو خاطر میں نہ لائے۔

جہاد کے اس تمہیدی طور پر ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جان و مال کے ذریعے جہاد کا صریح حکم دیا۔ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اس کے دین کی سر بلندی کے لیے دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ

کیونکہ موت وحیات تو انہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وقت معین سے پہلے نہ موت آسکتی ہے اور نہ وقت معین کے بعد زندگی باقی رہ سکتی ہے۔ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو سنتا ہے۔ ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے۔ اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ کوئی شے اس کے اعاطہ علم سے باہر نہیں۔ لہذا اپنی جان کو اللہ کی راہ میں پیش کر دو۔ اس کا حکم ہے جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ اگر اس مالک الملک نے جان کی قربانی قبول کر لی۔ تو اس سے اچھا سودا کیا ہو سکتا ہے۔ اُس کا نرا اعلان ہے إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ اُس نے تو مؤمنوں کے جان و مال جنت کے بدلے خرید رکھے ہیں۔

جہاد بالمال

جہاد بالمال کے متعلق فرمایا مَنْ ذِي الذِّمِّي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے۔ قرض حسن۔ اللہ کو قرض دینا یہ ہے کہ اُس کے راستے میں مال کے ذریعے جہاد کیا جائے اس کو قرض حسن اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کو یقین کامل ہو جائے کہ جہاد میں لگائی ہوئی اُسکی رقم ضائع نہیں جائے گی۔ اس کا بدلہ اُسے بڑھا چڑھا کر مل جائے گا فَيُضَاعِفُهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً اس قرض حسن کو اللہ تعالیٰ دگن، بلکہ کئی گنا کر دے گا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خلوص کے ساتھ دیا ہوا کھجور کا ایک دانہ، اُحد پہاڑ کے برابر بڑھ کر واپس ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے اجر و ثواب کو اس قدر بڑھا دیں گے۔ جو شخص فی سبیل اللہ ایک پیسہ خرچ کرے گا، اُس کو کم از کم دس گنا تو ضرور ملیگا کہ یہ قطعی قانون ہے مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امِّثْلِهَا البتہ جہاد میں خرچ ہونے والے مال کے بدلے کی کم از کم مقرر سات سو گنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی کوٹن کی لمبائی جہاد میں مضمر ہے۔

جہاد کی ہمت

جہاد بالمال اور جہاد بالنفس دونوں بڑی اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ اگر جہاد سے گریز ہو گا، تو نہ عزت ہوگی اور نہ دین کا غلبہ باقی رہے گا۔ بے دین اور کافر

طاقتیں غالب آجائیں، حضور علیہ السلام کے ارشاد سے اور قرآن کریم کے مطابق جہاد سے گریز کرنے والے فاسق ہو جاتے ہیں یا منافق ہو جاتے ہیں۔ البوداد و شریف کی روایت میں ہے کہ اگر تم جہاد کو ترک کر کے تجارت، کھیتی باڑی یا دوسرے کاموں میں منہمک ہو گئے یَسْلُطُ اللَّهُ عَلَيْكُمْ الذِّكْلَةُ تَوَاشِدُ تَعَالَى تَمَّ بِذَلَّتْ سَلْطَ كَر دیکھو حَتَّى تَرْجِعُوا إِلَى دِينِكُمْ اور جب تک دین کی طرف واپس نہیں آؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تم سے ذلت کو دور نہیں کریں گے۔ جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد موجود تھا اُن کو عزت اور غلبہ مل تھا۔ جب جذبہ جہاد میں کمی واقع ہوئی تو نہ عزت رہی نہ غلبہ غیر اقوام کی ملی ہلکت سے مسلمان آپس کی جنگ و جدال میں مصروف ہیں۔ یہ انگریزی تہذیب کا اثر ہے کہ ہم اپنے اکابرین کو بھول کر غیر اقوام کے گن کا سبے ہیں۔ دنیا میں چالیس سے زیادہ اسلامی سلطنتیں ہونے کے باوجود ان پر سپر پاورز کا غلبہ ہے اس قسم کے تجربات گزشتہ تاریخ میں بھی ملتے ہیں۔ جب عیسائیوں نے سپین (اندلس) پر قبضہ کیا تو وہاں مسلمانوں کی آبادی دو کروڑ کے قریب تھی۔ مگر بعد میں وہاں صرف گیارہ ہزار باقی رہ گئے، کچھ مائے گئے، کچھ جبر عیسائی بنائے گئے۔ یہ مسلمانوں کی آپس کی نا اتفاقی ہے کہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ایران اور عراق کئی سالوں سے دست و گریباں ہیں۔ دونوں اسلامی ملکوں کی طاقت کمزور ہو رہی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ کسی غیر مسلم قوم کو موقع مل جائے۔ اور یہ دونوں اُن کے قبضہ میں چلے جائیں۔ روس اور امریکہ ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ افغانستان میں کیا ہوا۔ یکے بعد دیگرے کتنے سربراہ قتل ہوئے، ملک کمزور ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ روس بزرگ مشیر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔ "فَلَمَسْتَبْرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ -

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے متعلق ان دروس میں کئی دفعہ بیان آچکا قرضِ حق ہے۔ یہاں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اتفاق فی سبیل اللہ کو قرضِ حق سے تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اُس کو قرضِ لینے کے مترادف ہے جو وہ کئی گن بڑھا کر دیگا۔ اس سے پہلے اس ضمن میں آچکا ہے وَلَا تَلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ

إِلَى التَّهْلُكَةِ مال کو روک کر پہنچے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حضرت شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ قرض حسن وہ قرض ہے جسکی واپسی کا تقاضا نہ کیا جائے بمقروض پر احسان نہ جتایا جائے اس کو حقیر نہ سمجھا جائے اور اس سے بدلہ نہ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو قرض لینے سے مراد جہاد میں خرچ ہے۔ یا غریبوں کو محتاجوں کی اعانت ہے۔ اس کا بدلہ قطعی طور پر آخرت میں کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائیگا۔ ایک شخص نے جہاد کے لیے ایک اونٹنی پیش کی۔ جس کے ساتھ ہمارا بھتی اور اس پر پالان کسا ہوا تھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، بہت اچھا کام ہے۔ قیامت کے روز اسے ایسی سات سو اونٹنیاں ملیں گی۔

قبض و بطن بظاہر خرچ کرنے سے مال کم ہو جاتا ہے مگر انسان کو جان لینا چاہیے وَاللّٰهُ يَفْضِلُ وَيَبْصُطُ قَبْضُ وَيَبْصُطُ تَر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا چاہتا ہے مال قبض کر لیتا ہے۔ اور جس کا چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ یہ اختیار اس نے اپنے پاس رکھا ہے۔ اور وہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کس کو کتنا مال دیا جائے۔ چنانچہ وہ اُس کے مطابق رزق میں کمی اور زیادتی کرتا ہے۔ لہذا انسان کا یہ وہم کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کا مال کم ہو جائیگا، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ انسان بڑا ناشکر گزار ہے۔ جب اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ تو اُسے زور بازو کا نتیجہ کہتا ہے اور جب وہ کم کر دیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے اور پھر کہتا ہے۔ کہ تنگی کے لیے میں ہی رہ گیا تھا۔ خدا پر شکوہ کرتا ہے۔ مگر اپنے کرتوت کو نہیں دیکھتا۔ کہ میرے افعال کیسے ہیں فرمایا یہ بات سین ختم ہونے والی نہیں ہے۔ وَالَّذِينَ سُرُّ جَعُولُونَ تم سب کو اُسی مالک الملک کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ لہذا جہاد بالنفس اور جہاد بالمال ہر دو طریقوں سے اللہ کو راضی کرو۔

تَجْفُولُ ۲

درس یکمہ چارہ (۱-۴)

الْبُقْعَةُ ۲

آیت ۲۴۶

الَّذِينَ تَرَأَى الصَّلَاةَ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ
 قَالُوا لِنَبِيِّنَا لَئِنْ لَمْ تَأْتِنَا بِآيَةٍ نَكُنَّ مِنْكَ لَمَكًا نَقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
 قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ أَنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا
 تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَالَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ
 أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءَنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ
 الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٢٤٦﴾

تو جمعہ کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف نہیں دیکھا، موسیٰ علیہ السلام
 کے بعد جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں
 تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اُس پیغمبر نے کہا کہ اگر تم پر لڑائی فرض کر دی جائے تو شاید
 تم نہ لڑو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کیا ہے کہ ہم نہ لڑیں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے
 گئے ہیں اور اپنی اولادوں سے علیحدہ کیے گئے ہیں۔ پھر جب اُن پر لڑائی فرض کر
 دی گئی تو اُن لوگوں نے روگردانی کی مگر بہت تھوڑے لوگوں نے ان میں سے۔

اور اللہ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو ﴿۲۴۶﴾

گزشتہ درس کی آیت کریمہ جہاد کے مسئلہ میں بمنزلہ تمہید تھی۔ اس میں جہادِ مال
 اور جہادِ نفس کی ترغیب دی گئی تھی۔ اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی ہوا۔ جب کہ
 کچھ لوگ جہاد کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک
 کر دیا۔ اور بنی زمانہ کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر زندہ کیا۔ اس سے ثابت
 ہوا تھا کہ لڑائی سے رُو فرار اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ موت و حیات تو
 قبضہ قدرت میں ہے۔ موت اپنے وقت میں نہ ہی آتی ہے۔ اس میں تقدیر و

دعا خیر کا کوئی امکان نہیں۔ پھر اسی آیت کے اگلے حصے میں لڑائی کا واضح حکم بھی دیا۔ کیونکہ جو قوم جہاد سے جی چراتی ہے۔ وہ مغلوب ہو کر قہرِ مذلت میں جا گرتی ہے۔

آج کے درس میں جہاد ہی کے متعلق تنظیم کا تذکرہ ہے جہاد ایک اجتماعی مسئلہ ہے اور اس کے لئے تنظیم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ گویا یہاں سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سیاسی نظام کے اصول و قواعد بیان فرمائے ہیں اور اس کے طریق کار کی وضاحت فرمائی ہے۔

دنیا بھر کا سیاسی نظام اجتماعییت سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن پاک نے اسلام کے سیاسی نظام کے مددِ فعال و غیر فعال کے علاوہ بعض دوسری سورتوں مثلاً سورۃ صفت، سورۃ حج، سورۃ انفال اور سورۃ تہرہ وغیرہ میں بیان کیے ہیں بلکہ ان سورتوں کے بعض مقامات تو اس نظام کے متعلق مستقل الابواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے اس لیے اس نظام کو چلانے کے لیے حاکم یا امیر کا تقرر لازمی ہے۔ خصوصاً جہاد جیسے اجتماعی کام کے لیے امیر لشکر کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی سرکردگی میں قوم جہاد میں حصہ لے سکے۔ بخاری، مسلم اور حدیث کی دیگر کتابوں میں امارت یا خلافت پر باب موجود ہیں۔ اور اس میں مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے مکمل تعلیم ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ایک مثال کے ذریعے اس مسئلہ کو سمجھایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک بنی اسرائیل کے حالات درست تھے۔ اگرچہ اس عرصہ میں کہیں کہیں کوئی قباحت بھی پائی گئی مگر مجموعی طور پر ان کے حالات اچھے تھے۔ وہ سب ابنِ مرنہ کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے حالات بڑی دیر بعد بگڑنے شروع ہوئے۔ ان میں بھی شرک کی بیماری پیدا ہو گئی۔ انبیاء کی نافرمانی اور ان کا قتل قرآن پاک میں مذکور ہے۔ فسق و فجور بہت بڑھ گیا۔ جس طرح اس زمانہ میں مسلمانوں میں ہر قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں اس زمانہ میں بنی اسرائیل طرح طرح کی خرابیوں میں طوٹ تھے۔ جب وہ نیچی کو چھوڑ کر بادی کی طرف راجع ہو گئے، تو ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اُس زمانے میں عمالقہ بڑی طاقتور قوم تھی۔ انہوں نے بنی اسرائیل

کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ قوم بنی اسرائیل کی قریبی ہمسایہ تھی، لہذا وہ آسانی سے ان پر غالب آگئے اُن کے مردوں کو قتل کیا، عورتوں کو لوٹیاں بنایا۔ اسرائیلی روایات میں آتا ہے کہ عمالقمہ نے تیس ہزار نوجوان لڑکیوں کو لوٹیاں بنالیا۔

حضرت سمویل
علیہ السلام
(SAMUEL)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوت کا سلسلہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں جاری رہا۔ حتیٰ کہ لادی خاندان میں کوئی نیک آدمی باقی نہ رہا۔ تمام کے تمام مرد مالاختی اور نابکار تھے۔ ایک نیک آدمی دشمنوں کے مقابلہ میں آگیا، اس کی بیوی اس وقت حاملہ تھی۔ قحط الرجال کے اس زمانہ میں اُس عورت نے دعا کی کہ مولا کریم! مجھے نیک اور صالح بیٹا عطا کر۔ اتفاق کی بات کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا عطا کر دیا۔ جب کانام اُس نے سنا، یا سمویل رکھا۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کو سن لیا اور بیٹا عطا کیا گویا یہ لفظ اسماعیل کا ہم معنی ہے جب یہ لڑکا بڑا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے بنی بنایا اس پر برہمی اُتر لی فرمائی۔ یہ واقعہ جو بیان ہوا ہے یہی بنی سمویل علیہ السلام کے زلنے کا واقعہ ہے جس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام مسیح علیہ السلام سے گیارہ یا تیرہ سو سال پہلے مبعوث ہوئے اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تہریت لانے جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ الغرض! بنی اسرائیل اپنے نبی سمویل علیہ السلام کے پاس بیت المقدس میں جمع ہوئے۔ اور اُن سے درخواست کی کہ ہمارے لیے تنظیم بنائیں ہمارا امیر مقرر کریں جس کی سرکردگی میں ہم دشمن کا مقابلہ کر کے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں۔

ارشاد دہوتا ہے۔ اَلَمْ تَكُنْ اِلَى الْمَلِكِ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ كَبِدٍ مَكْحُومٍ
کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف نہیں دیکھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اِذْ قَالُوا لِنَبِيِّهِمْ اُتِعْثُ لَنَا مَلِكًا جَب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک امیر یا بادشاہ مقرر کریں جس کی سرکردگی میں نقتالِ فِی سَبِيلِ اللّٰهِ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

لفظ ملک
کی تشریح

لفظ ملک وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ملک، سردار، امیر، حاکم یا خوشحال آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے

پاس کچھ لوگ آئے، اپنی مالی حالت کا تذکرہ کیا اور مدد کی درخواست کی۔ منسرایا اگر تم چاہتے ہو تو تمہارے ملک (حاکم) کے پاس سفارش کیے دیتا ہوں، اور اگر چاہو تو تمہارے پاس پھر حسبِ قرین ہم تمہاری خدمت کریں گے، یا اگر چاہو تو صبر کرو کیونکہ صبر کا نتیجہ آخرت میں بہترین ہوگا۔ چنانچہ ان لوگوں نے سوال کھٹنے کی بجائے صبر کو اپنایا۔ یہاں پر ملک معنی حاکم استعمال ہوا ہے۔

ایک اور شخص آیا کھٹنے لگا میرے حالات بہت خراب ہیں۔ میری کچھ مدد کریں آپ نے فرمایا۔ کیا تمہارے پاس مکان ہے، کہا ہے۔ پھر پوچھا تمہاری بیوی ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں بیوی لہجی ہے۔ پھر آپ نے دریافت کیا۔ تیرے پاس کوئی خادم بھی ہے تو اُس نے اس بد بھی اثبات میں جواب دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ تیرے پاس مکان ہے، تیری بیوی موجود ہے۔ خدمت کے لیے لو کہ بھی ہے۔ تو پھر تو کیا فقیر ہے۔ اَنْتَ مِنَ الْمَلُوكِ تو تو بادشاہوں میں سے ہے۔ مطلب یہ کہ تو خوشحال آدمی ہے جس کے پاس ضروریات کی یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ ملک کھٹنے کا مستحق ہے۔

ملوکیت کا تصور

بہر حال عربی زبان میں ملک کے مختلف معانی ہیں جن میں بادشاہ یا امیر بھی شامل ہے صاحبِ امر یعنی حاکم وقت بھی مراد ہے۔ مگر ملوکیت کا جو تصور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اسلام ہرگز اس کی تائید نہیں کرتا۔ آج ہم سمجھتے ہیں کہ بادشاہ وہ ہے جو کسی ملک کے ہر شاہ و سفید کا مالک ہے۔ جو چاہے حکم دے اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہو۔ مگر ملوکیت کا یہ تصور غیر فطری اور اسلامی تعلیم کے سرسری سنائی ہے اور ڈکٹیٹر شپ بھی اسی مالکیت کا نام ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو شرعی نظام سیاست عطا کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات نازل فرمائی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام (POLITICAL SYSTEM) کیا ہے۔ اُنی کا امیر کیا ہو، اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اور وہ کن امور کا پابند ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی

جماعت کن اوصاف کی حامل ہونی چاہیے۔ اس کے حقوق و فرائض کیا ہونگے وغیرہ وغیرہ مگر افسوس کہ اٹھویں دور کے بعد مسلمانوں میں بھی غیر اسلامی تصور ملکیت سرایت کر گیا۔ اور یہ آج بھی مسلمانوں میں موجود ہے۔

ہم اے قریبی زمانہ میں چودہویں افضل حق بڑے فاضل آدمی ہوئے ہیں۔ زمین و مکانات کی صورت میں لاکھوں کی جائیداد کے مالک تھے۔ انگریزی دور میں اسمبلی کے ممبر تھے۔ سرکاری ملازمت میں انپیکٹر بھی رہے۔ مگر انگریزوں کی غلامی کا طوق اتار کر ان کے خلاف جہاد میں شامل ہو گئے۔ مجلس احرار سے منسلک ہوئے۔ زمین و مکان ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دی، حتیٰ کہ ان کا جائزہ مجلس احرار کے دفتر سے اٹھایا گیا۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں حضور علیہ السلام کی سیرت طیبہ پر بھی ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔ فرقہ داریت کے خلاف کتاب لکھی، سورۃ فاتحہ کی تشریح قلبندہ کی۔ آپ نے ملکیت کے متعلق ایک نہایت عمدہ بات کی ہے۔ فرماتے ہیں: "افسوس کہ بنو امیہ کے بعد مسلمانوں نے اسلام کا اجتماعی اور شرعی نظام چھوڑ کر اس کی جگہ شنشاہیت کاٹا بچھا دیا ہے۔ وہ ملکیت اور شنشاہیت جو قصور و کسر کی کاطرہ اتیان تھا اور جس کو مٹانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو مبعوث فرمایا۔ یہی نظام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مسلمانوں میں پھر رائج ہے۔"

کابل کے امیر امان اللہ خان مرحوم کا باپ امیر حبیب اللہ خاں مرحوم بھی اپنے وقت کا بادشاہ تھا۔ اس کے متعلق حضرت مولانا عبد اللہ شہزاد لکھتے ہیں کہ آخری دور میں ایسی حالت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ متعدد بیویاں (تین صد بیویاں) لکھنے کے باوجود شریف لوگوں کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ مارا تھا۔ ایسا عیاش آدمی تھا۔ بڑی حیثیت کا مالک تھا مگر اس قسم کی حرکتیں شنشاہیت کا خاصہ ہوتا ہے۔ آخر وہ قتل ہوا مگر قاتل کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ باقی نوابوں اور بادشاہوں کا بھی یہی حال ہے۔ نواب حیدر آباد جب مراٹھوں کے قتل وقت اس نے بھی تقریباً پونے دو سو عورتیں (درشتہ) اکٹھی کر رکھی تھیں۔

بہر حال بنی اسرائیل نے حضرت سیموئل سے کہا کہ آپ ہمارے لیے کوئی امیر مقرر کر دیں جس کی کمان میں ہم دشمن سے جنگ کر سکیں۔ اگرچہ اُس وقت اللہ کے نبی موجود تھے مگر وہ کافی بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ اور جنگ میں بنفس نفیس شرکت سے معذور تھے۔ البتہ ہدایات دینے کے لیے وہ کافی تھے۔ لہذا انکی قوم نے عرض کیا کہ ہمارے لیے کوئی قابل امیر مقرر کر دیں، جو جنگ میں ہماری قیادت کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جنگ کرنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسلام میں جماعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کے بغیر سیاسی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ جیسے فرمایا لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ یعنی جماعت کے بغیر اسلام کا کوئی تصور نہیں اور لَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِالْاِمَامِ یعنی اور امیر کے بغیر جماعت کسٹم نہیں اسی لیے فرمایا کہ سفر میں اکیلا آدمی نہ جائے۔ اس کے ساتھ جماعت ہونی چاہیئے۔ ایک اور زور _____ شیطان میں ہنگامہ کی تعداد جماعت ہے۔ اور اگر چار آدمی جمع ہو جائیں تو فرمایا۔ خیر الجماعۃ اربعۃ بہتر جماعت چار آدمیوں کی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جب سفر پر روانہ ہونے لگو تو اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لو، اسکی سرکردگی میں، اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرو۔ انفرادی حالت میں شیطان کے غلبے کا خدشہ ہے۔ اس لیے سفر بھی بحیثیت جماعت اختیار کرو۔ شیطان کے شر سے محفوظ رہو گے۔

الغرض! جب قوم نے خود نبی سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک امیر مقرر کر دیا جائے جسکی سرکردگی میں وہ جہاد کریں۔ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اَنْ تَكُنَّ عَلَيْنَكُمْ اَلَا تَقَاتِلُوْا تو نبی نے کہا کہ اگر تم پر لڑائی فرض کر دی جائے تو شاید تم نہ لڑ سکو، نبی نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ جنگ فرض ہونے کے بعد اگر تم نے اس میں لیت و عمل کیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ جاؤ گے۔ لہذا فرضیت جہاد سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَا نَقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قوم کہنے لگی کہ ہمیں کیا ہے کہ ہم لڑائی نہ کریں اللہ کے راستے میں وَقَدْ اَخْرَجَنَا

نبی اور قوم
میں مکالمہ

مِنْ دِيَارِهَا مَا لَمْ نَكُنْ هُمْ بِنَاصِرٍ لِّهٖمْ سِوَاكَ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدَرٌ هُنَّ حَاكِمَاتٌ لِّرِّجَالٍ وَلَهُنَّ فِي شَأْنِهِنَّ مَقَالِدٌ وَلَهُنَّ اَمْوَالٌ مِّمَّا كَسَبْنَ وَرَبُّهُنَّ يَعْلَمُ
اور ہمارے مکانات پر قبضہ کر لیا ہے وَابْتَكَرْنَا اور انہوں نے ہمیں ہماری اولادوں سے جدا کر دیا ہے۔ ہماری عورتوں کو لونڈیاں اور بچوں کو غلام بنالیا ہے۔ اب نہ لڑنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ لہذا ہم ضرور اپنے دشمن سے جنگ کریں گے۔ آپ ہمارے لیے امیر لشکر مقرر کر دیں۔

بنی اسرائیل کے اس قدر اصرار کے بعد قَلَمًا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ
جب اُن پر لڑائی فرض کر دی گئی، قَوْلًا اِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ لَرَأَوْا مِنْ سَبْعِ مِائَاتٍ
ایک قلیل تعداد کے سوا سب اپنے وعدے سے پھر گئے۔ انہوں نے جہاد سے منہ موڑ لیا۔ اس کی تفصیلات اگلے رکوع میں آرہی ہیں۔ تاہم آگے وہ بیان بھی کر رہے ہیں جس میں تھوڑے لوگوں نے نہمت اور جہاد سے دشمن کا مقابلہ کیا اور پھر وہ غالب آئے۔

آج مسلمانوں کی حالت بھی اُس زمانے کے بنی اسرائیل سے کم خراب نہیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات اس قدر بگڑے ہوئے ہیں کہ اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وجہ ایک ہی ہے کہ جہاد سے روگردانی کر رہے ہیں۔ دوسرے کچھ دستِ نحر ہیں مگر آپس میں دست و گریبان ہیں۔ ذرا غور کریں فلسطینیوں کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اُن کی ہزاروں لڑکیاں غیر مسلموں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں۔ انہیں پہننے کے لیے زمین پر کوئی ٹھکانہ میسر نہیں آرہا ہے۔ فلپائن کی عیسائی اکثریت نے مسلمان اقلیت کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وہ مسلمانوں کو مار دینی ڈاکو کتے ہیں۔ حالانکہ وہ بیچارے قلیل تعداد میں ہیں مگر انہیں بھی جینے کا حق نہیں دیا جا رہا ہے۔ قبرص میں بھی مسلمانوں کا یہی حال ہو رہا ہے۔ صرف چند سال پہلے چالیس ہزار قبرصی ترکوں کو ختم کر دیا گیا۔ اب انہوں نے ایک جزیرہ میں پناہ لے رکھی ہے۔ مگر عیسائی قوتیں انہیں وہاں بھی اکٹھا نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کی حکیم یہ ہے کہ کسی طرح اِن کو علیحدہ علیحدہ کر کے اِن کی جمعیت کو ختم کر دیا جائے۔

فرمایا وَاللّٰهُ عَلَیْكُمْ بِالْفِطْرِ حَیۡنَ اللّٰہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ظالم ارغول

ظالم بزدل ہوتا ہے اور جہاد سے جی چڑاتا ہے۔ وہ خود بھی کوئی اچھا کام نہیں کر سکتا بلکہ برائی کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ اُس سے اچھے نظام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے لیڈر ظالم ہیں۔ اس قسم کے مولویوں، مشائخ، امیروں، تاجروں سے اچھائی کی کیا امید ہو سکتی ہے البتہ اچھائی کی امید عادل شخص سے ہو سکتی ہے۔ وہی نظام اسلام قائم کر سکتا ہے۔ وہی جہاد کر سکتا ہے۔ اور قوم کو ذلت سے نکال کر عزت و آبرو کی زندگی دے سکتا ہے۔

اس ایک جملہ **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ** میں ان سب چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

اہم بیضاوی منافقین کے متعلق لکھتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا راز فاش کرتے ہوئے فرمایا **اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ** اصل فساد ہی لوگ ہیں ان کا اصلاح کا دعویٰ محض فریب ہے۔ کفر، شرک، معصیت، حدود اللہ کو توڑنا، بدعت کا اجرا، چوری، ڈاکہ، قتل، دوسروں کے حق کا ضیاع وغیرہ سب ظلم کی مختلف شاخیں ہیں۔ ظالم سے اسی قسم کے افعال سرزد ہوں گے۔ البتہ جب عادل حاکم آئے گا، تو تمام برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ حق و عدل کا دور دورہ ہوگا کہ عدل نظام اسلام میں سب سے بڑا ستون ہے۔ حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ ایمان چار ستونوں پر قائم ہے یعنی صبر، عدل، جہاد اور یقین، لہذا عادل شخص کے ایمان کی گواہی دی جاتی ہے۔ اور ظالم آدمی بے ایمان اور کافر ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ** اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد و پنج (۱۵)

آیت ۲۳۴ تا ۲۳۸

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا
 قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ
 وَلَمْ يَأْتِ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ
 وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن
 يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۳۴﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ
 إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ
 مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ
 تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُم إِن كُنتُمْ
 مُؤْمِنِينَ ﴿۲۳۵﴾

Eudf

ترجمہ: پھر اُن کے نبی نے اُن سے کہا: بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے
 طاوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہنے لگے، ہم پر اُس کی حکومت کیسے ہوگی۔ اور
 ہم اُس سے حکومت کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور وہ مال میں وسعت بھی نہیں دیا گیا۔ اُنہی
 پیغمبر نے اُن سے کہا، بیشک اللہ تعالیٰ نے اُسے تمہارے اوپر منتخب کیا ہے
 اور اس کو علم اور جسم کی فراخی کے لحاظ سے زیادہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
 جس کو چاہے بادشاہی دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے
 والا ہے ﴿۲۳۵﴾ اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ بیشک اُس کی بادشاہی کی

نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئیگا۔ جس میں تمہارے رب
 کی طرف سے مال کی تسلی ہے۔ اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں۔ جن کو تمہاری اور
 ہارون علیہما السلام کی اولاد نے چھوڑا ہے۔ اس کو فرشتے اٹھا کر لائیں گے

بیشک اس میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں اگر تم یقین رکھتے ہو (۲۴۸)

گتہ شتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ وہ مغلوب ہو گئے۔ دشمن نے اُن کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اُن کے بچوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیا۔ انہوں نے نبی وقت حضرت سمویل علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیں۔ جس کی سرکردگی میں ہم دشمن سے جنگ کر کے اپنے گھرنے ہوئے علاقے واپس لے سکیں اور اپنے گھروں کو لوٹ سکیں نیز اپنے مردوں اور عورتوں کو دشمن کی غلامی سے نجات دلائیں۔ ان کے نبی نے فرمایا کہ دیکھنا کہیں اپنے وعدے سے بچر نہ جانا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم آپ کی طرف سے مفہم کیے گئے بادشاہ یا امیر کی اطاعت کریں گے۔ آج کے درس میں بنی اسرائیل کے لیے طاوت بادشاہ کے تقرر اور بنی اسرائیل کے انکار کا بیان آ رہا ہے۔

طاوت بطور
بادشاہ

ارشاد ہوتا ہے۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ كَيْفَ نَبِيٍّ لَّهُمْ طَالُوتُ مَبْدَاً بِيْشَاقِ اللّٰهِ تَعَالٰی سے کہا اِنَّ اللّٰهَ فَدَعَاكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُوْنَ اَبَشَاقِ اللّٰهِ تَعَالٰی نے تمہارے لیے طاوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ لہذا تم اس کی سرکردگی میں اپنی تنظیم قائم کرو اور پھر دشمن سے جہاد کرو۔ مگر اُس قوم کے آسودہ مال لوگوں کو طاوت کا انتخاب پسند نہ آیا۔ قَالُوا كُنْ لَکَ الْمُلْکُ عَلَيْنَا طَالُوتُ ہمارا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو غریب اور کمزور حیثیت کا مالک ہے۔ وہ ہمارا بادشاہ بننے کا اہل نہیں وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْہُ اس سے زیادہ بادشاہ بننے کا ہمارا حق ہے۔ وَلَکُمْ یَوْمَئِذٍ سَعۃٌ مِّنَ الْمَالِ ان کے پاس تو مال بھی نہیں ہے۔ وہ ہمارا سردار یا امیر بننے کے بالکل اہل نہیں ہے۔

دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بادشاہی تو زیادہ تر یہودا کے خاندان میں رہی جن میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ اور نبوت زیادہ تر لادی خاندان میں رہی جس سے حضرت داؤد علیہ السلام تھے۔ یہ طاوت بن کش حضرت یوسف علیہ السلام

کے چھوٹے بھائی بن یامین کی اولاد سے تھا اور یہ نسبتاً چھوٹا خاندان سمجھا جاتا ہے۔ مگر حضرت سمویل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اُسے بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر فرما دیا۔ ان کے خاندان کو دیگر خاندانوں کی طرح عزت حاصل نہیں تھی، یہ کم تر لوگ تھے۔ خود طاقت کپڑے رنگنے کا کام نہ کرتا تھا۔ جشن کتے ہیں۔ کرتا تھا۔ لہذا بنی اسرائیل اس کے بطور امیر مقرر پر رضامند نہ ہوئے۔ دراصل مالی کمزوری نبوت تو تسلیم کرنے میں ہمیشہ رکاوٹ رہی ہے۔ جب بھی کسی نبی نے نبوت کا دعوے کیا۔ تو اس کی قوم نے یہی جواب دیا کہ تو تو ہماری قوم کا گھٹیا آدمی ہے۔ تیرے پاس نہ مال و دولت ہے۔ نہ زمین و مکانات ہیں۔ نہ سونا چاندی ہے۔ تو نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ یہی چیز طاقت کو بادشاہ تسلیم کرنے میں مانع ہوئی کیونکہ وہ شخص قوم کا ایک ادنیٰ فرد سمجھا جاتا تھا۔ اور دنیاوی مال و مملکت سے محروم تھا۔

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر سے امیر مقرر کرنے کی درخواست کی، اُس وقت طاقت کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ یہ سب لوگ پیغمبر کے پاس جمع تھے اور ان سے سوال و جواب کر رہے تھے۔ طاقت کے باپ کا گدھا گم ہو گیا تھا، وہ تلاش کرتا ہوا اُس طرف جانکا جہاں بنی اسرائیل کے لوگ جمع تھے۔ چنانچہ وہ بھی اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُدھر اللہ کے نبی کو وحی کے ذریعے خبر دی جا چکی تھی کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جس کا قد نبی کے پاس موجود لاٹھی کے برابر ہو۔ نیز یہ کہ وہ آدمی آدھ سے اس کے پیچھے پر نبی کے پاس خوشبو دار تیل والی شیشی میں جوش پیدا ہو گا۔ لہذا جس شخص پر یہ نشانیاں صادق آجائیں اُسے امیر مقرر کر لیا جائے۔ جب طاقت اُس مجمع میں پہنچا تو تیل کی شیشی میں جوش پیدا ہو گیا۔ جب اُس کا قد باگیا، تو لاٹھی کے برابر نکلا، چنانچہ سلطانہ کے نبی نے طاقت کو بادشاہ یا امیر مقرر کر دیا مگر بنی اسرائیل نے اُسے اپنا امیر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اللہ کے نبی نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ محض مال و دولت یا اعلیٰ خاندان کا ہونا امیر کی خصوصیت

ہی مارت کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ اصول مقرر ہیں جن کی بناء پر کسی شخص کو مارت کے عہدے پر فائز کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی بات جو غیر مہر نے کہی **قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ** اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے۔ لہذا اس میں کسی کے ذاتی اختلاف کو دخل نہیں ہونا چاہیے اور دوسری بات یہ کہ **وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ** اللہ نے اُسے علم اور جسم میں وسعت دی ہے۔ یعنی ایسی یہ غولی ہے کہ وہ علم میں بھی تم سے زیادہ ہے۔ اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی تم میں سے زیادہ قوی ہے۔ یہاں پر علم سے مراد سیاسی علم یعنی نظام حکومت چلانے کی صلاحیت ہے۔ جہاں تک دینی علم کا تعلق ہے۔ وہ تو نبی کے پاس تھا تاہم اللہ تعالیٰ نے سیاسی علم طاوت کو عطا کیا تھا۔ الیہ سر کے لیے جسمانی طور پر صحت مند ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر صحت مند یا بیمار اور لاغر شخص نظام حکومت کو بطریق احسن انجام نہیں دے سکتا۔ طاوت تیس سال کا وجہ نوجوان تھا۔ اقد اور اور صحت مند تھا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اُسے اس کام کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ اور اس انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو نبی منتخب فرمایا۔ اسی طرح اُس نے طاوت کو بادشاہت کے لیے منتخب فرمایا۔

خلیفہ کا انتخاب

بعض اوقات اللہ تعالیٰ خلیفہ کا انتخاب بھی خود کرتا ہے جیسے دنیا میں سب سے پہلے خلیفہ آدم علیہ السلام تھے۔ **اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً** میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا **یٰۤاٰدَاسَ جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ** اے داؤد علیہ السلام ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا۔ سلیمان علیہ السلام کی خلافت کا ذکر بھی آتا ہے۔

چونکہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب یہ تو ممکن نہیں کہ ملت اسلامیہ کے لیے اللہ تعالیٰ خود کسی کو خلیفہ منتخب فرمائے۔ اب خلیفہ کے انتخاب کے لیے کئی ایک صورتیں ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ سمجھدار، دانا اور صاحب حل و عقد مسلمان خود خلیفہ کا انتخاب کریں۔ جس طرح حضور علیہ السلام کے

بعد لوگوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کو منتخب کیا تھا۔ انتخاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ خلیفہ خود اپنا جانشین مقرر کر دے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو مقرر فرمایا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ خلیفہ خود مستحق ترین شخص کو اس کام کے لیے نامزد کر دے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص طاقت کے زور پر خود بخود اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس کی مثال حضرت امیر معاویہؓ کی ہے۔ جنہوں نے غالب آکر خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ اس طرح مسند اقتدار پر آنے والا شخص اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق حکومت کا نظم و نسق چلائے۔ تو یہ صورت بھی قابل قبول ہے۔ خلافت کے معاملہ میں اہل اسلام میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک مسلمانوں کی جماعت پر واجب ہے کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کریں۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرتے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی یہی جماعت اُسے معزول بھی کر سکتی ہے۔ کیونکہ خلیفہ بھی ایک انسان ہوتا ہے اور وہ بھی غلطی کر سکتا ہے۔

_____ بر خلافت اس کے شیعہ کا عقیدہ یہ ہے۔ خلیفہ یا امام معصوم ہوتا ہے۔ اور اُس کا انتخاب من جانب اللہ ہوتا ہے اس کی خلافت مستقل ہوتی ہے اور کوئی اُسے معزول نہیں کر سکتا۔ حالانکہ یہ عقیدہ درست نہیں ہے۔ خارجی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حاکم صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ خلیفہ کی ضرورت ہی نہیں ہے یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

خلیفہ کا انتخاب اس قدر اہم مسئلہ ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے یہ مسئلہ آپ کے کفن دفن سے پہلے طے کر لیا۔ کیونکہ ہر اجتماع کام میں امیر کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر تمام امور اس کے احکام کے تحت انجام دیے جاتے ہیں۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے کہ جب تین آدمی سفر پر روانہ ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں تاکہ سفر کے تمام معاملات تنظیم کے تحت حل ہوں۔

مولانا عبید اللہ سندھی اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جو لوگ عزت و ابر کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ملک کا نظام ایسے ہاتھوں میں دیں، جو اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ کر سکیں۔ اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے جو خود ایماندار اور عادل ہوں۔ مولانا تشریح فرماتے ہیں کہ جن ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں اسلامی نظام نافذ ہو، مگر جب حکومت منتخب کرنے کا وقت آتا ہے۔ تو ہمیشہ غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ امپری کا ممبر اس شخص کو چن جو کتاب اللہ کا عالم اور حضور علیہ السلام کی سنت اور خلفائے راشدین کے دور کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔ جو شخص کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے واقف نہیں، وہ اسلامی نظام کیسے لایا جائے گا ممبر ایسا ہونا چاہیے۔ جو قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کر دے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور آخرت میں محاسبے کا ڈر ہو۔ صرف ایسے لوگ ہی اللہ کا قانون جاری کر سکتے ہیں۔ وہ جب پارلیمنٹ میں جائیں تو سربراہ بھی صحیح منتخب کریں گے۔ اور قانون بھی ٹھیک ٹھیک وضع کریں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھی ہمارے اکابرین میں سے ہیں۔ آپ اجتماعیات اور اقتصادیات کے ماہر تھے۔ آپ سکھوں کے گھر میں پیدا ہوئے مگر اللہ تعالیٰ نے کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سولہ سال کی عمر میں مسلمان ہو کر حضرت خواجہ محمد صدیق کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے انہیں اپنا منہ بولا لایا بنا لیا اس عمر میں ان کا ختنہ بھی کرایا۔ مولانا بھی اپنے آپ کو خواجہ صاحب کا روحانی فرزند کہتے ہیں۔ حضرت خواجہ محمد صدیق اپنے زمانے کے اس پایہ کے بزرگ تھے۔ جس پایہ کے حضرت بنیہ بغدادی ہوئے ہیں۔ ان کے دو مرید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک مولانا غلام محمد دین پوری اور دوسرے مولانا سید تاج الدین امر دہلی۔ مولانا دین پوری علم میں زیادہ وسعت نہیں رکھتے تھے تاہم حاجی امداد اللہ کی طرح نسبت بہت اونچی تھی۔ جنوبی پنجاب اور سندھ میں اس دور میں ان جیسا کوئی بزرگ نہیں ہوا۔ سید تاج الدین امر دہلی میں دونوں خوبیاں پائی جاتی تھیں آپ عالم بھی تھے اور مجاہد بھی۔ آپ کے ہاتھ پر تقریباً سات ہزار ہندو کھ مسلمان

ہوئے شیخ المذہب مولانا محمود اکھنڈ کے دوست اور رفیق الہی کی طرح انگریزوں کے سخت دشمن تھے، آپ نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

جب مولانا عبید اللہ سندھی تحصیل علم کے لیے ہندوستان جا رہے تھے۔ تو حضرت خواجہ محمد صدیق نے ان کے حق میں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی صحیح عالم دین کے پاس پہنچائے اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ اور چلتے چلتے مولانا سندھی دارالعلوم دیوبند پہنچ کر حضرت مولانا شیخ المذہب کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جلد علوم آپ کے حاصل کیے۔ اور حدیث کا درس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے لگوا دیا جا کر لیا آپ مدرسہ دیوبند کے سرپرست تھے مگر قیام لگوا دیا تھا۔ مولانا سندھی کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ خود دیکھتے ہیں کہ علم میراث کی کتاب سراجی صرف دو گھنٹے میں پڑھ لی اور صحاح کستہ میں سے ابن ماجہ اور نسائی دو دن میں ختم کر لی۔ جب آپ علم حاصل کر کے واپس اپنے پیر صاحب کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے آخری وقت میں اپنے دونوں شاگردان کو وصیت فرمائی تھی۔ کہ جب عبید اللہ واپس آئے۔ تو اُسے اپنا بیٹا سمجھنا۔ چنانچہ ان دو بزرگوں نے آپ کو باپ کی شفقت دی۔

مولانا سندھی خود فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ تحصیل علم کے بعد میں نے اٹھارہ سال تک اپنے استاد محترم مولانا محمود اکھنڈ کی خدمت میں رہ کر اسلامی سیاست اور حکومت کی سیکھی۔ شیخ المذہب سیاست کے بہت بڑے اہم تھے۔ مولانا سندھی کا چھوٹا ساقی اللہ تعالیٰ نے ان میں وہ صلاحیت رکھی تھی کہ انگریز جیسا جابر حکمران آپ کے بہت خائف تھا۔ آپ کے پیچھے ہر وقت جا سوس لگے بہتے تھے۔ آپ بارہ سال تک محکمہ میں رہائش پذیر رہے۔ عرب حکومت نے بھی سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کے باوجود انگریزوں کو ہمیشہ ان کی طرف سے طوفان اٹھنے کا خطرہ رہتا تھا۔ انگریزوں نے ایک مولوی کو جاکو کے لیے محکمہ بھیج دیا۔ آپ کو پتہ چلا تو فرمایا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اللہ

کے گھر میں بھی میرا بیچا کر رہے ہو۔ تقسیم ہند سے پانچ سال قبل آپ نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے انگریز کی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اب یہ اس ملک میں نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ زیادہ عرصہ ہندوستان میں بٹھر گیا تو میری قبر پر تھوک دینا کہ تم نے جھوٹ کہا تھا۔ مگر اس کے بعد دو سال کے اندر انڈیا انگریز کو ہندوستان خالی کرنا پڑا۔

شرائط خلافت

جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے کہ خلافت کے لیے اعلیٰ خاندان کا ہونا لازم و ملزوم ہے۔ بلکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے طاقت کی جو صفات بیان کی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ علم اور صحت کے لحاظ سے دوسروں سے بہتر تھا۔ اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اسے اس کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ اکا لیے اہم البوجہ جصاص اور دیگر مفسرین کہہ رہے ہیں کہ خلیفہ کے لیے خاندان قریش سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ حدیث شریفہ **الْأَخْلَافُ مِنْ الْقُرَیْشِ** کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب قریش کے علاوہ لوگ کسی دوسرے پر متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس وقت قریش میں خلافت کا کام انجام دینے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ اگر دو آدمی بھی خاندان قریش سے باصلاحیت ہوں گے تو خلافت کسی اور طرف منتقل نہیں ہوگی۔ مگر عباسیوں کے دور میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو گیا کہ دو آدمی بھی باصلاحیت موجود نہ رہے۔ لہذا خلافت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی۔ دوسری جگہ آتا ہے **مَا أَقَامُوا حَبِيبًا** انصاف پر قائم رہیں گے۔ خلافت اُن کے پاس رہی۔ چنانچہ ساڑھے چھ سو سال تک خلافت اسی خاندان میں رہی پھر جب

اہلیت سے محروم ہو گئے تو خلافت سے محروم ہو گئے۔ آج بھی من حیث القوم مسلمانوں میں صلاحیت ناپید ہے۔ مسلمان خود اپنا صحیح خلیفہ منتخب نہیں کر سکتے۔ آج وہ مسلمان کمال سے پیدا ہوں جو قومی درد کھنے لگے ہوں۔ اور اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کر سکیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہو گا۔ یہ قوم قعر مذلت سے نہیں نکل سکتی۔

الغرض! فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض خصوصیات کی بنا پر طاہرات کو بادشاہ منتخب فرمایا ہے۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَّشَاءُ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا کرتا ہے وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ اور اللہ تعالیٰ رحمت والا اور علم والا ہے وہ جس کو بادشاہی دیتا ہے اس کو مال و دولت سے بھی نواز سکتا ہے۔ اور جس کے اندر خود اس نے صلاحیت رکھی ہے۔ اس کو میر بنا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے علم میں ہے اللہ کے نبی نے اللہ کے حکم سے اپنی قوم کے سامنے ایک معجزانہ نشانی کا اظہار فرمایا۔ تاکہ ان کی تسلیم ہو جائے کہ طاہرات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا انتخاب بالکل درست ہے۔ قوم جانتی تھی کہ جب دشمن نے اُن پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ تو سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا وہ مقدس صندوق بھی اٹھا کر قریہ پاریم میں لے گئے تھے۔ جس میں آل موسیٰ اور آل داود کے تبرکات تھے۔ جن میں حضرت موسیٰ کی لاش بھی تھی۔ تختی کے ٹکڑے۔ تورات کا کچھ حصہ، آپ کا لباس اور پاپوش وغیرہ تھے۔ یہ ایسی بابرکت چیز تھی کہ بنی اسرائیل سفرِ حضر میں ہمیشہ اسے ساتھ رکھتے تھے یہ تہارت جنگ میں بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے یہی برکت اللہ انہیں فتح دیتا۔ تہارت یہ کہ حضرت سلیمان کے زمانے تک بنی اسرائیل میں رہا۔ پھر آپ نے بیت المقدس میں سیکل سلیمان کی تعمیر کے وقت اسے رکھ دیا۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بعض کہتے ہیں کہ سیکل سلیمان میں دفن ہے۔ غالباً اس لیے یہودی دہلی پر کھدائی کر رہے ہیں تاکہ وہ تہارت حاصل جائے۔

اگرچہ بنی اسرائیل کو تبرکات کے گھوم جانے کا بڑا قلق تھا مگر وہ مجبور تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَقَالَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنْ كَيْفَ نَعْبُدُكَ يَا رَبُّنَا کہ اے خداوند! ہم نے اُن سے کہا۔ اِنَّ اَيْكَةَ مُلْكِكَ اَنْ يَّاتِيَكُمْ التَّابُوتُ تَہَاہُے پاس وہ صندوق خود بخود آجائے گا فِيْہِ سَبْکِیْنَتَہٗ مَن رَّبِّکُمْ جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکینِ قلب ہے۔ وَبَقِیَّتہٗ مِمَّا سَلَّکَ الْاُمَمُسُ وَالْہَرُونَ علیہ السلام کی اولاد نے چھوڑا ہے۔ تَحْمِلُہُ الْمَلَائِکَۃُ اے فرشتے اٹھا کر لائیں گے۔

یہ صندوق بیس سال تک دشمن کے قبضہ میں رہا۔ اللہ کی قدرت وہ جس جہتی میں

صندوق کو رکھتے تھے۔ وہاں دبا ہوا پھوٹ پڑتی اور وہ جتنی تباہ ہو جاتی تھی۔ اس طرح پانچ بتیاں تباہ ہو گئیں۔ تو ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس صندوق کو کسی طرح نکال دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے صندوق بیل گاڑی پر رکھ کر بیلوں کو ایک طرف ہانک دیا۔ بیل چلتے چلتے طاہرہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اور اس طرح صندوق ان کے پاس آ گیا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ یہ صندوق اگرچہ بظاہر بیل گاڑی پر آیا تھا۔ مگر اللہ کے حکم کے مطابق اُسے فرشتے لائے تھے۔ جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ انہوں نے ہی بیلوں کو طاہرہ کے دروازے پر لاکھڑا کیا تھا فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُمْ اس میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں۔ اِنَّ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ هٰذِيْنَ اگر تمہیں یقین آیا، اِنَّ نشانوں کو دیکھ کر بنی اسرائیل طاہرہ کے بادشاہ مقرر ہونے پر مطمئن ہو گئے۔ چنانچہ قوم نے ان کی سرکردگی میں جہاد کرنے کا عزم بھی کر لیا۔ اب اللہ کا بنی اسرائیل بھی موجود تھا اور طاہرہ بادشاہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ وہ گلے سے جگہ کے لیے نکلے جس کا ذکر اگلے درس میں آئے گا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس پچھدوش (۱۰۶)

آیت ۲۴۹

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ
 بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ
 يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً يَدَهُ
 فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ
 آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِطَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ
 الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْكُوا اللَّهَ كَمِ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ
 غَلَبَتْ فِئَةُ كَثِيرَةٍ أَمَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۳۹﴾

تسجہ ص ۶ جب طالوت اپنے لشکر کے ہمراہ باہر نکلے، تو انہوں نے کہا، بیشک
 اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائے والا ہے ایک نہر ہے۔ پس جس نے نہر سے پانی پی یا وہ مجھ
 سے نہیں ہے۔ اور جس نے اس سے نہ چکھا بیشک وہ میرا ہے۔ ان جس نے ہاتھ
 سے پانی کا چلو بھریا وہ مستشار ہے۔ پس لوگوں نے اس میں سے پی یا سوئے تو وہ
 آدمیوں کے۔ پھر جب طالوت اور اس کے ہمراہ اہل ایمان نہر سے پار ہوئے تو کہنے
 لگے کہ آج جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی ہمیں طاقت نہیں ہے۔ جو
 لوگ اللہ تعالیٰ سے طاقت کا یقین رکھتے تھے، کہنے لگے کہ بہت دھوا یا ہوا ہے
 کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں اللہ کے حکم سے۔ اور اللہ تعالیٰ
 میر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۳۹﴾

گہشتہ درس میں طالوت کے بطور بادشاہ تقرر کا بیان آچکا ہے۔ جب اللہ کے
 نبی نے بنی اسرائیل کی درخواست کے مطابق طالوت کو بادشاہ مقرر کیا۔ تو انہوں نے اُسے
 اپنا رہبر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ یہ تو ایک عزیز آدمی جس کے پاس

مال و دولت نہیں ہے۔ ہم ٹسے اپنا بادشاہ کیسے تسلیم کر لیں۔ اس سے زیادہ تو بادشاہت کے ہم حقدار ہیں مگر اللہ کے نبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طاقت کو علم اور جسمانی طاقت سے نوازا ہے۔ نیز یہ انتخاب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جس کو چاہے بادشاہت دے دے۔ لہذا تمہیں اس پر معترض نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ دیکھو طاقت کے تقرر کی ایک خاص نشانی یہ ہے کہ تمہارا وہ مقدس صندوق جس میں انبیائے سابقین کے بعض تبرکات محفوظ ہیں۔ اور جسے تمہارے دشمن اٹھا کر لے گئے تھے، وہ تمہارے پاس فرشتے لے کر آئیں گے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ وہ مقدس صندوق ایک بیل گاڑی کے ذریعے خود بخود طاقت کے دروازے پہنچ گیا۔ اب قوم نے طاقت کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور اس کی سرکردگی میں دشمن سے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ آج کے درس میں لشکر طاقت کی دشمن کے مقابلے کے لیے روانگی اور پھر راستے میں عیش آنے والے واقعات کا تذکرہ ہے۔

لشکر طاقت
اور جالوت

طاقت بادشاہ کی سرکردگی میں فوج کی تیاری شروع ہوئی۔ عام اعلان کیا گیا۔ کہ تمام کے تمام صحت مند جوان فوج میں بھرتی ہو جائیں۔ چنانچہ اسی ہزار کا لشکر جراتیار ہوا۔ دشمن بھی بڑا طاقتور تھا۔ قوم عاتقہ کا سردار جالوت تھا۔ دس فٹ قد کا یہ جوان بڑا طاقتور تھا۔ اُسے دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ بائبل کی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ جالوت کی ڈھال تین من وزنی تھی۔ چہرہ چھوڑ کر اس کا باقی سارا جسم زرہ میں محبوس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بڑے بڑے کھیل جوان موجود تھے مگر سب کافر اور مشرک تھے۔ لشکر طاقت کا ان لوگوں کے ساتھ مقابلہ تھا۔

سپاہی اوجھا

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلامی لشکر بعض مخصوص اوصاف کا حامل ہونا چاہیے۔ تاکہ اُسے دشمن کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہو۔ سب سے پہلی بات یہ ہے۔ کہ کسی سپاہی میں حرص کا مادہ نہ ہو۔ اگر ان میں حرص اور لالچ پیدا ہو گیا تو وہ ناکام ہو جائیں گے۔ اس کے بجائے طبیعت میں استقلال ہونا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی آزمائشوں میں گھبرانہ نہیں چاہیے۔ اسلام کے سپاہی کے لیے مستقل مزاجی ایک اچھی علامت ہے۔

اس کے علاوہ صبر ثبات بھی کا بہت بڑا اصول ہے۔ صبر، شکر، اللہ کا ذکر، نماز، عقیقہ، توجیہ پر پختگی، تعظیم شاعر اللہ اور دعا سب ایسے اصول ہیں۔ جو سلفوں کا طرہ امتیاز ہیں حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ کے صبر و استقلال اور مصائب کو برداشت کرنے کے کتنے واقعات حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ انہوں نے بھوک، پیاس اور ہر قسم کے ابتلا کو برداشت کیا۔ مگر جاد سے منہ نہیں موڑا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ کی معیت میں ایک اسلامی لشکر جہاد پر روانہ ہوا۔ راستے میں راشن کی کمی واقع ہو گئی۔ اور اس کی مقدار مسمیٰ بھرنی کس رہ گئی۔ جب راشن بالکل ختم ہوا گیا۔ تو ایک ایک کھجور حصے میں آنے لگی۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب کھجور کی گٹھلیوں کو چوس لیا جانا اور اوپر سے پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا جانا۔ جب بالکل کچھ نہ رہا تو درختوں کے پتے کھانے شروع کر دیے۔ کوڑے پتے کھا کھا کر صحابہؓ کی باچھیں پھٹ گئیں۔ حدیث کے لفظ ہیں تَفَسَّقَتْ أَفْوَاضُهُمْ اُنْ کے منہ پھٹ گئے۔ مگر اس قدر مصیبتیں جھیلنے اور تکلیفیں برداشت کرنے کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ بلکہ دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فتح و کامرانی کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

شکر کی
آداب

بعض اوقات سالار لشکر اپنے لشکر کی آزمائش بھی کرتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے۔ کہ فوج ہر قسم کی سختیوں برداشت کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔ اور بعض اوقات اس میں خاص مصلحت بھی ہوتی ہے۔ جو امیر لشکر کے ذہن میں ہوتی ہے۔ تو اس لحاظ سے امیر کو حق حاصل ہے۔ کہ وہ حالات کے پیش نظر فوج کو کوئی حکم دے۔ جس کی بظاہر کوئی افادیت نہ ہو حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک کا واقعہ ہے۔ حضرت عمرؓ و ابن العاصؓ کو امیر لشکر بنا کر روانہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ فوج میں بطور سپاہی شامل تھے۔ جب دشمن کے قریب پہنچے تو ایک جنگل میں ڈیرہ لگایا۔ رات سخت سرد تھی۔ مگر امیر لشکر نے حکم دیدیا کہ کوئی شخص آگ نہ جلائے۔ لوگ سخت حیران ہوئے کہ شری میں جھٹھک رہے ہیں۔ مگر آگ جلانے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ نہ آگ جلی نہ کھانا پکا۔ لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ سے گزارش کی کہ امیر لشکر کے پاس سفارش کریں۔

کہ آگ جلانے کی اجازت دیں، مگر شیخینؒ نے یہ کہہ کر سفارش کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ اس شخص کو حضور علیہ السلام نے امیر مقرر کیا ہے۔ اس کی اطاعت ہم پر لازم ہے۔ آگ نہ جلانے میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ آخر علی الصبح امیر نے دشمن پر حملہ کر کے کا حکم دیا۔ وہ لوگ اسلامی لشکر کی آمد سے بے خبر تھے۔ اچانک حملہ ہوا۔ تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور لشکر اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ اُس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اگر رات کو آگ روشن کستے تو دشمن کو ہماری آگ کا پتہ چل جاتا اور وہ جنگ کے لیے تیار ہو جاتے۔

طاوت نے بھی اپنے لشکر کو اللہ کے حکم سے آزمائش میں ڈالا۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ جب طاوت لشکر کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ كَمَا اللَّهُ تَعَالٰی تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانا چاہتا ہے کہتے ہیں۔ کہ یہ ایک چھوٹی سی نہر ہے جو حیران میں شمالاً جنوباً بہتی ہے بیچ درمیان کے راستے اس کی کل لمبائی دو سو میل کے قریب ہے۔ تاہم براہ راست قریب ترین فاصلہ پینٹھ میل بنتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد دریائے اردن ہے جسے عبور کر کے دشمن کے مقابلہ پر جانا تھا۔ جب لشکر اس نہر کے قریب پہنچا۔ تو امیر لشکر نے اعلان کیا۔ کہ تمہاری آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ اگرچہ تم پیاس کی شدت میں مبتلا ہو مگر اگر اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہاں سے پانی نہیں پینا فَهَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ جو کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرے نہر کا پانی پی لے گا۔ وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ اِرْحَمِمْ نے اس پانی کو بالکل نہ چکھا ابلا تب وہ مجھ سے ہے۔ یعنی وہ میرے لشکر میں شامل رہے گا۔ اِنِّ اتِّبِعُ لَٰكُنَّ هَٰؤُلَاءِ لَمْ يَمْسَسُوهُ اِلَّا مِنْ غُرُوفَةٍ ۖ فَيَسِدُّ عَلَيْهِمْ طَبَقٌ مِّنْ سَمٍّ مِّنْ عِلَالٍ ۚ اس کی گنجائش ہے کہ جو کوئی اپنے ہاتھ سے چلو بھر لے تو اس کو اجازت ہے اس سے زیادہ پانی پینے کی اجازت نہیں۔

فَلَيْسَ مِنِّي ۚ دے الفاظ بہت سی احادیث مبارکہ میں بھی ملتے ہیں۔ جہاں

کہیں حضور علیہ السلام نے امت کو کسی کام سے روکا، فرمایا جرایا کر گیا۔ فَلَيْسَ رَمِيَتْ وَهُوَ مِمَّنْ
نہیں ہے۔ جیسے فرمایا مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي جو میری سنت سے
اعراض کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یہ جیسے فرمایا مَنْ لَوْ يُكْرِمُ ضَيْفَنَا
فَلَيْسَ مِنَّا جو ہماری مہمان کی عزت نہیں کرتا وہ ہم سے نہیں یعنی وہ ہماری عجمت
سے خارج ہے ایک اور مقام: فرمایا مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا
جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا
جو کسی مسلمان کو دھوکا دے، وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ

عرضِ طاہرات کے پانی سے منع کرنے کے باوجود فَشَرِبُوا مِنْهُ
إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ اسی ہزار کے شکر میں سے اکثریت نے خوب پیٹ بھر
کر پانی پیا، سوائے ایک قلیل تعداد کے جنہوں نے امیر شکر کے حکم پر مہر مستحق
کا دامن تھامے رکھا کتے ہیں کہ اس قلیل تعداد میں سے بعض نے تو بالکل نہ پیا
اور بعض نے چلو بھر پانی لے لیا۔ جس کی اجازت تھی۔ حدیث شریعت میں ان کی تعداد
۳۱۳ آتی ہے۔ اور یہ تعداد بدر کے جانثاروں کی تعداد کے برابر ہے۔ بعض روایتوں
میں ۳۱۹ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسی ہزار کے شکر میں صرف یہ قلیل تعداد آزمائش میں پوری
اٹھی، باقی کی غالب اکثریت پانی پینے کے بعد سستی اور کاہلی کا شکار ہو گئی۔ حتیٰ کہ
وہ آگے بڑھنے سے بھی معذور ہو گئے۔ اور نہر کے اس پار ہی رُک گئے۔

فَلَمَّا أَجَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَبَ طَالُوتُ اور اس کے
ہمراہی اہل ایمان نہر سے پار پہنچے تو سب نے جالوت، کا لشکر موجود تھا۔ حضرت
عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے مفسرین کرام کے حوالہ سے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ
فرماتے ہیں کہ اس وقت طالوت، کا لشکر تین گروہوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ پہلا گروہ
ناقص الایمان تھا، جنہوں نے حکم کے خلاف سیر ہو کر پانی پیا اور لڑائی کے قابل نہ رہے
دوسرا گروہ کامل الایمان لوگوں کا تھا جنہوں نے چلو بھر پانی پیا۔ مگر یہ گروہ اپنی قلب
تعداد کی بنا پر دشمن کے شکر سے خوفزدہ تھا۔ کہ اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ کیسے

ہوا۔ کہتے ہیں کہ تیسرا گروہ اکل الایمان تھے جن کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ قلت و کثرت ان کے نزدیک بے معنی چیز تھی۔

غرض پہلا گروہ تو تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے جنگ کی طرف نہ کھینے کی ہمت ہی نہیں کی۔ دوسرا گروہ کہنے لگا قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ اپنی قلت تعداد کی وجہ سے ہم جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اگر لڑائی شروع کی۔ تو ہم مغلوب ہو جائیں گے۔ اسی ہزار کا لشکر لے کر نکلے تھے مگر اب صرف ۲۱۲ باقی ہیں۔ یہ دشمن سے یکے بعد دیگرے ہوں گے رُہ تیسرا گروہ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُوا اللَّهِ اور یہ ایسا گروہ تھا۔ جسے یقین کامل تھا کہ انہیں ایک دن اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اگر بزدلی سے مر جائیں گے تو بھی اللہ کے ہاں پیشی ہے۔ اور اسکی رضا کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادیں گے تو پھر بھی جانا تو وہیں ہے۔ وہ ہماری نیتوں سے واقف ہے۔ لہذا انہوں نے لشکریوں کو تسلی دی کہ دیکھو تعداد کی قلت اور کثرت کی وجہ سے جنگ نہیں لڑی جاتی بلکہ اس کے لیے بامقصد اور پُر خلوص جذبے کی ضرورت ہے۔ تم اپنی ہمت کے مطابق پوری قوت کے ساتھ ٹکرا جاؤ اور نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ کیا تم تاریخی واقعات کو بھول چکے ہو۔ كَعُوْمَنْ فِتْيَةٍ قَلِيلَةٍ کہتے ہی قلیل تعداد کے لشکر سے کثرت کثیرۃ یَا دُنِ اللہ جو اللہ کے حکم سے کثیر تعداد لشکروں پر غالب آئے۔

تاریخی حقائق

صحابہ کرامؓ کے لیے کہتے ہی واقعات تاریخ میں ملتے ہیں جن میں صحابہؓ کی قلیل تعداد دشمن کی کثیر تعداد پر غالب آئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک جنگ کا جو نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس میں دشمن کا لشکر ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ جب کہ مسلمانوں کی تعداد صرف ساٹھ تھی۔ اس واقعہ کے متعلق کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

غَنَاسَتُونَ وَهُمْ سِتُونَ أَلْفًا
مَعَ هَذَا قَوْلًا مُدْبِرِينَ

اس معرکہ میں ایک ایک مومن ایک ایک ہزار کافر کے مقابلہ میں تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا کی۔ صرف دس مسلمان شہید ہوئے جب کہ کفار کے دس ہزار جہنم داخل ہوئے۔

بخاری شریف میں حضرت زبیرؓ کا واقعہ آتا ہے آپؓ نے درالاکھ کفار کے لشکر میں تنہا کوردگئے اور تلوار چلاتے ہوئے ایک ستر سے دوسرے سرے تک چلے گئے۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے پھر واپس آئے اور بیسٹار کفار کو ہلاک کیا۔ جنگ اعدائے کے متعلق طبری کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ایک بڑا سخت مرحلہ پیش آگیا۔ ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ اور آپؐ اکیلے رہ گئے۔ اس نازک موقع پر انصار مدینہ میں سے حضرت ابو دجانہؓ نے حضور علیہ السلام کی حفاظت کے لیے اپنی پشت کو بطور ڈھال استعمال کیا۔ اور تلوار اور نیزے کے چوڑی زخم کھائے۔ مگر آپؐ کی حفاظت کی۔ ایک اور موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور فرمایا، کون ہے جو اس کا حق ادا کرے گا۔ سب خاموش تھے کہ ابو دجانہؓ بول اٹھے حضور! یہ مجھے عطا فرمائیں، میں اس کا حق ادا کروں گا۔ اور پھر آپؐ نے واقعی اس کا حق ادا کر دکھایا۔

جب سیدہ کذاب نے دعویٰ نبوت کیا۔ تو اس کے پاس چالیس ہزار کاشکے تھا جو قلعہ بند ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کا ایک قلیل لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں سرکوبی کیلئے پہنچا۔ مگر مضبوط قلعہ سر نہیں ہوتا تھا۔ آخر حضرت ابو دجانہؓ نے ایک تدبیر بنائی۔ کہنے لگے، مجھے فکر کمری میں ڈال کر رات کی تاریکی میں کسی طرح قلعہ احمد آباد در، باقی کام میں خود کروں گا۔ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت ابو دجانہؓ نے نوکری سے نکل کر بے دریغ تلوار چلا کر شروع کر دی۔ دشمن میں افراتفری پیدا ہو گئی، وہ سمجھے کہ مسلمانوں کا لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا ہے۔ لہذا انہوں نے خود ہی قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اس موقع کے میں سیدہ کے ۲۸ ہزار آدمی مارے گئے۔ کئی ہزار کفار صرف ابو دجانہؓ کی تلوار کا شکار ہوئے۔

غرض! اُن اکل الایمان لوگوں نے باقی سپاہیوں کو حوصلہ دیا۔ کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ہماری قلیل تعداد کو کثیر تعداد پر غالب کرے گا۔ لہذا تم صبر و استقامت کے ساتھ جنگ میں کود جاؤ۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر ایسی ضروری چیز ہے۔ جس کے بغیر نہ نماز ادا ہو سکتی ہے نہ روزہ کی بھوک پیاس برداشت ہوتی ہے۔ نہ جہاد میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی تبلیغ کا کام کما حقہ ادا ہو سکتا ہے۔ صبر قلت البرہمی کا ایک اہم اصول ہے۔ اس کو اپنانے والے ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس پچھدھفت (۱۰۷)

آیت ۲۵۰ تا ۲۵۱

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا مَبِيعًا
ثَلَاثَ أَفْدَامِنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُمْ
يَاذُنَ اللَّهِ فَتُ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاسْلَمَهُ اللَّهُ الْمَلِكُ وَالْحِكْمَةُ
وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمُ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ
عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٥١﴾

ترجمہ : اور جب جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے ہوئے تو کہنے لگے اے
ہماری پروردگار ! ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ۔ اور کافروں
کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ﴿۲۵۰﴾ پس اہل ایمان نے اُنی (کافروں) کو شکست دی اللہ
کے حکم سے اور قتل کیا حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو اور اللہ تعالیٰ نے داؤد کو
سلطنت اور حکمت دی سارے جہاں دکھایا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے
ساتھ دفع نہ کرتا، تو زمین خراب ہو جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ جہاں والوں پر فضل کرنے والا ﴿۲۵۱﴾

گزشتہ درس میں طالوت کے لشکر کی روانگی کا تذکرہ تھا کہ جب وہ دشمن کی طرف
پہلے تو راستے میں طالوت نے اپنی فرج کو آزمایا۔ کہ یہ لوگ کس حد تک محکم و
برداشت کر سکتے ہیں۔ راستے میں نہر پڑتی ہے۔ اللہ کے حکم سے طالوت نے
اپنے پیالوں کو اس نہر سے پانی پینے سے منع کر دیا۔ اور پیاس برداشت کر نیکی
تفقیں کی۔ مگر البتہ سخت شدت کی صورت میں چلو بھر پانی پی لینے کی اجازت ہی
مگر لشکر کی اکثریت پیاس برداشت نہ کر سکی اور انہوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا
جس سے ان کی ہمت اور کاہلی پیدا ہو گئی اور وہ آگے سفر کرنے کے قابل نہ رہے

لہذا تھک ہار کر وہیں بیٹھ گئے۔ بالوت صرف ۲۱۲ سپاہیوں کا لشکر لے کر نہر سے پار ہوئے۔ اب فوج تین گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ جنہوں نے خوب پانی پیادہ ناقص الایمان لوگ تھے الزورہ اُدھر تھرہ گئے۔ جو نہر سے پار گئے۔ ان میں بھی دو طرح کے آدمی تھے جنہوں نے جلو بھر پانی بیتا تھادہ کال الایمان تھے محکمہ ۲۱۲ کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم جالوت کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ تیسرا گروہ جس نے بالکل پانی نہیں بیتا تھادہ اکمل الایمان لوگ تھے جنہوں نے درمروں کو تسلی دی کہ قعدہ کی کثرت اور قلت سے بہت گھبرائو۔ دنیا میں کتنے ہی واقعات پیش آچکے ہیں۔ جن میں قلت نے اکثریت کو شکست دی۔ فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لہذا تم صبر استقامت پر قائم رہ کر جہاد کرو اللہ تعالیٰ مسیح دیگا۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ صابروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب آیات زیر درس میں دونوں لشکروں میں جنگ کا حال بیان ہو رہا ہے۔ کہ کس طرح بنی اسرائیل نے میدان جنگ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کی اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں مسیح سے نوازا۔

میدان جنگ
میں دعا

گذشتہ درس میں اسلامی سپاہ کے اوصاف بیان ہو چکے ہیں۔ کہ انی کے اندر حرص کا مادہ نہیں ہونا چاہیے۔ نیز یہ لوگ صبر و استقلال کے پیکر اور اچھے اخلاق کے حامل ہونے چاہئیں۔ اور ان کا آخری وصف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کامیابی کے لیے دست بدعا ہوتے ہیں۔ آج کے درس میں سب سے پہلے اسی دعا کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوسٰی بِآٰیَاتِنَا اَنْ يُّخْرِجَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ مِنْ اَرْضِهِمْ وَيُخْرِجَهُمْ مِنْ اَرْضِ مِصْرَ کے سہنے ہوئے فَاَلْقٰوْا اَتْرَافَهُمْ لے دعا کے لیے ہاتھ اٹھالیے اور کہنے لگے ، رَبَّنَا اَفْرِجْ عَلَيْنَا صُدْرًا اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر ڈال دے وَنُفِثْ اَفْئِدَتَنَا اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ وَاَفْصِرْ عَلٰی الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

دعا ایک ایسی اعلیٰ دار فاعل چیز ہے جس کے ذریعے انسان اپنے رب کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے۔ خاص طور پر میدان جنگ میں غیر مسلم قوتیں اپنی طاقت کے غرور

میں شراب پی کر اور گانے گاتے ہوئے جنگ کا ابتداء کرتے ہیں۔ جب کہ ایمان والے جنگ شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور گر گڑا کر فتح کی دعائیں کرتے ہیں کیونکہ دعا ایسی چیز ہے جو ساری عبادت کا پتھر ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا **الْعِبَادَةُ مَعَ الْعِبَادَةِ** یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے تمام غزوات میں میدان جنگ میں پہنچ کر دعائیں کی ہیں۔ جنگ بدر کے تعلق بخاری، مسلم، نسائی اور حدیث کی دوسری کتب میں مذکور ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے کس قدر گر گڑا کر دعا فرمائی۔ آپ رات بھر عاجزی و انکاری کے ساتھ دعا مانگتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ کی پیاد مبارک بھی کندھے سے سر کر گئی۔ آپ فرماتے تھے **اللَّهُمَّ إِنْ تَهَلَّكَ هَذِهِ الْعَصَابَةُ لَا تُقَبِّدْ فِي الْأَرْضِ لَنَا مَوْلَاكَ** اے میرے مخلص! میں نے یہ مٹھی بھرا اہل ایمان میرے نام پر جنگ میں دھکیل دیے۔ اگر یہ ہلاک ہو گئے۔ تو اے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہے گا۔ آپ نے ایمان والوں کو حکم دیا کہ وہ جب بھی دشمن کے مقابلے میں مکلیں تو اس طرح دعا کریں **اللَّهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجِيبِ السَّأَلِ** اے کتاب نازل کرنے والے اور بادلوں کو چلانے والے اللہ! اہل ایمان! اے خدا کی کھال کو شکست دے اور ہم کو فتح سے سرفراز فرما۔

حضور نے ایسی جامع دعا سکھائی۔ کہ پہلے لفظ میں ہی اسکی حقیقت کو واضح فرما دیا۔ **اللَّهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ** یعنی اے اللہ! جس نے کتاب نازل فرمائی ہے مقصد یہ ہے۔ کہ ہم یہ جنگ اس لیے کر رہے ہیں۔ کہ اس پر دو گرام پر عمل درآمد کر سکیں جو تو نے کتاب آمار کر ہمیں دیا ہے۔ اس جنگ سے ہماری کوئی ذاتی اغراض و البتہ نہیں ہیں۔ بلکہ تیری کتاب کے احکام لوگوں تک پہنچانے مقصود ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو رکاوٹ آئے اس کو دور کرنا مقصود ہے۔ ہمارا مقصد ہوس ملک گیری نہیں۔ ہم مال غنیمت کے لیے نہیں آئے اور نہ لوگوں کو غلام بنانے کی خاطر آئے ہیں۔ بلکہ ہم نے اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی جانوں کو اپنی تنہائیوں پر رکھا ہے۔

اللَّهُمَّ اِنْ رَوْعَاتِنَا وَاسْتَرْعَوْا رَتْنَا اے اللہ! ہمارے خدوں کو ٹال

میں اور ہماری عیوب پر پردہ ڈال۔ غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ کے لیے خود دعائیں کی ہیں۔ اور صحابہ کو سکھائی ہیں۔ حضرت علیؑ نے دیکھا کہ بدر کے پہلوان میں سجدے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت عاجزی کے ساتھ یَا قَہُومُ کہہ رہے ہیں۔ اے اللہ! ہم تیری رضا کی خاطر آئے ہیں۔ ہماری زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہمارا غلبہ تیری شہادت پر منحصر ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؑ پلے گئے۔ میدان جنگ کا چکر لگا کر واپس آئے۔ تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام اسی طرح سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اللہ کے حضور دعائیں کہہ رہے ہیں۔

الغرض! حالات مٹھی بھر ساقیوں کے ساتھ میدان میں اترا۔ اللہ کے نبی صومیلؑ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جاہلوت کا کثیر لشکر دیکھ کر دل دہل گیا۔ اُس وقت گڑگڑا کر دُعا کی رَبَّنَا اے ہمارے پروردگار! دُعا کے ابتداء میں خدا تعالیٰ کی صفت ربوبیت کو مقدم رکھا۔ کیونکہ پانا اور درجہ کمال تک پہنچانا صفت ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ رَبَّنَا کے لفظ کے ساتھ اپنی عاجزی اور انکاری کا اظہار کیا۔ جیسا کہ اکثر دعائوں کی ابتدا میں یہ لفظ آتا ہے۔ جیسے رَبَّنَا اَتَمِنَّا فِي الْآخِرَةِ يَا جَبَّارُ رَبَّنَا هَبْ لَنَا يَا رَبَّنَا اَعْقِرْنَا وغیرہ، یاں پر یہ دُعا کی رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَدْرُكَ اے اللہ! ہم پر صبر ڈال دے یا صبر انڈیل دے۔ جو ہمیں صبر کا مادہ پیدا ہو جائے وَثَّقْتَ اَعْمَانَا اور ہمیں ثابت قدم رکھ۔ ہمارے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے۔ اور ہم دُعا کی _____ ساتھ دشمن کا مقابلہ کریں۔ یہ ایسا موقع تھا کہ دشمن کی قوت کو دیکھ کر اہل ایمان کو سخت پریشانی لاحق تھی حتیٰ کہ بَلَّغْتَ الْقُلُوبَ الْحَسَّاجَةَ اُن کے دل اچھل کر لگے تک آگئے تھے، کا منظر تھا قرآنِ عظیم میں وہ رب العزت سے دُعا کر رہے تھے۔ کہ مولا کریم! ہمیں دشمن کے مقابلے میں صبر کی دولت عطا کر اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ اور پھر آخری بابت یہ کہ وَاصْصِرْ عَلٰی الْفِتَنِ الْكَافِرِينَ کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما اور ان پر غلبہ عطا فرما۔ کفار کفر کے پروگرام کے داعی ہیں۔ اور اہل ایمان حق کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں۔ نیکی، اطاعت اور تیری رضا کا پروگرام

نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا ان کی نصرت فرما۔

جب جالوت نے دیکھا کہ مقابلے میں معمولی سا لشکر ہے تو کہنے لگا میری ساری فوج کو لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لشکر کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اُس نے اپنے میں جنگ کا طریقہ یہ تھا کہ ابتدا میں دونوں طرفوں سے ایک ایک آدمی نکلتا اور مقابلہ کرتا۔ پھر دونوں اطراف سے ایک ایک اور سپاہی نکلتا ہے۔ حتیٰ کہ عام جنگ شروع ہو جاتی۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں جنگ بدر میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب کفار مکہ نے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو لٹکارا تو مسلمانوں کی طرف سے انصار مدینہ میں سے کچھ جابا ز نکلے مگر کفار نے کہا کہ یہ تو مدینہ کے کاشتکار ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لیے ہم پہلے لوگ آئیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کو میدان میں لے کر حکم دیا۔ چنانچہ اُدھر سے حضرت عبیدہؓ شہید ہوئے اور کفار کے تین جوان جہنم داخل ہوئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا کارنامہ

اہل اسلام کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام کے والد الیاس یا یسی بن عورید بھی شامل تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے جن میں داؤد علیہ السلام سب سے کم سن تھے کہ آپ کم سن کے باعث جنگ میں شرکت کے لیے نہیں آئے تھے۔ بلکہ اپنے بڑے بھائیوں کو سامان پہنچانے کے لیے دہاں پہنچے تھے، اُدھر اللہ کے نبی کو حکم ہوا کہ جالوت کے مقابلے کے لیے داؤد کو نکالو۔ آپ نے اُن کے باپ کو جمع چھ بیٹوں کے طلب کیا۔ اور بمطابق حکم الہی داؤد علیہ السلام سے پوچھا کیا وہ جالوت کا مقابلہ کریں گے انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ چنانچہ اللہ کے نبی نے آپ کو جالوت کے مقابلہ کے لیے نکالا۔ آپ نے تلوار، تیر بانیزہ استعمال کرنے کی بجائے دشمن پر پتھر پھینکنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ آپ کم سن تھے مگر بڑے ذہین اور سمجھنے والا تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے قبیلے سے ایک پتھر نکالا اُسے فلاخن میں ڈالا اور زور سے گھما کر جالوت کو دے مارا۔ جالوت سر تاپا لہے میں غرق تھا، صرف اُس کا ہاتھ کھلا تھا۔ پتھر وہیں پر جا کر لگا۔ اور سر کے پار نکل

گیا۔ آپ نے دوسرا اور تیسرا پتھر چلایا تو جالوت زمین پر گر گیا۔ آخر داؤد علیہ السلام نے اس کا اوپر پہنچکا اس کا کام تمام کر دیا۔ جب لشکر لے دیکھا کہ اُن کا سردار مارا گیا ہے۔ تو اس کی جگہ دوسرے نے لینے کی کوشش کی مگر وہ بھی کیفر کردار کو پہنچا۔ آخر دشمن کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ اہل ایمان نے ان کا تعاقب کر کے انہیں مکمل شکست سے ہمکنار کر دیا۔ اسی واقعہ کے متعلق یہاں ارشاد ہوا ہے۔ فَهَزَمُوهُمْ بِأَذْنِ اللَّهِ الْكَلْبِ نے فلسطینوں کو اللہ کے حکم سے شکست دیدی وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ اور حضرت داؤد علیہ السلام نے سالار لشکر جالوت کو قتل کر دیا۔

مناقب
حضرت داؤد علیہ السلام

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام اپنے باپ اور بھائیوں کے پاس میدان جنگ کی طرف آئے تھے۔ تو راستے میں درختوں کے تنوں سے آواز آئی، اے داؤد! تمہارے قریب یہ پتھر ہیں انہیں اٹھا لو، تمہارے کلمے آئیے چنانچہ آپ نے ان میں سے تین پتھر اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیے اور پھر یہی پتھر اپنے جالوت پر چلائے جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ آپ اتنے بہادر تھے کہ دشمن کے محلے میں کبھی پشت نہیں پھیری۔ آپ بچپن میں بکریاں چراتے تھے۔ جب کبھی کوئی بھیڑ یا یا شیر بکریوں پر حملہ کرتا تو آپ اس کے جبرے بھاڑ دیتے۔ اللہ نے اتنی طاقت عطا کی تھی۔ اگرچہ قد میں آپ چھوٹے تھے مگر جسم میں قوت ہلا کی تھی۔ آپ نہایت خوش الحان تھے۔ جب آپ تلاوت کرتے تو پڑے بھی آپ کی آواز سننے کے لیے ٹھہر جاتے، اُن کا لہجہ داؤدی آج بھی محاورات استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے لوسہ کو آپ کے ہاتھ پر موم کر دیا تھا۔ جدھر چاہتے موڑ لیتے۔ چنانچہ آپ لوسہ کی زر میں بھی بناتے تھے۔ عبادت کا یہ حال تھا کہ آپ کہتے عبد البشر کہا گیا ہے۔ یعنی آپ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔

وَاللَّهُ الْعَلِيُّ اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکومت بھی عطا کی تفسیری روایات میں آتا ہے کہ تلاوت کے بعد آپ ان کے جانشین بنے

آپ کو خلیفہ اللہ کہا جاتا ہے۔ **يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ** اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا۔ بائبل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی بہادری سے متاثر ہو کر طاوت نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت داؤد سے کر دیا تھا۔ حکومت کے علاوہ فرمایا **وَالْحُكْمَةَ** اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکمت بھی عطا کی۔ عام طور پر حکمت سے مراد غایت درجہ کی عقلندی اور معاملہ فہمی ہوتا ہے تاہم بعض فرماتے ہیں کہ یہاں پر حکمت سے مراد نبرت ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اس سے پہلے اسرائیلیوں میں حکومت اور نبوت میں مختلف شخصیتوں کے پاس ہوتی تھی جیسے نبی سموئیل علیہ السلام تھے اور حکومت طاوت کے پاس تھی مگر یہ دونوں چیزیں داؤد علیہ السلام پر اکڑ اکٹھی ہو گئیں۔ طاوت کے بعد آپ کو خلافت ملی اور حضرت سموئیل کے بعد آپ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے۔

ایک اور خصوصیت جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی، وہ ہے **وَعَلَّمْنَاهُ صَا** **يَسَاءُ** اللہ تعالیٰ نے جو چاہا حضرت داؤد علیہ السلام کو سکھا دیا۔ داؤد علیہ السلام کا ذکر قرآن پاک میں تلواریں مقامات پر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مختلف فنون اور علوم سے نوازا۔ پندروں کی بولیوں کے علم کا تذکرہ تو سورۃ نمل میں موجود ہے **عَلَّمْنَاهُ صَا** **الطَّيْرِ** ہمیں اڑتے جانوروں کی بولی سکھائی گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے متعلق فرمایا **وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا** ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا کیا۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے سلیمان علیہ السلام بھی نبی ہوئے اور خلیفہ ہوئے۔ یہ درویشی اسرائیل کا سنہری دور تھا۔ خلافت اور نبوت ایک جگہ پر جمع تھیں امن اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اچھائی کو غلبہ حاصل تھا۔ اور برائی دم توڑ رہی تھی۔

آیت کے الگ حصے میں اللہ تعالیٰ نے جادو کا فلسفہ بھی بیان فرمایا۔ **وَكُلُّوْا** **دَفَعَ اللّٰهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّفَسَادِ النَّفْسِ** اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے نہ بٹلاتے تو زمین میں فساد برپا رہتا۔ یعنی جب کسی گروہ نے خدا کی زمین پر ہامنی پھیلانے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے

مقابلے میں دوسری جماعت کو بھیج کر مضہین کا خاتمہ کر دیا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب قوم عمالہ کی زیادتیاں مد سے بڑھ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے طاہرہ کے ذریعے ان کا قلع قمع کر دیا۔ اسی لیے دشمن کے ساتھ جہاد کا حکم ہے ”حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةً“ یہاں تک کہ فتنہ و فساد بالکل ختم ہو جائے کفر و شرک کی ناپاکی دور ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہونے لگے اور اسلام کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ یہی وہ مشن ہے جسے جمال الدین افغانیؒ نے کراٹھے اور اپنی پوری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی۔ آپ نے مسلمانوں کو ذہن نشین کر لیا کہ عیسائی اور یہودی انگریز اسلام کی دشمن طاقتیں ہیں۔ وہ اسلام کی شمع کو بجھانا چاہتی ہیں۔ لہذا اہل اسلام کو اس باغ کا ٹرس لینا چاہیے۔ اور اپنا دفاع کرنا چاہیے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ پہلے مرحلے میں دفاعی جہاد (DEFENSIVE) فرض ہے اگر جہاد سے روگردانی کی گئی تو درندہ صفت طاقتیں دنیا میں جھجائی رہیں گی۔ اور کسی کی جان، عزت و آبرو محفوظ نہ ہوگی۔ بزدلی دکھانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

بہر حال فرمایا کہ یہ سنت اللہ ہے۔ کہ وہ کسی برائی کو ختم کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر وسائل پیدا کر دیتا ہے۔ دنیا میں کتنے فرعون، لہمان اور فرعون پیدا ہوئے مگر آخر ختم ہو گئے۔ کبھی جرمنی کا طوطی بولتا تھا۔ اب امریکہ اور روس پھر باور نہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے پروگرام کے مطابق اول بدل کر رہتا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ اللہ تعالیٰ اہل جہان پر فضل کر رہا ہے۔ جب وہ کسی ظالم کی تیغ کٹی کرتا ہے۔ تو یہ صحیح معنوں میں دنیا والوں پر اس کا فضل ہوتا ہے انہیں ظلم سے نجات مل جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے مشن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ دنیا میں ظلم کو ختم کریں۔ حق و انصاف کا نظام قائم کریں عقیدہ توحید کو پختہ کریں۔ چنانچہ ظلم کو مٹانے کے لیے جہاد کی ضرورت ہے۔ جہاد کی مشروریت اگلی آیات اور کئی دوسرے مقامات پر آئیگی۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾
 تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ
 كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ
 الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلَ
 الَّذِينَ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مَنْ بَدَّهِمْ مَنْ بَدَّ مَآجَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتِ وَلَكِنْ
 اخْتَلَفُوا فِيهِمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
 مَا اقْتُلُوا وَقَدْ لَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿٢٥٣﴾

۲۵۳

ترجمہ : یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو ہم آپ کو حق کے ساتھ سناتے ہیں۔ اور بیشک
 آپ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں (۲۵۲) یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض
 کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ بعض ان میں سے وہ ہیں کہ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے
 کلام کیا اور بعض کے درجات بہت بلند کیے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام
 کو واضح نشانیاں دیں۔ اور ہم نے اس کی روح القدس کے ساتھ تائید کی۔ اور اگر
 اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان نبیوں کے بعد آئے۔ بعد اس کے کہ ان کے
 پاس واضح باتیں آچکی تھیں۔ لیکن انہوں نے اختلاف کیا۔ اور بعض ان میں سے ایمان
 لائے۔ اور ان میں سے بعض نے کفر اختیار کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے
 لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے (۲۵۳)

ربطیات بنی اسرائیل کے واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے
 حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بطور خاص اور پھر تمام انبیاء کی نبوت
 کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں جہاد کی حکمت بیان فرمائی تھی۔ اور

معتزین کے اعتراض کا رد تھا۔ اور واضح کیا تھا کہ اگر جہاد فرض نہ کیا جاتا تو معتزین زمین میں فساد برپا کر کے اس کو خراب کر دیتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت فرمائی۔ اور ہمتی کے خاتمے کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ تمام انبیاء اپنے اپنے دور میں جہاد کرتے آئے ہیں۔ اسی ضمن میں طاووت کا ذکر کیا۔ جو کہ سمریکل نبی کے زمانے میں ہوا ہے۔ آپ کے نام پر بائبل میں دو صحیفے بھی موجود ہیں۔ آپ خود بھی جہاد میں شریک ہوئے۔

بعثتِ انبیا
کا مقصد

حضرت شاہ دلی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد لوگوں کو ایمان اور توحید کا راستہ بتانا، اور ان کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کرنا ہے اس کے علاوہ رسومات باطلہ کو مٹانا اور رفع نظام بین الناس یعنی لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو فرو کرنا ہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جہاد لازمی ہے۔ اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ معاشرہ میں ظلم و زیادتی برپا کرنے والے لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے جسم میں بھوڑا ہوتا ہے۔ جب تک اس بھوڑے کو کاٹ نہیں دیا جاتا، جسم تندرست نہیں ہو سکتا، اسی طرح جب تک فسادِ لوگوں کو جڑ سے نہیں اکھاڑ دیا جاتا، معاشرے میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی آپریشن کا نام جنگ ہے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی تصدیق فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کیا۔ کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں موت سے ڈر کر

تصدیقِ رسالت

بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر اللہ نے انہیں راستے میں ہی موت سے ہم کنار کر دیا۔ پھر اللہ کے نبیؐ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی دی۔ ان کی اپنی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے طاووت کو ان کا حیم مقرر کیا۔ اور اس کی سرکردگی میں جہاد کا حکم دیا۔ پھر راستے میں لشکر کی آزمائش ہوئی۔ اور ان میں سے بہت تھوڑے اس آزمائش میں پورے آئے اکثریت نے بے صبری کا اظہار کیا۔ اور جہاد سے محروم ہے۔ بائباؤں کی ایک قلیل تعداد کو اللہ نے فتح سے ہم کنار کیا۔ اس موقع پر اللہ نے دُعا کا فلسفہ سکھایا۔ اور پھر یہ ان جنگ میں دشمن کا سردار حضرت داؤد علیہ السلام کے پتھر سے ہلاک ہوا۔ طاووت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بنایا۔ یہ تمام واقعات ہیں، جنہیں

بندے ہیں اور محصور ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں گناہ سے پاک رکھتا ہے۔ البتہ باعتبار فضائل اور خصوصیات فَضْلًا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے یہاں پر ایک غلبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ یعنی نبیوں کے درمیان تفاضل نہ کرو۔ یہ مجھے بھی باقی نبیوں کے درمیان فضیلت نہ دو۔ یہاں پر یوں کہیں بنی کے مقابلہ میں کسی کو فضیلت نہ دو۔ اس کے متعلق محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ میں اپنی عقل سے بات نہ کرو کہ بعض کو بعض پر فضیلت دینے لگو اور بعض کی توبہ کرنے لگو، ایسا نہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے کفر لازم آجاتا ہے۔ فضیلت کا جو ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے۔ اُسی پر کاربند رہو۔ چنانچہ اس امر میں اجماع اور اتفاق ہے کہ حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر فضیلت دی ہے۔ آپ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے درجات ہیں خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے اَلْحَقُّ جَٰلِلُكَ الْبَاسِ اِمَامًا اَيْضًا مِّنْ قَوْمٍ كَوْمِ الْاِمَامِ بَانَ وَالْاِهْوَالِ ۔

اس مقام پر فضائل انبیاء کے متعلق ارشاد ہے وَهَهُمْ مِّنْ كَلِمَةِ اللّٰهِ اُنْ مِّنْ سَبْعِ اَيَّامٍ ۔ جن کے ساتھ اللہ نے کلام کیا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْمًا اُوْدَ كُوْهُ طُوْرٍ اَللّٰهُ نے موسیٰ علیہ السلام سے بالمشافہ کلام فرمایا۔ معراج کے واقعہ میں آتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اَوَّلُ النَّبِيِّينَ یعنی سب سے پہلے نبی کون ہیں۔ آپ نے فرمایا آدم علیہ السلام پھر عرض کیا ہے حضور! کیا وہ نبی ہیں۔ فرمایا ہاں وہ سبھی مَکْلُوْمُ اللّٰهِ اَللّٰهُ نے اُن سے بالمشافہ کلام کیا۔ آپ سب سے پہلے نبی ہیں اور سب سے آخری نبی حضور خاتم النبیین علیہ التّیْمۃ والسلام ہیں۔ فرمایا وَلَدَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجَتٍ اور بعض کے درجات بلند کیے۔ اس آیت میں بعض کے درجات سے مراد حضور علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درجات سب نبیوں سے

زیادہ بلند کئے ہیں۔ اللہ نے آپ کو مقام محمود پر سرفراز فرمایا ہے۔ جس کا مظاہرہ قیامت کے روز ہوگا۔ آپ کو شفاعت کبریٰ عطا ہوئی ہے۔ آپ کو وسیلہ عطا ہوا ہے آپ کی امت کو اکثریت حاصل ہے آپ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے آپ کو کتاب بھی سبب افضل دی گئی ہے اور آپ کو اللہ نے بی شمار معجزات عطا کیے ہیں غرضیکہ آپ کے درجہ بہت بلند فرمائے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ نقص کے درجات بلند کیے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے معجزات

فرمایا وَإِنِّي نَسِيتُ ابْنَ مَرْيَمَ الْبَتُّنَتِ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ قرآن میں اسکی وضاحت موجود ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں مردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑھیوں کو تندرست کرنا، اللہ کے حکم سے غیب کی خبریں دینا۔ گھر سے کھا کر آنے والے کو بنا دینا کہ کیا کھایا ہے وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جہاں بھی قرآن میں ذکر آتا ہے۔ عیسیٰ ابن مریم کے نام سے آتا ہے۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ آپ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اللہ نے انیس بغیر باپ کے پیدا کیا۔ قیامت کے روز بھی آپ کو یاعیسیٰ ابن مریم کے لقب سے پکارا جائے گا۔ اور پھر لو چھا جائے گا۔ کہ کیا آپ نے لوگوں کو کیا تھا۔ کہ مجھے معبود بنا لو۔ آپ جواب دیں گے۔ سُبْحَانَكَ اے اللہ تو پاک ہے۔ میں ایسی بات کس طرح کر سکتا ہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ میں نے تو انیس وہی کچھ کہا جس کا تو نے مجھے حکم دید۔ گویا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا رد کیا گیا ہے۔ اور ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ مر سید اور پردیو جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ بھی ثابت کرتے ہیں۔ یہ بات قرآن پاک کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ اور اٹھارہ عقیدہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دیں۔

روح القدس
سے تائید

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہی فرمایا وَإِيْدُنْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ہم نے روح القدس کے ساتھ ان کی تائید فرمائی۔ روح القدس کا معنی عام طور پر جبرائیل علیہ السلام کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جبر بھی جلتے تھے

ہو سکتے۔ ان میں سے ہرگز وہ اپنا پرگرام نافذ کرنا چاہے گا۔ لہذا ان کے درمیان ضرور ٹکرا ہوگی اور یہی جہاد ہے۔ جو اہل اسلام پر فرض کیا گیا ہے۔ کیونکہ جہاد کے بغیر فتنہ و فساد کا قلع قمع نہیں ہو سکتا و چھٹے درس میں آچکا ہے۔ کہ جہاد کے ذریعے خرف و فساد کو ٹٹا مقصود ہے اسی چیز کے متعلق فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعے نہ مٹاتا تو زمین میں فساد بپا رہتا۔ لہذا جہاد لازم قرار دیا۔ اور بتا دیا کہ جہاد کو ترک کر دو گے تو یسقط اللہ ذلک علیکم (البرہان) اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دے گا اور یہ ذلت ختم نہ ہوگی۔ حتیٰ توجعوا الی دینکم جب تک تم اپنے دین کی طرف پلٹ کر نہ جاؤ گے۔ فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَفْتَنَكُمَا أَكْثَرَ التَّمَاثِيلِ تَرِيه لَوَگ آپس میں نہ لڑتے سب ایک ہی راستے پر ہوتے اور ان میں کوئی اختلاف رونما نہ ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل اور قوت عطا کی ہے۔ اُسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور پھر اُسے اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے ارادے سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ إِنَّا هَدَيْنَا السَّبِيلَ إِنَّمَا شَاكِرُوا وَإِنَّمَا كَفَرُوا یہ اپنے ارادے کا خود ذمہ دار ہے جو راستہ اختیار کرے گا اس کے مطابق جزا و جزا کا مستحق ہوگا۔ اگر صحیح راستہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے گا۔ اور اللہ ایمان پر راضی ہوتا ہے کفر پر راضی نہیں ہوتا۔ اہل ایمان کو نجات دے گا اور ان کو فلاح حاصل ہوگی۔

فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ وہ چاہتا تریہ لوگ اختلاف کا شکار نہ ہوتے وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُؤِيدُ مگر اللہ تعالیٰ وہ کچھ کرے گا جو اس کا اپنا ارادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اور اپنے بندوں کو آزما کر اس کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ اس کا غشار یہ ہے کہ لوگ ایمان کا راستہ اختیار کریں۔ اور جو لوگ کفر کے راستے پر چل نکلیں ان کے شر و فساد کو مٹانے کے لیے ایمان دے گا جہاد کریں تاکہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو۔ اور اللہ کا دین اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ
يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ
هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٥٤﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے
اس سے پیشتر کہ وہ دن آجائے۔ جس میں خرید و فروخت نہیں ہوگی۔ اور نہ دوستی ہوگی۔
اور نہ سفارش ہوگی اور جو لوگ کفر کرنے والے ہیں وہی بڑے ظالم ہیں۔

گزشتہ درس میں نبوت اور رسالت کا ذکر تھا۔ اس سے پہلے جہاد کا تذکرہ تھا۔
اللہ تعالیٰ نے جہاد کی حکمت بھی واضح فرمائی۔ اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کا بیان ہے
اس کا تعلق اس آیت کے ساتھ ہے۔ جس میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ ان کا ایک
گروہ موت کے ڈر سے جاکھڑا ہوا۔ پھر اللہ نے انہیں راستہ میں موت دے دی
پھر اپنے خاص فضل سے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا
”فَاقْتُلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ اللہ کے راستے میں دشمنانِ خدا اور دشمنانِ دین سے
ٹکھو جاؤ۔ اور پھر درمیان میں یہ بھی فرمایا ”هَنْ ذَا الَّذِي يَقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا“
کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے۔ اور اللہ اُسے بڑھا چڑھا کر عطا کرے گا۔ یہ مالِ تسبیح
کے نیکی تر غریب ہو گئی۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرہ سب سے لمبی سورۃ ہے۔ اور اس میں
مختلف الانواع مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ اس سورۃ میں عبادات، معجزات اور معاملات
کا بیان ہے۔ خصوصاً معاملات کی بہت سی تفصیلات ہیں۔ عالمی قوانین یعنی نکاح
و طلاق کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام کی تعمیل نفس پر شاق
گزرتی ہے۔ انسان کا نفس اور اس کی سوچ بوجھل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جان و مال کی

جہادِ دینی
کی قرآنی

قربانی پیش کرتے وقت بڑی دشواری پیش آتی ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کے لیے خاص تاکید فرمائی ہے۔ اور اکثر لوگ جان و مال کی وجہ سے ہی معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ محبت کسی نفس کی ہر مال کی، یہ انسان کو قانون کی خلاف ورزی پر ابھارتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر جان کو کھپانے کا حکم دیا ہے۔ اور دوسری جگہ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو جان کو بگاڑ دینا نسبتاً آسان سمجھتے ہیں۔ مگر مال کے خرچ کرنے میں نکیل واقع ہوتے ہیں یہ ایک روحانی بیماری ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَمَّا دَاخِلُ دَعْوَاكَ مِنْ الْجَنَّةِ بَعْلٌ سَ بَرَّ بِيَارِي كَرْنِ يَ بَہ۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

گر جان طلبی مذاقتہ نیست

گر زر طلبی سخن میں جاہت

یعنی اگر جان کا مطالبہ ہے۔ تو اس میں کوئی مذاقتہ نہیں، جان حاضر ہے۔ اور اگر مال چاہتے ہو۔ تو یہ بات نہیں بن سکے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کے متعلق خصوصی احکام دیے ہیں۔ مال پر بہت سی عبادت موقوف ہیں۔ اگر مال خرچ نہیں کیا جائے گا۔ تو جہاد بھی نہیں ہو سکتا۔ زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، حج نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگلے رکوع میں اتفاق فی سبیل اللہ کا تذکرہ بالتفصیل آئے گا۔

اتفاق فی سبیل اللہ

چنانچہ یہاں پر بھی ارشاد ہوتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِے ایمان والو! اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمْ خَرِجْ کَر داس میں سے جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے۔ مراد اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ یہاں پر رَزَقَكُمْ خصوصاً توجہ طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ یہ ہمارا عطا کردہ ہے۔ ہم نے ہی اسباب و وسائل مہیا کیے تو تمہارے پاس مال آیا و مگر نہ انسان اگر اپنی ذاتی کاوش کی بنا پر کچھ حاصل کرنا چاہتا، تو اُسے کچھ نہ ملتا۔ یہ مال ہم نے ہی تمہیں دیا ہے۔ جس سے خرچ کرنے کا حکم دے ہے ہیں۔ لہذا اس میں کسی قسم کی حیل و حجت نہیں ہونی چاہیے۔ اسی موضوع کو سورۃ النور میں بھی بیان فرمایا۔ جہاں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے

وہاں فرمایا "وَأَنفُسُهُمْ مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي أَنشَأَهُمُ" اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اُن کو دوہرہ تاکہ وہ مکاتبت کرے اپنی جان چھڑا سکیں۔ یہاں پر یہ نظریہ واضح کر دیا گیا کہ ایماندار اپنے مال کو اپنی ذاتی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اللہ کا انعام سمجھتا ہے۔ جو اس نے مہربانی فرما کر عطا کیا۔ کبھی کوئی اسباب پیدا کر دیے۔ کہیں مزدوری مل گئی۔ لڑکری میسر آگئی، کاروبار میں برکت ڈال دی۔ وراثت سے حصہ مل گیا، کوئی تحفہ مل گیا۔ یہ سب مالک الملک کے پیدا کردہ اسباب ہیں۔ اس لیے انسان کو جو بھی مال میسر آتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی جانب سے ملتا ہے لہذا اس کے راستے میں خیرات، صدقات، زکوٰۃ وغیرہ پر خرچ کرنا کوئی اپنا ذاتی کارنامہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس کو فنی پر اٹھنا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس کا دیا ہوا مال اُس کے حکم کے مطابق خرچ ہوا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو مال خرچ کیا جا رہا ہے وہ آیا کہاں سے ہے۔ کھائی حلال کی ہے یا حرام کی۔ ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کی بھی سخت وعید ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ وَاجْمَعُوا فِي الطَّلَبِ طلب کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کرو۔ حرام کی کھائی سے اجتناب کرو۔ حرام کی کھائی کھانے والے کی نہ عبادت قبول ہوتی ہے نہ صدقہ کسی کام آتا ہے۔ اور یہی چیز مرنے کے بعد جہنم کا توشہ بنے گی۔

اب خرچ کرنے کے متعلق بھی اصول و قواعد ہیں۔ ہر شخص کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ فرمایا وَلَا تَسْبِقُوا سُرُفًا نہ کرو ولا تُبْذِرُوا فضول خرچی سے بچ جاؤ۔ اللہ کے دیے ہوئے انعام کو صحیح طریقے سے خرچ کرو ہمارے دیے ہوئے مال میں سے اپنی جائز ضرورتیں بھی پوری کرو۔ اور پھر حقوق و فرائض اور واجبات کا خیال بھی رکھو۔ جہاد کے لیے خرچ کرو۔ اقامت دین اور تبلیغ دین پر خرچ کرو۔ غر بار و مساکین کی اعانت کرو۔ مقروض کا قرضہ ادا کرو۔ تاہم اپنی ذاتی ضرورتیں مقدم ہیں۔ اُن کو پہلے پورا کرو۔ یہ بات مستحسن نہیں۔ کہ آدمی سارا مال خرچ کرے اور خود محتاج ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کے لیے تو صدیق اکبرؑ جیسا صبر درکار ہے

خرچ میں اعتدال کی راہ

ایک صحابی کو کچھ سونا حاصل ہوا، لاکھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا کہ اے اللہ کے رسول میں یہ مال صدقہ کرتا ہوں، آپ نے فرمایا الیامت کرو پہلے اپنی ضروریات پورا کرو۔ اس کے بعد صدقہ کرو۔ خود محتاج ہو کر بیٹھ جاؤ گے تو پھر شکوہ کرو گے۔ خاص طور پر جب کہ برداشت کا مادہ بھی نہ ہو۔ لہذا ہر کام میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ پورے کا پورا مال خرچ نہ کرو۔ بلکہ اپنی جائز ضروریات کیلئے بھی رکھ لو۔

روز قیامت
خرید و فروخت
نہ ہوگی

فرمایا اللہ کے رستے میں خرچ کرو مِّن قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ بَشِيرًا اس کے کہ وہ دن آجائے جب کوئی خرید و فروخت نہیں ہوگی۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اُس دن اگر کوئی شخص کوئی قیمتی سے قیمتی چیز دیکر بھی ایمان یا کوئی نیکی خریدنا چاہے گا تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ اول تو کسی کے پاس دنیا کا مال و دولت ہوگا ہی نہیں جس سے کوئی چیز خریدی جاسکے۔ دوسرے وہاں کوئی بازار نہیں سکے گا جہاں خرید و فروخت ہو سکے۔ یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ یہاں پر انسان اچھے اعمال کے ذریعے، عبادات کے ذریعے، مال خرچ کر کے آخرت کا توشہ خرید سکتا ہے۔ مگر وہاں قیامت کے دن ایسی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی کمی کو خرید و فروخت کے ذریعے پورا کر سکے۔ وہاں خرید و فروخت قطعاً ناممکن ہوگی۔ وہاں نیکی حاصل کر نیکی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ اس دارالعمل میں النان وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ مَصْدَقاً آخرت کے لیے ذخیرہ بنا سکتا ہے۔ وہ تو دارالحجرا ہوگا۔ قیامت کے دن تو کردہ اعمال کا بدلہ ملے گا۔ وہاں سنئے سکرے سے عمل کر نیکی اجازت نہیں ہوگی۔ نہ وہاں خرید و فروخت ہوگی۔

دوستی کام
نہ آئے گی

فرمایا وَلَا خُلَّةٌ وہاں پر عام دوستی بھی کام نہیں آئے گی۔ جس طرح اس دنیا میں اقربا پروری اور تعلقات کام آتے ہیں وہاں پر ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں تو لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہونگے اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ مِّمَّا كَانُوا يَتَوَدَّوْنَ جس کی بنیاد نیکی اور تقویٰ تہ ہوگی اِنَّ اِلَٰهَ الْمُتَّقِينَ اَبْلَ اِيْمَانٍ کی دوستی وہاں پر قائم رہے گی۔ مگر فاسق و فاجر اور کفو و لعب والی دوستیاں ختم ہو جائیں گی۔ مہربان دوست

دوسرے سے نفرت کریگا۔

عام سفارش
نہیں ہوگی

فرمایا جس طرح خرید و فروخت اور عام دوستی نہیں ہوگی۔ قیامت کے دن
وَلَا تَشْفَعُ عَمَّ سَفَرَش بھی نہیں چلے گی۔ اس دنیا کا دستور ہے کہ بڑے لوگ سفارش
کے ذریعے بڑے بڑے مجرموں کو بھی چھڑا لیتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن ایسا نہیں
ہوگا۔ وہاں سفارش ہوگی مگر اس شخص کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت
فرمائیں گے آگے آیت الحکمہ کی آرہی ہے۔ جسے اعظم آیت فی القرآن کہا گیا ہے۔
اس میں مسئلہ سفارش کو واضح کیا گیا ہے۔ مشرک لوگ جو سمجھتے ہیں کہ ہمارے معبود ہماری سفارش
کر کے ہمیں چھڑائیں گے اور ہمیں درجات بھی دلائیں گے۔ اس قسم کی سفارش قطعاً باطل
ہے۔ کیونکہ وہاں پر شفاعت مشروط ہوگی۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ لَا تَنْتَكُمُونَ
إِلَّا مَن أِذْنُ لَهُ مِنَ الرَّحْمَنِ وَقَالَ صَوَابًا۔ اس دن کو کوئی کلام بھی نہ کر سکے گا سوائے
اس کے کہ جسے اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے۔ اور وہ بھی اس شرط پر کہ اُس کی بات
ٹھیک ٹھیک ہو۔ غلط بات کہہ نہ سکے گا تو اجازت ہی نہیں ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے
فرمایا میری شفاعت اُس شخص تک پہنچے گی لِمَنْ لَا يَشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا جو
اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک میں ملوث نہ ہوا ہو۔ مشرک یا دھرم پر یا کسی اور بے عقیدہ کے
کے لیے سفارش کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

اسی لیے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو، جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لو۔
آج یہ موقع ہے۔ یہ عمل کی دنیا ہے۔ اس میں جو کچھ کر سکتے ہو کہ لو۔ کل کو دارالجزا
میں جا کر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہاں تو بدلہ دیا جائے گا۔ اُس روز نہ کوئی شخص
نیک خرید سکے گا۔ نہ کوئی دوستی کام آئیگی اور نہ کوئی سفارش کام آئے گی یہ سب کچھ
بتلا دیا۔ مزید شرائط اگلی آیت میں آئیں گی۔

فَرَأَى الْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ کفر کرنے والے ہی سب سے بڑے ظالم
ہیں انہوں نے اللہ کے احکام، اس کی کتاب اور اس کے انبیاء کا انکار کیا۔ یہ انسان کے
بدبخت ہونے کی واضح نشانی ہے۔ مشرک کے باسے میں واضح حکم ہے اِنَّ الشِّرْكَ

کفار ظالم ہیں

لَظْمٌ عَظِيمٌ شَرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ اگر شرک جیسے ظلم سے باز نہیں آؤ گے تو پھر اللہ نے جہاد کا حکم بھی دیا ہے اس کے ذریعے کفر و شرک کی یخ کنی کی جائے گی۔ اور اس کام کے لیے جہاں جان کی قربانی دینی پڑتی ہے وہاں مال بھی لگانا پڑتا ہے۔ اور یہی اتفاق فی سبیل اللہ ہے۔ آگے دور کو دع کے دوران اتفاق فی سبیل اللہ کا ذکر مزید تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

درس پچھدہ (۱۱۰)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۵۵

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ
 لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ
 إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا
 يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ
 السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ ۚ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ عَلَى الْعَرْشِ
 الْعَظِيمِ ۝

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، مگر وہی ہے۔ وہ زندہ ہے۔ قائم
 رکھنے والا ہے۔ نہیں پگھلتی اس کو اور نگھ اور نہ نیند، اسی کا ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے
 اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے۔ جو اس کے سامنے سفارش کر سکے بغیر اس کی
 اجازت کے، جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے
 اور نہیں احاطہ کر سکے کسی چیز کا اس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے وسیع ہے
 اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے اور نہیں تھکاتی اس کو حفاظت ان کی اور وہ بلند تر

اور عظمت والا ہے ۲۵۵

پہلے درود کو ع میں اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت کا ذکر فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ
 بیان کر کے جہاد کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ اور پھر نظام اسلام کی نشان دہی کی ہے۔ کہ امیر کیسا
 ہونا چاہیے۔ سپاہی اور لشکر کی صفات کیا ہوں جہاد ہی کے سلسلہ میں جان و مال کی قربانی
 کا خصوصی ذکر فرمایا ہے۔ پھر اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ کہ جہاد کرنا نبیوں کا کلام
 نہیں۔ فلسفہ جہاد بیان کیا ہے۔ کہ اگر جہاد کا حکم نہ ہو، تو فسادِ لوگ زمین میں فسادِ بپا
 کریں گے۔ لہذا اسو سائنسی کو درندہ صفت لوگوں سے محفوظ رکھنے کے لیے
 جہاد ضروری ہے۔

رابطہ آیت

اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور توحید کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ اور اس کا ربط پہلی آیتوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ہے جہاد کے سلسلہ میں جان و مال کھپانے کا ذکر ہو چکا ہے۔ مگر ان دو چیزوں کی قربانی اُسی وقت قبول ہوگی جب ایمان صحیح ہو اور انسان کا عقیدہ توحید پر ہو۔ اعمال کا دار و مدار عقیدہ پر ہے۔ اگر عقیدہ درست نہیں ہوگا، تو کوئی عمل قابل قبول نہیں۔ عقیدہ توحید کے بغیر باطل بننے اعمال بھی بے سود محض ہوں گے۔ ان کی حیثیت راکھ اور غبار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لہذا مسئلہ توحید کو مسئلہ جہاد کے ساتھ یہ ربط ہے۔

پیشتر ازیں بنی اسرائیل کے واقعہ کے ضمن میں نظام خلافت بھی سمجھا دیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اقتدار کا حقیقی مالک خلیفہ نہیں ہوتا جو اپنی من مانی کرنا پھرے، بلکہ اقتدار کا مالک اللہ ہوتا ہے۔ خلیفہ تو اللہ کا بندہ ہوتا ہے جو نظام خلافت کو چلاتا ہے۔ اس سورۃ کے آخری حصہ میں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ کہ خلیفہ اقتدار کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو امین ہوتا ہے۔ اور دین اور شریعت کو جاری کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جماعت ہوتی ہے۔ جو نفاذ شریعت میں اس کی مدد کرتی ہے۔ اُسے مجلس شوریٰ کہیں یا کچھ اور۔ وہ ہر حال "وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" کے تابع ہوتی ہے۔ تو گویا نظام خلافت کا صحیح طور پر قائم کرنا بھی عقیدہ توحید پر موقوف ہے لہذا اس لحاظ سے بھی آیت زیر درس کو سابقہ آیات کے ساتھ ربط ہے۔

یہ آیت ایک لمبی آیت ہے اور آیت انکری کہلاتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی گڑسی کا ذکر ہے۔ وَبِعَ كُنْهِيَ السَّعْوَةِ وَالْمُزْنِ۔ حدیث شریف میں اس آیت پاک کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت ابی ابن کعبؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے پوچھا کہ قرآن پاک میں سب سے بڑی آیت کون سی ہے۔ تو حضرت ابی ابن کعبؓ نے نہایت ادب سے عرض کیا اللہ و رسولہ اعلیٰ یعنی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر حضور علیہ السلام نے پوچھا۔ اچھا یہ بتاؤ، قرآن پاک میں بہتر آیت کون سی ہے۔ انہوں نے پھر عرض کیا۔ اللہ اور اس کا

آیت الکرسی
کی فضیلت

رسول ہی بترجما ہے۔ پھر نبی کریم نے حضرت ابی غیسہ سے سنا کہ ہاتھ مار کر وہی سوال کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا حضور! اعظم آیت فی القرآن اللہ لا الہ الا ہو
الحق القیوم یعنی قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت یہ آیت الحکسی ہے تاہم اس
آیت کا یہ اعزاز الفاظ یا کلمات کے اعتبار سے نہیں بلکہ فضیلت کے اعتبار سے
اُسے سب سے بڑی آیت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے۔ جو شخص فرض نماز کے بعد اخلاص کے ساتھ
آیت الحکسی پڑھیگا، وہ اگلی نماز تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگا حضور نبی کریم
رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔ جو کوئی فرض نماز کے بعد اخلاص
کے ساتھ آیت الحکسی پڑھیگا۔ موت کے سوا اس کے دخول جنت میں کوئی چیز نافع
نہیں ہوگی۔ یعنی جنت میں داخلے کے لیے صرف موت ہی درمیان میں رکاوٹ
ہے۔ جو نہی اس کی موت واقع ہوگی، وہ شخص جنت میں داخل ہو جائیگا۔ گویا یہ آیت
کرمیہ تلاوت کرنے والا جنت کا مستحق ہو گیا۔

ایک اور حدیث میں اس آیت اور سورہ مومن کی چند ابتدائی آیات کی مزید
فضیلت آئی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں مگر فضیلت کے لحاظ سے ان کو کمال
درجہ حاصل ہے۔ **حُكِّمَ ۝ كُنْزُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝**
غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ۝ لَا إِلَهَ إِلَّا
هُوَ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ حضور نے فرمایا جو شخص آیت الحکسی اور سورہ مومن
یا غافر کی یہ تین آیتیں رات کے وقت تلاوت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے
صبح تک اس کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ اور جو کوئی صبح کے وقت یہ آیتیں تلاوت
کرے گا، وہ رات تک اللہ کی امان میں ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ کہ حضور نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ سورہ بقرہ
میں ایک ایسی آیت ہے۔ جو فضیلت کے لحاظ سے سب سے بڑی آیت ہے
جس گھر میں یہ آیت پڑھی جاتی ہے۔ وہاں شیطان نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ وہاں سے

بھاگ جاتا ہے۔ اس آیت کا اتنا عظیم اثر ہے۔ یہ بھیجیں میں صدقہ الفطر کے اناج کی حفاظت والی حدیث آتی ہے کہ اُس اناج کی حفاظت حضرت ابو ہریرہؓ کے ذمہ تھی۔ آپ رات کو پہرہ پر تھے کہ شیطان نے اس اناج میں سے کچھ لینا چاہا۔ مگر صحابی رسول نے اسے پکڑ لیا۔ مگر اس کے منت خوشامد کرنے پر چھوڑ دیا۔ پھر دوسری رات اُئی۔ تو یہی واقعہ پیش آیا آپ نے شیطان کو دبوچ لیا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ اس دفعہ چھوڑ دیا جائے پھر نہیں آئیگا آپ نے پھر اس کو چھوڑ دیا مگر وہ کفنِ سختِ تیسری رات پھر آگیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے پھر اُس کو پکڑ لیا۔ اور فرمایا میں آج تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ بلکہ حضور کے پاس لے چلوں گا۔ شیطان نے پھر منت سماجت کی اور کہا کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جس کا تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔ پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگا کہ اگر تم آیت النحر سی پڑھ لیا کرو، تو شیطان تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ تمہاری حفاظت ہوگی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے تیسری رات بھی شیطان کو چھوڑ دیا۔ اور صبح کو سلامِ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا اے ابو ہریرہؓ! شیطان ہے تو جھوٹا، مگر بات اس نے ٹھیک کہی ہے۔ اگر کوئی شخص ایمان کے ساتھ اس آیت کی تلاوت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا محافظ و نگہبان ہوگا۔

الغرض! اس آیت پاک کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لہذا ہر مسلمان کو اسے در و زبان بنالینا چاہیے۔ ہر نماز کے بعد اس کی تلاوت کی جائے۔ صبح و شام کرے پڑھا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے مامون فرمائے گا اور آخرت میں جنت میں داخلے کی ضمانت ہوگی۔ تاہم مفسرین اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ہر دُعا اور ذکر کی قبولیت کے لیے بعض شرائط ہیں۔ ہر دُعا اور ہر ذکر محض پڑھ لینے سے درجہ قبولیت تک نہیں پہنچ جاتی۔ قبولیت دُعا کے لیے ضروری ہے کہ دُعا کو فرائض سے خالی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز، روزہ، فرض کیا ہے۔ قرآن کا تارک نہ ہو۔ بلکہ انہیں پورا کرتا ہو۔ اور پھر اس کا رزق بھی جلیل ہو۔ اس کا کھانا، پینا اور پہنا حرام سے پاک ہو۔ اور یہ بھی قبولیت کی شرط ہے کہ انسان حتی الامکان امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر پر عمل کرتا ہو۔ تہذیبی شریعت کی حدیث — میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُعْبَدُ دُعَاءً عَنْ قَلْبٍ غَافِلٍ۔ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔ جب کوئی دعا کرے۔ تو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کرنی چاہیے۔ خدا کی بارگاہ میں ایسی دعا قبول نہیں۔ جو دل کی گہرائیوں سے نکلنے کی بجائے محض زبان کی حرکت تک محدود ہو۔

یہ آیت پاک بچاس الفاظ پر مشتمل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے گیارہ دلائل موجود ہیں۔ یہ آیت گویا مجموعہ دلائل ہے۔ اس آیت کی فضیلت ان معانی میں ہے۔ کہ کسی چیز کا علم یا اس کا ذکر اس کے معلوم یا مذکور کے تابع ہوتا ہے۔ یعنی جو درجہ اور فضیلت کسی مذکور معلوم کو حاصل ہوگا، وہی اس کے علم یا ذکر کو حاصل ہوگا۔ اب قرآن پاک میں تو تمام چیزوں کا ذکر ہے۔ کہیں خود قرآن پاک کے متعلق آتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ ہدایت ہے۔ کہیں اللہ کے پیروں کا ذکر ہے۔ کہیں بڑے آدمیوں کا ذکر ہے۔ کہیں فرعون و قارون کا واقعہ بیان ہوا ہے کہیں صاحبین کا ذکر ہے۔ کہیں احکام ہیں کہیں نواہی ہیں۔ انسان کی تہذیب کا بیان ہے۔ اس کے نفس اور روح کی کیفیت کا ذکر ہے۔ اسی طرح قرآن میں خود خدا تعالیٰ کی ذات اور اسکی توحید کا ذکر ہے، کہیں اس کی صفات کمال اور کہیں صفات جلال و جمال کا ذکر ہے۔ تو یہ جو اللہ کا ذاتی ذکر ہے۔ یہ تمام اذکار سے افضل ہے۔ لہذا جن آیات اور جملوں میں ان چیزوں کا ذکر ہوگا، وہ آیات، باقی آیات سے افضل ہوں گی۔ اس لحاظ سے چونکہ آیت الحکسی میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسکی صفات کا ذکر ہے۔ لہذا یہ آیت پاک بھی باقی آیات سے افضل ہے۔

توحید باری تعالیٰ

اس عظیم آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الشّٰدِیْ ہِیَ۔ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا، نہ عارضی نہ مستقل، نہ باپ نہ بیٹا کوئی بھی معبود نہیں۔ معبود وہی اور صرف وہی ہے۔ جو کوئی اللہ کے علاوہ کسی اور کو بھی معبود مانتا ہے، تو اس کا سھتیدہ قطعاً باطل ہے۔ وہ تو ایسی ذات ہے الٰہی جو

زندہ ہے۔ اس کی حیات ابدی اور سرمدی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی زندگیاں ہیں، سب جزوی اور عارضی ہیں۔ کسی کو دائمی حیات حاصل نہیں۔ زندگی کا سرچشمہ خدا کی ذات وعدہ لاشریک ہے۔ یہ اُس کی مشیت ہے۔ جس کو جتنی زندگی چاہے اُسے دے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔

وہ اَلْقَيُّوْمُ بھی ہے۔ یعنی خود قائم ہے۔ اور کائنات کی باقی چیزوں کو قائم رکھنے والا ہے وہ عالم بالا سے لے کر ذرہ ذرہ تک کا محافظ اور نگراں ہے۔ وہی پیدا کرنا والا ہے وہی جتنا عرصہ چاہے قائم رکھنے والا ہے اور پھر وہی فنا کرنے والا بھی ہے لوگوں نے کئی قسم کے باطل عقیدے بنا رکھے ہیں۔ عیسائیوں نے باپ، بیٹا اور روح القدس کا نظریہ قائم کیا ہوا ہے۔ تین خدا ہیں۔ کیا ایک خدا کالی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق پیدا کرنے والا برہما ہے۔ تھامسے والا کوشنوس ہے اور فنا کرنے والا شیواجی مہاراج ہے۔ اُن کے بھی تین خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے باطل نظریات کی تردید فرمائی۔ اور یہ بات واضح کر دی کہ اَلْعَيُّ الْقَيُّوْمُ وہی ہے۔ پیدا بھی وہی کرتا ہے۔ پرورش بھی وہی کرتا ہے قائم بھی وہی رکھتا ہے اور پھر فنا بھی وہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے عقیدے ہیں سب باطل ہیں۔

اور پھر اُس مالک الملک کی ہر چیز پر نگرانی اور حفاظت بھی اس طور ہے۔ کہ لَا تَأْخُذْهُ سِنَةٌ وَلَا قَوْمٌ نہ اُسے اور نہ آتی ہے اور نہ نیند۔ اور نہ اور نیند تو غفلت کی علامت ہے اور اُس کو آتی ہے جس کو تھکاوٹ ہو جائے اور آرام کی ضرورت ہو۔ مگر اللہ کی ذات تو پاک ہے نہ وہ تھکتا ہے اور نہ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔ یہ تو ناقول انسان ہے جو کچھ مشقت کرنے کے بعد تھک جاتا ہے۔ اور پھر اُسے آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نیند جیسی نعمت تیار کی ہے۔

اللہ نے اس کو سُبَّانَا کہا ہے یعنی نیند انسان کے

لیے آرام کا ذریعہ تاکہ جب محنت کرنے کے بعد تھک جا جائے تو کچھ دیر آرام کر کے پھر سے تازہ دم ہو جائے۔ اور دوبارہ کام کاج اور عبادت میں مصروف ہو جائے۔ یہ تمھکان، کمزوری اور پھر آرام کی ضرورت اللہ تعالیٰ کی شان کے شایان نہیں ہے۔ وہ ان چیزوں سے پاک اور منزہ ہے۔ بلکہ درحقیقت لہ ما فی السَّحُوتِ وَمَا فی الْأَرْضِ زمین و آسمان کی ہر شے اسی کی پیدا کردہ ہے۔ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور اُس کی مطیع ہے، ہر چیز پر اُسی کا تصرف ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ ذات ہے جو یُصَوِّفُ الْأَمْرَ کَیْفَ یَشَاءُ جس طرح چاہے تصرف کرتا ہے۔ کسی چیز کا گھٹنا، بڑھنا، بلندی، پستی، زندہ کرنا اور مارنا سب اُس کے اختیار میں ہے ہر چیز پر اُسی کا حکم چلتا ہے۔

مسئلہ شفاعت فرمایا جب قادر مطلق وہ ذات ہے۔ تَوَمَّنْ ذَا الَّذِیْ یُشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ کون ہے جو اُس کے سامنے سفارش کرنے کا دم مار سکے بغیر اس کی اجازت کے۔ مشرکوں کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ اُن کے معبودان کی سفارش کریں گے، اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ ہو یا ناراض یہ ہماری سفارش کر کے خدا کو ضرور ہی منالیں گے۔ یہودیوں اور نصاریوں کا بھی اسی قسم کا عقیدہ ہے۔ حالانکہ جبری اور قہری سفارش کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے کہ اس دن نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کا کام آئیگی وَلَا یُفْعَلُہٗ اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ سفارش کرنیکی اجازت ہوگی۔ اشرف المخلوقات میں سب سے افضل انسان حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میں رب الحکمین کے سامنے آؤں گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور لمبا سجدہ کروں گا پھر حکم ہو گا یا محمد ارفع راسک، اے محمد! آپ اپنا سر اٹھائیں۔ آپ بات کریں آپ کی بات سنی جائے گی۔ آپ سفارش کریں، آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا یہ سجدہ دس برس کے وقفہ کے برابر لمبا ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دیں گے۔ بغیر اجازت کے کوئی سفارش نہیں ہوگی اور اجازت بھی اس شخص کے

یہ دینی جائیگی جس کا عقیدہ توحید پر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہوگا: وَلَا يَمْنَعُ الْإِبَادَهِ
 الْكَفَرُ اللہ تعالیٰ کفر والے عقیدہ، شرک والے عقیدہ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ کفر کرنے کی توفیق
 تو دے دیتا ہے۔ کافر کی رسی تو دراز کر دیتا ہے۔ مگر ان سے ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ اس
 کے نزدیک وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ کافر لوگ ہی اصل ظالم ہیں۔ نیز یہ کہ
 إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ لہذا قیامت کے دن
 سفارش دو شرطوں سے مشروط ہوگی۔ اور سختی سفارش ایسا شخص ہوگا۔ مَنْ لَا يُشْرِكْ
 بِاللَّهِ شَيْئًا جو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا نہ ہو۔ اور پھر یہ کہ بغیر اجازت کے
 سفارش نہ ہوگی۔ جب اجازت ہوگی تو انبیاء ملائکہ، اولیاء شہداء اور مومن سفارش کریں گے
 صحیحین کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سجدہ ریز ہوں گے۔ اور
 اللہ تعالیٰ بار بار سفارش کی اجازت دیں گے۔ یہ سفارش مختلف قسم کے لوگوں کے لیے
 ہوگی۔ ایک دفعہ اجازت ہوگی کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق سفارش کریں۔ آپ
 سفارش کر کے اُن لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے۔ پھر سجدہ کریں گے پھر اجازت
 ہوگی، اب ایسے لوگوں کی سفارش کریں۔ آپ اُن لوگوں کو بھی دوزخ سے نجات
 دلوائیں گے اور اس طرح آپ بار بار سجدہ کریں گے اور اللہ بار بار سفارش کی اجازت
 دیں گے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور علیہ السلام کی شفاعت نصیب فرمائے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ مختار مطلق اور قادر مطلق ہے اور جس طرح وہ الہ برحق ہے علم غیبی نہ ہوتا ہے
 اسی طرح وہ حکیم کل بھی ہے۔ چنانچہ یہ اس کی صفت خاصہ ہے۔ يَكْلُمُ مَا بَيْنَ
 أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وہ ماضی کو بھی جانتا ہے اور مستقبل سے بھی واقف
 ہے۔ اس دنیا کے تمام امور کا بھی مکمل طور پر عالم ہے اور آخرت کے جہان یعنی برزخ
 اور قیامت کے حال کے ذرہ ذرہ سے بھی واقف ہے۔ یہ ماضی حال مستقبل
 وغیرہ انسانوں کی نسبت سے ہے مگر نہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کوئی چیز غائب
 نہیں وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ تیرے رب کے کوئی ذرہ
 برابر چیز بھی غائب نہیں۔ وہ ہر شے کو جانتا ہے۔ وَلَا يَحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ

عِلْمُہُ الْاَلَدِیْہَا شَاءَ مَخْلُوْقٌ مِیْنِ سَعِیْہِ الْاِنْسَانِ، جن یا فرشتے یا کوئی اور مخلوق ہو کر کوئی بھی خدا تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہاں جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے، وہ کسی کو اتنا علم عطا کر دیتا ہے۔ خدا کا علم غیر محدود ہے۔ اور غیر متناہی ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں مگر مخلوق کا علم محدود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق بخاری شریف کی روایت موجود ہے۔ کہ ایک چڑیا نے پانی میں چونچ ماری اور جتنا پانی لے گئی تھی لے لیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا، اے موسیٰ! تیرا درمیر علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اس چڑیا کی چونچ کی مانند ہے۔ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کے علم میں سے اتنا حصہ بھی بھل نہیں کیا۔ جتنا اس چڑیا نے سمندر سے پانی لیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ میں بڑا عالم ہوں۔ بھلا ہمارے علم اور اللہ تعالیٰ کے علم میں کیا نسبت ہے۔ تاہم یہ ایک مثال ہے مگر نہ اللہ کا علم قدرت تو اس سے کبھی زیادہ وسیع ہیں۔ حتیٰ کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب جو لوگ دوسروں کے متعلق گمان رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہر چیز کو جانتے ہیں انکو کیا کہا جائے۔ بعض لوگ اولیاء اللہ اور بعض انبیاء کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ہر ایک بات کو جانتے ہیں۔ بھائی! یہ شرکیہ عقیدہ ہے۔ ہر چیز کا جاننے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ہاں لَدِیْہَا شَاءَ جس قدر اللہ بلائے، اتنا ہی جانتے ہیں۔ یہ معبود برحق ہی جانتا ہے کہ کسی کو کیا دکھ اور کیا تکلیف ہے۔ دوسرا کوئی نہیں جانتا اور نہ اس کو رفع کرنے پر قادر ہے۔ وہ جب تک چاہتا ہے کسی کو مشکل میں ڈالے رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے۔ مصیبت اور پریشانی کو دور کر دیتا ہے۔ آج کی دنیا میں بیچائے فلسطینی کن حالات گزر رہے ہیں۔ فلپائن میں کس مشکل میں گرفتار ہیں۔ افغانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان کھڑے بے بس ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو مسلمانوں کے حالات کو درست فرمائے۔ کون ہے۔ جو ان کو مشکلات سے نکالے۔ اُن کی کشتی کو گرداب سے نکالے تو درکار اللہ کے سوا کون ہے جو اُن کے حال سے بھی واقف ہو۔

تمام انسانی برادری میں سے انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں۔ مگر ان کا علم بھی محدود ہوتا ہے، وہ عالم الغیب نہیں ہوتے عالم الغیب والشادات صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ اُسی کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ اس کے علاوہ کسی اور کا علم ہر شے پر محیط نہیں ہے۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اُن کی کرسی آسمان و زمین سے وسیع ہے عرش اور کرسی کا ذکر قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے۔ مگر اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان اشیاء کی موجودگی پر ایمان لے آئیں۔ عرش اور کرسی کا حجم کیا ہے۔ ان کی ساخت کیا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے احاطہ علم میں نہیں آسکتیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ساتوں زمینیں اور آسمان کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں۔ جیسے کسی بہت بڑے میدان میں کھڑا سا ہو۔ اسی طرح عرش کے مقابلے میں کرسی کی ایسی ہی نسبت ہے۔ عرش اتنا بڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش کو عرشِ عظیم فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ کرسی سے مردِ علم اور قدرت ہے جو ہر چیز پر وسیع ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اُسْتَوٰی اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔ کس کیفیت کے ساتھ، جیسا اسکی شان کے لائق ہے۔ یہ بات ہمارے فہم و فراست میں نہیں آسکتی۔ اور نہ ہم اپنے ذہن سے اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ بس ان چیزوں پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔

وَلَا يَؤُودُهُ حِفْظُهُمْ اِن چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ کو تھکا نہیں دیتی۔ انسان تو مسلسل کچھ عرصہ کام کر کے تھک جا کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر آرام چاہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی مسلسل نگرانی کے باوجود تھکتا نہیں۔ وہ ازل سے لے کر اب اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے کام میں مصروف ہے۔ نہ وہ تھکتا ہے، نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اور نہ کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہوتی ہے۔

وَهُوَ الْعَلِیُّ اور وہ باغبار ذات بہت بلند ہے۔ وہ ہمارے تصور و ہم

اور خیال سے بلند تر ہے۔ اس کے علاوہ وہ الْعَظِيمُ بھی ہے۔ یعنی اس کی صفات بہت عظمت والی ہیں۔ وہ کمال عظمت کا مالک ہے۔ وہ ذات کے لحاظ سے بلند ہے تو صفات کے لحاظ سے عظیم ہے۔

ہر شخص کو چاہیے کہ اس بلند مرتبہ آیت کو در زبان بنائے تاکہ حضور علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہ آیت اس کے لئے بخشش و حضرت کا ذریعہ بن جائے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس پچھد یا زودہ (۱۱۱)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۵۶ تا ۲۵۷

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ
 يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
 الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۵۶﴾ اللّٰهُ وَلِىُّ
 الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ
 كَفَرُوْا اُولٰٓئِكَهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى
 الظُّلُمٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

۲۵۶

ترجمہ ۱۰۔ دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں تحقیق ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے
 پس جو شخص طاغوت کے ساتھ کفر کرے گا۔ اور اللہ پر ایمان لائے گا۔ پس اُس نے مضبوط
 کڑا پکڑ لیا ہے جس کے لیے ٹوٹنا نہیں ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا ہے اور جانتا ہے ﴿۲۵۶﴾
 اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا کارساز ہے، جو ایمان لائے، اُن کو اندھیروں سے روشنی کی طرف
 نکالتا ہے، اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کو اختیار کیا۔ اُن کے دوست اور ساتھی طاغوت
 ہیں۔ وہ اُن کو روشنیوں سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخ میں رہنے
 والے ہیں وہ اس کے اندر ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵۷﴾

گذشتہ درس میں آیت الحکسی کا ذکر تھا۔ اور اس کی فضیلت بیان ہوئی تھی۔ یہ آیت رابطیت
 فضیلت کے اعتبار سے قرآن حکیم میں سب سے بڑی آیت ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق توحید
 باری تعالیٰ سے ہے۔ حضور علیہ السلام کا وعدہ ہے۔ کہ جو شخص غلوں نیت کے ساتھ
 آیت الحکسی کی تلاوت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں مقام عطا فرمائیں گے۔ آج
 کے درس میں اسی موضوع کو آگے چلایا گیا ہے۔ کہ دین اسلام کی قبولیت اور پھر
 اس میں غلوں نیت انسان کا اپنا فعل ہے۔ جس قسم کا عقیدہ اور عمل ہو گا اس کے مطابق

جزا و سزا ہوگی۔ دین میں زبردستی نہیں ہے۔ بلکہ یہ انان کا اپنا انتخاب ہے۔
 فرمایا لَّا اِكْرَاهُ فِي الدِّينِ دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہے۔ کسی کو زبردستی
 دین میں داخل کر نیکی قطعاً اجازت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قَدْ تَبَيَّنَ الرَّشْدُ
 مِنَ الْغَيِّ ۚ ہدایت گمراہی سے بالکل واضح ہو چکی ہے۔ اب کوئی اشتباہ باقی نہیں
 رہا۔ نیکی اور بدی کا امتیاز کھل کر سامنے آ گیا ہے لہذا جو شخص اپنی مرضی سے اسلام میں
 داخل ہونا چاہے، بلا جھجک اسلام قبول کر لے۔ اور جس کا دل نہیں مانتا۔ وہ ایمان نہیں
 لاتا تو جھجک نہ لائے۔ اُسے زبردستی دین میں داخل نہیں کیا جائیگا۔

اس آیت کی تفسیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں ”جبر نیست بے دین“
 یعنی دین اسلام میں دماغ کے لیے کسی شخص پر جبر ردائیں ہے۔ تاہم اسلام میں فی الجملہ جبر
 موجود ہے۔ اور اس سے مراد وہ تمام احکام ہیں جن کے ذریعے کسی پر سختی کی جاتی ہے۔
 مثلاً جہاد کا تعلق جبر سے ہے۔ جبر کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حدود کا قیام ہے
 کوئی مجرم خوشی سے سزا قبول نہیں کرتا، اُسے اس کے کردہ گناہ کی سزا جبراً دینا پڑتی ہے
 زانی کو سنگ سار کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ شرابی کو کوڑے مارے جاتے ہیں
 وغیرہ وغیرہ جبر کی اقسام سے ہیں اور یہ جبر بالکل جائز اور ضروری ہے۔ البتہ کسی غیر مسلم
 کو طاقت کے ذریعے اسلام قبول کھینے پر مجبور کیا جائے۔ یہ اسلامی تعلیم کے منافی
 ہے۔ اسی لیے فرمایا لَّا اِكْرَاهُ فِي الدِّينِ ۚ

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ ایک عیسائی بڑھیا
 تھی۔ امیر المؤمنین نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس عورت کو کہو کہ اسلام قبول کر لے
 جب اس کو یہ پیغام ملا، تو کہنے لگی، میری عمر کا بیشتر حصہ عیسائی مذہب پر گزر رہا ہے
 عمر کے اس آخری حصہ میں میرا دل نہیں چاہتا کہ اُس مذہب کو چھوڑ دوں جس پر زندگی
 گزاری ہے۔ مجھے یہ بڑا دشوار نظر آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس بڑھیا کو اس
 کے حال پر چھوڑ دو۔ کیونکہ دین میں جبر نہیں ہے۔

امام ابو بکر جصاصؒ نے ”احکام القرآن“ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ”زالۃ النہا“

میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کا دشمن نامی رومی غلام تھا۔ مدت تک آپ کی خدمت کرتا رہا۔ اُس نے آخر عمر تک اسلام قبول نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے غلام کو بلا کر کہا کہ تو بڑا قابل آدمی ہے۔ خاص طور پر حساب کتاب میں بڑا ماہر تھا۔ فرمایا اگر اسلام میں جبروا ہوتا تو میں تمہیں زبردستی مسلمان بنا لیتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر تم مسلمان ہو جاتے تو تمہاری قابلیت کی بنا پر کوئی اچھا عمدہ دیتا۔ اب میں یہی کرتا ہوں کہ تجھے آزاد کر دیتا ہوں۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔

تاریخ آل عثمان کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ترکی کے سلطان سلیم خان کے زمین میں یہودی اور عیسائی بڑی سازشیں کرتے تھے۔ خلیفہ المسلمین اُن سے بڑے تنگ آئے اور آخر حکم جاری کر دیا کہ جو بھی عیسائی اور یہودی ملے اُسے زبردستی اسلام میں داخل کر لیا جائے۔ جب یہ خبر اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو پہنچی۔ تو وہ فوراً سلطان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور فرمایا کہ میں نے سنا ہے تم نے کوئی ایسا حکم جاری کیا ہے سلطان نے اقرار کیا کہ ہاں میں نے ایسا سرکلر جاری کیا ہے۔ کہ تمام عیسائی اور یہودیوں کو زبردستی مسلمان بنالیا جائے۔ ان کے عبادت خانے کو وقف کر دیے جائیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی سازشوں کی وجہ سے سلطنت میں فتنہ برپا کر رکھا ہے۔ شیخ الاسلام نے فرمایا اے خلیفہ! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کا حکم ہے لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ دین میں جبر نہیں ہے۔ آپ ایسا حکم جاری کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ خلیفہ نے فوری طور پر یہ حکم واپس لے لیا۔

اوزنگ زیب عالمگیر کے متعلق انگریزوں نے بڑا پراپیگنڈا کیا۔ کہ وہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانا تھا۔ مگر یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اورنگ زیبؒ نے پچاس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اگر وہ واقعی زبردستی اسلام میں داخل کرتا، تو کم از کم دہلی کے گرد و نواح میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہتا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھیں۔ کہیں بھی غیر مسلموں کے ساتھ جبر کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسلام ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کا فروغ تبلیغ کے ذریعے ہوا ہے، تلوار کے ذریعے نہیں ہوا۔ برصغیر میں مسلمان

آٹھ سو سال تک حکمران رہے ہیں۔ مگر کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا اسلام کے پاکیزہ اصول کی ترجمانی ضرور کی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں کتنے غیر مسلم رہا کرتے تھے مگر کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کسی کو زبردستی دین میں داخل کیا جائے یہ اسلام کی تعلیم کے منافی ہے۔ **لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ** دین میں جبر نہیں ہے۔

شانِ نزل

حضور علیہ السلام کے در و درمیز سے پہلے مدینہ طیبہ میں دو قسم کے لوگ تھے ایک ترسیدہ دی تھے۔ جو بڑھے لکھے اور مالدار لوگ تھے۔ دوسرے عرب تھے۔ جو عام طور پر ان پڑھ اور غریب لوگ تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہی لوگ انصار مدینہ کہلائے۔ چونکہ یہ لوگ پسماندہ تھے۔ اس لیے یہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے انہیں یہودیوں کے پاس چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ اسلام آنے کے بعد جب یہودی خاں بنو نضیر اور بنو قینقاع کو مدینہ سے نکالا گیا۔ تو اس وقت ایک انصاری ابو حصین کے دو بیٹے یہودیوں کی تحویل میں تھے۔ اور انہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ جب وہ مدینہ سے جانے لگے تو انصاری نے چاہا کہ اپنے بیٹوں کو زبردستی اسلام میں داخل کر کے انہیں اپنے پاس رکھ لے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ **لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ** دین میں جبر نہیں ہے۔ لڑکے جوان ہیں۔ انہوں نے یہودیت اختیار کر رکھی ہے۔ اب اگر وہ اپنی مرضی سے جائے ہیں تو مسلمانوں کو ان کے روکنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

ابوداؤد اور دیگر کتب احادیث میں عبداللہ بن عباس کی روایت ہے جسے امام ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے۔ اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبل از اسلام انصار مدینہ کی عورتیں اولاد کی تمنا کرتیں تو یہ منت مانتیں کہ اگر اللہ نے انہیں لڑکا عطا کیا۔ تو وہ اُسے یہودی کر دیں گی۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتیں، جس کی وجہ سے کئی بچے یہودیوں کی تحویل میں چلے گئے۔ جب اسلام آیا تو اس وقت کچھ بچے بنو نضیر کی تحویل میں تھے جب انہیں مدینہ بدر کیا گیا۔ تو وہ لڑکے بھی ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ اُس وقت انصار مدینہ کی خواہش ہوئی کہ اپنے بچوں کو اسلام میں داخل کر کے یہودیوں کے ساتھ

جانے سے روک لیں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ حق اور باطل واضح ہو چکے اب جس کو جی چاہے حق کو قبول کرے۔ اور جو چاہے باطل پر اڑے۔

حق اور باطل کو واضح کرنے کے بعد فرمایا: فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ مضبوط کرنا جس نے طاغوت کا انکار کیا۔ وَيُؤْمِنُ بِاللّٰهِ اور اللہ پر ایمان لایا فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ اس نے مضبوط کڑا پکڑ لیا۔ لَا انفِصَامَ لَهَا جو ٹوٹ نہیں سکتا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ گریا ایسی مضبوط جگہ پر پہنچ گیا۔ جہاں پر وہ محفوظ ہو گیا۔ اب اس کو کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ اور یہ ایسا مضبوط مقام ہے۔ جو کمزور ہو کر ٹوٹ جی نہیں سکتا بلکہ یہ ہمیشہ حق پر قائم ہے گا۔

قرآن پاک میں طاغوت کا لفظ (آٹھ مرتبہ) استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ طغیان اور طغوان کے مادہ سے ہے جسے سرکشی پر محمول کرتے ہیں۔ عام طور پر اس کا ترجمہ شیطان کیا جاتا ہے۔ مگر شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ ”ہڑدنکا“ کیا ہے۔ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ یعنی اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش چھوڑ دو۔ ہڑدنکا کا لفظ اس پر بولا جاتا ہے۔ جو بزدل سردار بن جائے اور لوگوں سے زبردستی اطاعت کرائے۔

پھر شیطان کا بھی یہی کام ہے۔ لہذا اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ كُلُّ مَا يَسْغُلُكَ عَنِ الْحَقِّ فَهُوَ طَّاغُوتٌ جو کوئی چیز تمہیں حق سے مشغول کرنے والی ہے۔ وہ تمہارے لیے طاغوت ہے۔ گویا حق سے ہٹانے والا شیطان ہو یا انسان، مال ہو یا اولاد و سب طاغوت کی تعریف میں آئیں گے۔ باطل راستے پر چلانے والے مال باپ اور غلط طرف لیجانے والے پیر بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ غرضیکہ جو بھی کسی کو حق سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، وہ اس کے لیے طاغوت ہے۔

عردہ کا معنی اکٹرا اور دلفنی کا معنی مضبوط ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک ادیسکے ستون پر چڑھ گئے۔ اُس کے آخری سر پر ایک کڑا لگا ہوا تھا جسے آپؐ نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ صبح اُٹھے اور حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب بیان کیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اس خواب کی تعبیر یہ ہے۔ اَنْتَ تَمُوتُ مَعِيَ الْمُسْلِمِ تمہاری موت اسلام پر آئیگی۔ یعنی مرنے والے ہم مسلم کا دامن پکڑے رکھو گے۔ لَا اَنْفِصَامَ لَهَا کا یہی مطلب ہے کہ وہ مضبوط کڑا ہے۔ جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ کڑا اُمّہ سے چھوٹ کر سکتا ہے۔ مثلاً آدمی گمراہ ہو جائے اور اسلام کا دامن چھوڑ دے۔ مگر یہ حلقہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور اس کو تناسل والے آدمی محفوظ رہا ہے فرمایا وَاللّٰهُ سَجِنٌ عَلَیْکُمْ اللّٰہ تعالیٰ ہر شے کو سنسا اور جاننا ہے۔ وہ انسان کے ارادے تک سے واقف ہے۔ کہ وہ کوئی کام نیک نیتی سے کر رہا ہے یا بد نیتی سے۔ وہ ہر ایک کی پکار کر سناتا ہے۔

وَرَدَتْ

آگے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ملنے والے انعام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو شخص دین اسلام کے ساتھ وابستہ ہو گیا اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہو گیا۔ اللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست، رفیق، کارساز، مددگار و ولی ہے۔ جو ایمان لائے۔ لفظ ولی میں یہ سب معنی پائے جاتے ہیں جیسے فرمایا اَنْتَ وَلِیُّنَا فِی الدُّنْیَا وَآٰخِرَہِ دُنْیَا اور آخرت میں تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ جب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ ہماری پرستش کرو۔ تو وہ جواب دیں گے۔ اے سولی کو ہم ! اَنْتَ وَلِیُّنَا تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ ہم لوگوں کو کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہماری پرستش کرو۔ انہوں نے تو خواہ مخواہ شیطان کی بات مانی ہے۔ بہر حال فرمایا، اللہ تعالیٰ ہی مومنوں کا مددگار ہے اور وہ اُن کی مدد اس طریقہ سے کرتا ہے یُخْرِجُہُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی السُّوْرِ اِن کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ یہاں پر لُور کو مفرد استعمال کیا ہے۔ اور ظلمات جمع ہے۔ مقصد یہ ہے کہ توحید اور

ایمان تو ایک ہی چیز ہے۔ جب کہ کفر اور شرک بہت سے ہیں۔ کوئی ستاروں کو پوج رہا ہے۔ کوئی انسانوں کی پرستش کرتا ہے۔ کوئی جنات کو حاجت روا سمجھتا ہے اور کوئی بتوں کے آگے سجدہ برپا ہے۔ یہ سب ظلمت کی قسمیں ہیں۔ الغرض کہیں کفر شرک کی ظلمت ہے۔ کہیں گناہ اور نفاق کی ظلمت ہے اور کوئی شک کی ظلمت میں مبتلا ہے مگر ان سب کے مقابلے ایمان اور توحید واحد نظریہ ہے۔ لہذا ایمان پر نور صیغہ واحد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو کس طرح اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ تو اس نے اپنے نبی بھیجے ہیں۔ کتابیں بھیجی ہیں۔ جن کے ذریعے اہل ایمان کے دلوں کو منور کرتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: **أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلدِّينِ سَلَامٍ ۖ اللَّهُ تَعَالَىٰ جَسَدِ سَلَامٍ** کہ جس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے **فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ تَحْتِهِ** وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہے۔ اور اس کے برخلاف دوسرے لوگ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی واضح راستہ نہیں ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا: **إِنْ تَسْقُوا اللَّهَ يَغْفِلْ لَكُمْ خُزُقًا ۖ أَكْمَرُ اللَّهُ سَافِرَاتِهِ** رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ہر تاریکی میں راستہ پیدا کر دیگا۔ تمہارے راستے کو روشن کر دیگا۔ مشکلات کو حل کر دیگا۔ اور تمہارے تمام امور میں آسانی پیدا کر دیگا۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ اہل ایمان دوسرے لوگوں کے درمیان روشنی میں چلے گا۔ جس نے ایمان کا راستہ نہیں پکڑا وہ اندھیروں میں بھٹک گیا۔ اس کے لیے تمام معاملات میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ مگر اہل ایمان ایسی روشنی سے منور ہے۔ جو اسے برزخ میں بھی کام آئیگی۔ اور اس کی قبر بھی روشن ہو جائیگی۔ حضور نے فرمایا نماز مومن کے لیے قبر میں روشنی پیدا کرے گی۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

فرمایا **وَالَّذِينَ كَفَرُوا جُزِئُوا** جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا **أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْعَذَابُ** ان کے ساتھی طاغوت ہیں۔ اور ان کا کام کیا ہے **يُخْرِجُوهُمْ مِّنَ التَّوْبَةِ** طاغوت کی دوستی

رَالِی الظُّلُمَاتِ وہ انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ تو کوئی انہیں کفر کی طرف لے جاتا ہے کوئی شرک کی طرف اور کوئی بدعت کی طرف۔ اور کوئی ترغیب دلا کر معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسے لوگ بہر حال دین و ایمان کی روشنی سے نکل کر اندھیروں کی طرف ہی جاتے ہیں۔ یہ تو پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ دین میں جبر نہیں۔ اب ایمان اور کفر کا تقابلی جائزہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

فرمایا جو لوگ روشنی سے نکل کر اندھیرے کی طرف جائیں گے۔ ان کا انجام یہ ہے۔ کہ اُولَئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ ہي لوگ اہل دوزخ ہیں۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ یہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں ہی جلتے رہیں گے۔ وہاں سے نکلنے کی کوئی امید ہوگی كَلَّمَا ارَادُوْا اَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِيْدُوْا فِيْهَا۔ جب کبھی وہاں سے نکلنا چاہیں گے واپس دھکیل دیے جائیں گے۔ ان کے مقابلے میں جو اہل ایمان ہیں، وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جنت ہو گا۔ وہ دائمی عیش و راحت میں ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے دین اسلام کے مضبوط کڑے کو پکڑ لیا۔ اور پھر اس گرفت کو کمزور نہیں ہونے دیا۔

الْمُتَرَالِ الَّذِي حَاجَّ اِبْرَاهِمَ فِي رَبِّهِ اَنْ اُتِىَهُ اللَّهُ
 الْمَلَكُ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِمُ رَبِّي الَّذِي يُبْحِي وَيُمِيتُ لَا قَالَ
 اَنَا اُحْيِي وَامُيتُ قَالَ اِبْرَاهِمُ فَاِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ
 الْمَشْرِقِ فَاتِّبِعَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ
 لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

ترجمہ : کیا آپ نے اس شخص کی طرف نہیں دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔ اُس کے رب کے پاسے میں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بادشاہی دی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تو وہ شخص کہنے لگا، میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا بیشک اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی جانب سے لاتا ہے۔ تم اس کو مغرب کی جانب سے لاؤ۔ پس وہ شخص حیران ہو گیا جس نے کفر کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والی قوم کو راہ نہیں دکھاتا ﴿۲۵۸﴾

رابطہ آیت

اس سے پہلے آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور کفار کا ذکر فرمایا تھا کہ اللہ ایمان والوں کا کار ساز ہے۔ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے۔ ان کے ساتھی طاغوت یا شیطان ہیں، جو انہیں ایمان کی روشنی سے نکال کر کفر کے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ گویا درقسم کے گردبوں کا ذکر ہوا۔ ایک اولیاء الرحمن یعنی وہ لوگ جن کا ولی اللہ تعالیٰ خود ہے۔ وہ رحمن کے دست میں۔ اور دوسرا ان کو وہ اولیاء الشیطان کا ہے۔ جنہوں نے طاغوت کو اپنا دوست بنا رکھا ہے۔

آج کے درس سے شروع ہونے والے کچھ عرصے میں بھی اللہ جل جلالہ نے

انہیں دو قسم کے گرد ہوں کے متعلق بات کی وضاحت کے لیے تین مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں مسئلہ توحید، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حیات بعد الہیات کا مسئلہ اچھی طرح سے سمجھایا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ نے اپنی قدرت اور صفت کو سمجھایا ہے۔ اور ساتھ توحید خالص کی وضاحت فرمائی ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ اور توحید کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح ان آیات کو پہلی آیات کے ساتھ ربط ہے۔

ابراہیم علیہ السلام اور
نبرد میں منظر

آج کے درس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرے کا ذکر ہے، جو انہوں نے بادشاہ وقت فرود کے ساتھ کیا تھا۔ اور جس میں آپ نے توحید باری تعالیٰ کے متعلق دلائل دیے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلْحَقُّ تَعَالٰی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰہِیْمَ فِیْ رَبِّہِمْ کیا آپ نے اُس شخص کو نہیں دیکھا۔ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔

اَلْحَقُّ تَعَالٰی اس سے پہلے بنی اسرائیل کے واقعے میں بھی آچکا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ رویت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک بصری اور دوسری قلبی یا علمی۔ رویت بصری وہ ہے۔ جسے آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اور پھر واقعہ بیان کیا جائے۔ اور رویت علمی وہ ہے۔ جو علم کے ذریعے حاصل ہو۔ کسی واقعہ کو آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ ابراہیم علیہ السلام اور فرود کا یہ واقعہ بھی حضور علیہ السلام کی بعثت سے تقریباً اڑھائی ہزار سال پہلے پیش آیا۔ اس لیے رویت بصری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا مشاہدہ علم کے ذریعہ کرایا۔ اور اس کو اس طرح یاد کرایا۔ اَلْحَقُّ تَعَالٰی آپ نے نہیں دیکھا یا آپ کو نہیں معلوم۔ مطلب یہ کہ آپ کو اچھی طرح اس واقعہ کا علم ہے کہ کس طرح اُس شخص نے اللہ تعالیٰ کے متعلق ابراہیم علیہ السلام سے مکالمہ کیا۔ اور وہ شخص کون تھا۔ اَنَّ اُمَّتَیْہِ اللّٰہُ الْعُلَکَ جِسْمِ اللّٰہِ تعالیٰ نے ملک یعنی حکومت عطا کی ہوئی تھی۔ وہ وقت کا بادشاہ تھا۔

اس شخص کے متعلق مختلف تفاسیر اور تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں۔ کہ اُس کا نام

نمرود کا
شجرہ نسب

۱
نمرد تھا۔ اُس کے باپ کا نام کنعان بن کوش تھا۔ لہذا وہ نمرد ابن کنعان کہلاتا تھا۔ بعض اوقات
پسے اپنے دارا کی طرف منسوب کر کے نمرد بن کوش بھی کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہ شخص حضرت
نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث میں حام کی نسل میں سے تھا۔ اور اس
کا پایہ تخت عراق میں اہل کے مقام پر تھا۔ اس زمانے میں یہ بڑا مشہور و معروف شہر تھا۔
جو موجودہ بغداد سے ستر یا سو میل کے فاصلے پر تھا اس شہر سے بہت سی تہذیب و ملت
ہیں۔ نمرد، کلدانی خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے چار سو سال تک حکومت کی تفسیری
ردایات میں آتا ہے۔ کہ نسل کے اعتبار سے یہ شخص ٹھیک نہیں تھا۔ تاہم یہ وہ شخص
ہے۔ جس نے سب سے پہلے سر پہ تاج شاہی رکھا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ چار شخص ایسے گنہگار ہیں۔ جن کی پوری دنیا پر گناہی
تھی۔ ان میں سے دو مسلمان تھے اور دو کافر۔ مسلمانوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین
ہیں۔ جن کا واقعہ سورۃ کہف میں ملتا ہے۔ کفار میں ایک نمرد اور دوسرا نحت نصر تھا
جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں آیا ہے۔ اس شخص نے بنی اسرائیل کو بالکل برباد اور ذلیل
کر دیا تھا۔

اس بات میں اختلاف ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرد کے ساتھ مناظرہ منظرہ کب ہوا
اُن کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے ہوا یا اس کے بعد۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ واقعہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے
جو نبی ابراہیم علیہ السلام جوان ہوئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی تبلیغ شروع
کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہل عمر سے ہی رشد و ہدایت عطا کی تھی۔ قرآن پاک
میں موجود ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدًا مِنْ قَبْلِهِمْ نَمْنَعُ
ابراہیم علیہ السلام کو ابتدا سے ہی رشد و ہدایت دی۔ آپ کے والد آذر سرکاری ملازم
تھے۔ اس کے علاوہ وہ اُس بڑے بت خانے کے اسچارج تھے، جسے بادشاہ
کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ مناظرہ اس وقت ہوا۔ اس کے بعد آپ کو آگ میں ڈال دیا۔
بعض دوسرے مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ مذکورہ مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
۱۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳، ۲۔ قرطبی ج ۲، ۳۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳، ۴۔ (فیاض)

کے گل میں لے جانے کے بعد مولانا ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے نرنز جاتے کا مجزہ دیکھ کر بھی مردہ
آپ پر ایمان لائے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَتْ لَوْطِ عَلَیْهِ السَّلَامُ کُلُوْکِیْ نَیْ اَکْثَرُ نَصْرَیْ: کی ابراہیم گھر میں آپ کی
بیوی سارہ تھی۔ جسے ایمان کی دولت حاصل تھی۔ اُن ایام میں یہ مناظرہ ہوا۔ آخر وہ وقت
بھی آیا جب ابراہیم علیہ السلام کو اپنا وطن بابل بھی چھوڑنا پڑا۔ اس سفر میں آپ کے ہمراہ
حضرت لوط اور آپ کی بیوی تھے۔ آپ عراق سے چل کر فلسطین پہنچے۔ وہاں اپنے
بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو تبلیغی مشن پر بحر لوط کے کنارے متعین کیا۔ پھر آپ مصر
پہنچے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ پہنچ کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ اور اپنے فرزند اسماعیل
کو وہاں چھوڑا۔ آپ واپس فلسطین آگئے۔ اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے در سر
بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام نے وہاں کے تبلیغی فرائض سنبھالے۔

مناظرے کا
پس منظر

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور غرود کے درمیان بحث و مباحثہ کی قربت
کیوں پیش آئی۔ اس کے متعلق مولانا شیخ المنذر اور شاہ عبدالقادر نے اپنی تفامیر
میں مختصر نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے پہلی آیت میں اہل ایمان اور اہل کفر
کا تذکرہ تھا۔ اُن کے نور اور ظلمت کا بیان تھا۔ اور اب اس آیت میں اسی سلسلہ
میں بعض نظریں پیش کی گئی ہیں اور اس پہلی نظیر میں غرود اور حضرت ابراہیم کا ذکر ہے
کہ جو کوئی شخص غرود کے دربار میں جاتا تھا۔ وہ سب سے پہلے اُسے سجدہ کرتا تھا جب
ابراہیم علیہ السلام دربار غرود میں پہنچے۔ تو آپ سے بھی سجدہ کرنے کی توقع کی گئی
مگر آپ نے غرود کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر مناظرے کی مذکورہ صورت
پیش آئی۔

غرود کا واقعہ تاریخ کی تمام روپائی کتابوں میں ملتا ہے مگر محض تاریخی روایات
پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ تاریخ میں ہر قسم کے واقعات بلا تحقیق نقل کر دیے
جاتے ہیں۔ پرانے مؤرخین میں ابن خلدون کو ادنیٰ مقام حاصل ہے۔ یہ آٹھویں صدی
ہجری میں ہوئے ہیں۔ اور تاریخ کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے
تاریخ کا ایک ضخیم مقدمہ قبلہ کیا ہے جس میں تاریخ کے مختلف موضوعات

یہ حاصل بحث کی ہے۔ اس نے پوری دنیا کو تاریخ کا فلسفہ سکھا دیا ہے۔ یورپ اور ایشیا کے تمام مؤرخین ابن خلدون کے شاگرد ہیں۔ خود قاضی بھی تھے۔ مگر تاریخی روایات کی صحت کے متعلق ان پر بھی مکمل انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ طبری کی تاریخ میں بھی صحیح اور غلط ہر قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ تاریخ دان کسی واقعہ کی پوری تحقیق نہیں کرتے۔ یہ تو محدثین کو شرف حاصل ہے۔ کہ کسی واقعہ کو نقل کرنے سے پہلے داوول کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ ہر غلط واقعہ درج نہیں کیا جاتا۔ البتہ امام ابن کثیرؒ نے اس ضمن میں کافی پیش رفت کی ہے۔ آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے شاگردوں میں ہیں۔ آپ نے واقعات کی جانچ پڑتال کی کوشش کی ہے۔ روایات پر صحیح یا غلط ہونے کے متعلق جرح بھی کی ہے۔ آپ کی تاریخ کی کتاب البدایہ والنہایہ سولہ جلدوں میں ہے۔ جس میں آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے زمانے تک کے واقعات تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ مستند تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ بہر حال انہوں نے واقعات کی صحت کا کسی مددک خیال رکھا ہے اپنے قرآن پاک کی تفسیر ابن کثیرؒ لکھی ہے۔ جو اعلیٰٰ رب کے تفسیر تسلیم کی جاتی ہے۔

تاریخی روایات کی صحت کی جانچ پڑتال میں امام مسعود لغویؒ کا نام سرفہرست ہے۔ آپ امام رازیؒ سے بھی

پہلے پانچویں صدی میں ہوئے۔ آپ کا بطن خراسان میں بغات ہے۔ آپ اعلیٰ پائے کے محدث تھے۔ آپ کی حدیث کی کتاب معین کے نام سے موجود ہے۔ جو علم حدیث کی بلند پایہ کتاب ہے۔ جسے صاحب مشکوٰۃ نے مزید شرح کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ آپ مفسر قرآن بھی ہیں۔ آپ کی تفسیر معالم التنزیل کے نام سے موجود ہے۔ جو چار جلدوں میں ہے۔ اور اُس دور کی معتبر تفسیروں میں شمار ہوتی ہے۔ بہر حال انہوں نے تاریخ کی واقعات میں صحت کا کسی قدر زیادہ التزام کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے واقعہ کے متعلق امام ابن کثیرؒ امام لغویؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے۔ جب کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور لوگ بھوکوں

مرنے لگے، اس وقت فردوس کے پاس غلے کا ذخیرہ موجود تھا۔ لوگ اُس کے پاس غلے لینے کے لیے جاتے تھے۔ اور دربار میں پہنچ کر سب سے پہلے سجدہ کرتے اور پھر اپنا مدعا بیان کرتے۔

اسل مناخرو

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی فردوس کے دربار میں پہنچے مگر آپ نے اُسے سجدہ نہ کیا۔ اُس نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے سوا کسی درگزر کو سجدہ نہیں کرتا۔ فردوس نے کہا کہ رب تو میں ہوں لہذا مجھے سجدہ کر دو۔ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا تم تو محض حاکم وقت ہو اور رب نہیں ہو۔ رب وہ ذات ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تمہارے اختیار میں یہ چیز نہیں ہے۔ لہذا تم رب نہیں ہو سکتے۔ اس آیت پاک میں بھی بات بیان کی گئی ہے۔ لَاذَقَالَ اِنَّ رَبَّهُمْ رَبِّي الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ یعنی میرا رب ہے جو زندگی بخشتا ہے اور مارتا ہے فردوس فرمایا قَالَ اَنَا اُمِيتُ وَاُحْيٰتُ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ چنانچہ اپنی طاقت کے مظاہر کے لیے اس نے دو قیدی منگوائے۔ جو بے گناہ تھا اُس کو قتل کر دیا۔ اور جو مجرم تھا اُسے آزاد کر دیا۔ اور کہنے لگا۔ دیکھو میں نے جس کو چاہا زندگی دے دی اور جسے چاہا موت کے حوالے کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ شخص عقل کا ایسا اندھا ہے کہ موت و حیات کے مضمون کو نہیں سمجھ سکا۔ یہ گنہگار کو چھوڑ دینے اور بے گناہ کو قتل کر دینے کو زندگی اور موت سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ زندگی کا مالک تو وہ ہے جو بے جان چیز میں جان ڈال دے اور جاندار کی جان اپنے اختیار سے قبض کر لے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے فردوس کو یہ قوت سمجھتے ہوئے اس نکتہ پر مزید بحث نہ کی۔ بلکہ ایک دوسری دلیل سے سمجھایا۔ قَالَ اِنَّ رَبَّهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ يَآتِيْ بِالسَّمٰنِ مِنَ الْمَشْرِقِ میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے فَاَتَتْ بِهَا مِنَ الْعَصْرِ تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ اب اُس کے حواس درست ہوئے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایسا سوال کیا ہے جس کا اس کے پاس کوئی جواب

نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ قَبُضَتِ الَّذِي كَفَرَ نمرود حیران ہو گیا گویا اللہ نے اس کی مستردی دی۔ وہ لاجواب ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے مزید بحث نہ کی۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر ابراہیم علیہ السلام سے مزید مناظرہ کیا۔ تو بات بالکل بگڑ جائیگی اور دو جھڑپا ثابت ہو جائے گا۔ لہذا وہ خاموش ہو گیا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اس مقام پر مزید بحث و تمحیص ہر کتنی تھی فرض کرو اگر نمرود سورج کے طلوع و غروب کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کو یہ جواب دیتا کہ سورج کو مشرق سے تو میں طلوع کرتا ہوں تم اپنے رب کے کہو کہ مغرب کے نکالے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ یقیناً ابراہیم علیہ السلام کو سچا کہہ دکھاتا اور سورج کو مغرب سے طلوع کر دیتا مگر نمرود کو اپنی شکست کا یقین نہ ہو گیا۔ لہذا اُس نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی عملت جانی۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا دور ربہ خیر پاک دہند میں بھی پیش آیا تھا۔ مغل بادشاہ جہانگیر بھی اپنے آپ کو سجدہ کرتا تھا۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اس کے سامنے سجدہ کیا جائے۔ مخلوق میں سے کسی کے لائق نہیں کہ اسے سجدہ کیا جائے۔ چنانچہ جہانگیر کے زمانے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سجدہ کی علی الاعلان مخالفت کی۔ بہر حال یہ آپ کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ کہ جہانگیر جیسا اکھڑ مزاج بادشاہ بھی اس فعل سے تائب ہو گیا۔ اور اس کا عقیدہ درست ہو گیا۔ البتہ اسکی بیوی رافضیہ تھی۔ مگر وہ رافضیوں کا طرہ ذرا نہیں بنا۔ اور صحیح دین اسلام پر قائم رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ جہانگیر کے بعد شاہ جہان مزید دین کی طرف راغب ہوا۔ اور پھر اورنگ زیب عالمگیر جیسا خوف خدا رکھنے والا بادشاہ بھی پیدا ہوا جس نے اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔

بہر حال جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو سجدہ کر لے سے انکار کر دیا تو اُس نے آپ کو غلہ مینے سے انکار کر دیا۔

اور آپ کو خالی داپس آنا پڑا۔ واپسی پر دل میں خیال آیا۔ کہ گھر والوں کو خالی لڑنے کا کیا جواب دوں گا۔ آپ نے راستے میں اپنا تھیلہ ریت سے بھر لیا۔ تاکہ گھر والوں

کو معلوم ہو کہ خالی ہاتھ واپس نہیں آئے۔ گھر پہنچ کر تھیلہ گھر میں کھا اور خود سوسے بیوی نے سمجھا کہ آٹے کے لئے ہیں چنانچہ وہ اٹھی تاکہ تھیلے میں سے آٹا کی روٹی تیار کرے تھیلہ کو کھولا تو اس میں واقعی آٹا تھا نہ مایا کر مٹنے کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو جگایا کہ کھانا کھالیں آپ نے پوچھا روٹی کس چیز سے پکائی ہے۔ بیوی نے عرض کیا، اُس آٹے سے جو آپ لائے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی کی ہے۔ اور ریت کا آٹا بن جانا ایک معجزہ ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کو سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔ وہ کمال قدرت کا مالک ہے۔ اس کی صفت اس کے فعل سے سمجھ میں آتی ہے۔ جب کوئی عجیب و غریب فعل سرزد ہوتا ہے۔ تو پھر پتہ چلتا ہے کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اور جب یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ تو پھر اس کی توجہ کی پہچان ہوتی ہے۔ کہ ایسی صفت کا مالک اور کمال قدرت اور کمال صفت کا مالک صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ گویا اس سائے واقعہ سے یہ بات نکلی کہ موت و حیات کا مالک اور نظام شمسی کو چلانے والا فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ چاہے قمر بڑے سے بڑے سرکش کو لا جواب کر دے۔ اور چاہے توریت کو غلہ میں تبدیل کر دے۔ یہ سب اس کی کمال قدرت کے کرشمے ہیں۔ جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔

ظالم ہریت
سے محروم ہیں

فرمایا اللہ تعالیٰ کی صفات کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لانا، تو پھر وہ پرے درجے کا ظالم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا یعنی ان کی راہنمائی نہیں کرتا پہلی آیت میں بھی آچکا ہے۔ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ کہ کافر لوگ ہی ظالم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ مشرک ہیں اور شرک کی حقیقت یہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ مشرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور اس کے مرتکب ظالم لوگ ہیں۔ جو لوگ شرک جیسے ظلم عظیم میں پھنس جاتے ہیں۔ اللہ ان

ظلم ہے؟ تب نہیں ہوگا، اُسے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔
 الفرض گذشتہ درس میں بیان ہونے والے ادلیار اللہ اور اولیاء الشیطن کی مثال
 اس درس میں آگئی۔ فرد علاؤت کا پرستار تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام حق پر قائم تھے۔ اللہ
 تعالیٰ نے حق کو فتح نصیب فرمائی۔ اور اپنی صفت کے ذمیلے اپنی ذات کی پہچان کر لی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

الْبَقَرَةُ ۲

درس یکمہ پندرہ (۱۱۳)

آیت ۲۵۹

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا ۚ
 قَالَ أَلِي بُنَىٰ لَهُ هَٰذَا ۚ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ
 عَامٍ ثُمَّ بَقِيَ ۚ قَالَ كَمْ لَبِثْتُ ۚ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ
 قَالَ بَل لَّبِثْتُ مِائَةَ عَامٍ ۚ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ
 لَمْ يَسْنَخْهُ ۚ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ
 إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهُمَا الْحَمِإَ ۚ فَلَمَّا
 تَبَيَّنَ لَهُ ۚ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۵۹﴾

تس جملہ ۴ (کیا نہیں دیکھا آپ نے اس شخص کو) جو ایک بستی پر گزرا، جو کہ ہلنے
 — چھٹل پر مگر ہی ہوئی تھی۔ اُس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا۔
 اس کے ویران ہونے کے بعد، پس اللہ تعالیٰ نے اُس شخص پر موت طاری کر دی
 سو سال تک۔ پھر اُسے اٹھایا۔ اللہ کہہ کہ تو یہاں کتنی دیر تک رہا ہے۔ اُس نے
 کہا، میں یہاں ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
 نہیں بلکہ تو سو سال ٹھہرا ہے۔ پس دیکھ ہلنے کھانے اللہ مشروب کا طر، وہ متغیر نہیں
 ہوا۔ اللہ دیکھا اپنی سجدہ کے گتھے کی طرف اللہ تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی
 بنادیں۔ اللہ دیکھ ٹھیل کی طرف، اس طرح ہم ان کو ابھارتے ہیں۔ پھر ان کو گشت پہناتے
 ہیں۔ جب اُس شخص پر بات واضح ہو گئی، تو وہ کہنے لگا، میں جانتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ
 ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ﴿۲۵۹﴾

رہنمائی گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء الرحمن اللہ اولیاء الشیطان کی مثال بیان فرمائی۔
 ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام اولیاء الرحمن کا نمونہ ہیں۔ اللہ دوسری طرف نمرود

ادبیار الشیطان کی مثال ہے دونوں کا مناظرہ و مباحثہ اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دلائل و براہین کی رو سے غالب آہا اور کافر کا حیران و پریشان ہو جانا یہ سب بیان ہو چکا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دشگیری فرمائی اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ اللہم و لی الذین استنوا یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا کار ساز ہے۔ اس مثال سے شیطان کی شیطنیت بھی سمجھ میں آئی کہ فرود کر اللہ تعالیٰ نے بادشاہی عطا کی تھی مگر اس انعام کا فخر گزار ہونے کی بجائے وہ شیطان کے پیچھے لگ گیا اور خود خدائی کا دعویدار بن گیا۔ اس نے انعام الہی سے غلط فائدہ اٹھلایا اور سرکشی اختیار کی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اسے صراط مستقیم دکھانا چاہا تو اس نے جھگڑا شروع کر دیا۔

آج کے درس عالی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال کے درپے اپنی قدرت کاملہ اور حیات بعد الممات کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ یہ مثال بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کو ثابت کیا ہے۔ مولانا حمید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات معارف الہیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر انسان کا روز قیامت پر یقین پختہ ہوتا ہے۔ لہذا غلیظ وقت کا فرض ہے کہ وہ ایسے واقعات کی تشریح کرے تاکہ لوگوں کے دلوں میں دوبارہ جی اٹھنے کے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

متعلقہ شخص
کون تھا

اس آیت کی ابتداء ارفی کا لفظ مذنی سے کی گئی ہے یعنی اُس شخص کا واقعہ جس کا ذکر ایک تباہ شدہ بستی پر ہوا۔ اور اس نے دل میں سوچا کہ اللہ تعالیٰ ایسی پامال شدہ بستی کو کیسے دوبارہ آباد کرے گا۔ یہاں پر اُس شخص کا تعارف نہیں کر لیا گیا۔ جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ حدیث پاک میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ بائبل، تفسیری روایات اور تاریخ سے اُس شخص کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں مفسرین کے اقوال میں سے ایک قول تریہ ہے۔ کہ یہ شخص سکریس سلمان ہی نہیں تھا۔ بلکہ حیات بعد الممات کا منکر تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے اپنی آنکھوں سے دوبارہ جی اٹھنے کا مشاہدہ کر لیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شخص نہ صرف

مومن تھا بلکہ اللہ کا نبی تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ کون سا نبی تھا، تو بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ یرمیاہ نبی تھے جن کا ذکر تورات میں موجود ہے۔ اور زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ آپ عزیر علیہ السلام تھے۔ اور اسی عجیب و غریب واقعہ کی بنا پر اسرائیلی آپ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں موجود ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ یعنی یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔

تاریخی
پس منظر

یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت سے پانچ سو سال پہلے پیش آیا۔ جب بنی اسرائیل میں سرکشی پیدا ہو گئی۔ اور وہ مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تو اس وقت بابل پر تخت نصر جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ کہتے ہیں کہ فرود کی طرح بخت نصر نے بھی پوری دنیا پر حکومت کی۔ چنانچہ اس نے شام و فلسطین پر حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ اور یہ و ظلم اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بنی اسرائیلیوں کو قتل کر دیا۔ اور لاکھوں لوگوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر اپنے ساتھ عراق لے گیا۔ بنی اسرائیل کی تمام کتابیں تورات سمیت جلا ڈالیں۔ حتیٰ کہ تورات کا ایک نسخہ بھی سلاکت نہ بچا۔ تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ قید ہونے والوں میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب آپ قید سے رہا ہو کر واپس اپنے وطن آئے تھے تو یہ واقعہ راستے میں پیش آیا۔ اس واقعہ کے مقام کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راستے میں کوئی شہر رہا ہوتا تھا۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہ خود یہ و ظلم کا شہر تھا۔ بہر حال اس کی حالت یہ تھی کہ مکانات کی چیتیں اور دیواریں زمین بوس ہو چکی تھیں اور وہاں کوئی شخص زندہ سلامت موجود نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ کسی زلزلے میں یہ ایک پُر رونق اور آباد شہر تھا۔ مگر اس وقت کھنڈرات کا ڈھیر بن چکا تھا

واقعہ پر
سطحی نظر

کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام گدھے پر سوار آئے تھے۔ آپ کے پاس کھانے پینے کا کچھ سامان بھی تھا۔ ایک برتن میں پھلوں کا کچھ شیر تھا۔ اور ایک ٹوکری میں انجیر تھے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو بلد خرب ہو جاتی ہیں۔ بہر حال آپ کا اس

اجڑے ہوئے شہر پر گزر ہوا۔ کھنڈرات کو عبور کرتے ہوئے ایک مقام پر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیا یہ اجڑا ہوا شہر بھی کبھی آباد ہوگا؟ اسی سوچ و بچار میں کھنڈرات کے درمیان ایک مقام پر اترے، گدھے کو بانڈھا کھانے کا کچھ حصہ کھایا اور باقی پاس رکھ لیا۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی، اذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ اور پھر یہی سوئے کہ اللہ تعالیٰ نے سو سال تک سلائے رکھا۔ جس وقت سوئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور جب بیدار ہوئے تو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اٹھنے کے بعد ان سے سوال و جواب ہوئے کہ کتنا عرصہ سوئے۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ سو سال تک سوتے رہے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے کرشمہ کے طور پر انہیں دکھایا کہ اس سو سال کے عرصہ میں ان کا کھانا بالکل تروتازہ تھا خراب نہیں ہوا تھا۔ البتہ ان کا گدھا مر چکا تھا اور اس کی ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے گدھے کو زندہ کیا۔

جب عزیر علیہ السلام موت کی نیند سمہے تھے۔ تو اس دوران بخت نصر مر گیا، ایران کے بادشاہ خسرو نے فلسطین پر حملہ کر کے اسے اپنے زیرِ نگیں کر لیا، اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیا۔ اور انہیں فلسطین کو دوبارہ آباد کرنی کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انہوں نے تیس سال کے مختصر عرصہ میں اس اجڑے شہر کو دوبارہ آباد کر لیا۔ اور پھر ایسا محوس ہوتا تھا کہ یہ شہر کبھی دیران ہوا ہی نہیں۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ پر رونق ہو گیا۔ دنیا کی تاریخ میں آبادی اور بربادی کی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ مگر جنگ کے خاتمہ سے چند سال کے اندر اندر جرمنی اس طرح آباد ہو گیا۔ کہ گریباوہاں کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ بڑی بڑی بلڈنگیں۔ فیکٹریاں، کاروباری مراکز پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت کے ساتھ معرضِ وجود میں آ گئے۔

اسی طرح تیس سال کے عرصہ میں وہ شہر لورہی آب و تاب کے ساتھ دوبارہ آباد ہو گیا۔ اور جب عزیر علیہ السلام اپنی موت کے سو سال پورے ہوئے

اس طرح دیا کہ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةً عَامٍ اَبٍ پر سو سال تک کے لیے موت طاری کر دی۔ ثُمَّ بَعَثْنَاهُ پھر آپ کو اٹھایا۔ اور کہا قَالَ كَمْ لَبِثْتَ تم کتنی دیر ٹھہرے یعنی اس حالت میں کتنا عرصہ ہے، ذرا بتاؤ تو سی۔ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط عرض کیا، ایک دن یا دن سے کچھ کم ٹھہرا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةً عَامًا بکہ تم ایک سو سال تک ٹھہرے اور آپ کو بار کرانے کے لیے فرمایا فَاَنْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرِبِكَ لَمْ يَسْنُئْ ذرا اپنے کھانے اور مشروب کی طرف دیکھو، وہ متغیر نہیں ہوا یعنی اتنا عرصہ گزرنے کے بعد گل ستر کر خراب نہیں ہوا نہ اس کی شکل تبدیل ہوئی ہے۔ نہ ذائقہ اور نہ رنگ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت ہے۔ کہ جلد خراب ہو جانے والی چیز کو اتنے لمبے عرصے تک محفوظ رکھا۔ اور دوسری طرف خود عزیر علیہ السلام ہیں۔ ان کا جسم سو سال تک کھنڈرات کے درمیان پڑا رہا مگر بالکل صحیح سلامت اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہ اس کا گوشت گلا سڑا اور نہ ہڈیاں علیحدہ ہوئیں۔ جس طرح اُس مالک الملک نے اصحاب کف کو تین سو سال تک ایک غار میں محفوظ رکھا، اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم کو ایک سو سال تک آنچ نہ آنے دی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے اپنی حکمت کے ساتھ ایسی چیزیں ظاہر کرتا ہے۔ پورا شہر آباد ہو گیا۔ مگر جس جگہ عزیر علیہ السلام آرام فرماتھے، وہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ آج لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دجال کہاں مقید ہے۔ آج دنیا کا کوئی حصہ نظروں سے اوجھل نہیں رہا۔ آخر وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ بھائی! اللہ تعالیٰ نے اُسے لوگوں کی نظروں سے مخفی کر دیا ہے۔ جب اُس کا حکم ہوگا، ظاہر ہو جائے گا۔ یا جوج ماجوج کی قوم بھی ایسی ہی ہے۔ وہ بھی کسی کو نظر نہیں آتے۔ انکے بزدلوں نے دعوے کیا کہ انہوں نے پوری دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا ہے مگر یا جوج ماجوج کبیں نظر نہیں آئے۔ مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حکمت سے چھپا رکھا ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ جب اس کا حکم ہوگا، یہ قوم پہاڑوں سے نکل کر ظاہر ہو جائے گی۔

حضرت عزیر علیہ السلام کے خود اپنے ساتھ اور کھانے کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا۔ اب انکے گدھے کا انجام دیکھئے۔ ہمارے ہاں تو گدھے کی سواری کو مستحق نہیں سمجھا جاتا، مگر اس زمانے میں یہ ایک علیحدہ سواری شمار ہوتی تھی۔ بڑے خوبصورت اور طاقتور گدھے ہوتے تھے، خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھے کی سواری کی ہے۔ آپ بالکل تکلف نہیں فرماتے تھے۔ جو سواری میسر آئے، استعمال میں لے آتے تھے جب آپ بنو قریظہ سے جنگ کے لیے تشریف لے گئے۔ تو آپ کے پاس یہی سواری تھی۔ اور اس پر پالان بھی نہیں تھا۔ مگر آپ نے اسی حالت میں اُس پر سفر کیا۔ آپ نے اونٹ اور گھوڑے پر بھی سفر کیا، اور اگر کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل دیئے، حضرت جابرؓ بیمار ہو گئے۔ آپ کا گھر مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ حضور علیہ السلام بیمار پرسی کے لیے جانا چاہتے تھے، کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل دیئے، حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضور تشریف لائے۔ تو آپ پر گدھ دو غبار پڑا ہوا تھا۔ بہر حال گدھے کی سواری کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے عزیر علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ ذرا اپنے گدھے کی طرف دیکھو۔ کہ اُس کا کیا حشر ہوا ہے۔ فرمایا یہ سب واقعات پیش کرنے کا کوئی مقصد ہے۔ وَلِيَجْعَلَكَ الْاٰخِرَ قَلْتًا اس آگے ہم آپ کو لوگوں کے لیے نمونہ بنادیں۔ کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے موت طاری کرنے کے بعد پھر کس طرح زندہ کر دیا۔ اب دیکھو گدھا کس طرح زندہ ہوا ہے۔ فرمایا وَانْظُرْ اِلٰی الْعِظْمِ۔ ان ہڈیوں کی طرف نگاہ کر دو۔ گدھا مر چکا ہے۔ گوشت گل نظر کو ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ فرمایا ان کی طرف دیکھو كَيْفَ نُنْشِئُهَا ہم کس طرح ان کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ نشتر کا معنی ہوتا ہے، ابھارنا، اٹھانا وغیرہ نامشعرہ اس عورت کو کہتے ہیں، جو خاوند کی نافرمان ہو اور مطلبے میں اٹھ کھڑی ہو۔ فرمایا دیکھو! ہم ان ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچہ تیار کر کے ہیں۔ ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے ہڈیاں

ابھریں، ان کا ڈھانچہ تیار ہوا۔ پھر ان پر گوشت چڑھا۔ گدھے کی شکل و صورت بنی اور پھر وہ زندہ ہو کر بولنے لگا۔

ہر ذی جان کا جسم ہڈیوں پر قائم ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جب انسان مر جاتا ہے۔ تو اس کے جسم کی تمام کٹافیں گل سڑ جاتی ہیں۔ صرف دم کی ہڈی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتی ہے۔ قیامت کے دن اسی ہڈی سے پورا ڈھانچہ اور پھر پورا جسم اٹھایا جائے گا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے گدھے پر وار دیا اور پھر حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے گدھے کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ وار د ہونے والی موت کے اس سو سالہ عرصہ کو عالم برزخ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

جب کوئی انسان مر جاتا ہے۔ تو اس کا تعلق اس دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز دوبارہ جی اٹھنے تک برزخی زندگی کھلاتی ہے۔ اس عرصہ میں انسان کو وقت کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کتنا عرصہ برزخ میں رہا ہے جیسا کہ سورۃ یٰسین میں آتا ہے کہ جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے، تو کہیں گے "مَنْ لَّعَنَّا مِنْ مَقْعَدِنَا هٰذَا" ہمیں ہماری خراب گاہوں سے کس نے اٹھایا۔ ان کو ایسا ہی محسوس ہوگا جیسے کوئی شخص رات کو رات کے وقت کچھ دیر کے لیے سوتا ہے۔ اور پھر اٹھ بیٹھتا ہے۔ یہی چیز حضرت عزیر علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ سو سال تک سوئے ہوئے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

عالم برزخ میں وقت کا احساس تو نہیں ہوتا۔ مگر راحت اور تکلیف کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آتا ہے کہ جب کسی شخص کو دفن کر دیا جاتا ہے تو پھر مگر نکیر اس سے سوال و جواب کرتے ہیں اس ابتدائی امتحان میں اگر وہ شخص کامیاب ہو رہا ہے۔ تو اس کو میٹھی فیند سلا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے راحت کا سامان میکا کر دیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ ناکام ہو گیا ہے۔ سوالات کا جواب نہیں دے سکا۔ تو پھر قیامت تک کے لیے اسے تکلیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے تکلیف کا احساس تو ہوتا ہے مگر وقت کا احساس نہیں ہوتا۔

مرنے کے بعد ایک عام انسان کے جسم کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ قانونِ قدرت کے مطابق مردہ جسم گل سڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ قبروں کی کھدائی کے دوران بعض اوقات چھوٹی موٹی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اور بعض اوقات وہ بھی نہیں ملتیں۔ البتہ اس امر پر اتفاق ہے کہ ابیاری علیہم السلام کے اجسام قبر میں بھی محفوظ رہتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ حَرَمَ عَلٰی الْمَرْمُضِ اَنْ تَسْكُنَ اَحْبَسَادَ الْاَنْبِیَاءِ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا۔ کہ وہ نبیوں کے جسموں کو کھل سکے۔ ہاں شہداء کے متعلق مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ بعض شہداء کے جسم بھی قبروں میں محفوظ رہتے ہیں۔ بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ بعض شہداء کو شہید ہوئے پچاس سال گزر چکے تھے۔ بارش اور سیلاب کی وجہ سے ان کی قبروں میں شگاف پڑ گئے، تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے جسم ویسے ہی محفوظ تھے جیسا وہ دفن کیے گئے۔ ابھی پچھلے دنوں اس بات کا اعلان ہوا ہے کہ جو لوگ چھ سو سال پہلے تاتاریوں کے علاقے میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے تھے، ان کے جسم بالکل محفوظ برآمد ہوئے تھے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ جَبِ يَرْتَامُ حَظِيْرُ حَضْرَتِ عَزِيزِ عَلَیْہِ السَّلَامُ بِرَوَاضِحِ ہُوْگِیْنِ ان کے سوال کا جواب مل گیا۔ انہوں نے حیرانگی کے انداز میں سوال کیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ اس اجڑی ہوئی بستی کو کیسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی آنکھوں سے دکھا دیا۔ کہ اُس نے نہ صرف پورے شہر کو آباد کر دیا بلکہ خود ان کو اور ان کے گھر کو سو سال کے بعد پھر زندہ کر دیا۔ تو عزیر علیہ السلام نے کہا قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِیْقٌ میں جان گیا ہوں اور مجھے علم ہو گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ آباد کو برباد اور اجڑے دیار کو پھر سے آباد کر سکتا ہے۔ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

کسی چیز کو تسلیم کر لینے یا اس پر یقین کر لینے کے تین درجے ہیں۔ اگر کسی چیز کا علم کسی درجے کے شخص کی معرفت ہو تو اسے علم الیقین کہتے ہیں۔ کیونکہ ایسی چیز کا اور اک علم کے ذریعے ہوا ہے۔ اور اگر کوئی شخص خود اپنی آنکھوں سے کوئی واقعہ

دیکھ لے۔ تو اُسے عین الیقین کہتے ہیں۔ اور یقین کا تیسرا درجہ حق الیقین ہے۔ اور یہ اُس صورت میں ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی واقعہ خود اپنے ساتھ پیش آئے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے اوپر وارد ہوئی ہو۔ اور اس کی کیفیت خود اپنے اوپر طاری ہوئی ہو۔ اس سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور یہی چیز کو تسلیم کر لینے کا آخری درجہ یعنی حق الیقین ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ عین الیقین بھی ہے اور حق الیقین بھی عین الیقین اس لحاظ سے کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے خود اپنی آنکھوں سے مردہ گدھے کو زندہ ہوتے دیکھا۔ ان کی نظروں کے سامنے گدھے کی بوسیدہ ہڈیوں سے ہڈیاں پتیار ہوا، پھر ان پر گزشت چڑھا۔ گدھے کی شکل و صورت بنی اور پھر وہ آواز دینے لگا۔ یہ واقعہ حق الیقین کے درجے میں اس لحاظ سے ہے کہ یہ معاملہ خود عزیر علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ خود سو سال تک موت کی آغوش میں ہے۔ اور پھر زندہ ہو گئے۔ جہاں تک پہلے درجے علم الیقین کا تعلق ہے۔ تو حضرت عزیر علیہ السلام کو بھی حاصل تھا۔ کیونکہ آپ اللہ کے نبی اور برگزیدہ مومن تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی دُعا اور قیامت کے دن دوبارہ جی اُٹھنے پر علمی لحاظ سے بھی یقین تھا۔

اگلی آیت میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہے۔ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکا اظہار اور علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک کا مشاہدہ ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوْ لِمَ
تُؤْمِنُ ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبِي ۖ قَالَ فَخُذْ
أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ أَجْعَلْ عَلَىٰ
كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً ثُمَّ أَذْهَبْنَا يَأْتِيَنَّكَ سَفِيَا
وَاعْلَمَنَّ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۰﴾

۳۰

تس جہد : اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے
کہا کہ مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کیا تم یقین نہیں
رکھتے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں میں یقین رکھتا ہوں لیکن یہ اس لیے تاکہ میرا
دل تسکین پکڑے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، چار پرندے پکڑ لو اور پھر انہیں اپنے پاس لے کر آؤ
ر اپنے پاس ٹھہرے ٹھہرے کر دو (پھر ہر ہاڑ پر ان میں سے ایک ایک جزو رکھ دو۔
پھر ان کو بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان کو کہ جبکہ اللہ تعالیٰ
کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے ﴿۳۰﴾

توحید باری تعالیٰ، اُس کی کمال قدرت اور بعثت بعد الموت کے متعلق اس

تہید

رکوع میں دو واقعات آپکے ہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ درس میں حضرت ابراہیم
علیہ السلام اور فرود کے مناظرے کی تفصیلات بیان ہوئی تھیں۔

اور گزشتہ درس میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ آیا تھا۔ جس میں انہوں نے موت
وحیات کے منظر کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے اطمینان قلب حاصل کیا۔ آج
کے درس میں اسی قسم کا تیسرا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ اس میں بھی بعثت بعد الموت
کا بیان ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ انہیں

مردوں کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کرایا جائے تاکہ ان کا ایمان عین یقین کے درجے تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔ اور حکم دیا کہ چار ہندسے لے کر ذبح کرو۔ ان کے گوشت آپس میں ملا دو۔ پھر ان کے تھوڑے تھوڑے حصے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔ اس کے بعد ہر ایک ہندسے کو اُس کا نام لے کر بلاؤ۔ وہ تھوڑے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے مردہ ہندوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ کر اطمینان قلب حاصل کیا۔

بعض مفسرین کرام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ سے اس سوال کے پس منظر میں یہ بات بیان کرتے ہیں کہ موت اور زندگی سے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرد کے ساتھ مکالمہ ہو چکا تھا۔ جس میں آپ نے دعویٰ کیا تھا کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ مگر فرد اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اور اس نے بے گناہ کو قتل کر دیا اور مجرم کو آزاد کر دیا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اُس کی اس احمقانہ حرکت پر موضوع سخن بدل کر طلوع شمس کی دلیل پیش کر دی جس سے فرد عاجز آگیا تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کو پورا پورا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ مگر اُن کے دل میں موت و حیات کا منظر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کی گئی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دکھا دیا کہ کس طرح ہندسے زندہ ہو گئے۔

بعض دوسرے مفسرین اس پس منظر میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دریا کے کنارے پر ایک مردہ جانور پڑا دیکھا۔ جب دریا میں نہ آتی اور پانی کناروں سے باہر نکلتا تو دریائی جانور مردہ جانور کا گوشت کھاتے اور جب پانی پیچھے ہٹ جاتا۔ تو خشکی کے جانور اُس مردار کا گوشت کھاتے اور اُوپر سے ہندسے بھی آکر گوشت کھا جاتے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس مردار کا گوشت خشکی، پانی اور فضا کے جانور کھا رہے ہیں۔ یہ گوشت کتنے مختلف پیڑوں میں جا رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے مختلف اجزاء کس کس جگہ سے

والسلام کے دست مبارک پر بیعتِ ضرعان کر رہے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ — اُن کے دلوں کی بات کو جانتا تھا فَاَنْذَلْنَا السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ اور اُن پر تسکین نازل فرمائی۔ نبی کریم اور تمام صحابہ کرام کو تسکین قلب حاصل ہو گئی۔ بعض دوسرے مواقع پر بھی اس قسم کے اشارات ملتے ہیں۔ تو بہر حال نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی یہی بات سمجھائی۔ کہ مَرُدُّوْں کو زندہ کرنے یا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کسی بھی معاملے میں کسی نبی کو شک نہیں ہو سکتا۔ جب میں کسی معاملہ میں شک نہیں کرتا، تو ابراہیم علیہ السلام کیسے شک کر سکتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے لَوْ كُشِفَ الْغُطَاءُ مَا زِدْت بِيَقِيْنًا یعنی اگر غیب کا پردہ بھی کھول دیا جائے۔ تو میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اس قول سے بعض لوگوں نے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ حضرت علیؑ کا علم یقین اتنا پختہ ہے۔ کہ عین یقین سے ان کے ایمان میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام اطمینان قلب کے لیے خود عین یقین کا مطالبہ کر رہے ہیں لہذا بقول ان کے اس سے حضرت علیؑ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بھائی! یہ بات نہیں ہے۔ حضرت علیؑ تو اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں۔ ان کے مراتب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مفسر قرآن مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایک ولی کا عین یقین بھی نبی کے علم یقین تک نہیں پہنچ سکتا، نبی کا اصل یقین ہی اتنا بلند ہے کہ ولی کی دُعا تک رسائی نہیں۔ چہ جائیکہ نبی کے طاعتِ قلب ثلثے یقین تک پہنچ جائے وہ تو اور بھی بلند ہوتا ہے۔ لہذا ولی کی نبی پر فضیلت تو کجا، وہ تو انبیاء کی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ سکتے حضرت علیؑ کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایمان کی مدد تک ان کا یقین اتنا پختہ ہے۔ کہ اس میں مزید اضافے کی گنجائش نہیں اگرچہ درمیان سے غیب کا پردہ بھی اٹھ جائے اپنے اطمینان قلب کی بات نہیں کی۔ یقین اور طاعتِ قلب دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ اسی لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا۔ کہ مولا کریم! تیری قدرت پر مجھے پورا پورا

یقین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر میں دلی اطمینان چاہتا ہوں۔ جو کہ اس سے اگلا درجہ ہے۔ مجھے میری آنکھوں سے مشاہدہ کرائے کہ مرنے کی کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔

چار پرندے

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى نَفْسُ هَذِهِ الْأَنْفُسِ كَلُوا، اپنی طرف مائل کر لو۔ بعض اُسے ص کی زیر کے ساتھ فَصْرُ هُنَّ پڑھتے ہیں۔ صَارَ يَصِيرُ کا معنی اٹھٹے ٹکڑے کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ چار پرندے لو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ بہر حال یہ لفظ دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اپنے ساتھ مانوس کر لو۔ یا ذبح کر کے بولی بولی کر دو بعض مفسرین کہتے ہیں کہ پرندوں کو محض مانوس کیا گیا تھا، ذبح نہیں کیا گیا تھا۔ مگر یہ تفسیر مردود ہے اصل بات یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اُن پرندوں کو ذبح کیا۔ اُن کے پر اُتار دیے اور ان کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں بلا دیا۔ خلط ملط کر دیا۔ جیسے گوشت کا قیمہ کیا جاتا ہے۔

اب رہیہ سوال کہ وہ چار جانور کون کون سے تھے۔ قرآن پاک میں تو اس کی تفصیل نہیں ہے۔ البتہ تفسیروں میں آتا ہے کہ یہ چار جانور، مرغ، اکوا، کبوتر، اور مور تھے۔ اور ان پرندوں کا انتخاب اس وجہ سے تھا کہ ان میں کوئی نہ کوئی انسانی صفت پائی جاتی ہے۔ مثلاً مرغ میں شہوت کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے اور یہی چیز انسانی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی وجہ سے ہنگامے، جنگلیں اور بھرتا ہی ہوتی ہے کرے میں حرص کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض انسان بھی حرص و ہوا میں بہت آگے ہوتے ہیں۔ کبوتر میں دنیا کی محبت، پیچہ ہوتی ہے اور بعض دنیا دار انسان بھی اسی مرض میں مبتلا ہوتے تھے۔ چوتھا جانور مور ہے۔ اس میں تجبر کی فراوانی ہوتی ہے جب خوش ہوتا ہے۔ تو ناچنے لگتا ہے۔ اور اپنے خوبصورت پر پھیلا دیتا ہے۔ اُسے اپنے حسن و جمال پر بڑا فخر ہوتا ہے۔ مگر جب اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا ہے تو شرمسار ہو جاتا ہے۔ اور پر گرا دیتا ہے۔ یہی حال حضرت انسان کا بھی ہے ذرا آسوگی ملتی ہے۔ تو غرور و تکبر کرتا ہے۔ بات بات پر اکڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ

کی پڑ آتی ہے۔ تو ہتھیار ڈال دیا ہے۔ بعض لوگوں نے کوسے کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے وہ بھی کھانے کا بڑا لالچی ہوا ہے۔ جب کہ اکثر انسان بھی کھانے پینے کو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ انسان میں پائے جانے والے ان چار اوصاف یعنی حرص، شہوت، اہمیت دنیا اور تجکر کے علاوہ ہر انسان کے بعض اپنے اپنے خواص بھی ہیں۔ جن میں خون، سودا، بلغم اور صفرا شامل ہیں۔ بہر حال ان چار اوصاف والے پرندوں کے انتخاب سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ان کو ذبح کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان بھی اگر ان اوصاف بقیہ کو کھل ڈالے، تو کمال تک پہنچ جائے گا۔ جب تک یہ گندے اوصاف انسان میں موجود رہیں۔ وہ کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

پرندوں کی
موت و حیات

بہر حال قرآن پاک یا حضور علیہ السلام نے ان پرندوں کی تفصیل نہیں بتائی۔ اس قسم کی باتیں تفسیری روایات میں آتی ہیں۔ اس قسم کی حکمت کی باتیں مفسرین کو کم سمجھا جیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چاروں پرندوں کو ذبح کیا۔ ان کے پر علیحدہ کر دیے۔ پھر ان کے گوشت کا قیمہ کر کے آپس میں ملا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً مِّنْهُ پھر ہر پہاڑ پر اُس طے جلع گوشت کا ایک جزو رکھ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم کیا۔ اُس قیمہ کے چار حصے کیے اور چار مختلف پہاڑوں پر رکھ دیے۔ پھر ارشاد ہوا۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَحْكُمْنَ پھر انہیں بلاؤ تفسیری روایات میں آتا ہے۔

کہ ابراہیم علیہ السلام نے باری باری ہر ایک پرندے کا نام لے کر بلایا۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا گا۔ يَا تَيْنِكَ سَخِيًّا تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب آپ نے مرغ کو آواز دی تو فضا میں اس کی ہڈیاں نمودار ہوئیں۔ پھر اس کے گوشت کا جو حصہ جس جس پہاڑ پر تھا وہاں سے فوراً آیا اور ہڈیوں پر چڑھ گیا۔ پھر مرغ کے پر اکڑ گئے اور مکمل مرغ بن کر زندہ ہو گیا۔ اس طرح دوسرے پرندے بھی زندہ سلامت ہو گئے۔ جس طرح عزیز علیہ السلام کے گدھے کی ہڈیاں اکٹھی ہوئیں ان پر گوشت چڑھا۔ اور پھر وہ مکمل گدھا بن کر آؤنہ فیضی لگا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام

آنکھوں کے سامنے زنج شدہ پرندوں کو زندہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک ہے جب اس کا حکم ہوگا۔ قیامت برپا ہوگی۔ تو تمام مردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ فرمایا وَاَعْلَمُ اور جان لو، خوب اچھی طرح سمجھ لو، اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ حَکِیْمٌ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے۔ جس طرح چاہے کرے، اس کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ وہ حکم ہے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ کمال درجہ کی حکمت کا مالک ہے عزیز کا معنی عزت دینے والا بھی ہوتا ہے یہ خدا کی صفت ہے۔ وہ عزت کا مالک بھی ہے۔

معجزہ اور کرامت

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت کے قین واقعات آپکے ہیں۔ خصوصاً بعثت بعد الموت کے متعلق حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ پرندوں والا واقعہ بالکل واضح ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ اس قسم کا جو عجوبہ ظاہر کرتا ہے، اسے معجزہ کہتے ہیں۔ قرآن پاک اور احادیث میں بے شمار معجزات کا تذکرہ موجود ہے۔ اگر اس قسم کے واقعات کسی امتی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں تو وہ کرامت کہلاتے ہیں۔ قادری سلسلہ کے بزرگوں میں سے یہاں بہت سبب میں ایک نیک شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے ان کے لیے ثابت ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کیا تھا۔ لکھنؤ میں ایک مردہ کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ لوگوں نے یہ کرامت بھی دیکھی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے چچا کے سامنے بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ انہوں نے بھی مردہ کو زندہ کیا تھا الخرض اس قسم کے واقعات کرامت کہلاتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ کہ معجزہ یا کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ ایسا کام انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَّاتِيَ بِآيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کسی نبی کے اختیار میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا کر سکتا ہے لہذا معجزات اور کرامات کے جو سبب واقعات ہیں۔ انہیں تسلیم کرنا چاہیے۔ مگر بلا تحقیق ہر بے سہروا کو کرامت تسلیم کرنا درست نہیں

ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ پر بہت سی کرامت ظاہر ہوئیں جن کا ثبوت ملتا ہے مگر بارہ سال تک کشتی ڈوبنے والے واقعہ کی کوئی اصل نہیں ہے۔ لہذا یہ قابل تسلیم ہرگز نہیں۔

معجزہ اور کرامت کے علاوہ ایک اور چیز ہے، جسے استدراج کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے۔ تو کسی کافر کے ہاتھ بھی کوئی عجوبہ ظاہر کر دے مگر یہ عزت والی بات نہیں ہوتی بلکہ امتحانی ہوتا ہے، جس طرح حدیث شریف میں موجود ہے۔ کہ دجال مُردوں کو زندہ کریگا۔ یہ کرامت نہیں بلکہ استدراج ہوگا۔

توحید باری تعالیٰ اور معاد کے متعلق تین واقعات بیان کرنے کے بعد اُسے سخن پھر اتفاق فی سبیل اللہ کی طرف جاتا ہے اگلی آیات کا تعلق پھر اُسی پہلی آیت اَنْفَعُوا مَعَادَ زَقْنَكُمْ کے ساتھ ہے۔ لہذا اگلے رکوع کا موضوع پھر وہیں سے چلیگا، جہاں کچھابیانی ختم ہوا تھا۔ درمیان میں اس کی تائید کے لیے تین واقعات کا ذکر آگیا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ
حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةٌ
حَبَّةٌ ۖ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ
عَلِيمٌ ۝ (۲۹۱) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ
لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مِمَّا وَلَا آذَى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲۹۲) قَوْلٌ
مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعَهَا آذَى ۖ
وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝ (۲۹۳)

ترجمہ : اُن لوگوں کی مثال جو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔
اُس دانے جیسی ہے۔ جس نے سات بایوں کو اگایا۔ ہر بالی میں سو دانے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ
دکا کر رہے (بڑھا رہے) جس کے لیے چاہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے اور
سب کچھ جاننے والا ہے ۝ (۲۹۱) جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کے راستے میں خرچ کئے
ہیں۔ پھر جو کچھ انہوں نے خرچ کیا اس کے پیچھے احسانِ جلا اور تکلیف دینا نہیں لگاتے
ایسے لوگوں کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور اُن پر کوئی خوف نہیں
ہوگا اور نہ وہ غلگین ہوں گے ۝ (۲۹۲) دوستر کے مطابق بات لہدہ و گدہ کرنا اُس صدقہ
سے بہتر ہے۔ جس کے پیچھے تکلیف (سنا) ہو۔ اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور

بردار ہے ۝ (۲۹۳)

ربطیت
انفاق فی سبیل اللہ

آیت انکرسی میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان تھا، جو دین کا اصل الاصول اور بنیاد ہے
اس آیت میں اللہ کی صفات کا ذکر بھی آچکا ہے۔ گذشتہ رکوع کی تین آیات میں تین

واقعات بیان ہوئے ہیں، جن کو جان لینے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازے اور جسے چاہے اس سے محروم رکھتا ہے، زندگی اور موت بھی اللہ جل جلالہ کے دست قدرت میں ہے۔ کسی اور کے اختیار میں نہیں۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے جہاد کا واقعہ بھی بیان ہوا کہ کس طرح ان لوگوں نے جہاد سے گریز کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سزائیں مبتلا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں واضح ہدایت دی کہ جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرو۔ اہل ایمان سے یہ بھی فرمایا "أَفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ" ہم نے جو تم کو رزق دیا ہے۔ اس میں سے خرچ کرو۔ درمیان میں مذکورہ بالا بیانات کے بعد روکنے پھر اتفاق فی سبیل اللہ کی طرف ہے۔ ان آیات میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنا فی فضیلت کا بیان ہے۔ اور ان شرائط کا ذکر ہے۔ جن کی بنا پر خرچ کیا ہوا مال اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے سات باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے دو باتوں کا ذکر آج کے درس میں ہے اور باقی پانچ اگلی آیات میں آئیں گی۔

اجر و ثواب
کے سبب

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اور اس کے بدلے میں ملنے والے اجر کا نقشہ کھینچا ہے۔ نیکی کے ہر کام میں خرچ کرنا اتفاق فی سبیل اللہ کہلاتا ہے۔ تاہم جہاد کی خاطر خرچ کرنا اس کی خصوصی مدہ ہے۔ کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دین کو غلبہ مائل ہوتا ہے۔ جس سے دین کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دینی تعلیم کا فروغ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے علاوہ غزبار و مسکین کی اعانت، بیوگان اور یتیم کی حاجت روائی اتفاق فی سبیل اللہ کا اہم جزو ہے۔ اس قسم کے تمام اخراجات کی فضیلت اور اجر و ثواب کو اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے مال کی مثال اُس دانے جیسی ہے أَنْتَبَكَّتْ سَبْعَ سَبَابِلَ خُجْرَاتٍ اٹھنے لگا ہے۔ فِي كُلِّ سَبْلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ اور ہر خوشے میں سو دانے پیدا

ہوتے ہیں۔ جس طرح زرخیز زمین میں ایک دانہ بویا جائے اور اس کی مناسب دیکھ بھال اور آبیاری کی جائے تو اس سے سات سو دانے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہونے والے ایک پیسہ کا اجر و ثواب سات سو گنا حاصل ہوتا ہے۔ قرآن و سنت میں ہر نیکی کے اجر و ثواب کے کسی معیار میں جن کا ذکر آتا ہے سورۃ النعام میں آتا ہے۔ مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مَثَلٍ هَا، ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ہے جب کہ حدیث میں سات سو گنا تک بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ نیکی کے کام میں جس قدر اخلاص پایا جاتا ہے۔ اُس کے مطابق اس نیکی کا اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے۔ تاہم سورۃ النعام کی آیت پاک کے مطابق ہر نیکی کا کم از کم اجر دس گنا ہے۔ اس کے بعد جس قدر اخلاص بڑھتا جائیگا۔ ثواب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاص پر سات سو گنا تک اجر حاصل ہوگا۔ تاہم مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ جس کے ساتھ دین کی اقامت اور اشاعت والبتہ ہے، اس سلسلہ میں کی گئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی نیکی کا ثواب سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے اور پھر جس قدر خلوص بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اجر و ثواب بھی بڑھتا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی جہاد کے موقع پر ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک اونٹنی پیش کی جس کو ہمار لگی ہوئی تھی اور اس پر کجاہ کا ہڑ تھا آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم نے بہت اچھا کیا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت والے دن ایسی کئے ہوئے کجاہ والی سات سو اونٹیاں عنایت کرے گا۔ گویا جہاد میں خرچ کیے جانے والے مال کا کم از کم اجر سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے۔ کم از کم دین کی عزت اور بقا جہاد کی وجہ سے ہے۔ اور اعلیٰ درجے کی کوئی انتہا نہیں ہے اللہ تعالیٰ بقنا چاہے۔ بڑھا چڑھا کر دے دے وہ مالک ہے۔ اسی لیے فرمایا واللہ ۛ یضیع لمن یتأخر اللہ تعالیٰ بڑھتا ہے جبکہ چاہے واللہ ۛ وایح علیکم اللہ تعالیٰ بڑی رحمت والا ہے اور سب کچھ جانتا والا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صدقہ کی فضیلت کو متعلق روایات میں بیان فرمادیں پہلی یہ

کہ عام نیکی کا بدلہ دس گناہ سے لے کر سات سو گنا تک ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے کا کم از کم اجر سات سو گناہ اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

معیار قبولیت

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال کی قبولیت کا ایک معیار مقرر کیا ہے۔ اور وہ ہے کہ صدقہ محض رضا الہی کے لیے ہو۔ اور وصول کنندہ کو نہ تو احسان جتلیا جائے۔ اور نہ اُسے صدقہ کے بدلے اذیت دی جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ ثُمَّ لَا يُؤْتُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى پھر اُس خرچ کرنے کے پیچھے احسان اور اذیت نہیں لگاتے یعنی وہ کوئی چیز دے کر مستحق کو نہ احسان جتلاتے ہیں۔ کہ میں نے تیری فلاح وقت حاجت پوری کی اور نہ اُس کو اذیت پہنچاتے ہیں یعنی سستے نہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غریب آدمی کو صدقہ دیا۔ اور پھر اُسے بار بار یاد دلاتے رہے۔ یاد دہندوں کے سامنے بیان کرتے پھرتے ہیں۔ کہ میں نے فلاں آدمی کو زکوٰۃ و خیرات دی ہے۔ یا یہ بھی ہر لحاظ سے کہ جس محتاج کو کوئی چیز عطا کی ہے۔ اس کے بدلے میں اس سے شکریہ لی جائے۔ جو ظاہر ہے کہ اُسے تنگ کر لے اور ستانے کے مترادف ہو گا۔ کسی کو دھکا دیا جائے۔ پٹائی کر دی جائے۔ اگالی نکالی جائے یا طعن و علامت کی جائے۔ یہ سب ایذا رسانی کی باتیں ہیں۔ فرمایا وہ لوگ جو خرچ کرنے کے بعد ایسی برمی حرکات سے باز رہتے ہیں۔ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ایسے ہی لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔ جو انہیں کسی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ایسے لوگوں کو نہ اس دنیا میں کوئی خوف ہو گا۔ اور نہ وہ الگ جہاں میں غمگین ہوں گے۔ بلکہ ان کی دنیا و آخرت ہر دو مقامات سے سنور جائیں گے اور وہ کامیاب و کامران ہوں گے۔

برخلاف اس کے اگر کسی شخص نے کسی محتاج کی مالی اعانت بھی کی۔ اور اس کو احسان جتلیا یا اذیت پہنچائی۔ تو اس کا صدقہ باطل ہو گا۔ اور اس کے بدلے میں

کوئی اجر و ثواب بھی حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ الٹ محصیت میں مبتلا ہو کر عذاب کا مستحق ہو جائیگا۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ احسان جتلانے والے شخص کی طرف نظر شفقت سے دیکھنا بھی پسند نہیں کریگا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پاک بھی نہیں فرمائے گا۔ بلکہ اُن کے لیے عذاب الیم تیار ہوگا۔ اس حدیث میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اپنا تبعد یا شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔ اس کی طرف نظر شفقت سے نہیں دیکھیگا۔ اور وہ جہنم میں جائیگا۔ حدیث کے الفاظ میں اسفل من الکعبین نفی النار بھی آیا ہے۔ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ لٹکا کر وہ تحریمی اور قابل مؤخذہ ہے۔ بہر حال صدقہ کے متعلق دو چیزوں کی سخت وعید فرمائی۔ کہ صدقہ دینے والا نہ تو احسان جتلانے اور نہ ملکیت دے۔ اگر ایسا کرے گا۔ تو نہ صرف اس کا صدقہ باطل ہو جائے گا۔ بلکہ خود معطلی گنہگار ہوگا اور عذاب کا مستحق ٹھہریگا۔

بعض اوقات سائل لجاجت کرتا ہے۔ منت کا جت کرتا ہے۔ اور اپنے سوال پر اصرار کرتا ہے۔ اس صورت میں فرمایا قَوْلٌ مَّقْشُورٌ دستور کے مطابق نرم جواب دینا وَمَغْضُوةٌ اور درگزر کرنا، اس کے اصرار پر بدزبانی سے پرہیز کرنا خَيْرٌ مِّنْ مَّوَدَّةٍ يَّتَّبِعُهَا اذیٰ اس صدقہ سے بہتر ہے۔ جس کے بعد ازیت پہنچائی جائے مطلب یہ کہ سائل کے بعد ہونے پر اُسے نرمی کے ساتھ جواب دے دیا جائے تو بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ اُسے کچھ دے بھی دیا جائے۔ اور ساتھ طعن تشنیع اور گالی بھی دے دی جائے۔ یا اُسے دھکے دیکر نکال دیا جائے۔ ایسا کرنے سے صدقہ باطل ہو جائے گا۔ لہذا ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کر کے وقت یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے صدقہ کا و خیر کی ضرورت ہے۔ نہیں، بلکہ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ اللہ تعالیٰ تو ایسی چیزوں سے بے نیاز ہے۔ صدقہ دینے سے انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے اُسے تقرب الی اللہ حاصل ہوگا۔ اس کا نفس پاک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہے۔ بڑا بردبار ہے۔ اکثر اوقات مجرموں کو مہلت دیتا ہے۔ بہت سے

لوگ اللہ کی اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بڑے کاموں میں لگ جاتے ہیں ۔
 مگر انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ وقت مقرر پر گرفت بھی کر لیتا ہے ۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَةِ ۲

درس پچھد شانزدہ (۱۱۶)

(آیت ۲۶۳ تا ۲۶۶)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ
وَالَّذِي كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ
تَرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ
عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۲۶۳﴾
وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ
اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا
وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُوهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطُلَّ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۶۴﴾ أَبَوْدُ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ
مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا
مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ لَهُ
فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَفُلِحَتْ رَقَّتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ
اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۶۵﴾

ترجمہ

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقات کو باطل نہ کرو۔ احسان جہلا کر اور تکلیف
دے کر۔ اُس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
اور قیامت کے دن پر تعین نہیں رکھتا۔ پس اُس شخص کی مثال (یعنی اس کے خرچ کرینے کی)
صاف چٹان یا پتھر کی ہے، جس پر ٹٹی ہو پس پہنچے اس کو مرسلا دھار بارش
اور چھوڑ دے۔ اس کو باطل خالی اور صاف۔ یہ لوگ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں

ضائع ہوتا ہے۔ ریاکار نہ صرف اجر و ثواب سے محروم رہتا ہے بلکہ الٹا گناہ گار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُس نے اللہ کی رضا کے لیے خرچ نہیں کیا۔ بلکہ شہرت اور نیکی نامی کی خاطر کیا ہے۔ حدیث شریفین میں آتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ریاکار کو فرمائے گا۔ جاؤ تمہارے لیے میرے پاس کوئی اجر نہیں۔ تم ایسے صدقہ کا اجر الٰہی سے لو۔ جن کی خوشنودی کی خاطر صدقہ کیا تھا۔ کیونکہ انا اغنی الشیء کمیں شریحوں سے پاک ہوں میرا کوئی ہمسر نہیں۔ اسی لیے ریا کو شرک اصغر کہا گیا ہے۔ شرک کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں ریا یکی قسم کا شرک شمار ہوتا ہے۔

فرمایا ایک تو ایسا شخص دکھائے کے لیے خرچ کرتا ہے اور دوسرے کو کہ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر یقین بھی نہیں رکھتا۔ اگر اُسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی قدرت کاملہ اور بعث بعد الموت کا یقین ہوتا۔ تو پھر دوسروں کو دکھائے کے لیے نیکی کا کام نہ کرتا محض رضا الٰہی کے لیے اپنا مال خرچ کرتا۔

چٹان کی مثال
فرمایا وَمِثْلُهُ كَمِثْلِ صَفْوَانَ عَلِيدٍ سُكَّاجٍ رِیَاكَار کی مثال اس چٹان کی سی ہے۔ جس پر مٹی پڑی ہو۔ اور بظاہر یہ نظر آئے کہ اگر اس مٹی میں سچا بودیجا تو فصل اُگ گئے گی۔ مگر حقیقت میں وہ مٹی نہیں ہوتی بلکہ سخت اور صاف چٹان پر مٹی کی ترجمی ہوتی ہے۔ فَاصَابِلُهُ وَكِبَلٌ؟ جب اُس پر زور کا مینہ برسا، تیز بارش ہوئی فَتَرَكَهُ صَلْدًا تو مٹی بڑ گئی اور صاف چٹان باقی رہ گئی۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح چٹان پر بوسے گئے بیج سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ریاکاری میں خرچ کیے گئے مال کا کچھ بدلہ نہیں ملے گا۔ جو بھی صدقہ احسان جتلائے، ایذا پہنچانے یا ریاکاری کے لیے دیا جائے گا وہ باطل ہو جائے گا فرمایا لَا تَجْعَلْهُ مَرْدُوكَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا اے لوگ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں ہونگے جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یعنی جو صدقہ و خیرات کیا ہے۔ کیونکہ اس میں ریاکاری کا عنصر شامل ہے لہذا انہیں اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔

کافر راہنما
سے شروع

فرمایا **وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ** اللہ تعالیٰ کافروں کی راہنمائی نہیں کرتا۔ جو لوگ بظاہر نیکی کا کام کرتے ہیں۔ دھڑا دھڑال خرچ کر رہے ہیں۔ مگر نیت میں خرابی ہے۔ کوئی احسان مبتلا رہا ہے۔ کوئی ایذا پہنچا رہا ہے۔ اور کوئی محض ذاتی شہرت کی خاطر خرچ کر رہا ہے۔ تو ایسے لوگ ہمیشہ غلط راستے پر بھٹکتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی راہِ راست کی طرف راہنمائی نہیں فرمائیں گے۔ یہ ان کے لیے سزا کے طور پر ہے۔ ورنہ اگر ان میں ذرہ بھی نیک نیتی موجود ہو، تو اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف فرمائے۔ مگر جب تک یہ لوگ اپنی بُری حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ کھنڈا شرک اور فسق و فجور پر نادم ہو کر اس کو ترک نہیں کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے خود صراطِ مستقیم کی راہنمائی طلب نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب نہیں کئے گا۔

رضا الہی کے
لیے خرچ

ریا کاری کے طور پر خرچ کرنے کی وضاحت کے بعد اب تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ** اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی رضا کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رضا الہی کا حصول بہت بڑی نعمت ہے۔ جس سے اللہ راضی ہو گیا۔ اسے سب کچھ مل گیا۔ اور جس کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا۔ وہ ہر چیز سے محروم ہو گیا، تو فرمایا جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں **وَيُثَبِّتُ لَهُمْ اَنْفُسَهُمْ** اور ان کا دوسرا مقصد اپنے نفسوں کو ثابت رکھنا ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ ان کا مقصد اصلاحِ نفس بھی ہوتا ہے۔ تاکہ دلِ النفاق فی سبیل اللہ اور نیکی کے دوسرے کاموں پر ثابت قدم رہے۔ اور ان کے دلوں سے بھل کا مادہ دور ہو کر ان میں فیاضی کا مادہ پیدا ہو جائے۔ فرمایا ایسے لوگوں کی مثال **كَمَثَلِ جَنَّةٍ اَوْ بَيْتٍ** اُس باغ جیسی ہے جو اور نیکی جگہ پر واقع ہو **اَوْ بَيْتٍ اَوْ بَيْتٍ** جب اس باغ پر زور دربارش ہو، **فَاَنْتَ اَكْلُهَا ضِعْفَيْنِ** تو وہ دگنا پھل دے۔ **فَاِنْ لَّمْ**

يُصِبُّهَا وَابِلٌ فَطُلٌّ اور اگر تیز بارش نہ ہو تو اس کے لیے معمولی بارش جیسے اوس، بھی کافی ہو۔ بہترین کلام فرماتے ہیں۔ یہاں پر تیز بارش سے مراد یہ ہے۔ کہ کوئی شخص فیاضی کا خوب مظاہرہ کرتا ہے۔ اور اللہ کے راستے میں کھل کر خرچ کرتا ہے۔ تو اس مثال کے مطابق وہ کئی گنا زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ اور معمولی بارش یعنی معمولی مقدار میں خرچ کرتا ہے۔ تو اس کی کامیابی کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کی نیت درست ہو، احسان، ایذا اور ریاکاری سے پاک ہو۔ نیت بمنزلہ زمین کے ہے۔ اگر زمین نفیز ہے یعنی نیت درست ہے۔ تو تھوڑا خرچ کرنا بھی اس کے لیے مفید ہوگا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے۔ أَخْلَصَ فِي دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلٌ مِنَ الْعَمَلِ اپنے دین میں اخلاص پیدا کر لو، تو تھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا۔ لہذا انہی کے ہر کام میں رضا النی جو شہرہ پیش نظر ہونی چاہیے، قبولیت کا یہی معیار ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھ رہا ہے۔ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں۔ تمہارے دلوں کے حالات اور نیت سے واقف ہے۔ وہ تمہارے اخلاص کے درجے کو جانتا ہے۔ اُس سے کوئی چیز اوچھل نہیں لہذا ہر کام کرتے وقت اپنی نیت کو درست کر لو۔

کسی مترق نعمت کے ضائع ہو جانے پر کس قدر پریشانی ہوتی ہے۔ اس کی باغ کی مثال وضاحت چٹان والی مثال میں ہو چکی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اس قسم کی ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں۔ جس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت پر ہی انسان کا انحصار ہو۔ اور وہ ضائع ہو جائے تو انسان کو کس قدر دکھ ہوتا ہے۔ اور اس کی امیدوں پر کس طرح پانی پھر جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص نیکی کا کام کرنے کے باوجود بعض وجوہ کی بنا پر اس کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ اَلْيَوْمَ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَجْمٍ وَاعْتَابَ يُخْرِجُ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ کیا تم میں سے کوئی شخص

یہ بات پسند کرتا ہے۔ کہ اس کے پاس کھجوروں اور انجوروں کا باغ ہو۔ جس کے سامنے نہریں بہتی ہوں لَٰهُ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ اس باغ میں ہر قسم کے پھل موجود ہوں وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ اور باغ کا مالک بڑھاپے کی عمر میں ہو۔ وَلَٰكِنْ ذَرِيَّتُهُ ضَعْفَاءُ اور اس کی اولاد کمزور ہو۔ یعنی ان کے لیے کوئی اور ذریعہ معاش بھی نہ ہو۔ تو ایسی صورت میں فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَلَقَتْ باغ کسی بجولے کی لپیٹ میں آجائے جس کے اندر آگ ہو جو باغ کو جلا کر خاک کر ڈالے۔ تو زرا اندازہ کیجئے، ایسی صورت میں اُس باغ کے مالک کی کیا حالت ہوگی۔ اس کا ایک ہی ذریعہ معاش تھا۔ یہ باغ ہی اس کی کل پونجی تھی۔ جس پر اس کا اور اس کی اولاد کا انحصار تھا۔ جب یہ ہی جل کر خاکستر ہو گیا۔ تو وہ کس طرح ہر چیز سے محروم ہو گیا۔

فرمایا احسان جتلانے والے، ایذا پہنچانے والے یا ریاکاری کے لیے خرچ کھنے والے کی حالت بھی قیامت کے دن ایسی ہوگی۔ جس طرح وہ باغ اپنے مالک کا کھجورنی کا سہارا تھا۔ اسی طرح یہ شخص اپنے خرچ کردہ مال کے اجر و ثواب کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ مگر جب قیامت کا دن ہو گا۔ تو ایسا شخص اسی طرح ثواب سے محروم ہو جائے گا۔ جس طرح باغ کا مالک باغ کے جل جانے کے بعد اس کے ثمرات سے محروم ہو گیا، قیامت کے دن ایسا شخص ایک محتاج اور بالکل قلاش کے طور پر پریں بھپسے گا مگر اس کو فائدہ پہنچانے والی کوئی چیز اس کے پاس نہ ہوگی۔

فرمایا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰلَٰتِہٖ اِسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام پر اٹھاتا تھا اُسے پاس کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَتَلَحَّظَكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ اُنکر تم غور و فکر کر سکو۔ اچھی اور بُری چیزیں امتیاز کر سکو لہذا آج صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاؤ تاکہ کل قیامت کو پریشانی سے بچ جاؤ۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد و ہفدہ (۱۱۷)

آیت ۲۶۷ تا ۲۶۸

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا
 أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ
 تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغِشُّوا فِيهِ وُءَاكِلُوا
 أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿۲۶۷﴾ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ
 وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً
 مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۶۸﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو! وہ پاک چیزیں خرچ کرو جو تم نے کائی ہیں۔ اور اس
 میں سے بھی جو تم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔ اور ردی چیز کا قصد نہ کرو کہ تم اس
 سے خرچ کرتے ہو۔ اور خود اس سے لینے والے نہیں، سوائے اس کے کہ تم اس میں
 چشم لپٹتی کرو۔ اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بے پروا ہے اور تعریفیوں والا ہے ﴿۲۶۷﴾
 شیطان تم کو فقر کا وعدہ دیتا ہے۔ اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
 تم کو اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا
 اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶۸﴾

صدقات کی قبولیت کے متعلق تین شرائط کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کہ
 کسی کو خیرات سے کر نہ تو اس پر احسان جتلا یا جائے۔ نہ اسے تکلیف پہنچائی جائے
 اور نہ خرچ کرنے میں ریاکاری کا عنصر شامل ہو، یعنی خالص نیک نیتی کے ساتھ
 رضائے الہی مقصود ہو۔ اگر یہ چیزیں موجود ہوں گی، تو صدقہ باطل ہو جائے گا۔
 اور مینے والا گنہگار ہو کر واپس پڑ جائے گا۔ آج کے درس میں قبولیت کی چوتھی
 شرط مال کی پاکیزگی کا بیان ہے۔

قبولیت کی
جو حقیقی شرط
پاکیزگی مال

ارشاد ہوتا ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ**
اے ایمان والو! خرچ کرو پاک اور سٹھری چیزیں جو تم نے کمائی ہیں۔ گویا قبولیت صدقہ
کے لیے یہ بھی ایک شرط ہے۔ کہ صاف سٹھری اور بہتر چیز اللہ کے راستے میں دی
جائے۔ مفسرین کرام نے طيبات کی تفصیل میں دو چیزیں بیان کی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے
کہ جو مال فی سبیل اللہ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ حلال ہو۔ جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا
ہو۔ حرام مال سے ادا کردہ صدقہ قابل قبول نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص
چوری، ڈاکہ یا رشوت کا مال صدقہ کرتا ہے تو وہ بارگاہِ ہندوی میں کیسے مقبول ہو
گا۔ بلکہ ایسا کرنے سے انسان الٹا گندگار ہوگا۔ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ
جو شخص حرام کمائی کی خوراک کھائے گا یا لباس پہنے گا۔ نہ اُس کی عبادت قبول ہوگی
اور نہ اُس کا صدقہ خیرات قبول ہوگا۔ اور اگر ایسا شخص مر گیا اور اپنے پیچھے مال چھوڑ گیا
تو وہی مال اس کے لیے جہنم کا زادہ ہوگا۔ بعض چیزیں تو شرعاً طعی حرام ہیں اور
بعض مشتبہ ہوتی ہیں۔ مشتبہ مال کی خیرات بھی درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ واضح
حکم موجود ہے: **كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْزَاقِ حَلَالًا وَطَيِّبًا** یعنی حلال اور پاکیزہ
چیزیں کھاؤ۔ حرام سے پرہیز کرو۔

طیب کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز بھی صدقہ میں دی جا رہی ہے۔ وہ اعلیٰ
اور بہتر ہو۔ نہ کہ نجی اور ردوی چیز۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اچھی چیز اپنے لیے رکھ
لی جائے اور کم تر چیز زکوٰۃ و صدقات میں دی جائے۔ یہ بھی مناسب نہیں۔ حدیث
شریف میں آتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں۔ جو کھجور کے اچھے گچھے اپنے واسطے
محفوظ کر لیتے ہیں اور کمتر گچھے اصحابِ صدقہ کے لیے لٹکا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے ایسی تقسیم سے منع فرمایا ہے۔ جب تم خود ردوی چیز کو پسند نہیں کرتے تو
اللہ تعالیٰ اُسے کیسے پسند کریگا۔ لہذا زکوٰۃ و صدقات میں بہتر چیز دینی چاہیے۔

فرمایا، اے اہل ایمان! اُن پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو ماکسبتم
جو تم نے کمائی ہیں۔ اب کمائی کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ منجملہ اُن کے کمائی کا اولین

ذاتی کمائی
میں سے خرچ

ذریعہ انسان کی ذاتی محنت و مشقت ہے۔ کوئی تجارت کرنا ہے۔ دکاندار ہے۔ ملازم ہے۔ کارخانہ دار ہے۔

یامزدور ہے۔ یہ سب ذاتی آمدن کے ذرائع ہیں آمدن کے بعض دوسرے ذرائع ضروری ہوتے ہیں۔ جن میں انسان کی ذاتی مشقت کا دخل نہیں ہوتا، مثلاً کہیں سے ہدیہ مل گیا، وصیت کے ذریعے کوئی چیز حاصل ہوگی یا اُسے وراثت سے حصہ مل گیا۔ ان ذرائع حاصل مال بھی انسان کی ملکیت ہوتا ہے۔ تو پاکیزہ چیزیں خرچ کرنے کا قانون ان تمام ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی پر ہوگا۔ لہذا حکم ہوا ہے کہ تم جس حلال مال سے بھی خرچ کرنا چاہو، اچھی اور بہتر چیز دو۔ اللہ کے راستے میں کم تر چیز بینے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے گزہ چکا ہے: "أَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ" اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔ جب سائے کا سارا مال اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ تو پھر اُنکی کے نام پر اچھی سے اچھی چیز دینی چاہیے۔ نہ کہ گھٹیا چیز۔ کیونکہ بینے والا تو وہ خود ہی ہے براہِ راست خود محنت کر کے کمانے کے علاوہ ایک ذریعہ آمدنی زرعی پیداوار

زرعی پیداوار
میں سے خرچ

بھی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں سے بھی خرچ کرو وَمِمَّا
اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنْ الْأَرْضِ جُزْءًا لِيَرْضَوْهُ لِيَذُرَ فِيهِ يَأْكُلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الشُّعْبَ الَّذِي رَزَقْتَهُ مِنْهَا فَاُولَٰئِكَ سَوْفَ يُعْطَوْنَ اَمْثَلُ الَّذِي رَزَقْتَهُمْ اَوَّلًا وَلَٰكِنْ كَثِيرٌ مِّنْ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ
پیداوار میں ہر قسم کا غلہ مثلاً گندم، جو، چاول، مکئی، باجرہ اور دالیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا پھل اور سبزیاں بھی زرعی پیداوار ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کتنا خرچ کیا جائے۔ تو سب سے پہلے جو کچھ فرض ہے اُتو ادا ہونا چاہیے، جس طرح تجارت وغیرہ کے مال میں کل مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس طرح زرعی پیداوار سے عشر یعنی دسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا فرض ہے۔ البتہ اس مال کے دو حصے ہیں۔ باری زمین یعنی جو زمین مالک کی مشقت کے بغیر سیرا ہوتی ہے۔ اس میں سے دسواں حصہ اور جو نہری یا چاہی زمین ہے۔ جسے مالک خود محنت کر کے پانی بہم پہنچاتا ہے، اس میں سے بیسواں حصہ نکالنا فرض ہے البتہ بعض خود رو چیزوں جیسے گھاس، لکڑیاں اور کانے، ان تین چیزوں پر عشر نہیں

ہے۔ یہ معاف ہیں اگر یہ بیڑی خود کاشت کی جائیں۔ چائے کے لیے گھاس وغیرہ خود بولی جاتے، انکڑی کے لیے درخت لگائیں یا کانے کی کاشت کی جائے، تو پھر ان پر عشر ادا کرنا ہوگا۔ امام ابو حنیفہ کا یہ فتویٰ ہے، عشر کی ادائیگی تو فرض ہے۔ یہ تو لازمی ہے اس کے علاوہ اگر کوئی مزید خرچ کرے گا۔ تو وہ نازل میں شمار ہوگا۔ اور جب جبر و ثواب ہوگا۔

یہاں پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حضور علیہ السلام کی حدیث ہے۔ لَيْسَ فِي الْخَضِرَوَاتِ مَدَقَّةٌ یعنی سبز لویوں میں صدقہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی زرعی پیداوار ہے۔ اور زمین ہی سے نکلتی ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سبز لویوں پر عشر بالکل معاف ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سبز لویوں کا عشر سرکاری خزانے میں جمع کرانے کی ضرورت نہیں بلکہ خود اپنی صوابدید کے مطابق مستحقین میں تقسیم کر دے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ سبز باں جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے سرکاری انتظام میں پہنچتے پہنچتے اور پھر تقسیم ہونے تک اس کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اس لیے سبزی عشر یعنی دسواں یا بیسواں حصہ مالک کو خود تقسیم کر دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر سبزی کے دس گٹھے حاصل ہوئے ہیں۔ تو ان میں سے ایک اللہ کی راہ میں دے دے۔ یا اگر زمین چاہی یا نہری ہے۔ تو بیس گٹھوں میں سے ایک ادا کر دے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہی مسلک قرآن و سنت سے موافقت رکھتا ہے۔

زرعی پیداوار کے نصاب کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فرماتے کہ دوسو درہم سے کم مالیت کی زرعی پیداوار پر عشر نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث سے ثابت ہے کہ پانچ دسویں سے کم انج پر عشر نہیں۔ اور پانچ دسویں سے کم مالیت کا نصاب ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تجارتی مال سے متعلق ہے۔ جس شخص کے پاس تجارت کی غرض سے پانچ دسویں سے کم انج ہے وہ زکوٰۃ نہ دے کیونکہ یہ نصاب کو نہیں پہنچتا۔ البتہ زرعی پیداوار کے متعلق فرماتے

ہیں۔ کہ زرعی پیداوار قلیل ہو یا کثیر اس پر عشر ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق حدیث میں واضح الفاظ آئے ہیں۔ زمین کے مالک کو زرعی پیداوار کی کم سے کم مقدار پر بھی عشر ادا کرنا ہوگا۔ البتہ یہ سوال باقی رہتا ہے۔ کہ عشر کون ادا کرے، مالک اراضی یا کاشتکار یا دونوں۔ بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ عشر کی ادائیگی کاشتکار پر لازم آتی ہے۔ مالک اراضی پر نہیں۔ تاہم راجح قول یہ ہے۔ کہ عشر کی ادائیگی کے حصہ رسد ہی دونوں ذمہ دار ہیں۔ انہیں چاہیے کہ کل پیداوار سے پہلے عشر نکالیں اور باقی انج وغیرہ آپس میں تقسیم کریں۔

زمین کی پیداوار کا ایک اور ذریعہ معدنیات ہیں۔ عام زمین میں اور پہاڑوں میں کانیں پائی جاتی ہیں جن سے تانبہ، نمک، کوئلہ، لوہا، تونا، چاندی، تیل وغیرہ نکلتے ہیں ان تمام چیزوں کی زکوٰۃ خمس یعنی کل آمدنی کا پانچواں حصہ ہے۔ چونکہ ان اشیاء کی پیداوار کے لیے عموماً محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ بیج نہ پانی نہ نسلانی وغیرہ اس لیے اس کی کل آمدنی کا پانچواں حصہ یعنی بیس فیصد ادا کرنا ضروری ہے۔ البتہ ایک مسئلہ فقہائے کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ کہ ان کانوں کا مالک کون ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں۔ کہ کانوں کا مالک وہ شخص ہے جس کی اراضی سے معدنیات برآمد ہو، لہذا خمس بھی وہی ادا کرے گا۔ اگر یہ معدنیات کسی عام جنگل، صحرا یا سمندر سے نکلیں تو ان کی مالک حکومت ہوگی البتہ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ کان خواہ کیس بھی نکلے، اس کی مالک حکومت ہے۔ امام مالک صاحب انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

بہر حال فرمایا کہ اگر کھانی تمہاری ذاتی محنت و شغلت کی ہے۔ تو پھر اس میں سے حلال اور طیب چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور جو زمین کی پیداوار ہے اس میں سے بھی اچھی چیز خرچ کرو، وَلَا تَبْذُرُوا خَبِيثَاتِہُمْ تَتَّبِعُونَ اور ردی یا کم تر چیز کو خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ خبیث سے مراد ردی یا گھٹیا چیز ہے۔ اور اس کا اطلاق ناپاک چیز پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں صاف

خبیث مال
قابل قبول نہیں

تھری چیز دینی چاہیے۔ کیونکہ وَلَسْتُمْ بِالْخِذْيَةِ گھٹیا چیز جب تم خود اپنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایسی چیز کیوں دیتے ہو۔ گھٹیا چیز قبول کرنے کی ایک صورت ہے کہ اَلَا اَنْ تَغْضُوْا فِيْهِ تَمَّ خُودِشُم پوٹی کر لو۔ مگر یہ تم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ لہذا اللہ کی راہ میں بھی اچھی سے اچھی خرچ کرو۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَنْ نَّتَالُوْا الْبَسْرَ حَتّٰی تَنْفَقُوْا مِمَّا بَيْنُكُمْ تَمَّ ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے اچھی اوصاف تھری اور بہتر چیز ہی پسندیدہ ہوتی ہے۔ لہذا بہتر چیز ہی فی سبیل اللہ بھی ادا کرو۔

پاکیزہ چیز کے سلسلہ میں ترمذی شریعت کی حدیث ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا تُقْبَلُ صَلَوةٌ بِغَيْرِ طَهْوٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ یعنی طہارت کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا۔ اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا۔ لہذا جس مال کی زکوٰۃ، صدقات، خیرات وغیرہ دی جا رہی ہے اس کا حلال اور طیب ہونا بھی ضروری ہے۔ وَلَطَمُوْا اَچھے طریقے سے چالو کرو اِنَّ اللّٰهَ غَفِيْرٌ حَمِيْدٌ کہ اللہ تعالیٰ — بے پردا — اور بے نیاز ہے۔ اس کو تمہارے صدقات و خیرات کی کوئی ضرورت نہیں یہ تو تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے تاکہ تم اس سے آخرت میں مستفید ہو سکو۔ یہ دنیا میں قوم کے عز و مساکین کی اعانت کا ایک ذریعہ ہے۔ نیز تمہارے اپنے اخلاق بھی اس کی وجہ سے عالی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حمید یعنی تمام خوبیوں کا مالک خود ہے تم اچھا کام کرو یا بُرا کرو۔ وہ بے نیاز ہے۔ تمہارے اچھے اعمال نہ اس کی خدائی میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ

تمہارے بُرے اعمال اس کی خدائی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اس کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے تمہیں انعام سے نوازا ہے۔

شیطان کا
ہنگامہ

فرمایا، دیکھنا اس حملے میں شیطان کے ہنگامے میں نہ آجانا۔ شیطان کی یہ ہمیشہ
کوشش ہوتی ہے کہ وہ طرح طرح کے دوسرے ڈال کر انسان کو نیک عمل سے روکنے
کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں الشیطن یحیدکم عن الفقر
شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شیطان انسان پر اس طرح
حملہ آور ہوتا ہے کہ اگر مال فقور ہے تو وہ ہنگامہ کہ اگر یہ مال صدقات میں دیدیا
تو پھر تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ تم غفل ہو کر دوسروں کے محتاج ہو جاؤ گے۔
جب اس قسم کا خیال آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شیطانی دوسرہ ہے۔ اگر مال
قلیل بھی ہے۔ تو اس میں سے کچھ نہ کچھ دے دو، اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت دیگا۔
فرمایا وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ أَگَر خراج کر دو گے تو اللہ تعالیٰ
اس کی جگہ کسی دوسرے ذریعے مال دے دیگا۔ لہذا بخل نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ فراخ دل کا
مظاہرہ کرنا چاہیے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو دافرا مال دیا ہے۔ تو پھر شیطان دوسرے طریقے
سے حملہ کرتا ہے وَيَا مُرْكُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وہ تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا
ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مالدار آدمی کو فحاشی کے کاموں کی طرف لگا دیتا ہے کہ
فکر نہ کرو۔ تمہارے پاس بہت مال ہے۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو۔
دنیا میں بار بار نہیں آتا۔ لہذا کھاؤ پیو، عیش کرو۔ یا پھر اس کا مال کھیل تماشے اور فضول
رسم و رواج پر خرچ کرتا ہے۔ کہیں دھوم دھام سے شادی ہو رہی ہے۔ سانگہ
منائی جا رہی ہے۔ باجے بجاتے جا رہے ہیں۔ چراغاں کیا جا رہا ہے۔ کہیں عرس
منائے جا رہے ہیں۔ اور لاکھوں روپیہ ان فضول رسم و رواج پر ضائع کیا جا رہا ہے
یہ سب شیطان کے ہنگامے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ

فرمایا اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ تمہیں ابدی نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے
وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت
اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر اس کے حکم کے مطابق اس کے راستے میں خرچ

کر دیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرما دیگا۔ دنیا میں بھی برکت عطا کرے گا۔ اور آخرت میں اپنے فضل سے جنت میں داخل کر دیگا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ لہذا شیطان کے بہکائے میں نہ آنا بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین کر کے اس کے احکام کی بجا آوری کرو۔ اور دائمی علاج پا جاؤ۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑا ہی رحمت والا ہے۔ اس کے خزانے بہت وسیع ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں ٹھاتا بلکہ انہیں دگنا چرگنا عطا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے۔ وہ علیم بذات الصدور بھی ہے تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔ جس قدر اخلاص تمہارے دلوں میں موجود ہو گا اللہ تعالیٰ اس کے مطابق بڑھا چڑھا کر تمہیں عطا کریں گے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ

الْبَقَرَةِ ۲

درس پچھد ہشودہ (۱۱۸)

آیت ۲۶۹ تا ۲۷۰

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
 أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَا
 أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ
 وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت عنایت فرماتا ہے اور جس کو حکمت
 دی گئی، اُسے بہت زیادہ بھلائی عطا کی گئی۔ اور نہیں نصیحت قبول کرنے مگر وہ
 لوگ جو عقل والے ہیں ﴿۲۶۹﴾ اور تم جو بھی خرچ کرو صدقہ و خیرات یا کوئی نذر مانو نذر ماننا
 تو بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ اور ظلم کرنے والوں کے لیے کوئی مددگار نہیں ﴿۲۷۰﴾
 گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کی قبولیت سے متعلق چار شرائط
 کا ذکر فرمایا ہے۔ جن میں خیرات دیکر احسان نہ جملنا، ایذا نہ پہنچانا، اربا کاری سے اجتناب
 اور پاکیزگی مال شامل ہیں۔ باقی شرائط کا ذکر اگلے دروس میں آئے گا۔ یہاں درمیان میں
 اللہ تعالیٰ نے حکمت کی تشریح بیان کی ہے۔ اور اُسے خیر کثیر سے تعبیر کیا ہے۔
 اس میں نذر ماننے کے متعلق بیان بھی ہے۔ کہ یہ کس حد تک جائز ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔ یُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ اللہ تعالیٰ جسے چاہے
 حکمت عطا کرتا ہے۔ حکمت کا مادہ احکام سے نکلا ہے، جو پختگی کے معنی میں
 استعمال ہوتا ہے۔ لہذا حکمت سے مراد وہ چیز ہے۔ جو پختہ ہو۔ اور پھر صدقہ کے ساتھ
 اس کے مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ حکمت کا عام معنی فہم اور سمجھ کیا جاتا ہے
 بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں اَلْوَلْعُ النَّافِعُ الْمُؤَدِّي إِلَى الْعَمَلِ یعنی حکمت
 ایسے علم کو کہا جاتا ہے، جو مفید ہو اور انسان کو عمل تک پہنچائے۔
 امام مالکؒ حکمت کا معنی سنت کرتے ہیں۔ حکیم خدا تعالیٰ کی صفت بھی ہے

اور قرآن کریم کو بھی حکمت کہا گیا ہے۔ اور حضور علیہ السلام کی سنت مبارکہ کو بھی حکمت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی سمجھ دانا کی باتیں بھی حکمت میں شمار ہوتی ہیں۔

حضرت لقمانؑ کے نام پر قرآن پاک میں سورۃ موجود ہے۔ آپ نبی نہیں تھے، بلکہ حکیم تھے عربی میں حکیم اُس شخص کو کہتے ہیں مَن اَلْتَقَنَ الْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جو علم اور عمل دونوں میں سنبھت ہو۔ علاج معالجہ کرنے والے کو عربی زبان میں حکیم نہیں بلکہ طبیب کہتے ہیں۔ بہر حال حکمت کا اعلیٰ ترین درجہ انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عام مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت و دانائی میں حصہ عطا کرتا ہے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی سمجھ بہت بڑی حکمت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کرے۔ حضرت علیؑ کی روایت میں آیا ہے حضور علیہ السلام نے ہمیں عام مسلمانوں سے الگ کوئی خاص چیز نہیں دی۔ اَوْفَهُمْ اَوْفِيكَ رَجُلٌ اَمَّا اللّٰهُ فَاَلَا اللّٰهُ عَالِمُ نِعْمَتِهِ نے قرآن پاک کی سمجھ دے دی ہو، تو اُس سے انکار نہیں کرتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ اور خاص طور پر اُسے دین کا فہم اور سمجھ حکمت سے تو مذہبی شریعت کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو دو چیزوں سے محروم رکھا ہے، ایک اچھا اخلاق اور دوسرے دین کی سمجھ۔ بخاری شریف کی روایت میں حضور کا فرمان ہے مَن يُشِدَّ اللّٰهُ لِبَلَدٍ خَيْرًا يَعْقِبْهُ فِي الدِّينِ اللّٰهُ تَعَالٰی جس کے بارے میں بہتری کا ارادہ فرماتا ہے۔ اُسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔ پھر جب اس سمجھ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تو ایسا شخص ہی حکیم کہلاتا ہے۔

اس زمانہ میں حکیم کے ہم معنی الفاظ دانشور، علامہ یا ڈاکٹر (پڑھنے والے) وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر یہ استعمال درست نہیں ہے۔ حکیم کے لیے ضروری ہے کہ علم کی تکمیل کے ساتھ اس پر عمل بھی ہو۔ موجودہ دور میں بے شک بڑی بڑی ڈگریاں تو حاصل کر لی جاتی ہیں۔ مگر وہ عمل کہاں ہے جو حکمت کی اصل روح ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ

حکمت کی جڑ اور بنیاد خوفِ الہی ہے۔ حکمِ وہی ہر کتاب ہے۔ جس کے دل میں خوفِ خدا ہو۔ وگرنہ محض علم حاصل کرنے سے کوئی شخص حکیم نہیں ہو سکتا۔

گزشتہ درس میں گزر چکا ہے کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ شیطان انسان کو یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ دیکھو اپنے مال کو خرچ نہ کرنا۔ اگر خرچ کر دیا تو تم مفلس ہو جاؤ گے۔ تمہارے بیوی بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ تمہارا بڑا بچہ کا سہارا ختم ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ اس شیطانی دوسرے وہی شخص بچ سکتا ہے جسے قرآن پاک کا فہم ہوگا۔ فہم قرآنی دلائل شخص ہی بچے گا کہ الخاق فی سبیل اللہ کما نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ اس پر بکرت لیجے اسی چیز کا نام حکمت ہے اسی طرح گو حکمت الخاق سبیل اللہ پر انفرادی نہیں ہوگا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ ہر آدمی حکمت حاصل نہیں کر سکتا۔ البتہ جس شخص میں جس قدر حکمت کے حصول کی استعداد ہوتی ہے۔ اس کے مطابق وہ اپنا حصہ وصول کر لیتا ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ نکلتا ہے وَمَنْ حَقَّقَتْ الْيُكْمَةَ فَقَدْ أَفْوَيْ حَقِّقْنَا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی، اُسے خیر کثیر سے نوازا گیا۔ گویا حکمت یعنی فہم قرآن یا فہم دین تمام خوبیوں کا منبع ہے۔ اور فہم علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اور علم کی روشنی دینی مدارس پھیلا ہے ہیں۔ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تقریباً سو سو سال سے مصروف کار ہے۔ اس نے ایک صدی کے عرصہ میں چالیس ہزار علماء تیار کیے ہیں، جو صحیح معنوں میں دین کا فہم رکھنے والے لوگ ہیں۔ انہوں نے دنیا کے کونے کونے میں علم دین کی شمع روشن کی ہے۔ حضرت علیؑ اپنے بیٹوں کو نصیحت فرما رہے تھے۔ انہوں نے شکوے کے طور پر فرمایا بہت سے آدمی شکل و صورت میں انسان نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں وہ جانوروں جیسے ہیں۔ جب مال میں کمی واقع ہوتی ہے۔ تو فوراً سمجھ جاتے ہیں مگر دین سائے کا سارا بھی برباد ہو جاتے تو انہیں کچھ پروا نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عقل دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عقل وہ ہے جو ماہر معاشیات ہے۔ معاش میں ذرہ بھر کمی ملیٹی آئے، تو فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ مگر دین

کے معاملے میں بڑے سے بڑا نقصان بھی انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں، بیرسٹروں اور دانش ورروں میں یہی خرابی پائی جاتی ہے۔ کہ ان کی عقل معاش تو اعلیٰ سمجھے کا ہے۔ مگر وہ معاد کے معاملے میں بالکل کوڑے ہیں۔ حقیقت میں کامل شخص وہ ہے۔ جو قیامت اور اپنی بازگشت کے مقام کو سمجھتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے صدقات و خیرات کے ضمن میں یہ آیات نازل فرمیں۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کعب این خیر را بینی بگھر
 اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے۔ یہ جس جگہ بھی ملے اس کو اختیار کر لو، توفیق شریف کی روایت میں آئے ہے صکلمۃ الحکمة ضالۃ المؤمن حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اسے جہاں پاتا ہے۔ حاصل کر لیتا ہے۔ حکمت ہی ایسی چیز ہے۔ جو مومن کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ لہذا مومن ہمیشہ اس کا متلاشی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی اعلیٰ عہدہ منصب یا کسی دوسری قیمتی سے قیمتی چیز کو خیر کثیر سے تعبیر نہیں کیا۔ مگر یہ لقب صرف حکمت کو عطا ہوا، کیونکہ حکمت تمام خوبیوں کا منبع ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ حکمت کی انتہا یہ ہے۔ کہ انسان افضل الاشیا کو افضل العلوم سے معلوم کرے۔ افضل الاشیا خدا تعالیٰ کی ذات، وحدانیت اور اس کی صفات ہیں۔ لہذا جو شخص علم کے ذریعے اس راہ کو پائے گا، وہی صاحب حکمت ہو گا۔ اور پھر علم بھی محض زبانی کلامی نہ ہو، بلکہ اس میں دل کی حضوری اور عقل کا کمال شامل ہو۔ لہذا جسے حکمت عطا کی گئی اُسے گریبا بہت بہتری ملے دی گئی۔ اور یہی چیز منبع صفات اور ہر چیز کی جڑ اور بنیاد ہے۔

فرمایا وَصَايَ ذَكَرَ لَّا اَوْ لَمَّا لَآ لَبَّابٍ يَادِرْ كَهْ نَصِيحَتِ قَبُولِ نَسِي
 کرتے۔ مگر وہ جو عقل ملے ہیں۔ اور پھر عقل کو صحیح طور پر استعمال بھی کریں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلْقُسُورُ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَكْفُلُوْنَ
 وہ لوگ ہرے اور گونگے ہیں۔ جو عقل کو درست طریقے سے استعمال نہیں کرتے

کافروں کی مثال اللہ نے بیان فرمائی کہ وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں اُولَٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ
بَلْ هُمْ اَضَلُّ لَمْ يَكُونُوا جَانور بھی بعض باتیں سمجھتے ہیں، مگر جو لوگ جانوروں
سے بھی بدتر ہیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ فرمایا نصیحت کہ بھی وہی شخص قبول کرتا
ہے جس کے انذار دانی اور عقل ہوگی۔ درحقیقت شخص کو نصیحت سے کچھ فائدہ
نہیں پہنچتا۔

الْاِنْفَاقُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ہی کے ضمن میں یہاں پر نذر کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے۔ - مذہب نذر
وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مَنًّا اَوْ كُنِيَ خَيْرٍ مِّمَّا يَرْجُو صَدَقَةٌ
وخیرات ہی ہے۔ اَوْ نَذَرْتُمْ مَنًّا مَنَّا یا کوئی نذر مانا کہ اللہ یَعْلَمُہُ
اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ یہاں پر نذر کو صدقہ کے مقابلے میں ذکر کیا ہے۔
مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ صدقہ و خیرات تو بلا مشروطیات میں سے
ہے۔ مگر نذر جانز ہونے کے باوجود خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں
آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نذر نہ مانا کرو، کیونکہ یہ آدمی کو تقدیر سے
نہیں بچا سکتی۔ حدیث کے الفاظ ہیں لَا یُعْصِي نَذْرًا عَنْ فَتْرٍ جو کچھ تقدیر میں ہوتا
ہے وہ بگاڑ کر رہتا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ نذر تکمیل لوگ مانتے ہیں، اور نہ فیاض آدمی
مشروط نہیں لگاتے۔ وہ تو غیر مشروط طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے سہتے ہیں۔ گریبا
نذر ماننا مشروط عبادت ہے کہ اگر میرا فلاح کام ہو گیا تو میں اتنے نوازل ادا کروں گا۔
یا روزے رکھوں گا یا اتنا صدقہ خیرات کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ
مشروط۔ - باز صحنہ والی بات ہے۔ اور پھر یہ ہے کہ جب وہ کام ہو جائے تو
نذر کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ نذر جانز ہو۔ اور اگر نذر کو پورا نہ کیا تو
انسان گنہگار ہوتا ہے۔

مذہب نصیحت حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا نَذْرَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ گناہ کے کام
میں نذر ماننا جائز نہیں۔ اور اگر ایسا کہہ ہی لیا ہے تو پھر اس کا پورا کرنا درست نہیں
بلکہ اس کو توڑ کر نذر کا کفارہ ادا کر دینا چاہیے۔ فقہ کا مسئلہ ہے الْمُنْذَرُ عِبَادَةُ

منّت بمنزلہ عبادت ہے۔ اور عبادت بدنی بھی ہو سکتی ہے اور مالی بھی۔ بدنی عبادت کی مثال نوافل یا روزے ہیں۔ اور مالی عبادت میں صدقہ خیرات یا جانور ذبح کرنا ہے اسی لیے فرمایا کہ گناہ کے کام کے لیے یہ عبادت جائزہ نہیں ہے۔ اور اگر نذر غیر اللہ کے تقرب کے لیے مانی جائے تو یہ شرک بن جاتا ہے۔ جیسا کہ ہماری فقہ کی کتابوں عالمگیری اور شامی وغیرہ میں موجود ہے فقہائے کرام نے لکھا ہے۔ کہ جو لوگ قبروں کا غلاف پکڑتے ہیں اور زندہ مانتے ہیں۔ کہ اے بزرگ! اگر میرا فلاں کام ہو گیا، تو تمہارے دربار فلاں نذرانہ پیش کروں گا، فرمایا ایسی چیز بالاجماع باطل اور حرام ہے۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر ایسی منّت مانے کہ اگر فلاں کام ہو گیا۔ تو اسی بزرگ کو ایصالِ ثواب کے لیے محتاجوں کی یہ خدمت کروں گا تو وہ الگ بات ہے۔ اور اگر بزرگ کو ہی حاجت روا سمجھ لیا تو کفر شرک میں مبتلا ہو گیا۔ اسی لیے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ محیصیت کی نذر سسرے سے نذر ہوتی ہی نہیں۔ جیسے کوئی کہے کہ فلاں کام ہونے پر دس آدمیوں کو شراب پلاؤں گا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مزاروں پر تیل چڑھانا، موم بیاں جلانا، چادر میں چڑھانا، بکھرے چڑھانا یہ سب باطل اور ناجائز منّت میں شامل ہیں۔ اور اگر ایسا کرنے سے مراد بزرگ کی قربت حاصل کرنا ہے۔ تو پھر بھی شرک میں داخل ہے۔ اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے۔ کہ خدا کے علاوہ یہ بھی ہماری حاجات پوری کرتے ہیں، تو بھی کفر ہے۔ اور اگر محض مجاوروں کو کھلانا مقصود ہے تو یہ تخصیص بھی غلط ہے۔ پینے لگی مٹلی، گاؤں شہر کے غریب و مساکین کو کھلاؤ، ان کی جائزہ ضروریات کا خیال رکھو۔ مزاروں پر تو عموماً اوباش قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر نیت درست بھی ہو، تو بھی ایسے لوگوں کو کھلانا جائزہ نہیں۔ کیونکہ وہ محلج نہیں بلکہ پیٹھ درگد اگر ہیں۔ مزاروں پر موجود انتظامی عملہ بھی کھانے پینے میں شریک ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اس کے حقدار نہیں ہوتے اگر صاحبِ نصاب ہے تو منّت کا مال تو خود منّت ماننے والا بھی نہیں کھا سکتا۔ جس طرح زکوٰۃ کے حقدار، صرف اس کے مستحقین ہیں۔ اسی طرح نذر کا مال بھی

غراب و مساکین کا حق ہے۔ لہذا نذر کا مال قبروں کے مجاوروں اور دیگر لواحقین کو کھانا کسی طور جائز نہیں۔

سابع امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر بطور نذر تو ہو جاتی ہے مگر اس کو توڑنا ضروری ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں کَفَّارَتُهُ كَفَّارَةٌ الْيَسْمِينِ اس قسم کی نذر کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرو مگر معصیت کی نذر کو پورا نہ کرو۔ نذر کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا۔ ایک غلام آزاد کرنا، یا تین روزے رکھنا۔ ہاں اگر نذر جائز ہے تو اسکو پورا کرنا چاہیئے۔ جیسے مسجد میں چٹائیاں بچھا دے۔ طالب علموں کو کھانا کھلا دے۔ اُن کی کُتُب کا بند و بست کر دے وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اَکْرَمُ جُزْءٍ نَذْرًا نَفْسًا اللّٰهُ يَعْلَمُ سِرَّهُ قَدْرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اس کو خوب جانتا ہے۔ کہ تم نے کس نیت کے ساتھ منت مانی ہے نذر جائز ہے یا ناجائز۔ تم لوگوں کو دعو کا مے سکتے ہو۔ کہ فلاں کام فلاں نیت سے کیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ تو تمہارے دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔ وہ تمہاری ظاہر اور پوشیدہ سب باتوں کو جانتا ہے۔

ظالم بے یار
مددگار ہونگے

وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ لہذا جو کوئی شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ کفر کرتا ہے۔ غیر اللہ کی منت مانتا ہے۔ مستحقین کو نظر انداز کرتا ہے۔ کسی قسم کی زیادتی کرتا ہے، حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ غرضیکہ جو بھی کوئی بڑے سے بڑا یا چھوٹے سے چھوٹا ظلم کریگا، وہ مدد کے قابل نہیں ہے۔ اس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ جو شخص نماز نہیں پڑھتا، جنبت کی حالت میں غسل نہیں کرتا، روزہ نہیں رکھتا، گواہی دینے پر ظلم کرتا ہے۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، فرائض کو ترک کرنا، کسی کو تنگ کرنا یہ سب ظلم میں شمار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا لٹو خدا ہے الظلم ظلمات یوم الْقِیَامَةِ قیامت کے روز اس دنیا میں کیا ہوا ظلم اندھیروں کی صورت

میں سامنے آئے گا اس لیے فرمایا اسدن ظلم کرنے والوں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا
 ظالم اپنے ظلم کی وجہ سے پھنسنے ہوئے ہوں گے مگر ان کی خلاصی کے لیے کوئی مدد
 نہیں پہنچے گی۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ نہ عبادت میں ظلم کا ارتکاب کرے نہ معاملات
 میں اور نہ حقوق میں غرض کسی چیز میں ظلم نہیں کرنا چاہیے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

الْبَقَّة ۲

درس یکمہ نوزدہ (۱۱۹)

آیت ۲۴۱ تا ۲۴۲

اِنْ تَبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ؕ اِنْ تُخْفُوها وَتُؤْتُوها
 الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ؕ
 وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۴۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هٰذِهِمۡ وَلٰكِنَّ
 اللّٰهَ يَهْدِيۡ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوۡا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِكُمْ
 وَمَا تُنْفِقُوۡنَ اِلَّا اَبْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوۡا مِنْ خَيْرٍ
 يُّؤْتِ الْيَتٰمٰى ؕ وَانْتُمْ لَا تَظْلِمُوۡنَ ﴿۲۴۲﴾

ترجمہ: اگر تم صدقات کو ظاہر کرو۔ تو یہ اچھی بات ہے۔ اور اگر ان کو چھپا دو
 (پوشیدہ طور پر) فقرا کو ملے دو، تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ

تم سے برائیاں دُور کرے گا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، اس کی خبر رکھتا ہے ﴿۲۴۱﴾
 آپ کے ذمے نہیں ہے ان لوگوں کو راہِ راست پر لانا۔ مگر اللہ راہِ راست پر لائے
 جس کو چاہے۔ اور جو کچھ اپنے مال سے خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے نفسوں کے
 لیے ہے۔ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کی رضا کے لیے۔ اور جو کچھ بھی تم مال
 سے خرچ کر دو گے۔ تم کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائیگا ﴿۲۴۲﴾

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں صدقاتِ خیرات
 کے متعلق سات اصول بیان کیے ہیں۔ جن میں سے چار کا ذکر گذشتہ آیات میں آچکا
 ہے۔ آج کے درس میں پانچویں بات کا بیان ہے۔ کہ صدقات و خیرات ظاہری
 طور پر بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اور باطنی پوشیدہ طور پر بھی۔ اہم حقیقہ طور پر دینا زیادہ
 بہتر ہے۔ اس کے بعد چھٹی بات کا ذکر ہے۔ کہ صدقہ و خیرات غیر مسلم کو بھی
 دیا جاسکتا ہے۔ ساتویں بات کا ذکر آئندہ درس میں آئے گا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ صدقہ خیرات سے متعلق سب سے اہم چیز دینے والے کی نیت ہے اگرچہ ان کا اثر نیت میں تو رکائی ہے کسی کو احسان جتلانے یا ایذا پہنچانے کے لیے یا ریاکاری کے طور پر دیا۔ تو صدقہ باطل ہو جائے گا۔ تاہم نیک نیت کے ساتھ ظاہر آیا باطن دونوں طرح دینا جائز ہے۔ البتہ اس کی افضلیت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ فرض صدقات یعنی زکوٰۃ اور عشر کو ظاہر کر کے دینا چاہیے۔ اور نفلی صدقات کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے۔ برخلاف اس کے امام حسن بصریؒ، امام رازیؒ، مولانا شاہ شمس الدین عظیمیؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقات کی پوشیدہ طور پر ادائیگی کو افضل فرمایا ہے۔ خواہ وہ صدقہ فرض ہو یا نفلی مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ افضلیت اس بنا پر ہے کہ خفیہ دینے سے ایک تو ریاکار کا امکان باقی نہیں رہتا دوسرے لینے والے کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بہتر قرار دیا ہے۔

بعض اوقات کسی شخص کے مال کو ظاہر نہ کرنے میں بھی مصلحت ہوتی ہے۔ اگر زکوٰۃ ظاہر کر کے دی جائے تو کل مال کا علم ہو جاتا ہے۔ لہذا اس لحاظ سے خفیہ دینا بہتر ہے۔ البتہ ظاہر کر کے دینے میں ایک مصلحت بھی ہے کہ دیکھنے والے کو بھی شوق پیدا ہو کہ وہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اگر اس نیت سے کھلے طور پر صدقہ خیرات کرے تو یہ مناسب ہوگا۔ بایں ہمہ اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خفیہ طور پر خرچ کرنا افضل ہے۔ اس کی تصدیق صحیحین کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جن سات آدمیوں کے متعلق حضور علیہ السلامؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ان کو رب العزت کے عرش کے نیچے جگہ ملے گی، ان میں سے ایک آدمی وہ ہے تَصَدَّقَ بِمِثْلِهِ حَتَّىٰ لَا تَقْلُمَ شِمَالُهُ کہ دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے محکم بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ اس قدر خفیہ طور پر خرچ کرے۔

الفرض فرمایا اِنْ تُبَدَّ وَالصَّدَقَتِ فَنِعْمًا هِيَ، اگر تم صدقات

کو ظاہر کر دینا اچھی بات ہے۔ کہ اس میں اقتدار کا پہلو نکلتا ہے۔ کہ اس کو دیکھ کر دوسرا بھی اتفاق فی سبیل اللہ کے لیے تیار ہو جائے اور اگر زکوٰۃ ادا نہیں کرنا تو کرنے لگ جائے۔ اس کے علاوہ ایسا شخص لوگوں کی طعن و تشنیع سے بھی بچ جائیگا۔ جب وہ لوگوں کے سامنے صدقہ خیرات کرے گا، تو کچھ سوس کلو انے سے بچ جائے گا۔ وَلَنْ تَخْفُوْهَا وَتُوْتُوْهَا الْفُقَرَاءُ اور اگر تم اسے چھپاؤ اور خفیہ کر دے دو۔ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تَرِيْهِ تَهْلِيْهِ لِيَسْتَرْجِعَ اَمْ لَا اَعْلَمُ کہ اس سے نہ تو ریاکاری لازم آئے گی اور نہ لینے دینے کی عزت نفس مجبور ہوگی۔ پھر صدقہ خیرات کی حکمت بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری کچھ برائیاں تم سے دور کر دیگا۔ تمہارے بعض گناہ معاف کر دیگا۔ کیونکہ سارے گناہ صدقہ سے معاف نہیں ہوتے حدیث شریف میں آتا ہے اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ صدقہ و خیرات اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔ احسان جتانے والے کے متعلق آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ ایسے شخص کو نظرِ شفقت سے نہیں دیکھے گا۔ اور عذاب الیم میں ڈالے گا۔ مگر صدقہ و خیرات اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ مسند احمد میں نبی علیہ السلام کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔ اِنَّ الصَّدَقَةَ ظِلُّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ قیامت کے دن صدقہ مؤمن کے حق میں بمنزلہ سایہ کے ہوگا۔ جب میدانِ محشر میں انتظار رہے گی تبش ہوگی اس وقت صدقہ اپنے پنے والے کے سر پر سایہ کرے گا۔ صدقہ خیرات کی اس قدر فضیلت ہے۔ اور اس کی اس قدر برکات ہیں۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ اللہ تعالیٰ کو تمہارے تمام اعمال کی خبر ہے۔ وہ خوب جانتا ہے۔ کہ تم جو کچھ کر رہے ہو۔ اس کے نتیجے کیا نیت کا فرما رہے۔ پھر جیسی نیت ہوگی۔ اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ بدلہ عطا کرے گا۔ بہر حال صدقہ سے متعلق

یہ پانچویں بات بھی آگئی۔

غیر مسلم کے
بے صدقہ

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صدقہ خیرات غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ اس ضمن میں چھٹی بات ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں حضور علیہ السلام نے صرف مسلمانوں کو صدقہ خیرات دینے کا حکم دیا تھا۔ حدیث طریف میں مختلف الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا تَصَدَّقُوا عَلَى أَهْلِ دِينِكُمْ یعنی صرف اہل دین (مسلمانوں) پر صدقہ کیا کرو۔ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے لَا تَصَدَّقُوا إِلَّا عَلَى أَهْلِ الْإِسْلَام یعنی اہل اسلام کے سوا دوسروں (غیر مسلموں) پر صدقہ نہ کیا کرو۔ اس لیے آپ کے صحابہ کرام غیر مسلموں کو صدقہ دینے سے گریز کرتے تھے۔ پھر جب سلسلہ میں کفار مکہ سے صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ تو مکہ اور مدینہ کے لیے ایک دوسرے کے مال آنے جانے لگے۔ اس دوران میں حضرت اسماءؓ کی والدہ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیوی جو کہ ابھی تک مشرک تھی مدینہ آئی۔ تو حضرت اسماءؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضور! میری ماں آئی ہے۔ وہی مشرک کتنی اور وہ مشرک ہے۔ تو کیا ایسی حالت میں میں اس سے صلہ رحمی کروں۔ وہ محتاج بھی ہے۔ کیا میں اس کو کچھ صدقہ و خیرات دے سکتی ہوں۔ آپ نے فرمایا، ہاں اجازت ہے۔ تو گویا اللہ کے رسول نے غیر مسلموں کو صدقہ خیرات دینے کی اجازت دے دی۔ لہذا ثابت ہوا کہ صدقہ کا مال غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی اجر عطا کرے گا۔ یاد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیوی ام رومانؓ نے شروع ہی سے اسلام لے آئی تھیں مگر آپ کی دوسری بیوی یعنی اسماءؓ کی والدہ عقیلہ بنت عبد العزیٰ اسلام نہیں لائی تھیں۔

البتہ زکوٰۃ اور عشر غیر مسلموں کو نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ فرض ہے۔ اور اس کے متعلق بخاری اور مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے۔ کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا، تو دیگر احکامات کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی دیا اور واضح کیا تَوَخَّذْ مِنْ أَغْنِيَاءِهِمْ فَتُرَدَّ عَلَىٰ فَقَرَاءِهِمْ

لے فقیر کبیر (فیاض)

یعنی زکوٰۃ مسلمانوں کے اختیار سے وصول کی جاگی اور انہیں کے فقرا میں تقسیم کی جائے گی۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ۔ زکوٰۃ عشر کسی غیر مسلم کو نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ناجائز اور حرام ہے۔ ہاں نفل صدقہ، صدقہ فطر کفارہ کا صدقہ جیسے نذر، قسم یا ظہار کا کفارہ ہے، وہ بھی غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ محتاج ہو۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ صدقہ وغیرہ فرمی غیر مسلم کو تو دیا جاسکتا ہے۔ مگر حربی کا فر، مشرک و غیرہ کو دینا جائز نہیں یعنی ایسے غیر مسلم جو اہل اسلام کے ساتھ برسرِ پیکار ہوں، وہ اگر محملج بھی ہوں تو وہ صدقہ کے حق دار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ متحنہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے: لَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبُدُوْهُمْ“ یعنی جو لوگ تم سے لڑائی نہیں کرتے اور تمہیں قہائے گھروں سے نہیں نکالتے ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرماتے ہیں جو تم سے لڑائی لڑیں اور تمہیں گھروں سے نکال دیں۔ اور جو کوئی ایسے لوگوں سے راہ در رسم بڑھائیگا۔ تو ان کا شمار ظالموں میں ہوگا جہاں تک کفار کو راہ راست پر لانے کا تعلق ہے۔ تو یہ صرف اور صرف مشائے

ایزدی پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے۔ اے پیغمبر علیہ السلام لَيْسَ عَلَيْكَ هٰذَا بِعَمْرٍ اَيے لوگوں کو ہدایت دینا آپ کے ذمے نہیں ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّشَاءُ وَلٰكِنْ اَوَّلُ مَا يَهْدِيْ اللّٰهَ تَعَالٰی چاہے ہدایت دیے۔ یہ سراسر اللہ جل شانہ کے اختیار میں ہے۔ حضور علیہ السلام کے چچا ابو طالب نے آپ کی بڑی خدمت کی۔ ہر مشکل وقت میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے۔ مگر حضور کی انتہائی خواہش کے باوجود ابو طالب کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ اور وہ کفر کی حالت میں مرا۔ حضور علیہ السلام کو اس بات کا بڑا افسوس تھا۔ مگر اس معاملہ میں آپ بھی مجبور تھے کہ ہدایت تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ابو طالب کے فرزند حضرت علیؑ کم سنی میں ایمان

سے مشرف ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے داماد، جلیل القدر صحابہ اور غفلتے راشدین میں سے ہیں۔ مگر باب کو کلمہ نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ دُوْرًا مَّعْرُوْمًا پریں آتا ہے۔ اَقْلَمْتُ تَكْرِيْمَ النَّاسِ حَتّٰی يَكُوْنُوْا مِثْقًا مِّنْ يَّنِیْ کیا آپ لوگوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔ بلکہ فَانْعَمَ عَلَیْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ آپ کے ذمے دین کو پہنچانا ہے۔ آپ سے یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لائے۔ حساب قرہ ہمارے فٹے ہے۔

فرمایا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَا تُنْفِسِکُمْ اور تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو، یہ تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے مالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہیں اجر عطا کریگا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں بنی نفع انسان کے لیے ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہیں اجر و ثواب سے نوازنا چاہتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر محض رضا الہی کے لیے۔ اس میں کوئی دیگر مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا مقصد ہوگا۔ مثلاً کوئی اپنا مفاد وابستہ ہو۔ یا کاری پائی جائے یا کسی کو ایذا دینا مقصود ہو تو ایسی صورت میں صدقہ ضائع ہو جائے گا۔ لہذا محض اللہ کی رضا کے لیے صدقہ و خیرات کرنا چاہیئے۔ اس کی مخلوق کے ساتھ احسان کرنا چاہیئے۔ محابوں کی حاجت براری کرنی چاہیئے۔ یہ سب رضا الہی کے ذرائع ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ اور تم جو بھی خرچ کرو گے، نیکی کرو گے، کسی کے ساتھ بھلائی کرو گے۔ یُوَفِّیْکُمْ اِلَیْہِمْ اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان محلج کو مینے سے پورا اجر ملے اور کافر کو مینے سے کم ملے۔ بلکہ پورا بدلہ دیا جائیگا۔ اس بات میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیئے خالص نیت کے ساتھ جو بھی خرچ کیا جائیگا، اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں بڑھا چڑھا کر دیں گے۔ البتہ فضیلت اس بات میں ہے کہ محابوں میں سے بہتر محتاج

کو دیا جائے۔ مثلاً ایک نمازی ہے اور دوسرا بے نماز ہے۔ تو نمازی کو دینا زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہے۔ مگر جہاں مجبوری کا معاملہ ہو۔ وہاں کم تر آدمی کو بھی دینا چاہیے۔ اگر کوئی بے نمازی بھوکا مر رہا ہے۔ تو اسے پہلے دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہر نیکی کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ وَأَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ اور کسی شخص پر ذرہ بھر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ تو اس کے قانون کے خلاف ہے۔ کہ کسی آدمی سے ادنیٰ نیکی کو بھی نظر انداز کر دے۔

تِلْكَ التُّسُلُ ۲

الْبَفْرَةِ ۲

درس یکصد و بیست (۱۲۰)

آیت ۲۷۳

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا
فِي الْأَرْضِ يَحْبِبَهُمُ الْبَاهِلُ أَغْنِيَاءُ مِنَ التَّعَفُّفِ
تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ الْحَافَاطَ وَمَا
تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۴

ترجمہ: (صدقات و خیرات) ان فقراء کے لیے ہیں جنہیں روک دیا گیا ہے۔ اللہ کے
راستے میں۔ وہ زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ انہیں ناواقف آدمی بالرائگان
کہا ہے۔ سوال سے بچنے کی۔ جسے تم ان کو ان کی نشانیوں سے پہچانو گے
وہ لوگوں سے کجاعت کے ساتھ سوال نہیں کرتے۔ اور تم مال سے جو کچھ بھی خرچ کرو
اللہ تعالیٰ اس کو طے کرنے والا ہے (۲۷۳)

رہائیت سے متعلق اس سے پہلے چھ باتیں بیان ہو چکی ہیں۔ آج کے
درس میں ساتویں اور آخری بات کا بیان ہے۔ جیسا کہ گذشتہ دروس میں ذکر آچکا ہے۔ اتفاق
فی سبیل اللہ کے سلسلے میں پہلی بات یہ ہے۔ کہ صدقہ و خیرات دیکر احسان نہ جتلاؤ، دوسری
بات یہ ہے کہ جس کو صدقہ دیا ہے اس کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس
کام میں ریاکاری کو دخل نہ ہو، چوتھی شرط یہ ہے کہ پاکیزہ مال اور اعلیٰ چیز صدقہ میں دی
جائے، پانچویں یہ کہ صدقہ کھلے طور پر بھی دیا جاسکتا ہے، اور پوشیدہ طور پر بھی بشرطیکہ
نیست درست ہو یعنی اتفاق محض رضا الہی کے لیے ہو، چھٹی بات یہ ہے۔ کہ صدقہ
غیر مسلم مستحق کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف مسلمان تک محدود نہیں۔ کیونکہ ہدایت دینے
کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے، وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازے۔ ہاں
حربی کافر صدقے کا مستحق نہیں، اس کا زمی ہونا ضروری ہے۔ البتہ عشر اور زکوٰۃ
جو فرض الفرض میں سے ہیں، وہ خالص مسلمانوں کے لیے وقف ہیں۔ لہذا کسی قسم کے

غیر مسلم کو نہیں دیے جاسکتے۔

آج کے درس میں ساتویں اور آخری بات یہ ہے کہ صدقات و خیرات کے سبب فقیر اور مسکین زیادہ مستحق کون لوگ ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ صدقات لِلْفُقَرَاءِ فَقِیْرُوں کے لیے ہیں۔ لفظ فقیر اصل میں فقار سے مشتق ہے۔ اور فقار ایسے معذور شخص کو کہتے ہیں جسکی کمزوریاں ٹوٹا ہوا ہو، اور وہ چلنے پھرنے سے عاجز ہو۔ اسی مناسبت سے عام مصطلح میں فقیر سے مراد وہ شخص ہے، جو اپنی جائز ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج ہو۔ ایسے محتاجوں کا ذکر سورہ حشر اور دیگر کئی صورتوں میں آتا ہے۔ سورہ قمر میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں جن میں فقراء اور مسکین سب سے پہلے آتے ہیں۔ فقہائے کرام نے فقیر اور مسکین کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فقیر زیادہ مستحق ہے اور بعض مسکین کو پہلے نمبر پر لاتے ہیں۔ تاہم ان کی عام تعریف کے مطابق فقیر وہ ہے جس کے پاس بالکل کچھ نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو۔ مگر وہ اسکی جائز ضروریات کے لیے کافی ہو۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صرف فقیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقات و خیرات کے سبب زیادہ مستحق فقراء ہیں۔ جن کے پاس ضروریات زندگی کے لیے کچھ بھی نہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

آیت زیر درس میں فقراء میں سے اُن خاص فقراء پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے جو روک ٹوک دیے گئے ہوں۔ یعنی محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أَحْصَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ صدقات اُن فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے میں روک ٹوک دیے گئے ہیں۔ لَا يَسْتَطِيعُونَ صَرْفَ أَمْوَالِهِمْ فِي الْأَمْوَالِ اور زمین میں سفر کر کے نئی طاقت نہیں رکھتے۔ ایک مقام پر پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ احصار کا معنی ہے روک دینا، جیسا کہ حج کے احکام میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو لوگ حج یا عمرہ کے ارادہ سے نکلیں پھر راستے میں روک دیے جائیں۔ احرام باندھ چکے ہیں۔ مگر دشمن نے راستہ روک دیا ہے یا کوئی بیمار ہو گیا، کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، تو محصور شخص کو چاہیے کہ وہ قربانی کا جانور دوسرے

شخص کے ہاتھ بھیج دیے جسے حرم شریف میں جا کر ذبح کر دیا جائے۔ اہم ابوحنیفہ کے فتویٰ کے مطابق ایسی صورت میں محرم الحرام کھول دینا۔ اور پھر آئندہ موقع پر حج یا عمرہ جیسی بھی صورت ہو اسکی قضا دینا۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صدقہ وغیرات اُن لوگوں کا حق ہے۔ جو اللہ کے راستے میں روک دیے گئے ہیں۔ اور سفر کی طاقت نہیں رکھتے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں روک دیے جانے والے لوگوں میں دو قسم کے لوگ شمار ہوتے ہیں۔ فی سبیل اللہ سے عموماً جہاد مراد لیا جاتا ہے۔ لہذا مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ اس قدر نادار ہیں کہ جہاد پر محض اس لیے نہیں جاسکتے کہ انہیں ضروریات زندگی کے لیے محنت مزدوری کرنا ہوتی ہے۔ اگر جہاد پر چلے جائیں تو بچھے ان کے بچوں کی کفالت ممکن نہیں اور اگر کاروبار میں لگے ہوتے ہیں تو جہاد پر نہیں جاسکتے اس طرح وہ جہاد پر جانے سے روک دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگ صدقہ وغیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔ اگر ان کی اعانت کر دی جائے، تو جہاد کے فریضہ پر جاتے وقت وہ گھر کی کفالت سے بھی بے فکر ہو جائیں گے۔ اُن پر خرچ کرنا گریا جہاد کے رستے میں حائل رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔

محمدرین کی دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں، جو دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ حصول تعلیم کے لیے وہ مدرسہ میں پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ لہذا دیگر کام کاج کر سنے سے عاجز ہیں۔ اگر وہ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر کاروبار بھی کرنا چاہیں۔ تو ظاہر ہے کسی ایک کام کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔ گزراوقات کے لیے محنت، مزدوری، ملازمت، کاروبار، کھیتی باڑی وغیرہ ہر کام کے لیے پوری توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دینی تعلیم کے لیے بھی پورا وقت درکار ہے جب تک پورا وقت نہیں دے گا، نہ قرآن پاک یاد کر سکتا ہے۔ نہ قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ جذوقتی سے دونوں کام اوصو سے رہ جائیں گے اور طالب علم کسی کام میں بھی کامل نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ بعض اوقات اس طرح کا کام نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ ”نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملاح خطرہ ایمان“ ایک مشہور مقولہ ہے

۱۰ ناقص التعليم شخص گمراہی پھیلا کر نقصان کا باعث ہی ہوگا۔ لہذا جو شخص دینی تعلیم حاصل کرنا چاہے اُسے دیگر ضروریات سے بے نیاز بنانے کے لیے اُن پر خرچ کرنا ہوگا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس دور میں صدقہ و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق ہی لوگ ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دین حاصل کرنے والے لوگ ننھے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی دوسرا کام کلج نہیں کر سکتے۔ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ یہ لوگ اُخْصِیْ وَافِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الشَّرْکَ رَاسْتِیْ میں روک دیے گئے ہیں انہیں مدرسوں میں دینی تعلیم کے لیے پابند کر دیا گیا ہے۔ دیگر کاروبار کرنے سے ان کی تعلیم اور صوری رہ جائیگی۔ لہذا یہ لوگ تہلے صدقات و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں

فقیر کی پہچان

فرمایا مستحق فقیر کی ایک پہچان تو یہ ہے بِحَسَبِہُمْ الْجَاهِلُ اَعْنِیْ اَمِنْ التَّعَفُّفِ ناواقف لوگ ایسے مستحقین کو مالدار سمجھتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ سوال نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ اعانتہ کے مستحق ہیں۔ ایسے لوگوں کی مثال اصحاب صفہ کی ہے حضور علیہ السلام کی مسجد سے قریب ایک بوجہ تھکا اور پیکچور کے پتوں کی جھٹ بھتی۔ اس مقام پر ایسے لوگ جمع ہوتے تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگیوں دین کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ بعض اوقات چار چار سو آدمی بھی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ حضور علیہ السلام سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور جہاد میں جانے کی ضرورت پڑتی تو دوسرے چل بیٹے۔ کوئی کاروبار نہ کرتے تھے۔ مگر مستحق ہونے کے باوجود سوال نہیں کرتے تھے حضرت قبیصہؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت! میں بہت مفروض ہو گیا ہوں، میری مدد فرمائیں یعنی زکوٰۃ و صدقات میں سے کچھ دلا دیں آپ نے فرمایا۔ کہ اس وقت تو ہمارے پاس کچھ نہیں۔ البتہ تم رُک جاؤ، جب کوئی چیز میری آئیگی، تو تمہارے محلے پر غور کریں گے۔ پھر آپ نے فرمایا قبیصہ اِنَّ الْمَسْئَلَةَ لَا تَحْلُ یعنی اے قبیصہ! سوال کرنا حلال نہیں۔ سوائے تین قسم کے آدمیوں کے۔ اول وہ شخص جو ایسے فقر میں مبتلا ہو جائے۔ کہ مٹی میں مل جائے یعنی اس کے پاس کوئی چیز باقی نہ ہے۔ دوسرا وہ شخص جس پر کوئی مال ان پڑ جائے یا

قرضہ دینا ہے۔ اور فیلر وہ شخص جس کی قوم کے تین محل منہ آدمی گواہی دیں کہ واقعی یہ شخص بڑا نادار ہے۔ فاقہ کشی کر رہا ہے۔ اور اس کے پاس کچھ نہیں۔ فرمایا ان تین شخصوں کے علاوہ جو کوئی سوال کرتا ہے، وہ حرام کھاتا ہے۔ اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس مال موجود ہو۔ اس کے باوجود وہ سوال کرے، تو ایسا شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حالت میں پیش ہوگا کہ اُس کے چہرے پر گروشت ہی نہیں ہوگا۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے پاس خوراک، لباس اور ہنسنے کے لیے مکان کے علاوہ دوسرے کم کی مقدار میں مال موجود ہو، وہ صاحب نصاب بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے سوال کرنا حلال نہیں ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں جس کے پاس چالیس درہم ہوں، وہ بھی سوال نہیں کر سکتا۔ امام سفیان ثوریؒ پچاس درہم کے مقدار بتاتے ہیں حتیٰ کہ ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے کہ جس شخص کے پاس دو دقت کا کھانا موجود ہو، اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض اہل فتنہ یا پیشہ ور ہوتے ہیں، جنہیں کچھ ازار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس اگر چالیس، پچاس یا دوسو درہم سے کم مال ہو تو ان کے لیے سوال کرنا گنجائش ہے۔ ورنہ سوال کرنا حرام ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ اصحاب صفہ میں سے ہیں۔ ان کے متعلق ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے منبر اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان غش کھا کر گر پڑتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ لوگ میری گردن پر پاؤں رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مجھے جنون کا درورہ پڑ گیا ہے حالانکہ صابنہؓ الّا الجوع یہ صرف بھوک کی وجہ سے ہوتا تھا۔ اس قدر زبوں حالی کے باوجود آپ نے کبھی دست سوال دراز نہیں کیا۔ یہ ان صحابہ کا حال تھا، جنہیں اپنی عزت نفس اس قدر عزیز تھی۔ اس آیت میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے کہ خوش پوش ہونے اور سوال نہ کرنے کی بنا پر باوقعت آدمی سمجھتے ہیں کہ یہ شخص بڑا مالدار ہے۔ حالانکہ وہ اپنی

عزت نفس کی خاطر سوال سے گریزاں ہے۔ اکبر الہ آبادیؒ نے اسی چیز کی یوں ترجمانی کی ہے۔ ۷

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے

خدا ہی خوب واقف ہے۔ کسی پر کیا گزرتی ہے

آج کے محلّہ دور میں بھی عزت نفس کی پاسداری کی جاتی ہے۔ آج تو اشتراکی بھی کہتے ہیں الخبز بالکرامۃ یعنی ہر آدمی کو رعزت روٹی ملنی چاہیے۔ تاکہ اُسے سوال کرنے کے ذیل نہ ہونا پڑے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ سوال کرنے سے پاک دامن ہیں۔ وہ صدقات و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔

مستحق فقرہ کی دوسری پہچان یہ فرمائی فَتَعْرِفُهُمْ بِسَيِّئِهِمْ تَمْنُنِ اُنْہیں اُن کی نشانیوں سے پہچانو گے۔ واضح نشانی یہ ہے۔ کہ بھوک کی وجہ سے لاغر ہوں گے، اُن کے چہروں پر زردی چھائی ہوگی مزید برآں لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ اِلْحَافَاوہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اگر ہر امر مجبوری سوال کرنا ہی پڑے تو یہ وقار طریقے سے کرتے ہیں۔ پیشہ ور بھکاریوں کی طرح پیچھے نہیں پڑ جاتے کہ ضرور لے کر ہی پھوڑ بیٹھے ام ابوجہ جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اکحافا سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ لجاجت سے سوال نہیں کرتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ بالکل ہی سوال نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر سوال کریں گے تو لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ کہ نادر ہیں۔ مگر وہ تو اپنی ناداری کو ظاہر ہونے ہی نہیں دیتے۔ اسکی دلیل یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی فرما چکے ہیں۔ کہ سوال نہ کرنے کی وجہ سے تو لوگ انہیں غنی یعنی مالدار تصور کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگ مطلقاً سوال کرتے ہی نہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کہ پیشہ ور بھکاری فقر کی فہرست میں شامل گراہی حرام نہیں ہیں۔ کیونکہ بھیک مانگنا تو سخت محبوب ہے۔ اور جن ناداروں کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ان کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے۔ کہ وہ اس قدر خود دار ہیں کہ سخت ضرورت کے باوجود سوال سے گریز کرتے ہیں۔ مسلم ممالک میں عموماً اور جہاں سے ہاں خصوصاً لوگ جگہ جگہ

کے بعد حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ آپس نے زندگی میں پانچ سو پونڈ سیاہی استعمال کی۔ یہ اُن لوگوں کے کام کی برکات ہیں کہ دین کا فطر چل رہا ہے۔ ورنہ اگر اس زمانے کے بھکاریوں والی بات ہوتی، تو پھر دین کا اللہ ہی حافظ تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ کس نیت سے خرچ کر رہے ہو اور کس پر خرچ کر رہے ہو۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خرچ کی بہترین مہی پانفرادی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَةُ ۲

درس یکصد و بیست و یک (۱۲۱)

آیت ۲۴۲ تا ۲۴۹

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْبَيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً
 فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
 وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۴۲﴾ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ
 إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَخْبَطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ
 ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ
 وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى
 فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
 النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۴۳﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ
 الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿۲۴۴﴾ إِنَّ
 الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ
 وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ
 عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۴۵﴾

ترجمہ: وہ لوگ جو اپنے مال کو خرچ کرتے ہیں رات کے وقت اور دن کے وقت اور سیر
 طور پر اور ظاہری طور پر ان کے لیے ان کے رب کے پاس بدلہ ہے۔ اور نہ ان پر خوف ہوگا
 اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۴۲﴾ وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، وہ نہیں کھڑے ہوں گے۔
 مگر اس شخص کی طرح جس کے حواس شیطان ٹھکن کر دیتا ہے پھٹنے کی وجہ سے۔ یہ
 اس لیے کہ بیگ امنوں نے کہا کہ بیشک سود اگر بھی سود کی مثل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ
 نے سود اگر بھی کو حلال قرار دیا ہے۔ اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پس جس کے پاس نصیحت

انہی کے رب کی طرف سے، پس وہ ٹنگ گیا پس جو کچھ ہو چکا وہ اسکے لیے ہے اور اسکا معاملہ اللہ کی طرف ہے اور جس نے پلٹ کر کیا، پس یہی لوگ ذلخ ملے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۷﴾ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ شکر گزار اور گنہگار کو پسند نہیں کرتا ﴿۲۸﴾ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ ان پر نہ خوف ہو گا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۹﴾

گذشتہ کئی دروس میں صدقہ کا بیان آیا ہے۔ اور گذشتہ درس میں صدقات سے متعلق ساتویں بات یعنی اس کے بہترین مصرف کا ذکر تھا اب آج کے درس میں پہلے صدقات ہی کے معنی میں ان کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اور پھر اس کے محتاطانے میں سود کی خدمت سے، صدقہ و خیرات کرنے سے انسان کے اندر فیاضی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور بخل دور ہوتا ہے۔ اس کے سبب انسان کے اندر بنی نوع انسان کے لیے جذبہ ہمدردی پیدا ہوتا ہے، مکارم اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے، اور پھر یہی خصائل انسان کی نجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سود خور میں بخل کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق کا جنازہ نکلتا ہے۔ اور لامحدود دوسیانہ پر مال جمع کرنے کی حرص پیدا ہوتی ہے۔ انسانی ہمدردی اور فیاضی اٹھ جاتی ہے سود خور تنگ دل اور ظالم بن جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے اس کا دین تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اُس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برپا ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔

لعن اللہ اکل التلبؤ وموكلہ ... الخ اللہ تعالیٰ نے سود لینے والے اور دینے والے پر، اسکی دستاویز کے کاتب اور گواہان سب پر لعنت کی ہے اور صدقہ و خیرات کرنے والوں پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دونوں متضاد چیزوں کو اکٹھا بیان کیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خیرات کے چار متضمن مواقع بیان کیے ہیں
الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْإِيلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ لَوْ جُوْنُ

صدقہ کے
چار مواقع

مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات اور دن مِسْقًا عَلَیْنِیْہِ چھپا کر اور ظاہر کر کے۔ یعنی اہل ایمان چار حالتوں میں خرچ کرتے ہیں، وقت کے لحاظ سے رات ہوگی یا دن ہوگی اور حالت کے لحاظ سے پوشیدہ طور پر ہوگا یا ظاہر ہوگا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام اس آیت کے مکمل مصداق تھے۔ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے پاس اگر چار درہم آگئے ہیں۔ تو انہوں نے ایک رات خرچ کر دیا، ایک دن کے وقت ایک پوشیدہ طور پر خیرات کر دیا اور ایک کسی عام مجلس کے اندر، اور اس طرح اس آیت کو میرے پورا پورا عمل کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس چالیس ہزار درہم آئے۔ انہوں نے بھی قرآن پاک کے حکم کے مطابق انہیں چار حصوں میں تقسیم کیا۔ دس ہزار درہم رات میں خرچ کیے، دس ہزار دن میں پھر دس ہزار پوشیدہ طور پر اور دس ہزار علانیہ خرچ کے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بہت بڑے تاجدار و مالدار تھے۔ آپ بھی خرچ کرتے وقت چاروں مواقع کا خیال رکھتے تھے۔

یہاں سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ صدقہ خیرات کے لیے کوئی خاص وقت یا کوئی خاص جگہ معین نہیں ہے۔ بلکہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں اور ظاہر یا باطن ہر حالت میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ایسے لوگوں کے لیے اُن کے رب کے ہاں اجر ہے۔ وہ ضرور اس اجر سے مستفیذ ہوں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وہ مستقبل میں بیش آنے والے کسی خطر سے خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ اور نہ ہی گمراہی ہوئی زندگی پر انہیں کسی قسم کا افسوس اور غم ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے دنیا میں نیکی اور بھلائی کا کام کیا ہے۔ وہ عند اللہ ناجور ہوں گے۔

اس آیت پاک سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کے لیے کوئی خاص وقت یا دن مقرر نہیں کیا۔ کہ ضرور فلاں دن اور فلاں وقت پر ہو۔ بلکہ ہر روز اور ہر وقت خیرات ہو سکتی ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کے لیے جمعرات کا روز یا ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ مقرر کرتے ہیں۔ شعبان کی پندرہویں اور رمضان کی ستائیسویں

ایصالِ ثواب
کے لیے تعین وقت

تاریخ بھی بطور خاص مقرر کی جاتی ہے۔ یہ چیز اصولاً غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی پابندی عاید نہیں کی۔ البتہ جس چیز کی پابندی ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ جو کچھ حسرت سے کیا جا رہا ہے، وہ حلال کما کی سے ہو۔ دن رات اور تاریخ کا کوئی تعین نہیں۔ غریب مسکین کی خدمت کرنی ہے۔ تو کسی وقت بھی کی جاسکتی ہے۔ نیت درست ہونی چاہیے۔ محض اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ مردوں کو ایصالِ ثواب کے لیے میسر دن، ساتواں، رسواں، یا چالیسواں دن ہی کیوں ضروری ہے۔ اسی طرح مردوں کے ثواب کے لیے جمہرات کی تخصیص بھی ناقابلِ فہم ہے یہ محض ڈھونگ اور غلط طریقہ ہے۔ صدقہ و خیرات کے لیے کوئی تاریخ اور کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، خود ساختہ شریعت کے احکام ہیں۔

سود کی مذمت اور حرمت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سود کھانے کا ذکر فرمایا ہے لیکن مراد اس سے لینا دینا ہی ہے، صرف کھانا مراد نہیں۔ یہاں پر کھانے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کھانے پینے پر منحصر ہے اور یہ انسان کی اولین ضروریات میں سے ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی محنت مزدوری، کام کاج کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ پیٹ کی خاطر یہ کچھ کیا جا رہا ہے۔ آدمی کو دو وقت کی روٹی تو ضرور ملنی چاہیے، باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس مقام پر کھانے کا ذکر انہی معنوں میں کیا گیا ہے۔ تاہم سود کھانے سے مراد سود کا لینا دینا اور ہر قسم کے استعمال میں لیا ہے فرمایا جو لوگ سود کھاتے ہیں لَا يَفْقَهُوْنَ وہ قیامت کے دن نہیں سمجھنے ہونگے اپنی قبروں سے إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چمٹ کر منجھوٹا الحواس کر دیا ہو جب کسی شخص پر جن اثر ڈالتا ہے۔ جسے جن کا سایہ یا جن کا چمٹنا کہتے ہیں۔ تو وہ شخص اپنے ہوش و حواس قائم نہیں رکھ سکتا۔ اچھے طریقے سے کھڑا نہیں ہو سکتا، طرح طرح کی

حکمتیں کرتا ہے۔ تو فرمایا قیامت کے دن سود خور کی بھی یہی حالت ہوگی۔ جب وہ قبروں سے اٹھیں گے، تو ان کے پاؤں لڑکھڑاتے ہوں گے۔ اور ان پر جنوں کی سی کیفیت طاری ہوگی۔ یہ اُن کے لیے سود خوری کی سزا ہوگی۔

جن کا سایہ جن کا انسان کو چھٹ جانا اکثر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ جب کوئی شخص غلطی کرتا ہے۔ جس سے شیاطین کو تکلیف نہ پہنچتی ہے، تو وہ لوگوں کو چھٹ کر تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جنات کی مختلف قسمیں ہیں۔ جیسا کہ سورۃ جن میں آتا ہے ”هَيْكَا الْمُسْلِمُونَ وَهَيْكَا الْقَاسِطُونَ“ جس طرح انسانوں میں مومن اور کافر فاسق وغیرہ ہوتے ہیں، اسی طرح جنوں میں بھی ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ انسانوں کو نظر نہیں آتے کیونکہ ان کا مادہ تخلیق زیادہ لطیف ہے۔ انسانی آبادی کی طرح یہ دنیا جنوں سے بھی بھری ہوئی ہے۔ وہ بعض اوقات انسانوں کو چھٹ جاتے ہیں، ”مِنَ الصَّيِّطِ“ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں پنجاب میں کچھ مصنوعی اور جعلی کاروبار بھی ہوتا ہے حامل لوگ اپنے واقعات اور بڑبڑا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اکثر عورتوں کو بعض بیماریاں ہوتی ہیں۔ مگر عالمین نے بھی جنات چھٹنے پر معمول کرتے ہیں۔ حالانکہ بیماری کا علاج طبی طور پر ہی کرنا چاہیے۔ یہ اعتقاد کی کمزوری اور جہالت کا نتیجہ ہے۔ دگر بن حقیقی طور پر جن چھٹنے کی کیفیت تو سب کو معلوم ہی ہے۔ کہ انسان کیسی کیسی حرکتیں کرتا ہے۔ اور کس طرح حواس باختہ ہو جاتا ہے۔

تمہارا بقاعدہ فرمایا سود خور قیامت کے روز قبر سے حواس باختہ اٹھیں گے۔ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اس کی وجہ یہ ہے کہ قَالُوا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الْبَيْعِ اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الْبَيْعِ انہوں نے کہا تجارت سود کی مانند ہے۔ دونوں چیزوں میں کوئی فرق نہیں۔ لوگ تجارت کرتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں۔ اور پھر اس میں نفع کھاتے ہیں۔ اس طرح ساہوکار بھی اپنی رقم لگاتا ہے۔ اور اس پر نفع لیتا ہے۔ سود خور کا یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں اُسے سرمایہ جمع کرنے اور حلال حرام میں عدم تمیز کا جنون ہو چکا ہے۔ اسی لیے یہ سود کو تجارت کے برابر قرار دے رہا ہے، حالانکہ منافع کی مجلس کے بدلے میں ہوتا ہے۔ ایک شخص کوئی چیز

بچتا ہے۔ اور اپنی لاگت سے زیادہ وصول کر کے نفع کھاتا ہے۔ مگر سود میں تو کسی چیز کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ سود خوردہ کوئی چیز خریدتا ہے۔ اور نہ اُسے بچتا ہے۔ بلکہ صرف روپیہ ادھار دیکر اُس پر سود لیتا ہے۔ جو قطعاً حرام ہے۔

سود دشمنوں میں ہوتا ہے، ادھار کی شکل میں یا اجناس کی صورت میں۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قرض کے طور پر کچھ رقم دیتا ہے۔ اور پھر مقررہ مدت کے بعد اصل رقم کے ساتھ کچھ زائد بھی لیتا ہے۔ تو یہ صریحاً سود ہے۔ کیونکہ قرض لینے والے نے اس میں محنت کی ہے، نہ وقت دیا اور نہ صلاحیت صرف کی ہے۔ وہ محض اپنی رقم کے بل بوتے پر مقررہ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو سود ہے۔

جس کی صورت یہ ہے۔ کہ کوئی شخص جس کسی دوسرے شخص کو مقررہ مدت کے لیے مے اور پھر واپسی پر ادا شدہ جس سے زیادہ لے۔ یہ بھی سود ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے **اَللّٰهُبُ بِالذَّهَبِ** یعنی جب جس کا لین دین ہو۔ اور ایک جس کا تبادلہ ہو۔ تو برابر برابر ہونا چاہیے۔ سونے کے بدلے سونا ہو، چاندی کے بدلے چاندی ہو، نمک کے بدلے نمک ہو۔ جو کے بدلے جو ہو، گندم کے عوض میں گندم ہو تو یہ تبادلہ برابری کی بنیاد پر اور درست بدست ہونا چاہیے، جو کوئی ایک سیر گندم دیکر سو سیر گندم واپس لے گا تو یہ سود ہوگا اسی طرح ایک سیر گندم لے کر کچھ مدت کے بعد ایک سیر چاول واپس لے تو یہ بھی سود ہوگا۔ ہاں اگر اجناس مختلف ہوں تو شرح تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہے۔ مثلاً ایک سیر گندم کے بدلے میں دو سیر جو لے سکتا ہے، ایک تولہ سونے کے عوض کسی گنا زیادہ چاندی حاصل کی جا سکتی ہے۔ علیٰ هذا التیاس۔ مگر یہاں پر شرط یہی ہے۔ کہ سود بدست بدست ہو۔ اگر اس میں ادھار کیا ہے۔ اور اُس بدست کے معاوضہ میں کچھ زیادہ مل کر یا تو یہ ہو جاتا ہوگا۔

اہم ماکٹ فرماتے۔ کہ جو چیز بطور خوراک استعمال ہو سکتی ہے، جیسے گندم، جو چنا وغیرہ اور وہ اپنی قیمت بھی رکھتی ہے۔ اس میں اگر ادھار کی بنیاد پر کمی بیشی ہو گی۔ تو یہ سود ہوگا۔ اہم شائع اور اہم احمد بھی خوردہ والی اشیاء میں یہی حکم لگاتے

دیا ہے۔ اس کا خون چرتا ہے۔ وہ پہلے ہی کمزور ہے۔ اس پر اور مالی بوجھ ڈالا ہے۔ وہ شخص سخت گنہگار ہے۔ اور اللہ کے لیے آدمی کو بھی ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اہل ایمان کے
لیے بشارت

احکام الہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے برخلاف اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ ایمان لائے وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اور نیک اعمال کئے۔ یعنی اولادہ اہل ایمان ہیں۔ ان کا عقیدہ صحیح ہے۔ توحید خداوندی پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ بعثت بعد الموت پر یقین ہے۔ کتب سلور پر ایمان ہے اور ثانیاً وہ اچھے اور شائستہ کام انجام دیتے ہیں۔ برائی سے بچتے ہیں۔ بالخصوص وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ نماز کو قائم کرتے ہیں جو کرام العبادۃ المقربہ اللہ کا تقرب دلانے والی چیز ہے۔ اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ وَاَتَوُا الزَّكَاةَ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ یعنی بدنی عبادت کے ساتھ ساتھ مالی عبادت بھی کرتے ہیں۔ ان کے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔ بخل سے محفوظ ہیں۔ لَقَدْ اَجَّرْهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ اُنْ کے لیے اُن کے رب کے ہاں اجر مقرر ہے۔ اُن کے نیک اعمال کا ایک ایک ذرہ محفوظ ہے، اگر ربی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہے۔ تو اللہ اسے ضائع نہیں کرتا بلکہ اس کا بدلہ سات سو گنا تک یا اس سے بھی بڑھا کر عطا کرتا ہے۔ ایسے ہی نیکو کار لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا تَخْوَفْ عَلَیْہُمْ زَاہِدِیْنَ اُنہیں اس دنیا میں کسی قسم کا خوف ہوگا، وَلَا تَهْزَنْ عَلَیْہُمْ اُنہیں آخرت میں وہ کسی غم و فکر میں مبتلا ہوں گے۔ قیامت کا ڈر تو ہر ایک کو ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت میں وہ اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے مومن ہونگے برخلاف اس کے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے سخت مغموں ہوں گے۔ ایسے لوگ قیامت کے دن اپنے کیے پر پشیمان ہونگے اور کہیں گے۔ تَحْسَبُوْنِیْ عَلٰی صَافَرَتٍ فِیْ جَنْبِ اللّٰهِ اُنسوس اللہ کی دی ہوئی سلت سے میں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور آج قیامت کے دن نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہو گیا۔ بہر حال ایمان اور اعمال صالحہ کے حامل لوگوں کو نہ خوف ہوگا۔ اور نہ کسی قسم کا غم ہوگا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد و بست (۱۳۲)

آیت ۲۷۸ تا ۲۸۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۷۸﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۷۹﴾ وَلَئِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ فَتُمْ ثَوَفًا كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۸۱﴾

۲۷۸-۲۸۱

تس جہریدے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر تم (حقیقت میں) ایماندار ہو ﴿۲۷۸﴾ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا، پس سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا چیلنج۔ اور اگر تم توبہ کرو، تو تمہارے اصل مال تمہارے ہی ہیں نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائیگا ﴿۲۷۹﴾ اگر وہ ٹھنص ٹھنص سستی والا مقررہ منہ سے اس کو ملت دینی چاہیے اسودگی تک۔ اور یہ کہ تم صدقہ کرو (بخش دو) یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم جانتے ہو ﴿۲۸۰﴾ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کے سامنے ٹوٹکے جاؤ گے۔ پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جو اس نے کیا، اور ان پر کسی طرح ظلم نہیں کیا جائیگا ﴿۲۸۱﴾

رہنمائی

صدقہ و خیرات کی فضیلت کے بعد اللہ تعالیٰ نے سود کی حرمت اور مذمت بیان فرمائی۔ گذشتہ درس میں سود خور کی قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کی حالت کا تذکرہ تھا کہ وہ اپنی قبروں سے اس طرح مجنوبہ الحواس اٹھیں گے جیسے ان کو جن چمٹ گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں مال جمع کرنے کی فکر

میں اس قدر اندھے ہو گئے کہ ان کے نزدیک تجارت اور سود میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ سود کی حرمت کے نفاذ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے دو طریقے بتائے ہیں۔ پہلا طریقہ تو گزشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔

”فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ يَعْنِي وَعْظَ وَنَصِيحَتِ كَلَامِ اللَّهِ يَلْعَنُ سَوْدُ خُورٍ كُورٍ“

سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ اللہ کا حکم مان کر سود سے کنارہ کش ہو جائے تو بہتر و گرنہ ایسے لوگ اَصْحَابُ السَّارِ ہیں۔ ان کا گناہ ناقابل معافی ہے۔ ”هُوَ فِيهَا خَالِدٌ“ یہ دائمی جہنمی ہیں۔

سود کی لعنت سے نجات دلانے کا دوسرا طریقہ تعزیری عمل ہے جو آج کے درس میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب کہ حکومت اسلامی ہو اور وہ اسلامی احکام کا نفاذ کرے اور پھر ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تعزیری ہی کارروائی کرے۔ کسی بھی ملک و قوم کے لیے معاشی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نظام درست ہو جائے، تو لوگوں کے بیشتر دنیوی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں سود ایک بنیادی رخنہ ہے۔ جسے دور کیے بغیر لوگوں کی معاشی حالت درست نہیں ہو سکتی لہذا ایک اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے کہ ملک کو سود کی لعنت سے پاک کرے اور اس راستے میں آنے والے ہر روڑے کو ہٹائے، اور یہ چیز تعزیری قوانین کے ذریعے حاصل ہوگی، جس کا ذکر آج کے درس میں آ رہا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں طائف میں آباد قبیلہ بنو ثقیف کے کچھ لوگ سودی کاروبار کرتے تھے۔ مکہ میں آباد بنو مغیرہ طے بنو ثقیف کے مقروض تھے۔ انہوں نے سود پر روپیہ لے رکھا تھا۔ جب اسلام کی شمع نے خطہ عرب کو منور کیا، تو یہ دونوں قبیلے مسلمان ہو گئے۔ چونکہ بنو ثقیف کی رقم بنو مغیرہ کی طرف واجب الادا تھی، اول الذکر نے اپنی اصل رقم مجبوراً سود مطالبہ کیا، تو بنو مغیرہ نے جواب دیا کہ اسلام میں تو سود کا لین دین جائز نہیں ہے۔ لہذا اب تمہارا دعویٰ درست نہیں ہے۔

آخر معاملہ حضور طہیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر مسئلہ حل کر دیا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ ائْتُوا إِلَيْهِ بِإِيمَانٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ وَذَرُوا صَافِي مِّنَ الرِّبَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ اور سود کی بقیہ رقم چھوڑ دو، یعنی مطالبہ نہ کرو۔ اب یہ تمہارے لیے رہنمائی ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم فی الحقیقت مومن ہو، یعنی اگر سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہو، تو سود کا خیال قطعاً دل سے نکال دو۔

اس آیت پاک میں سود خوروں کے لیے توبہ کا بیان ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی رو سے مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ سودی کاروبار کو ختم کرنے کا انتظام کرے اور اگر سود خور سود خوری سے باز نہ آئیں تو پھر ان کے خلاف جہاد کیا جائے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا اور اگر تم نے ایسا نہ کیا یعنی سود لینے سے باز نہ آئے، تو پھر فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا چیلنج سن لو تمہارے خلاف جنگ ہوگی یہاں تک کہ تم اس قبضہ حرکت سے باز آ جاؤ۔ وَإِنْ تَبَيَّنَ پھر اگر تم نے توبہ نہ کر لی۔ سودی کاروبار کو ختم کر دیا فَلَكُمْ دِينُكُمْ تو تمہارا اصل دین تمہیں مل جائے گا۔ اور اس رقم پر جو سود لگایا گیا ہے۔ وہ نہیں ملے گا۔ وہ چھوڑنا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ سود خور سے توبہ کرائے کہ آئندہ کے لیے سودی کام سے قطعاً دست بردار ہو جائے۔ اگر اس نے ایسا کر لیا تو معاملہ ختم ہو گیا اور اگر کوئی شخص توبہ سے انکار کرتا ہے، تو حاکم اسے سزا دینے کا پابند ہے، اور یہ سزا سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ جو تابعین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اگر سود خور توبہ نہ کرے تو اسلامی نظام کے تحت ایسے شخص کا سر تلوار سے قلم کر دینا چاہیے۔ اب سود لینے والا دو طرح کا ہو سکتا ہے اگر ایسا شخص جو سود کو حرام نہیں سمجھتا، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور مرتد سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اسلام کے

ایک قطعی حکم کا انکار کیا ہے۔ لہذا اس کے خلاف جہاد ضروری ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اور پھر یہ ہے کہ مرتد نے جو مال اسلام کے دور میں کھایا تھا، وہ اس کے مسلمان ورثا میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اور جو مال اس نے ارتداد کے بعد کھایا تھا، وہ اسلامی بیت المال میں جمع ہو جائے گا۔

سود و غرہ کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ طے حرام تو سمجھتا ہے، مگر لے رہا ہے ایسا شخص دین کا باغی ہے۔ اور ایسے شخص کے خلاف بھی جنگ ضروری ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں منکرین زکوٰۃ نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ کا مال بیت المال میں جمع نہیں کرائیں گے۔ بلکہ اپنی مرضی سے لے خرچ کریں گے۔ تو ایسے لوگوں کے خلاف حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جہاد کیا تھا۔ اسی طرح جو لوگ سود کو حرام سمجھتے ہوئے بھی لے وصول کرتے ہیں۔ وہ باغی ہیں۔ اور ایک اسلامی حکومت کو ایسے باغیوں کے خلاف جہاد کا حکم ہے۔ اور پھر باغی کا مال بھی جبین لیا جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے تو مال واپس لے دیا جائے گا۔ اور اگر تائب نہ ہو، تو اس کا مال حکومت کے حق میں ضبط ہو جائے گا۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ارتداد کے لیے صرف فرائض کا انکار ہی ضروری نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سنت کا بھی انکار کرے گا۔ تو مرتد ہو جائے گا۔ امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی بستی کے لوگ اذان دینا ترک کر دیں، تو ان کے خلاف بھی جہاد ہو گا۔ اگرچہ اذان دینا فرض نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔ اسی طرح اگر بعض مسلمان غنہ کرنا چھوڑ دیں اور سمجھانے پر بھی اس پر آمادہ نہ ہوں، تو ایسے لوگ بھی باغی سمجھے جائیں گے۔ اور اسلامی قانون کے مطابق ان کے خلاف جہاد ہو گا۔ غنہ کرنا بھی سنت ہے، فرض واجب نہیں ہے۔ مگر اس کے تارکین کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ جیسا کہ فرائض کے تارکین کے ساتھ روا ہے۔

فرمایا اگر تم اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے سود کو چھوڑ دو، تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے۔ وہ تم لے سکتے ہو۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝

نہ تم کسی پر زیادتی کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے گا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور علیہ السلام نے اعلان فرمادیا کہ جاہلیت کی تمام رسومات کو اللہ تعالیٰ نے میرے پاؤں کے نیچے روند دیا ہے۔ تمام سودی کاروبار ختم ہو گئے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے لوگوں کے سودی کاروبار ختم کر رہا ہوں۔ حضرت عباسؓ کا سودی کاروبار بڑا وسیع تھا۔ آپ نے بحیرہ ختم کر دیا۔ اور سود کا ایک پیسہ تک لینے کی اجازت نہیں دی فرمایا کہ اپنی اصل رقم لے سکتے ہو تاکہ تمہیں بھی نقصان نہ ہو اور سود لے کر دوسرے کو بھی نقصان مست پہنچاؤ

اس کے بعد مقرض سے متعلق ایک خصوصی مسئلہ بیان کیا گیا ہے وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ اور اگر مقرض تنگ دست ہے وعدہ کے مطابق قرض واپس نہیں کر سکتا فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ تو اسے آسودگی تک ملت مے دینی چاہیے۔ محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ آیت کی رو سے تنگ دست کو ملت دینا واجب ہو جاتا ہے اور اگر مقرض جان بوجھ کر ڈال مٹول کر رہا ہے، تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیونکہ کلمہ موجود ہونے کے باوجود ڈال مٹول کرنا اور قرض کی ادائیگی سے اعراض کرنا ظلم کے مترادف ہے۔ اور ظالم شخص تعزیر کا مستحق ہوتا ہے۔ لہذا اگر شبہ ہو کہ مقرض کے پاس مال موجود ہے مگر ادا نہیں کرتا تو قرض خواہ عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ اور حاکم ایسے مقرض کو قید میں ڈال سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس مال موجود ہے تو قرضہ ادا کر کے رہائی حاصل کرے گا اور اگر عدالت کو یقین ہو جائے کہ یہ شخص قرضہ لوٹلے کے قابل نہیں ہے تو اسے ملت دی جاسکتی ہے۔

فرمایا وَإِنْ نَصَّدَ قَوْلًا خَيْرٌ لَّكُمْ اگر مقرض اس قدر مفلوک الحال ہے کہ قرضہ ادا کرنے کے قابل نہیں۔ تو ایسی حالت میں قرضہ بالکل معاف کر دینا ہی بہتر ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ لَقِيتُمُوهُ اگر تم کچھ جانتے ہو۔ بخاری اور مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا جس نے تنگ دست مقرض کو ملت دی أَوْ وَضَعَ عَنْهُ یا اسے بالکل معاف ہی کر دیا، تو فرمایا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے کہ قیامت کے دن ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہوگا۔ اور وہ ایسا دن ہوگا جس دن عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ بخاری شریف میں حضور علیہ السلام نے کسی سابقہ امت کے ایک شخص کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوگا جس کے پاس کوئی نیکی نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ————— دیکھو اس نے کوئی نیکی کی ہے۔ دریافت کرنے پر وہ شخص عرض کرے گا کہ میرے پاس نیکی تو کوئی نہیں ہے البتہ ایک بات یہ ہے کہ میں تجارت کرتا تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ لوگ مجھ سے قرضہ بھی لیتے تھے۔ میں نے نوکروں کو حکم دے رکھا تھا کہ تنگہ ست کو مہلت دے دیا کرو۔ ایسے شخص پر سختی نہ کیا کرو۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سلسلے فرمایا گنّ احقّ ہم درگزر کرنے کے زیادہ لائق ہیں۔ یہ شخص دنیا میں تنگہ ستوں سے درگزر کرتا تھا، لہذا آج میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم قرضہ معاف کر دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم اس عمل کی حقیقت کو جانتے ہو۔

حکومت وقت
کی ذمہ داری

سودی نظام کی بیخ کنی کے لیے حکومت وقت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ جو حکومت سودی نظام کی سرپرستی کرتی ہے، وہ مٹانے کے قابل ہے ورنہ لوگوں کو کبھی کون نصیب نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں کہ زمین میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت اور دوسرے سود کا قلع قمع۔ سودی نظام کا قیام یہودیت کی سرپرستی ہے۔ ناجائز منافع خودی مغرب اخلاق چیز ہے اور قابلِ مذمت ہے۔ اسلام نے اس کو مٹانے کا سختی سے حکم دیا ہے۔ مگر آج کی دنیا میں کتنے ملک ہیں جو سودی نظام سے پاک ہیں؟ ہر ملک کے ہر بینک میں سودی کاروبار ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمان ممالک میں غیر مسلموں کو بھی سودی کاروبار کی اجازت نہیں۔ غیر مسلموں کے ہاں شراب نوشی جائز ہے۔ لہذا وہ پی سکتے ہیں۔ مگر اسلامی حکومت میں اس کی تجارت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح وہ سود کا گوشت حلال سمجھ کر کھا سکتے ہیں مگر سود حرام ہے، وہ نہیں لے سکتے۔ یہ اتنی بُری

واجب نہیں ہے۔ مگر اس کے تارکین کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔
بیشاکہ فرائض کے تارکین کے ساتھ روا ہے۔

فرمایا اگر تم اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے سود کو چھوڑ دو، تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے۔ وہ تم لے سکتے ہو۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ

چیز ہے۔ بہر حال سورہ کے متعلق بعض تفصیلات بیان ہو گئیں، کچھ مزید باتیں سورہ آل عمران اور سورہ روم میں بھی آئیں گی۔

سورہ کے مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر ان احکام پر عمل نہیں کرو گے۔ آخرت میں عذاب کرواؤں گا یَوْمَ تَرْجَعُونَ فِیْہِ الرَّایُ اللّٰہِ اُس دن سے ڈر جاؤ، جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے جاؤ گے یعنی قیامت کا دن آنے والا ہے۔ دلائل پر ہر شخص کا حق ہو گا تَتَّبِعُوا کُلَّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ پھر ہر نفس کو اُس کے کئے کا بدلہ دیا جائیگا وَهُمْ لَا یُظْلَمُونَ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی یہی آیت ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے حضور علیہ السلام کی وفات سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ اور جمعہ کے دن اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ والی آیت نازل ہوئی تھی۔ مگر یہ آیت واقفوا یَوْمًا..... سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق اس آیت کے نزول کے بعد آپ اس دنیا میں ۲۳ دن تک تشریف فرما ہے۔ شاہ رفیع الدینؒ کی تفسیر کے مطابق آپ صرف تین دن بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ بہر حال حجۃ الوداع والی آیت کے ذریعہ اللہ نے تکمیل دین کا اعلان فرمایا اور پھر اس آخری آیت میں محاسبہ کی یاد دہانی کر کے وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ اس آیت کو سورہ بقرہ میں اسی مقام پر رکھنے کا حکم بھی خود اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے دیا۔

آیت نمبر ۳

درس یکصد و بہت دس (۱۲۳)

الْبَقَّةُ

آیت نمبر ۲۸۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّعَيَّنٍ
فَاعْتَبُواهُ وَلْيَكُنْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ
كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْهُ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ
شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا
أَوْ لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمْلَ هُوَ فليُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ

تس جہاں اے ایمان والو! جب تم آپس میں اور حاکم کا معاملہ کرو وقتِ معررہ تک
تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھے کوئی لکھنے والا انصاف کے
ساتھ۔ اور نہ انکار کرے کوئی کاتب (لکھنے والا) اس بات سے کہ وہ لکھے جیسا کہ اس کو
اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے۔ اور اس کو چاہیے کہ وہ لکھ دے۔ اور چاہیے کہ نکھوائے وہ شخص
جس کے اوپر حق ہے۔ اور اس کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرنا ہے جو اس کا پروردگار ہے اور
اس میں سے کسی چیز کو کم نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس کے اوپر حق ہے، بے عقل ہے یا
کمزور ہے، یا نکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا، پس چاہیے کہ نکھوائے اس کا سرپرست
انصاف کے ساتھ۔

اس سورۃ کے چھتیسویں رکوع سے مالی مسائل بیان ہو رہے ہیں۔ پہلے صدقہ و
خیرات کے متعلق مختلف مسائل کا ذکر ہوا۔ پھر سود کی حرمت اور اس کے احکام بیان
ہوئے۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے فرض یا ادا کار کے قوانین نازل فرمائے
ہیں۔ یہ ایک دروس کے ساتھ لکین دین کے معاملات ہیں۔ ان میں تین بنیادی
قوانین ہیں اور ان کے ساتھ کچھ ضمنی مسائل ہیں۔ بنیادی قوانین میں

دستاویز کی
اہمیت

دستاویز کی تیاری، گوہر کا تقرر اور رہن کی تفصیلات شامل ہیں ان کے ذریعے ادھار کے معاملات میں کسی ممکنہ تنازعہ سے بچا جاسکتا ہے۔ آج کے درس میں تحریر یعنی دستاویز کی تیاری کے متعلق احکام ہیں۔ آج کے دور میں تحریر کر لینا ایک معمول بات نظر آتی ہے۔ کیونکہ تعلیم عام ہے۔ اور یہ کام آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مگر جو وہ صدیاں قبل جب کوئی پڑھا لکھا آدمی خال خال ہی نظر آتا تھا، تحریر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اُس وقت لوگ اپنے معاملات عموماً زبانی ہی طے کرتے تھے جس کی وجہ سے اکثر جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے۔ لہذا تحریر کے یہ احکام نازل کیے گئے۔

کسی امر میں تحریر کر لینا کوئی فرض واجب تو نہیں مگر معاملات کی درستگی کیلئے مستحب کے درجہ میں آتا ہے معاملہ طے کرنے کے بعد آدمی بھول بھی سکتا ہے کہ کیا شرطیں تھیں، یہ متواتر تھی نسی ادم فَنَسِيتَ ذُرِّيَّتَهُ کے مصداق حضرت آدم علیہ السلام سے چوک ہوئی تو ان کی اولاد بھی بھول جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات کو طائی جھگڑے تک پہنچتی ہے اگر تحریر موجود ہوگی۔ تو تنازعہ کے وقت کام آئیگی۔ اور کوئی عدالت اس تحریر کی بنا پر فیصلہ کر سکیگی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دستاویز کے احکام نازل فرمائے تاکہ معاشرہ میں اس وجہ سے بگاڑ پیدا نہ ہو۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ تعلیم جبری ہونی چاہیے تاکہ لوگ معاملات کو درست رکھ سکیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنِّي لَآتِيكُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى جب تم کسی خاص مدت تک ادھار کا معاملہ کرو فَاكْتُبُوهُ پس اس کو لکھ لیا کرو۔ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ کیونکہ قلم کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ باادقات اسکی وجہ سے بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے لہذا کاتب کے لیے ضروری ہے۔ وَلَا يَأْتِ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے جب کہ اللہ نے اُسے علم دیا ہے۔ فَلْيَكْتُبْ بلکہ چاہیے کہ وہ لکھ دے یعنی جب کسی ان پڑھ شخص کو تحریر کی ضرورت ہو تو پڑھے

پہلے بیان ہو چکا ہے ”مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا“ جو اللہ کو قرض حسن
 دے۔ یعنی کسی ضرورت مند کو مقررہ مدت کے لیے نقد رقم ادھار پر دے دے اور اس سے
 زائد وصول نہ کرے۔ اگر نقد رقم کی واپسی پر اُس کے ساتھ کچھ زائد وصول کرے گا تو وہ
 سود ہو گا، جس کی حرمت کا بیان آچکا ہے۔ البتہ اگر کسی چیز کے تبادلے کے ضمن میں کوئی
 نقد رقم واجب الادا ہے۔ تو وہ ادھار ہے۔ اس صورت میں چیز بیچنے والا اپنی
 اصل لاگت سے زائد بھی لے سکتا ہے۔ جسے منفعہ کہتے ہیں۔ اور یہ جائز ہے۔ اس
 آیت کریمہ میں اسی بات کا تذکرہ ہے۔ کہ جب رقم مقررہ مدت کے لیے ادھار کا معاملہ
 کر لو تو اسے کچھ لیا کر دو۔ کئی شخص مکان یا زمین بیچتا ہے۔ کوئی جائزہ فروخت کرتا ہے
 جنس کا سودا ہوتا ہے۔ اور رقم کی ادائیگی کے لیے تاریخ یا دن کا تقرر ہوتا ہے۔ تو مشتری
 کے نوے دین یعنی ادھار ہے۔ جو وہ مقررہ تاریخ پر لو کر نے کا پابند ہے۔ عام طور
 پر خرید و فروخت نقد ہوتی ہے۔ لاکھ کے پاس چیز موجود ہے۔ اور لاکھ کے پاس
 رقم موجود ہے۔ تو تبادلہ دست بدست ہو جائیگا۔ اور اگر لاکھ قیمت کی ادائیگی کے لیے
 دولت طلب کرے۔ تو یہ ادھار کہلائے گا۔ ہاں اگر دونوں طرف چیز موجود نہ ہو۔ نہ
 لاکھ کے پاس چیز موجود ہے اور نہ لاکھ کے پاس رقم اور سودا طے پا جاتا ہے
 مثلاً زمیندار کہتا ہے کہ آئندہ فصل پر میں فلاں جنس اس بجائے فروخت کر دوں گا۔ یا
 کارخانے کی فلاں میٹھے کی فلاں پیداوار سنے دام میں دوں گا، اور لاکھ اُسے تسلیم کر
 لیتا ہے۔ تو شرعی اصطلاح میں اسے بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں۔ یہ ناجائز ہے
 فُہی عن بیع الکالی بالکالی ایسی خرید و فروخت سے شریعت نے منع کر دیا ہے۔

خرید و فروخت کی باقی دو صورتیں جائز ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ قیمت
 موجود ہے مگر چیز موجود نہیں وہ ادھار ہے۔ اس کو بیع سلم کہتے ہیں حضور علیہ السلام
 کا ارشاد ہے۔ فَلْيُسَلِّمْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ وَوزنٍ مَعْلُومٍ إِلَى أَحْبَلٍ
 یعنی بیع سلم بعین شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ جب کہ اس کی پیمائش، وزن یا مدت
 معلوم ہو اور جبکہ بھی معلوم ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ جنس بھی معلوم ہونی چاہیے

اور بجاوٹے کر لینا ضروری ہے۔ مثلاً دو فرائضوں کے درمیان طے پانا ہے۔ کہ فلاں چیز یا جنس کا اتنے تول یا ماپ میں فلاں تاریخ کو اس بجاوٹے میں دین ہوگا۔ چنانچہ قیمت نقد ادا کر کے سودا طے پاتا ہے۔ تو یہ درست ہے۔ چیز کے ماپ تول میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اور بجاوٹے مطابق اس کی کل قیمت میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ بیع سلم کے لیے بعض دیگر شرائط بھی ہیں مثلاً یہ کہ سوئے کی مدت کم از کم پندرہ دن ہونی چاہیے۔ بعض نے ایک ایک ماہ کا تعین کیا ہے۔ ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس چیز کا سودا ہو رہا ہے وہ مارکیٹ سے بالکل معدوم نہ ہو بلکہ معاہدہ طے پاتے وقت بازار میں موجود بھی ہو۔ اس قسم کی بیع میں مدت تبادلہ واضح ہونی چاہیے۔ اگر مدت کا تعین نہیں ہوگا تو بیع درست نہ ہوگی۔ مثلاً اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے کہ جنس کا تبادلہ اس وقت ہوگا جب فصل پکے گی جب کہ فصل پکنے اور کٹنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ اسی طرح کوئی شخص یہ سودا کرتا ہے کہ جب جانور بچہ دیگا، اُس وقت قیمت ادا کی جائے گی۔ اس قسم کی مجہول مدت قابل قبول نہیں اور ایسی بیع فاسد شمار ہوگی۔ اَجَلٌ مُّسَمًّى کا لفظ وضاحت کر رہا ہے۔ کہ مدت کا تعین لازمی ہے کہ فلاں دن یا فلاں تاریخ کو چیز وصول کی جائے گی۔ اور اگر مدت مجہول ہو تو اسے بیع الغرر کہتے ہیں۔ یہ دھوکے والی بیع ہے۔ اور شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔

بیع سلم کی دوسری صورت یہ ہے کہ چیز موجود ہے، وہ گاہک وصول کر لیتا ہے مگر قیمت فوری طور پر ادا نہیں کرتا بلکہ خاص مدت کے لیے ادھار کر لیتا ہے یہ بھی جائز ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا حضور! آپ کے پاس اوڑھنے کے لیے کپڑا نہیں ہے۔ فلاں یہودی کے ہاں کپڑا موجود ہے۔ آپ پیغام بھیج کر کپڑا ادھار لے لیں۔ اور مدت مقررہ پر رقم ادا کر دیں۔ حضور علیہ السلام نے یہودی کو ایسا پیغام بھیجا تھا، مگر اُس نے کپڑا بیٹے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم بیع کی یہ صورت بھی جائز ہے۔ مدت مقرر کر کے قیمت کا ادھار کیا جاسکتا ہے۔

ادائیگی قرض کا
عجیب واقعہ

قرض کی واپسی کس قدر ضروری ہے۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے سابقہ امت کا ایک عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا۔ فرماتے ہیں۔ ایک شخص نے دو سو روپے مقررہ مدت کے لیے ایک ہزار دینار قرض لیا۔ قرض خواہ نے کہا۔ کہ کوئی گواہ لاؤ، تو ضرورت مند کہنے لگا۔ میرا گواہ تو اللہ ہی ہے۔ پھر اس نے کہا۔ کوئی ضامن ہی لاؤ۔ تو وہ کہنے لگا۔ میرا ضامن بھی اللہ ہی ہے۔ غرض اس نیک دل آدمی نے بغیر گواہ اور ضامن کے ایک ہزار دینار قرض میں دے دیے۔ اتفاق ایسا ہوا۔ کہ جب قرض کی ادائیگی کا وقت آیا، تو مقرض دریا سے اُس پار سفر پر تھا، تاہم اُسے ادائیگی قرض کی ذمہ داری کا احساس تھا۔ وہ کنارے پر آیا، مگر کوئی کشتی نہ پائی جو اُسے دو سو روپے پر پہنچا دے۔ سخت پریشان تھا کہ قرض کی ادائیگی وقت پر نہ ہو سکے گی۔ اسی سوچ بچا میں اُس نے دونوں ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں دُعا کے لیے اٹھائیے اور عرض کیا، اے مولا کریم! میں نے فلاں شخص کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ کہ اس کی رقم فلاں تاریخ کو لوٹا دوں گا۔ رقم موجود ہے۔ مگر دریا کے پار جانے کے لیے سواری موجود نہیں۔ اگر قرض خواہ کو رقم وقت پر نہیں ملتی تو وعدہ خلافی ہوتی ہے۔ اے اللہ! اب تو ہی اس کا انتظام فرما۔ آخر اس لمحے دل میں ایک خیال آیا۔ اُس نے ایک بکڑی لی۔ اس کو کھوکھلا کر اس میں ایک ہزار دینا اور قرض عطا کے نام ایک رقم رکھ دیا۔ پھر اس کا منہ اچھی طرح بند کر کے اس کو دریا میں ڈال دیا اور خود پھر اُدھر کشتی تلاش کرنے لگا۔ اُدھر قرض خواہ کو یاد آیا کہ آج قرض کی ادائیگی کی تاریخ ہے۔ اور مقرض دریا سے اُس پار گیا ہوا ہے۔ پتہ نہیں آتا ہے یا نہیں۔ اسی خیال میں وہ دریا کے کنارے پہنچا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی کشتی آتی دکھائی نہ دی۔ وہ مایوس ہو گیا۔ وہ واپس آنے ہی والا تھا۔ کہ اُسے بہتی ہوئی ایک بکڑی نظر آئی۔ اُسے قریب سے بکڑی کو پکڑ لیا کہ گھر میں کسی کلمہ کہے گی۔ یا ایندھن کے طور پر ہی استعمال کر لیں گے۔ گھر پہنچ کر جب اس کو توڑ دیا۔ تو اس میں سے ایک ہزار دینار اور مقرض کا رقم ملا۔ وہ شخص اپنا قرض واپس پا کر مطمئن ہو گیا۔

وَلَا يَبْخَسُ مِنْهُ شَيْئًا اور تحریر کرتے وقت کسی چیز کی کمی نہ کرے، بلکہ دستاویز بالکل درست طور پر بکھولے۔ کہ اتنی رقم یا غلام چیز قرض پر لی گئی ہے۔ اور یہ غلام غیر سچ کو غلام مگر واپس کر نی ہے۔ بعض اوقات لکھاتے وقت بھی ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ اور تحریر میں زبانی معاہدے کے برخلاف لکھواتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے اور انصاف کی بجائے ظلم قائم ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بکھولنے والا اس قابل نہیں ہوگا کہ وہ درست طریقے سے دستاویز تیار کر سکے۔

ایسی صورت کے متعلق فرمایا: كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ ضَعِيفًا أَوْ ضَعِيفًا اَفَلَا يَنْطَلِقُ اَنْ يَعْمَلَ هُوَ يَعْنِي اگر مقروض جسے دستاویز بکھولنے کا حق ہے، بے عقل ہے یا ضعیف ہے۔ یا تحریر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مقصد یہ کہ اس میں کوئی ایسی فطری کمزوری ہے جسکی بنا پر وہ درست تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا کم عقل ہے۔ کہ معاملے کو سمجھتا نہیں۔ یا بہت کمزور یا بولڑھا ہے کہ اس درست نہیں یا زبان نہ جاننے کی وجہ سے لکھانے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو فرمایا فَلْيُكَلِّمْ وَلْيُفِي بِالْعَدْلِ اس کے ترجمان، اولیٰ اس پر بہت امانت دہ یا وکیل کی ذمہ داری ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ تحریر مکمل کر لے۔ اور کسی قسم کی رو رعایت نہ کرے۔ ادھر سے متعلق باقی دو قوانین یعنی گواہی اور رہن کا ذکر آئندہ دروس میں آئیگا۔

وَأَسْتَشْهِدُ وَآشْهِدَیْنِ مِنْ رِجَالِکُمْ فَإِنْ لَوْ يَكُونُ
رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَآمْرَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ
أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ وَلَا
يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذْ أَكَادُ عَوَاطِلَ لَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا
أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ
وَإِذْنِي الْأَتْرَابُ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا
بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا
إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَلَنْ تَفْعَلُوا
فَإِنَّهُ مُسَوِّغٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

شَیْءٌ عَلَیْكُمْ (۱۳۲)

تجہیز نہ اور گواہ بنا دو گواہ اپنے مردوں میں سے۔ پس اگر نہ ہوں "مرد" تو ایک مرد
اور دو عورتیں ان میں سے جن کو تم گواہوں میں سے پسند کر سکتے ہو اس وجہ سے کہ
اگر ان دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔ اور
گواہ انکار نہ کریں جس وقت ان کو بلایا جائے گواہی کے لیے، اور نہ دیگر ہو اس
بات سے کہ کچھ رقم معاملے کو چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مدت تک، یہ بات زیادہ نقصان
والی ہے اللہ کے نزدیک، اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی ہے۔ اور یہ
زیادہ قریب ہے کہ تم شک نہ کرو مگر یہ کہ دست بدست تجارت ہو جس کو تم اپنے
درمیان گردش دیتے ہو۔ اور تم پر گناہ نہیں ہے۔ اس بات میں کہ اسے نہ کھو، اور
گواہ بناو جس وقت تم سود کرتے ہو، اور نہ نقصان پہنچایا جائے رکھنے والے کو

اور دو گواہ کو، اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے اندر فسق اور نافرمانی والی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور اللہ تم کو سکھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے (۲۸۲) ادھار کے معاملے سے متعلق تین قوانین کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے ربطیات یعنی دستاویز کی تیاری، گواہی اور رہن۔ ان میں دستاویز یعنی تحریر کے احکام بیان ہو چکے ہیں۔ آج کے درس میں گواہی سے متعلق احکام ہیں اور اس کے ساتھ تحریر کی دوبارہ تائید آئی ہے۔ البتہ سرے اصول یعنی رہن کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آئے گا۔

اپس میں یوں کہتے وقت یا کوئی دیگر معاملہ طے کرتے وقت سنر یا
 اِسْتَشْهَدُوا مَشْهَدَيْنِ مِنْ رَجَالِكُمْ پنے میں سے دو گواہ مقرر کر لو۔
 دواہی کی ضرورت مختلف معاملات میں پڑتی ہے مثلاً مقدمات میں سے فوجداری
 مقدمہ اور دیوانی مقدمہ میں گواہی کے معیار مختلف ہیں۔ اسی طرح دینی معاملات اور
 نبوی معاملات میں گواہی کی شرائط مختلف ہیں۔ تو جس قسم کا معاملہ درپیش ہوگا
 اس کے مطابق گواہی کی شرائط عائد ہونگی۔ عام معاملات میں اس آیت کی رو سے
 کم از کم دو گواہ ہونے چاہئیں۔ مگر حدیث نبوی کی روایت کے متعلق ایک نکتہ
 دمی کی شہادت بھی کافی ہے۔ عام معاملات میں آزاد مرد کی گواہی قابل قبول ہوتی
 ہے، غلام کی گواہی معتبر نہیں ہوتی۔ روایت کے مسئلہ میں اگر استاد اور شاگرد
 یہ مجلس میں موجود ہوں تو شاگرد کی روایت مقبول ہے۔ مگر دینی معاملات میں شہادت علی الشہاد
 کا اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب اصل موجود ہو، تو فرع کی گواہی معتبر نہیں سمجھی جاتی۔ یعنی
 اصل کی موجودگی میں فرع گواہی نہیں دے سکتا۔

اس آیت کریمہ میں جس گواہی کا ذکر ہے، وہ عام معاملات سے متعلق ہے
 ان میں سے فوجداری مقدمات میں سے حدود و قصاص کے مقدمات میں صرف
 مردوں کی گواہی قابل قبول ہے۔ عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی۔ زنا کے
 مقدمہ میں سورۃ نور میں بَارُبْعَةٍ شَہَدَآءُ کا ذکر ہے۔ یعنی چار مرد یعنی گواہ

ہونے چاہئیں۔ وہاں پر عورتوں کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ عام طور پر نابالغ بچے کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی، مگر اہم مالک بعض شرائط کے ساتھ بچے کی گواہی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دیگر ائمہ کا موقف یہ ہے کہ گواہی کے سلسلے میں رجال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد نابالغ مرد ہے، ان کے نابالغ بچہ، اسی طرح مسلمان کی گواہی مستحب ہے۔ مگر کافر کی گواہی قابل قبول نہیں۔ جب کہ وہ مسلمان پر ہو۔ ہاں کافروں کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف درست ہے۔ علاوہ انہیں گواہ کا عادل ہونا بھی شرط ہے۔ فاسق کی گواہی مستحب نہیں۔ جو شخص شرعی حدود کی علی الاعلان خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ فاسق ہے اور ایسے شخص کی گواہی بھی مقبول نہیں۔ پھر گواہ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جس معاملے کے متعلق گواہی دے رہا ہے۔ اس معاملے کا اسے علم ہو۔ اگر اسے علم ہی نہیں۔ تو پھر اس کی گواہی چھوٹی ہے۔ وہ تو جھوٹا گواہ کہلائے گا۔

شہادت میں گواہ کا ذاتی مفاد نہیں ہونا چاہیے اگر اسے کوئی ذاتی مفاد پہنچ رہا ہے تو ایسی گواہی مردود ہوگی۔ یا اگر گواہ اس لیے گواہی دے رہا ہے کہ وہ خود کی نقصان پہنچ جائے تو ایسی گواہی بھی مقبول نہیں ہوگی۔ ایسی طرح گواہ لالچی اور بے عزت نہیں ہونا چاہیے جس کے خلاف گواہی دے رہا ہے اسے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی ہونی چاہیے۔ اگر گواہ باطل ہو جائے تو اسے کلام فرماتے ہیں کہ جہاں تمام کا اطلاق ہوتا ہو وہاں بھی گواہی قبول نہیں کی جائیگی مثلاً باپ بیٹے کے باپے میں گواہی دے تو نا منظور ہوگی۔ یا غلام نوکر وغیرہ اپنے مالک کے حق میں گواہی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ محکوم ہے اور لازماً اپنے حاکم کے حق میں جگلا۔

فرمایا معتبر گواہی یہ ہے کہ تم میں سے دوسرے گواہی دیں فَإِنْ لَمْ يَكُنْ رَجُلَيْنِ اور اگر دوسرے گواہ میسر نہ ہوں فَزَجَلْ وَأَمْرَاتُنِ تو ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں۔ یعنی دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا۔ اور یہ گواہ ایسے ہوں مَعْنُ تَرْضَوْنَ مِنَ الشَّهَدَاءِ جو تمہیں پسند ہوں۔ ظاہر ہے کہ پسند نہی ہوئے جو نیک اور عادل ہوں گے۔ جن سے ٹھیک ٹھیک گواہی کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ بغیر ثقہ اور جبرئیل آدمی سے درست گواہی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

فرمایا ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو اکٹھا کھنے میں حکمت یہ ہے۔
 أَنْ تَفْضَلَ إِحْدَهُمَا _____ اگر ان میں سے ایک مقبول جائے۔ فَتَذَكَّرَ

اِحْدَاهُمَا الْاُخْرٰی کو دوسری اُسکو یاد دلانے کیونکہ عورتیں عام طور پر مردوں کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہیں، ان کے دماغ میں رطوبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان سے نسیان زیادہ واقع ہوتا ہے اور وہ بھول جاتی ہیں یہ ایک انسانی فطرت ہے مگر نہ بعض عورتیں بڑی ذہین ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ایک لڑکی امتحان میں لڑ کے سے زیادہ نمبر حاصل کر لیتی ہے۔ بعض عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت بخشی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات مردوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ثابت ہوتی ہیں۔ تاہم عام فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ قانون عطا کیا۔ کہ چونکہ عورت کا مزاج اعصابی ہوتا ہے۔ اکثر بھول جاتی ہیں۔ اللہ نے دماغی کیفیت ہی ایسی بنائی ہے۔ لہذا ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ خطبہ کے دوران فرمایا کہ عورتیں ناقصات العقل والبدن ہیں۔ ایک عورت نے عرض کیا کہ ہم ناقص العقل ہیں۔ ہم میں کیا کمزوری پائی جاتی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کیا اللہ نے دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر نہیں رکھی۔ تو اس نے عرض کیا۔ ہاں حضور ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ عقل کی کمی کی وجہ سے ہے۔ عورت میں نسیان یعنی بھول کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ عورتوں میں دین کا نقصان یہ ہے۔ کہ وہ ہر ماہ کئی کئی روز تک نماز نہیں پڑھ سکتیں، روزہ نہیں رکھ سکتیں، یہ دین کا نقصان ہے۔ اگرچہ گناہ نہیں ہے۔ یہ ان کی مجبوری ہے مگر نقصان تو بہر حال ہے۔

یہ شہادت کا قانون ضروری ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ کسی مقدمہ کا فیصلہ دو طریقہ سے ہو سکتا ہے۔ یا تو فریقین گواہ پیش کریں گے یا فیصلہ قسم پر ہوگا۔ مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے۔ قضی بینہما وشاہد یعنی حضور علیہ السلام نے یا تو گواہوں پر فیصلہ فرمایا یا قسم پر۔ یعنی اگر گواہ موجود نہیں ہیں۔ تو پھر فیصلہ قسم کے ذریعے ہوگا۔ اہم شافعی تفسیر بھی فرماتے ہیں کہ معاملات میں چونکہ دو گواہ ضروری ہیں۔ اور اگر دو کی بجائے صرف ایک ہی گواہ میسر ہو، تو دوسرے

گواہ کی کئی قسم اٹھانے سے پوری ہوگی، وگرنہ فیصلہ درست نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ کرام فرماتے ہیں۔ البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر یعنی گواہ پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے اور قسم اٹھانا مدعا علیہ کے ذمہ ہے۔ بہر حال حضور نے بعض اوقات گواہوں پر فیصلہ کیا اور بعض اوقات قسم پر یعنی اگر موقع کا کوئی گواہ موجود نہیں ہے۔ تو مدعا علیہ کی بریت کے متعلق اس سے قسم اٹھوائی کہ وہ بے گناہ ہے۔

گواہ کی ضروری گواہوں کی حاضری کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا اور جب گواہوں کو طلب کیا جائے تو وہ گواہی کے لیے آنے سے انکار نہ کریں۔ یہ اُن کی ذمہ داری ہے۔ کوئی معاملہ الجھ گیا ہے۔ وہ موقع کے گواہ ہیں تو انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک شہادت دیکر معاملہ کا تصفیہ کر دیں۔ یہ اُن کی اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ تاہم فقہائے کرام فرماتے ہیں، کہ گواہ کا گواہی دینا استعجاب کے درجے میں ہے، اسے گواہی کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر معاملہ اس پہنچ کا ہے کہ کوئی اور گواہ نہیں ہے۔ صرف یہی ایک گواہ ہے۔ جو شہادت دینے پر آمادہ نہیں۔ تو ایسی صورت میں اس پر واجب ہو جاتا ہے۔ کہ وہ گواہی کے لیے حاضر ہو، وہاں انکار کی کوئی گنجائش نہیں ایسے ہی معاملہ سے متعلق فرمایا۔ کہ جب گواہوں کو شہادت کے لیے طلب کیا جاوے تو وہ انکار نہ کریں۔

جھوٹی گواہی حضور علیہ السلام نے جھوٹی گواہی (شہادتِ زور) کو شرک کے برابر قرار دیا ہے خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ فرقان میں عباد الرحمن کی صفات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی ہے "وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ" کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی دنیا سخت گناہ کی بات ہے۔ اس کی وجہ سے ہی جھوٹ کا سچ اور سچ کا جھوٹ بن جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انگریز کے بنائے ہوئے قاذون کے مطابق شہادت خود بنائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں گواہ آزاد نہیں ہوتا۔ کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق

شہادت دے بلکہ دلیل حضرات اور خود پولیس دے گواہ کو کھاتے پڑھاتے ہیں۔ کہ اس طرح کنسا ہے۔ اور اس طرح نہیں کہنا۔ یہ چیز دینا مٹا رہی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم فرمایا ہے۔ "اقِمْوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ" اللہ کے لیے بغیر کسی روایت کے گواہی دو۔ کسی امیر غریب، چھوٹے بڑے، اعلیٰ ادنیٰ کا لحاظ نہ کر دہکے صحیح صحیح واقعہ بیان کر دو۔ نہ کسی فریق سے ناجائز امید رکھو اور نہ کسی کے شر کا خوف دل میں لاؤ بلکہ گواہی کو محض اللہ کے لیے قائم کر دو۔ اگر یہ چیز پیدا نہ ہوگی، تو دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ لوگ ذلیل و خوار ہی ہوتے رہیں گے۔ لہذا اگر گواہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس کے بغیر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

محرر یک
مزدوری ہے

آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے تحریر کی دوبارہ تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا
وَلَوْ تَسَمَّوْا اَنْ تَكْتُمُوْهُ صُغِيْرًا وَّكَبِيْرًا اِلٰى اَجَلٍ مُّعَدٍّ لَّكُمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ
بڑا، معمولی نوعیت کا ہو یا اہم ٹسے لکھنے میں دیکھ نہ ہوں یعنی تحریر میں تاہل نہیں کرنا
چاہیے۔ بلکہ ٹسے مدت مقررہ تک کچھ لینا چاہیے۔ مستدرک امام حاکم کی روایت
ہے جسے امام ابن کثیر نے بھی بیان فرمایا ہے۔ کہ حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے ارشاد فرمایا، کہ تین قسم کے آدمیوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ پہلا شخص وہ ہے
جو خود مومن اور عادل ہے۔ مگر اس کی بیوی بد کردار، بد اخلاق اور فاسق ہے وہ
سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتی۔ اگر ایسا شخص بڑی عورت کو طلاق دے کر جدا نہیں
کرتا، تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ دوسرا
شخص وہ ہے۔ جو کسی یتیم کا سرپرست ہے مگر یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے
ہی اس کا مال اس کے حوالے کر دیتا ہے اور بچہ مال کو ضائع کر دیتا ہے۔ یا لے
شخص کی دعا بھی مستبول نہیں ہوتی، فرمایا، تیسرا شخص وہ ہے، جو کسی کو قرض دیتا
ہے مگر اسے لکھا نہیں، یہ شخص بھی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کر رہا ہے
لہذا اس کی دعا بھی مستبول نہیں ہوتی۔

فرمایا تحریر کر لینا فَذَلِكُمْ اَفْطَرُ عِنْدَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ

انصاف والی بات ہے۔ وَأَقُومُوا لَشَهَادَتِهِ اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی چیز ہے۔ وَأَدْلُوا لَنَا بَلَاءُ اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک و شبہ میں نہ پڑو۔ یہ سب تحریر کے فوائد میں سے ہیں۔ ہاں ایک صورت میں عدم تحریر کی گنجائش ہے إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُوكَ بِأَيْدِيكُمْ کہ دست بہ دست تجارت ہو جسے تم اپنے درمیان گردش دیتے ہو۔ یعنی معاملہ ایسا ہو کہ اُدھر چیز لی اور اُدھر رقم ادا کر دی یعنی سودا بالکل نقد ہے۔ اس میں ادھار کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا تو پھر نہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ تحریر کا مقصد قہر ہے کہ مقررہ مدت پر جب لین دین ہو، تو کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ مگر جب ادھار کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ اور تعین مدت کا سوال ہی نہیں تو پھر تنازعہ پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لہذا نقد معاملے میں تحریر کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر ایسی صورت میں بھی کوئی لکھنا چاہے۔ تو اس سے۔ اگر آئندہ زمانے میں معاملے کی نوعیت معلوم کرنا چاہو، تو تحریر کے ذریعے ٹھیک ٹھیک معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ تاہم ایک عام اصول یہ بتایا کہ لین دین کے معاملہ میں وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ سودا کرتے وقت گواہ ضرور بنا لو۔ اگر اس کی تحریر نہیں کرتے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر گواہ ضرور بنا لو کہ لین دین کا معاملہ ہے کسی وقت بھی کوئی تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے جس سے عہدہ بڑھانے کے لیے گواہی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں کتنا بہت اور گواہ کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ وہاں کاتب اور گواہ کا تحفظ بھی فرمایا ہے۔ تنازعہ کی صورت میں بعض اوقات فریقین کے ساتھ کاتب اور گواہ کو بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے زمانے میں کوئی شخص گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ اُسے کتنی دفعہ عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ اور اُس کا کتنا وقت ضائع ہوگا۔ اور پھر جس کے خلاف گواہی دیگا۔ وہ اس کا دشمن بن جائے گا اور اُسے نقصان پہنچائے گا۔ گواہی سے باز رکھنے کے لیے کہتے

کاتب اور
گواہ کا تحفظ

گواہوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے معاملے کے فریقین کو نصیحت فرمائی ہے وَلَوْ يَضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ اور نہ نقصان پہنچایا جائے لیکن طے کر لے کہ گواہ نہ گواہ کو۔ اگر ان اصحاب کو اور کوئی تکلیف نہ ہو تو کم از کم ان کے وقت کی قدر اور ان کی سواری کا انتظام تو ہونا چاہیے تاکہ کسی دوسرے شخص کی گواہی کے لیے انہیں ذاتی طور پر نقصان نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ دوئے نقصان نہ پہنچاؤ۔

فرمایا وَإِنْ تَفْعَلُوا أَكْرَمْتُمْ آبَاءَكُمْ ان شریف آدمیوں کو نقصان نہ پہنچاؤ گے، ان کا تحفظ نہیں کرو گے۔ فَإِنَّهُ قَسْوَقٌ بِكُمْ یہ فسق ہو گا، خدا کی اطاعت سے باہر نکلنے کے مترادف ہو گا، لہذا جہاں اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہو، وہاں کاتب اور گواہ کی جان و مال کے بھی محافظ بنو، اور انہیں ناجائز تکلیف نہ پہنچاؤ۔

فرمایا وَاتَّقُوا اللَّهَ اللہ سے ڈر جاؤ۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا خود خدا معاملہ میں دین کا برباد کناح طلاق کا، ہر حالت میں خوف خدا کو دل سے نہ نکالنا۔ دنیا کے معاملات کے متعلق ہمیرا پھیری کر کے، دھوکا اور فریب دیکر معاملے کو رفع دفع کر لینے سے بظاہر مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ یاد رکھا ہے ہیں۔ کہ یہ معاملہ ایک دین اللہ کی عدالت میں بھی پیش ہوتا ہے۔ یہاں تو تم چالاک کہہ کے مواخذہ سے بچ جاؤ گے مگر اس سب سے بڑی عدالت کے سامنے کوئی چال کام نہیں آئے گی۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔ لہذا اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ جس کی عدالت میں بالآخر تمہیں پیش ہونا ہے۔ فرمایا وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ اللہ تمہیں ایسی ہی نیکی اور اچھائی کی باتیں سکھاتا ہے۔ دلیالی اور فوجداری مقدمات کے معاملات اور ان کے متعلق احکام تمہیں اللہ تعالیٰ سکھاتا ہے۔ ان پر عمل کرو گے تو اس دنیا میں بھی چین کی زندگی بسر کرو گے اور آخرت میں بھی اس کی گرفت سے بچ جاؤ گے اور یاد رکھو وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ تمہارے حال سے ناواقف ہے بلکہ وہ تمہاری غمتوں سے بھی واقف ہے لہذا تم اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتے

اپنے اعمال کو ہمیشہ درست رکھو گے، تو فلاح پاؤ گے۔
 قرآن پاک کی یہ سب سے لمبی آیت ہے اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے
 بیسیوں مسائل بیان فرمائے ہیں۔ تاہم مہینہ دین کے معاملے میں دو قوانین یعنی تحریر اور
 گواہ کا بیان آچکا ہے۔ اب اگلی آیت میں تیسرے اہم قانون رہن کا تذکرہ ہوگا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

الْبَقَّة ۲

صاحبِ مکتبہ ربیع (۱۲۵)

آیت ۲۸۳

وَأَن كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ
مَقْبُوضَهُ فَإِن أَهَمَّ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي
أُؤْتِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ
وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمُ قَلْبًا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
عَلِيمٌ ۲۸۳

۲۸۳

مَن جہیں : اور اگر تم سفر میں ہو، اور کاتب (لکھنے والے) کو نہ پاؤ، پس یہی ہے
قبضہ کیا ہوا۔ پس اگر تم میں سے بعض کو بعض پر اعتبار ہو، پس چاہیے کہ وہ شخص ادا کرے
اس چیز کو جس میں اس پر اعتبار کیا گیا ہے اور جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے۔ وہ
اپنی امانت کو ادا کرے اور ڈرتا ہے اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور مت چھپا
گواہی کو۔ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے گا، بیشک اس کا دل گنہگار ہوگا اور اللہ
جو کچھ تم کام کرتے ہو، اس کو خوب جانتا ہے۔ ۲۸۳

رابطہ

اس سے پہلے لین دین کے معاملے سے متعلق دو احکام کا بیان آچکا ہے۔
سب سے پہلے اللہ جل شانہ نے تحریر کے متعلق احکام اور اس کی اہمیت بیان
فرمائی۔ پھر ایسے معاملات میں گواہ کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا ذکر فرمایا۔ اب اگلی
آیت میں قیصرے اصول یعنی رہن کے متعلق مسائل کا تذکرہ ہے۔ یعنی جب کسی کو
ادھار دو اس کے بدلے میں کوئی چیز رہن کے طور پر رکھ لو۔ جب قرضہ واپس ہوگا
تو رہن شدہ چیز واپس کر دی جائے گی۔

مکہ میں

رہن وہ چیز ہوتی ہے۔ جو قرض کے بدلے میں کسی شخص کے پاس رکھی جاتی ہے
اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر قرضہ کی رقم مقررہ مدت میں ادا نہ کی جائے تو قرض خواہ
اس چیز کو فروخت کر کے اپنی رقم پوری کرے، اور جو کچھ باقی بچے وہ ضرور اس کو لوٹائے

اس اصطلاح میں مقررہ یا مدیون کو رہن کہتے ہیں کہ اُس نے کوئی چیز رہن رکھی ہے اور جس کے پاس رہن رکھی جادے وہ مرتہن کہلاتا ہے۔ رہن میں چیز پر قبضہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر رہن مکمل نہیں ہوتا۔ فَرِهْنُ مَقْبُوضَةٌ میں اسی طرف اشارہ ہے رہن میں منقولہ یا غیر منقولہ کوئی بھی جائیداد رکھی جاسکتی ہے مثلاً مکان، زمین، باغ۔ جانور، زلیور، گاڑی وغیرہ وغیرہ۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ اور اگر تم سفر پر ہو فَلَكُمْ تَجْدُوا کتابت اور کتابت نہ ملے فَرِهْنُ مَقْبُوضَةٌ پس رہن ہے قبضہ کیا ہوا۔ اس آیت کریمہ میں رہن کے لیے سفر کی حالت ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تم سفر کی حالت میں ایسا کر سکتے ہو، مگر فقہائے کرام اور محدثین عظام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رہن حضر یعنی اقامت کی حالت میں بھی درست ہے۔ اور یہاں پر سفر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس عمل کی ضرورت سفر میں زیادہ ہوتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ کھنے والا میسر نہ ہو تو پھر اس کے بغیر چارہ نہیں کر سکتے رہن کی کوئی چیز بطور رہن رکھ لے۔ اور جب رہن قرضہ واپس کرے تو اپنی مرتبہ چیز واپس لے لے۔ اقامت کی حالت میں رہن خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے، بخاری اور ترمذی شریف کی صحیح حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے اپنے گھریلو اخراجات کے لیے مدینہ کے ایک یہودی (ابو ائیم) سے بیس صاع اور بعض روایات کے مطابق تیس صاع انج ادھار پر لیا تھا۔

اور اس کے بدلے میں اپنی درع یہودی کے پاس رہن رکھی تھی مگر آپ نے اپنی حیات مبارکہ میں واپس نہ لے سکے۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے قرض ادا کر کے درع واپس لی۔ مقصد یہ کہ رہن آپ نے مدینہ میں قیام کے دوران رکھا تھا۔ لہذا اس آیت میں سفر کی قید اتفاقی ہے۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرتہن رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں مثلاً زلیور پس سکتا ہے یا نہیں، باغ کا پھل یا زمین کی پیداوار حاصل کر سکتا ہے یا کوئی دودھ دینے والا جانور ہے، تو اس کا دودھ پی سکتا ہے یا نہیں۔ اس معاملے

رہن شدہ چیز سے
فائدہ اٹھانا جائز
نہیں

ہے کہ اگر امانت واپس نہ کی، تو اس کا ضرور عطا شدہ ہو گا۔ اور اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکیگا،

کتاب شہادت
گنہ ہے

گو اہی کا مسئلہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ گواہ کو مل ہو اور گواہی کا نصاب کیا ہے یہاں پر شہادت کا ایک دوسرا پہلو بیان کیا گیا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص کسی معاملے کو جانتا ہے۔ اور وہ متنازعہ کے تصفیہ میں معاون ہو سکتا ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الشَّاهِدَةِ

تو پھر شہادت کو چھپانے کی اجازت نہیں ہے۔ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَيَمُوتْ بِهَا شَهَادَةً كَوَيْبَانِ كَمَا فَإِنَّهُ أَتَاهُ قَلْبُهُ تو اس کا دل گنہگار ہو گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر دل کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ دل جسم انسانی میں ایک اعلیٰ حیثیت کا جزو ہے۔ اگر دل کی اصلاح ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے۔ اور دل کا بگاڑ پورے

جسم کا بگاڑ ہے۔ دل مرکزِ اخلاق ہے۔ عقیدہ کی اچھائی یا برائی کا تعلق بھی دل سے ہے۔ اس لیے یہاں پر فرمایا کہ جو کوئی گواہی کو چھپائے گا۔ حقیقت میں اس کا دل گنہگار ہے۔ اس کے دل میں فتور ہے۔ ورنہ وہ ایسی حرکت نہ کرتا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گویا ہے کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھر ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہے۔ تو سارا جسم ٹھیک ہے۔ اگر وہ بگڑ گیا ہے۔ تو سارا جسم خراب ہے فرمایا اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ يَادِرْ كَصُورِهِ

لوتھر بدل ہے۔ جس پر سارے جسم کا دار و مدار ہے۔ یہ دل ایسی چیز ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں سزا کا ذکر کیا ہے۔ تو وہاں بھی فرمایا تَطْلُعُ عَلَى الْأَفْبِدَةِ جہنم کی آگ کا اثر پہلے دل پر ہو گا۔ پھر جسم پر ہو گا۔ اسی لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب گواہی نہ دینے سے کسی کا حق ضائع ہو رہا ہو تو پھر گواہ کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ضرور گواہی دے۔ گواہ کی یہ ذمہ داری وجوب کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اگر گواہی سے انکار کرتا ہے۔ تو کتاب شہادت کا مرتکب ہو کر گنہگار ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی تبویٰ شہادت دیتا ہے۔ تو وہ بھی کتاب شہادت کا مرتکب تصور ہو گا۔ گواہ گواہی کو چھپانا جہنمی گواہی دینا برابر ہے۔

یہ ایک اصولی بات ہے۔ کہ جب کسی شخص پر کوئی چیز واجب ہو جائے، تو پھر

شہادت کا
واجب ہے

اس کی عدم ادائیگی گناہ کا باعث ہوگی۔ لہذا اس کے لیے اُس کام کا معاوضہ طلب کرنا جائز نہیں رہتا۔ اگر ایسا کرے تو اس نے واجب کی ادائیگی نہیں کی بلکہ مالی مفعدہ کے لیے گواہی دی ہے۔ اہل اتنی گنجائش موجود ہے۔ کہ گواہی دینے پر گواہ کو بھی کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنی جیب سے کئی خرچ کر کے گواہی کے لیے جاتا ہے یا اپنی سولاری استعمال کرتا ہے، خورد و نوش کا سامان خود کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا مالی نقصان ہوگا۔ اگر وہ اسے خوشی سے برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ تو کوئی حرج نہیں۔ تاہم اگر وہ متعلقہ فریق کی سولاری استعمال کرے، اس کی طرف سے کھانا کھائے، یا جس قدر اس کا خرچ ہوا، وہ اسے لے کر اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے جائز ہے۔

فَرَّأَى وَاللَّهِ بِمَا قَدْ صَلَوْنَا عَلَيْهِمْ تَمَّ جَوَاحِدٌ يَحْيَىٰ كَرَّمَ اللَّهُ وَجْهَهُ
 علم میں ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے حتیٰ کہ وہ تمہارے ارادوں اور مخفی عزائم سے بھی واقف ہے۔ تم غلط کام کر کے اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیکر انسان کی مزید رہنمائی فرمائی ہے۔ کہ اگر گرفت سے بچنا ہے۔ تو تقویٰ اختیار کرو۔ جیلے بدلنے سے غلط کام کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تم اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے۔

تِلْكَ التُّمُلُ ۳

البقرة ۲

درس پچھرت و شش ۱۲۶

آیت ۲۸۴

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ طَوَّانٌ تَبْدُوْا
مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ يَخْشَوْهُ يُحَاسِبُكُمْ بِهٖ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ
يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

تس جہم ۳: اللہ ہی کے واسطے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے
اور اگر تم ظاہر کرو اس چیز کو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا اُسے چھپاؤ تو اللہ تعالیٰ اس
کا حساب لے گا تم سے۔ پس بخش دے گا جس کو چاہے اور سزا دے گا جس کو چاہے۔

اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۲۸۴﴾

اختتامی کلمات

سورۃ بقرہ کے دروس اختتام پذیر ہیں۔ اور آج کے درس سے سورۃ کا پالیوں
اور آخری رکوع شروع ہو رہا ہے قرآن پاک کی اس سب سے لمبی سورۃ میں مختلف الالاع
احکام بیان ہوئے ہیں جن میں اصول بھی ہیں اور فرعی مسائل بھی ہیں عبادات، معاملات
مالی و مالی جہاد، نکاح و طلاق اور دیگر بے شمار مسائل بیان ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے
اس سورۃ کو تمام القرآن بھی کہا گیا ہے۔ گویا سورۃ مبارکہ قرآن پاک کی کوہان ہے۔ اس
کو قرآن پاک میں بلند مقام حاصل ہے۔

سورۃ کے آخری رکوع میں قرآن پاک کو نازل کرنے والے اللہ جل جلالہ کی حاکمیت
اعلیٰ کا بیان ہے کیونکہ اس میں مندرج تمام احکام و شرائع اسی کی جانب سے ہیں۔ اس کے
علاوہ اس کی قدرت اور تصرف کا بیان ہے۔ کہ اقتدار اعلیٰ بھی اسی کے پاس ہے
اور ہر چیز کے تصرف پر بھی اُسی کا حق ہے۔ وہ جس طرح چاہے۔ اپنی پیدا کردہ اشیاء
کو تصرف میں لائے۔ رکوع کی آخری آیات میں ایمان کی تفصیلات کا تذکرہ ہے۔
اور پھر بالکل آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کا قانون بتایا گیا ہے۔ اور وہ کلمات
سکھائے گئے ہیں جن کے ذریعے ایک بندے کو اپنے خالق و مالک کے حضور

دست بدعا ہونا چاہیے، اور اپنے مالک حقیقی سے اپنے گناہوں کی مغفرت اور اللہ تعالیٰ کی مدد کی درخواست پیش کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی مالکیت اعلیٰ کا اعلان اِنْ اِلَٰهَ اِلَٰهٌ اِلَّا هُوَ۔ لِّلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِثْلُ شَيْءٍ مَّا يَشَاءُ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے۔ مفسرین کو کلام فرماتے ہیں کہ کسی چیز کی تخصیص کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جن کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ فلاں چیز کو فلاں کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے۔ تخصیص کی پہلی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کا بنایا ہوا ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص کوئی برتن، مشینری، اوزار بنا رہا ہے تو اس کے حق میں وہ چیز خاص ہوتی ہے۔ خصوصیت کی دوسری وجہ ملکیت ہوتی ہے جس چیز کا کوئی مالک ہے۔ اُسے اس کے ساتھ تخصیص حاصل ہے۔ اور تیسری وجہ حق تصرف ہے۔ جس شخص کو کوئی چیز تصرف میں لانے کا حق ہے۔ اُس کو بھی خصوصیت حاصل ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی تمام کائنات کے ساتھ تخصیص ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ میں مذکور بالا تینوں صفات پائی جاتی ہیں۔ جن کی بنا پر اُسے کائنات کے ذرہ ذرہ کے ساتھ تخصیص ہے۔ وہ ہر چیز کو بنانے والا۔ وَهُوَ بِدِیْعِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے آسمان و زمین کو پیدا کرنے والی وہی ذات ہے۔ وہی ہر شے کا صانع ہے الَّذِیْ اَنْشَأَ كُلَّ شَیْءٍ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی کمال صنعت اور کاریگری کا شاہکار ہے۔ خود انسان اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا۔ مدیث شریف میں آتا ہے اَنَّ اللہ صانع کل صانع و صنعتہ ہر چیز اور اس کی صنعت کو پیدا کرنے والا اللہ وعدہ لا شریک ہے۔

چونکہ اِنْ اِلَٰهَ اِلَٰهٌ اِلَّا هُوَ کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اُسی نے ہر چیز کو بنایا ہے۔ لہٰذا اِنْ اِلَٰهَ اِلَٰهٌ اِلَّا هُوَ حقیقی بھی وہی ہے لَٰهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کائنات

کی تمام چیزیں اس کی ملک ہیں۔ اللہ کے علاوہ انسان کو جن چیزوں کی ملکیت حاصل ہے یہ عارضی ہے اور اللہ کے حکم سے ہے۔ حقیقی ملکیت صرف خدا تعالیٰ کی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی کسی انسان کی ملکیت قائم رہتی ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کسی سے حق ملکیت سلب کر لیتا ہے۔ اور پھر نہ ملکیت باقی رہتی ہے اور نہ قبضہ۔ انسان خود فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہ تمام چیزیں جن پر ملکیت کا دعویٰ تھا۔ یہیں رہ جاتی ہیں۔ گویا حقیقی ملک بھی ہر چیز کا اللہ ہی ہے۔

تیسری چیز تصرف ہے۔ اور کائنات کے درے درے پر اللہ تعالیٰ ہی کو کامل اور مکمل تصرف حاصل ہے۔ اگر کسی درے کو تصرف کی اجازت ہے۔ تو وہ خاص وقت تک کے لیے اور عارضی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو ذاتی تصرف حاصل نہیں۔ چونکہ خلقت، ملکیت اور تصرف کی تینوں صفات اللہ تعالیٰ ہی میں پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا اللہ مَکَافِ السَّمُوتِ وَمَکَافِ الْأَرْضِ آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ ہی کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مالکیت اعلیٰ بیان کرنے کے بعد بنی نوع انسان سے فرمایا وَلَا تُسَبِّحُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفَوُہُ يُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا یہاں پر یہ بات قابل غور ہے۔ کہ کسی اچھے یا بُرے کام کا مرتکب ہونا اور کسی چیز کا محض دل میں خیال آنا، دو مختلف چیزیں ہیں۔ کسی غلط کام کے کرنے سے مجاہدے کا عمل تو ذہن میں آتا ہے۔ مگر محض دل میں کسی خیال کے آجانے سے مجاہدہ کیا ہو گا جب کہ یہ ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ اس ضمن میں شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے نفس میں جو چیزیں آتی ہیں، وہ پانچ اقسام ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز اعتقاد ہے۔ انسان کا اعتقاد کیا ہے، وہ توحید پر کاہل ہے یا شرک میں طوط ہے۔ اس کے دل میں اخلاص پایا جاتا ہے۔ یا نفاق سے پڑا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اُسے اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین ہے یا وہ تردد اور شک کا شکار ہے۔ اعتقاد

محکم دلائل
پر مبنی

سے متعلق جو کچھ بھی اس کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اس کا محاسبہ ہوگا۔ اگر وہ مؤدہ مخلص اور اللہ پر یقین رکھنے والا ہے۔ تو اللہ کے ہاں جزا پائیگا اور اگر مشرک، منافق یا متردو ہے۔ تو سزا کا مستحق ہوگا۔ بہر حال ہر انسان کا اعتقاد قابل محاسبہ اور قابل مواخذہ ہے۔

دوسری چیز جس پر محاسبے کا دار و مدار ہے، محبت یا نفرت کا جذبہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے اَنْتُمْ لُاَعْمَالُ الْحُبِّ فِي اللَّهِ وَالْبُغْضِ فِي اللَّهِ مُحْسِنُ التَّوَكُّلِ کی خاطر محبت یا نفرت ہونا اچھے اعمال میں سے ہے۔ ایسا شخص اللہ کے ہاں جزا کا حقدار ہے۔ اور جس کے دل میں جذبہ محبت و نفرت اپنی ذاتی اغراض یا غیر اللہ کے لیے ہے۔ وہ لازماً سزا کا مستوجب ہوگا۔ دوسری حدیث میں فرمایا من احبب للهِ وَابْغَضَ للهِ وَاعْطَى للهِ وَمَنَعَ للهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ جس نے اللہ کی خاطر کسی سے محبت کی۔ اُسی کی خاطر نفرت کی۔ اُسی کی خاطر دیا اور اسی کی خاطر نہ دیا۔ تو اس نے ایمان کو مکمل کر لیا۔ ایک اور روایت میں اَنْتُمْ لُاَعْمَالُ الْفَاظِ بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو اللہ کے لیے نکاح کر دیا تو وہ کامل ایمان دار بن گیا۔ مقصد یہ ہے کہ دل میں آنے والے محبت یا نفرت کے جذبات اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل محاسبہ ہیں۔

اس ضمن میں تیسری چیز فرمایا نیت اور عزم ہے۔ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق اچھی یا بُری نیت قابل محاسبہ ہے۔ اگر کوئی شخص اچھائی کا کام کرنے کی محض دل سے نیت کرتا ہے۔ اور ابھی اس پر عمل درآمد شروع نہیں کیا، تو اس کو نیکی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور پھر جب نیک عمل کو کر گزرتا ہے۔ تو دس نیکیوں کا حقدار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک بُری نیت کا تعلق ہے۔ محض نیت پر مواخذہ نہیں ہے۔ البتہ جب اس نیت یا ارادے کے مطابق عمل کرے گا۔ تو اس کے ہمراہ اعمال میں صرف ایک ہی برائی نکھی جائیگی، اور وہ قابل محاسبہ ہوگا۔

نفس انانی میں غیر اختیاری طور پر آلے دالی چوتھی چیز اخلاق ہے۔ اور اس میں تقویٰ، زہد، حرص، لالچ وغیرہ آتے ہیں۔ کسی انسان کے اندر جس قدر تقویٰ اور زہد ہوگا

اسی قدر اس کے درجات بلند ہوں گے۔ اس کا ہر عمل اس کے تقویٰ اور زہد کے ساتھ پرکھا جائیگا۔ اور اگر کوئی شخص حرص، لالچ یا دیگر قبیح اشیاء کا شکار ہے۔ تو پھر اس کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ بہر حال اخلاق بھی قابلِ محاسبہ اور قابلِ مواخذہ ہیں۔

پانچویں چیز جس پر محاسبہ انسانی کا انحصار ہے، وہ خطرات ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ ان خیالات کی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں سے بعض قابلِ مواخذہ ہیں اور بعض پر کوئی گرفت نہیں۔ پہلی چیز ایسا خیال ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ غلامِ غلط کام کرنا چاہیے۔ مگر ذرا یہ خیال خود بخود چلا جاتا ہے۔ ایسے خیال پر کوئی مواخذہ نہیں ملے گا جس کہتے ہیں۔ دوسری قسم کا ایسا خیال ہے جو انسان کے دل و دماغ پر وارد ہو کہ کچھ دیر قائم رہتا ہے اور پھر نازل ہو جاتا ہے اسے خاطر کتے ہیں اور اس پر بھی کوئی محاسبہ نہیں۔ تیسری قسم کا خیال ایسا ہے کہ جب یہ آتا ہے تو اس سے انسان لطف اندوز بھی ہوتا ہے، اسے کوہم کہتے ہیں۔ اور ہماری امت میں ایسے خیال کا بھی کوئی محاسبہ نہیں، چوتھی قسم کا خیال حدیثِ نص ہے کہ انسان خود اپنے دل میں کوئی ایسی ویسی قابلِ مواخذہ بات کو کہے جس پر عمل نہیں کرتا ایسے خیال پر بھی امت محمدیہ پر کوئی مواخذہ نہیں اگرچہ بالکل امتیں قابلِ مواخذہ تھیں اس ضمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول مشہور ہے کہ ایسے خیالات سے بچا کرو۔ کیونکہ جس گھر میں دھواں اٹھتا ہے۔ وہ اگرچہ جلا آتو نہیں مگر گھر کو سیاہ ضرور کر دیتا ہے۔ اس قسم کے خیالات انسان پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ پہلی امتیں اس سے مستثنیٰ نہ تھیں تاہم ہماری امت میں اس خیال پر بھی کوئی مواخذہ نہیں۔

فرمایا ان خطرات کی پانچویں قسم وہ عزم اور ارادہ ہے جس کے ذریعے انسان برائی پر عمل درآمد میں سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ ایسے خیالات کا دل میں آنا قابلِ مواخذہ ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ تم اپنے دل کی بات ظاہر کر دیا چھپاؤ، یٰحٰمٰدُکُمْ بِاللّٰہِ اللّٰہُ تم سے حساب لے گا، تو صحابہ کرام پریشان ہو گئے۔ اور حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضور! ہم غماندہ روزہ، صدقہ، جہاد وغیرہ کی تکالیف برداشت کر سکتے ہیں

نہیٰ نزول

مگر اب ایک ایسی چیز کا حکم آیا ہے۔ جو ہمارے بس میں نہیں۔ دل میں خیالات کا آنا ایک ایسی چیز ہے جسے از خود ٹال نہیں سکتے۔ اگر اس پر محاسبہ شروع ہو گیا، تو ہمارے لیے کوئی جاسے رفتن نہ ہوگی۔ ہم اللہ کے دل کیسے سرخرو ہوں گے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، تم اس طرح کے لوگ نہ بنو جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی۔ جنہوں نے کہا تھا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یعنی ہم نے احکام کو سن لیا مگر ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تمہارا کام یہ ہے۔ کہ اللہ مالک الملک کی طرف سے جو بھی حکم آئے اس کے سامنے تسلیم خم کر دو اور اس کیلئے جذبہ اطاعت کا اظہار کر دو۔ اور اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا مانگو، چنانچہ جیسا کہ آگے آ رہا ہے صحابہ کرامؓ ہر حکم کی تصدیق اس طرح یا رہے تھے۔ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا عَفُوًّا ذَلًّا وَتَبْنَا لَیْنًا اے ہمارے رب ہم نے تیرا حکم سن لیا۔ اسکی اطاعت کی۔ تو ہمیں معاف فرمائے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے صحابہ کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ میری امت کے دلوں میں آنے والے دوسروں پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ گرفت اُن کی ہے جو دل سے نکل کر زبان پر آجائیں گے۔ یا اُن پر عمل درآمد ہو جائے گا جب تک عمل نہیں ہوگا، ایسے خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا۔

حضرت امیر شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ باطل اعتقادات، برے اخلاق یا فاسد نیت جو دل میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا ایم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اسکی اس طرح توجیہ فرمائی ہیں۔ کہ مواخذہ تو ہر چیز پر ہوتا ہے مگر انسان کو جو تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچی رہتی ہیں، وہ ایسے اعمال کا کفارہ بن جاتی ہیں اور انسان محاسبے سے بچ جاتا ہے۔ حضور کا فرمان ہے۔ کہ جب کسی شخص کو کوئی کانٹا چھب جائے، پھوکر لگ جائے۔ یا وہ کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اس وجہ سے اس کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے، وہ اسکی خطاؤں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اور انسان جب دنیا سے جاتا ہے تو پاک صاف ہوتا ہے۔

فرمایا محاسبے کے اس قانون کے باوجود فَيَغْفِرُ لَعَنَ نَبِیُّ اللہ تعالیٰ
مستتر ہے
قادر مطلق ہے

جسے چاہے معاف کر دے۔ جس شخص میں بخشش حاصل کرنے کی صلاحیت وجود ہوگی، اللہ تعالیٰ اُسے معاف فرمائے گا۔ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ اور جو سزا کے قابل ہوگا، اُسے سزا میں مبتلا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ کسی کو ناجائز تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ اس کا اپنا فرمان ہے وَمَا أَرْبُكَ بِظُلْمٍ لِّلْعَبِيدِ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اس کے ہاں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے بھی آچکا ہے وَأَنْتُمْ لَا تَظْلِمُونَ تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تمہارے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی اور یہ بھی فرمایا لَوْلِي سُلْطَانٌ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ ہر شخص کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

فَرِیَا یہ سزا اور جزا اللہ تعالیٰ کو ہی سزا دار ہے۔ کیونکہ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مالک ہے اور اسے حق حاصل ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے تصرف کرے۔ الغرض گذشتہ دروس میں آنے والے ہزاروں مسائل کا یہ اجتماعی تبصرہ ہے۔ کہ مالک الملک جو چاہے کرے۔ وہ جو بھی حکم دے، بندوں کا فرض ہے کہ اسکی تعمیل کریں۔ اور ہر شکل حکم پر اس سے آسانی کی دُعا کریں اور اس کے ساتھ بخشش طلب کریں۔

بَلَاغُ الرُّسُلِ ۳

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد و ہشت ہفت (۱۴۶)

آیت ۲۸۵

أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ط
 كُلٌّ آمِنٌ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ قَدْ لَا يُفَرِّقُ
 بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ قَدْ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا إِنَّ عَفْوَكَ
 رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿۲۸۵﴾

ترجمہ: ایمان لایا ہے رسول اُس چیز پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر اتاری گئی ہے۔ اور مومن بھی ایمان لائے ہیں۔ سب ایمان لائے ہیں۔ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر (اور وہ یہ کہتے ہیں) ہم نہیں تفریق کرتے کسی میں اس کے رسولوں میں سے۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔ ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۸۵﴾

گذشتہ آیت میں محاسب کا تذکرہ تھا۔ کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اُس کا حساب لیگا۔ نزول آیت پر صحابہ کرام کو سخت تشویش ہوئی۔ کہ اگر غیر اختیار می خیالات پر بھی انسان کی گرفت ہو گئی، تو حجات مشکل ہو جائے گی۔ صحابہ کرام نے اپنی تشویش کا ذکر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا تم یہودیوں کی طرح یوں نہ کہو سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یعنی ہم نے سنی لیا اور انکار کر دیا۔ بلکہ اس قسم کی صورت حال میں یوں کہا کرو۔ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ہم نے سن لیا اور مان لیا۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ چنانچہ صحابہ کرام نے دل کی پوری محبت کے ساتھ کہا ”سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا عَفْوَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ“

اس آیت میں درحقیقت اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی تعریف فرمائی ہے۔ صحابہ کرام

بھی لازم ہے۔ مگر اس کی تکمیل تصدیق قلبی سے ہی ہوتی ہے۔ اِقْرَأْ بِاللِّسَانِ
وَقَضَّيْنِ بِالْقَلْبِ

سب سے پہلے ایمان باللہ کا درجہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہونا
کیونکہ یہ بنیادی چیز ہے۔ نہ صرف اس کا وجود ہے بلکہ وہ واجب الوجود بھی ہے
یعنی اس کا وجود خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اللہ کے علاوہ
ہر چیز کا وجود عطا کیا ہوا ہے اور عارضی ہے مگر اللہ ہی ایک واحد ذات ہے
جو واجب الوجود ہے اللہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ اور اس لفظ میں یہ چیز پائی جاتی
ہے واجب الوجود المستجمع لجميع صفات الكمالات واجب الوجود
وہ ذات ہے جس میں تمام صفات کمال پائی جاتی ہیں۔ وہ ذات مبدعہ عن
النقص والذوال ہے۔ اس ذات میں نہ کوئی عیب ہے اور نہ کوئی نقصان
والی چیز ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ دائم و قائم ہے گا۔ اُسے کبھی زوال
نہیں آئے گا۔ جب لفظ اللہ بولا جاتا ہے تو یہ تمام صفات اس میں آجاتی ہیں۔
فارسی زبان میں جب اللہ کا ترجمہ خدا کیا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی بھی یہی ہے۔ کہ وہ
ہستی جو خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کی محتاج نہیں، اگرچہ یہ لفظ بھی واجب الوجود کا
ہی ہم معنی ہے کہ وہ ذات خود بخود ہے اور جمیع صفات کمال کے ساتھ
متصف ہے۔ وہ ذات نقص و ذوال جہی صفات سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ اور ان ہی سے
اللہ کی پہچان ہوتی ہے۔ ان صفات میں الرحمن، الرحیم، الملک، القہار، الشار
الصمد، الغنی، الحمی القیوم وغیرہ ہیں۔ یہ سب وجودی یا مثبت صفات ہیں۔
اور اللہ تعالیٰ کی بعض منفی صفات ہیں مثلاً "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ، لَمْ
يَكُنْ وَلَدًا، لَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةٌ" یعنی نہ اس کا اولاد ہے۔ اور
نہ وہ کسی کا اولاد ہے اور نہ اسکی بیوی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ———
کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے۔ لَمْ يَأْخُذْهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ اس کو نہ اونگھ آتی

ہے اور نہ خند آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام عیب اور نقصان والی صفات سے پاک اور منزہ ہے۔ جب سبحان اللہ کہا جاتا ہے تو اس کا معنی بھی یہی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ انقصا اور عیب والی صفات سے پاک ہے۔ نہ اس کو تھکاوٹ ہوتی ہے۔ اور نہ اس پر موت طاری ہوتی ہے۔ الحمد للہ کا بھی یہی معنی ہے۔ کہ وہ تمام صفات کمال کا مالک ہے۔

مقتضی
پر ایمان

جس طرح اللہ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی صفات پر ایمان لانا بھی لازمی ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانتا ہے۔ مگر توحید کو نہیں مانتا، تو وہ ایماندار نہیں ہے۔ یا ایک کی بجائے دو یا تین الہ مانتا ہے جیسے مجوسی یا عیسائی وغیرہ، تو بھی مشرک اور کافر ہو گیا۔ اگر توحید میں کوئی خرابی آئے گی تو انسان کافر ہو جائے گا۔ حضرت ام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص خدا کی ہستی کو ماننے کے باوجود کہتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کے لیے رسول نہیں بھیجتا، تو پھر بھی کافر ہے۔ کیونکہ رسول مبعوث کرنا اللہ کی صفت ہے۔ جس سے انکار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء اور رسول بھیجے ہیں اور آخر میں آپ کو مکمل پروگرام دے کر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا ہے اب قیامت کا انتظار رہے۔ کوئی نیا پروگرام نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت تقدیر بھی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں تصریح ہے۔ کہ جب تک کوئی تقدیر پر ایمان نہیں لائے گا، خدا کی بارگاہ میں اس کی عبادت مقبول نہیں۔ خواہ وہ احد پاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے اور تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور مشیت سے ہوتا ہے۔ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ وَهُوَ ذَاتُ مَا هِيَ جس نے تمام چیزوں کو مقدر فرمایا ہے لہذا لفظ اللہ میں تقدیر پر ایمان لانا بھی

آگیا، کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور اس کی تمام صفات پر ایمان لانا ضروری ہے
 فرمایا رسول اور اس کے صحابہ اللہ پر ایمان لائے۔ وَهَلْ يَكْفُرُ اُولَٰئِكَ
 فرشتوں پر بھی ایمان لائے، فرشتوں پر ایمان لانا، ایمان کا دوسرا رکن ہے جس کے
 پہلے فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا ہوگا۔ اور پھر فرشتوں کی بہت سی قسمیں
 ہیں۔ جیسے۔ ملائکہ الاعلیٰ اور ملائکہ السافلہ عرش کے گرد گھومنے والے فرشتے،
 علیین میں رہنے والے، آسمانوں پر مقیم اور پھر فضا میں بہنے والے، زمین پر رہنے والے
 یہ تمام فرشتوں کی مختلف اقسام ہیں۔ اہم شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ ملائکہ الاعلیٰ
 سے ملائکہ السافلہ تک فرشتوں کی سات قسمیں متعین ہیں اور ہر ایک قسم کو اللہ تعالیٰ
 نے الگ الگ اور مختلف نوعیت میں پیدا کیا ہے۔ جو فرشتے ملائکہ الاعلیٰ والے
 ہیں وہ اعلیٰ ترین یا نفیس ترین ہیں۔ جیسے فرشتے خواہ اور پر کے ہوں یا نیچے
 کے دوسری مخلوق سے لطیف تر ہیں۔ اس نورانی مخلوق میں روح اعتقل اور شعور
 پایا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ
 عبادت الہی سے نہ تھکتے ہیں نہ اذکاتے ہیں۔ وہ معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی
 کبھی نہیں کرتے۔ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ ۖ اور اللہ تعالیٰ انہیں
 جو کچھ حکم کرتا ہے۔ اس کی تعمیل کرتے ہیں وَكَيْفَ يَكُونُ مَا يُؤْمَرُونَ
 یہ اللہ تعالیٰ کی مقرب مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو فیضان کائنات میں پہنچتا
 ہے وہ انہی فرشتوں کے ذریعے پہنچتا ہے فرشتوں کے بعد لطافت کے
 لحاظ سے دوسرے درجے کی مخلوق جنات ہیں۔ مگر وہ معصوم نہیں ہیں۔ بنی نوع
 انسان میں سے صرف انبیاء کی جماعت معصوم ہے باقی کسی مخلوق کو یہ گارنٹی حاصل
 نہیں ہے۔

لطیف مخلوق ہونے کی وجہ سے فرشتے ہمیں اس دنیا میں نظر نہیں آتے
 ہاں اگر وہ شکل تبدیل کر لیں تو انہوں کو بھی نظر آسکتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ
 مبارک میں جب جبرائیل علیہ السلام وحیہ کلبیؑ یا کسی مسافر کی صورت میں آتے تھے، تو

نظر آتے تھے۔ عالم بزرگ اس مادی جہاں سے لطیف ہے اور حشر اُس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ جب انسان اُس جہاں میں پہنچیں گے، تو ان میں بھی کمال درجے کی لطافت پیدا ہو جائیگی، لہذا سب کو فرشتے نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنتی لوگوں کے پاس فرشتے آکر سلام کریں گے ۛ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ ۛ غرضیکہ فرشتوں پر ایمان لانا بھی ارکانِ ایمان میں سے ہے۔

کتبوں پر
ایمان

ایمان باللہ اور ایمان بالملائکہ کے بعد فرمایا وَکُتِبَ عَلَیْکُم مِّنْ دِینِکُم مَّا کُنتُمْ عَلَیْہِ سَآئِلِیْنَ یعنی حضور رسول مقبول اور صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر بھی ایمان لائے ہیں، کُتِبَ جمع کا صیغہ ہے۔ کہ کہ اجلا تمام آسمانی کتب پر ایمان لانا اور تفصیلاً قرآن پاک پر ایمان لانا ضروری ہے۔ قرآن پاک کا ہر حکم صحیح، برحق اور واجب التعمیل ہے۔ پہلی کتابیں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمائیں۔ اُن کے تمام احکام پر عمل کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے سنزل من اللہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے

راہِ سوال کہ اللہ نے کل کتنی کتبیں نازل فرمائی ہیں۔ اس بارے میں قرآن پاک کی کسی آیت یا کسی صحیح روایت میں کوئی تصریح نہیں ملتی۔ ہاں بزرگانِ دین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چار کتابیں کوہِ ثبوریٰ ہیں یعنی زبور، تورات، انجیل اور قرآن پاک اس کے علاوہ کچھ چھوٹی کتابیں یا صحیفے ہیں۔ اہم شافعیؒ کی روایت کے مطابق ایک سو چار کتابیں اور صحیفۃ اللہ نے نازل فرمائے۔ ہر نبی کے لیے کتاب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بہت سے انبیاء اپنے سے قبل آنے والی کتاب کی ہی پیروی کا درس دیتے رہے۔ مثلاً نزولِ تورات کے بعد جتنے بنی آئے وہ تورات کی ہی تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر وحی آتی تھی مگر قانونِ کتاب کا ہی پتہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح یونسؑ اور بعض دیگر انبیاء کے صحیفے بھی تھے۔ موجودہ بائبل یعنی تورات کے ساتھ ۹ صحیفے اور انجیل بھی ہے۔ پہلے پانچ باب تورات کے ہیں اور باقی دس نبیوں کے

صحیفے میں اس طرح یہ سب غلط ہو چکا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اللہ کی کتابوں میں بہت گڑبڑ کی ہے۔ مگر کچھ چیزیں آج بھی مجمع ہیں اور قرآن کے مطابق ہیں۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام پر پینکس صحیفے نازل ہوئے تھے۔ ہر مال آسانی کتابوں پر ایمان لانا ارکان ایمان میں سے ہے۔

آگے ایمان کے چوتھے جزو کے متعلق فرمایا وَرُسُلِهِ یعنی اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے گا۔ تو کافر ہو جائے گا۔ نصاریٰ کو دیکھ لیں۔ سابقہ تمام انبیاء کو مانتے ہیں مگر حضور خاتم النبیین کو تسلیم نہیں کرتے، لہذا کافر ٹھہرے۔

تمام رسولوں پر ایمان لانے کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی لَا تَقْفِرُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی رسول کو مان لیا اور کسی کا انکار کر دیا۔ یہودیوں کا یہی حال ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہیں۔ حضور خاتم النبیین کو بھی نہیں مانتے، لہذا یہ کافر ہی ہیں۔ جب تک ہر رسول پر ایمان نہ رکھیں خواہ ان کا نام معلوم ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس جس دور میں جس جس نبی کوبعث فرمایا۔ وہ سب اس کے برگزیدہ بندے تھے۔ اپنی اپنی قوم کے ہادی اور راہنما تھے، ہم ان سب کی تصدیق کرتے ہیں وَمَا أُولَئِكَ إِلَّا نَبِيُّونَ مَن رَّبُّكَ يُرْسِلُ فِي رِزْقِهِ لِيُثَبِّتَ لِيُنْزِلَ فِي رِزْقِهِ لِيُثَبِّتَ لِيُنْزِلَ فِي رِزْقِهِ لِيُثَبِّتَ برحق ہے۔ اور ہمارا ان پر ایمان ہے لَا تَقْفِرُوا کا یہی معنی ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں موجود ہے۔ انہوں نے عرض کیا حضور انبیاء کرام کا سلسلہ یکے شروع ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلے بنی آدم علیہ السلام تھے۔ گریا سب سے پہلے انسان بنی تھے۔ صحابی نے عرض کیا حضور کیا وہ بنی تھے ارشاد فرمایا، اہل بنی مکلم تھے۔ اللہ نے ان سے کلام فرمایا تھا۔ اور سب آخری بنی

وہ آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اس جہاں کا آخری دن ہو گا۔ اس کے بعد دوسرے جہاں کے ایام شروع ہو جائیں گے۔ اور ان کی فریحت الگ ہوگی۔ لہذا آخرت کے دن (یوم الحساب) پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ مگر وہ دن آنے والا ہے۔ جب حساب کتاب ہو گا۔ اور اس کے نتیجے میں جزا یا سزا اور جنت یا دوزخ کی منزل برحق ہے۔ جب ان کو ملکوت بنایا گیا ہے۔ تو پھر اس کے لیے جزا و سزا کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس کی تصدیق ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کافر ہو جائے گا۔ جب تک ایمان کے تمام ارکان پر ایمان نہیں لائے گا، گرفت سب سے بچ سکتا۔ یہ وہی اجزائے ایمان ہیں۔ جن کے متعلق سورۃ کی ابتداء میں اشارہ کیا گیا تھا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْغَيْبِ يَعْنِيْ مُتَّقِيْنَ وَهِيَ جَوْبِنِ دِيْكَهٖ اِيْمَانِ رَّكْعَتَهٗ هِيَ - يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْغَيْبِ يَعْنِيْ مُتَّقِيْنَ وَهِيَ جَوْبِنِ دِيْكَهٖ اِيْمَانِ رَّكْعَتَهٗ هِيَ -

چیز کی تشریح ہے۔ کہ وہ کون کون سے امور ہیں۔ جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

تو یہاں پر واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بمع اسکی صفات، اطلاق، کتابیں رسول اور روز قیامت ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حالانکہ نہ ملائکہ کو دیکھا، نہ رسول کو اور نہ قیامت کو دیکھا مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔

الْبَقَّةُ ۲

آیت ۲۸۶

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکصد و پست و ہشت (۱۲۸)

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا
مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إَصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۚ
وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفُ رُكُنَا وَاعْفُ رُكُنَا وَارْحَمْنَا وَفَنتَ
فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ④

۲۸۶

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اس
نفس کے لیے وہی ہے جو اس نے کیا۔ اور اس کے اوپر وبال بھی اس چیز کا ہے
جو اس نے کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم معمول جائیں یا غلطی کر
جائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو
ہم سے پہلے گزرے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور نہ اٹھا ہم سے وہ چیز جسکی
ہم طاقت نہیں رکھتے۔ اور درگزر کر دے ہم سے۔ اور بخش دے ہم کو اور ہم پر
رحم فرما۔ تو ہی ہمارا آقا ہے۔ پس کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ ④

مسلم شریف کی روایت میں موجود ہے کہ جب صحابہ کو تشریش لائح ہوئی کہ
کہیں دل میں پیدا ہونے والے غیر اختیاری خیالات پر اللہ تعالیٰ کی گرفت نہ آجائے، تو
نبی علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے برعکس لیوں کہہ کر وسیعاً
وَاعْتَصْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ چنانچہ جب صحابہ کرامؓ نے
دل کی گہرائیوں سے یہ کلمات کہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی تو حضور علیہ السلام نے
انہیں صحابہ کو تسلی دی کہ غیر اختیاری چیزوں پر اللہ تعالیٰ مؤانذہ نہیں کرتا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ
نے ایک عام قانون بتا دیا کہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا اللہ تعالیٰ

دین آسان
۴

کسی جان کو تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ مگر اس کی طاقت کے مطابق کسی کی قربت برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالنا عقل کے بھی خلاف ہے جس چیز پر انسان کا بس ہی نہیں اس پر محاسبہ کرنا یکے روا ہو سکتا ہے۔ بلکہ دین اسلام میں تو آسانی کا قانون کام کر رہا ہے۔ اسی سورۃ میں رمضان کے روزوں کے متعلق گزر چکا ہے۔ ”يُسَيِّدُ اللَّهُ بِكُمْ“ اَلْيُسْرَ وَلَا يُسَيِّدُ بِكُمْ اَلْعُسْرُ اَللّٰهُ تَعَالٰی تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔ وہ تو رحمن اور رحیم ہے۔ وہ کسی کوتاہی میں نہیں ڈالتا۔ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر آتا ہے ”مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ“ اللہ تعالیٰ نے دین میں تنگی نہیں ڈالی حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے ”الدِّينُ يُسْرٌ“ دین آسان ہے۔ اس میں کسی پر غمی نہیں کی گئی، نماز کے متعلق آتا ہے۔ ”فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِيعْ اِذَا كُنْتَ فَاعِدًا“ اگر طاقت نہ ہو کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکو فصَلِّ قَاعِدًا“ تہیض کر پڑھ لو۔ اور بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے فَعَلَى جَنْبٍ قَرِيبٍ کر بیلو کے بل پڑھ لو۔ گریا ہر شکل کے وقت اللہ تعالیٰ نے رخصت دی ہے جو چیز انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر مجبور نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی شخص نابینا ہے تو اسے دیکھنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس میں دیکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح جس شخص کے پاؤں کٹے ہوئے ہوں اُسے چلنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس کے ہاتھ موجود نہ ہوں۔ اسے کوئی چیز پکڑنے کے لیے نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسکی صلاحیت سے زیادہ تکلیف میں نہیں ڈالتے، اور غیر اختیاری باتوں پر اس کا مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا لَهُمَا مَا كُنتُمْ لَهَا كَاثِبَتَيْنِ انسان کے لیے وہ چیز ہے جو اس نے کائی وکلیہا مَا كُنتُمْ لَهَا كَاثِبَتَيْنِ اور جو کچھ اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ کھائے گا وہی اس کو مفید ہوگی۔ اور اسی چیز کا اس پر وبال پڑے گا۔ گریا اچھی چیز کا اچھا بدلہ لے گا اور بدائی پر مؤاخذہ ہوگا۔ اہم شاہ دلی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسانی افعال اس کے اخلاق، نیت اور اندرونی حکم کے مطابق سرزد ہوتے ہیں۔ ان پر مؤاخذہ ہوتا ہے۔

بھول اور
خطا میں فرق

نیان یا بھول ایسی غلطی کا نام ہے جس میں نیت یا ارادے کو دخل نہ ہو۔ بلکہ کوئی کام بھول کر ہو جائے اور خطا سے مراد یہ ہے کہ نیت کچھ اور کام کی ہوتی ہے مگر عمل کوئی دوسرا ہو جاتا ہے۔ مثلاً روزے کی حالت میں گلی کی نیت سے منہ میں پانی ڈالا مگر وہ حلق سے نیچے اتر گیا۔ کسی شخص نے شکار کے جانور کے پلے گولی چلائی مگر وہ کسی انسان یا دوسرے جانور کو لگ گئی، یہ خطا ہوتی ہے۔ اور آخرت میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ البتہ دنیا میں اس کی دیت اور کفارہ دینا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص خطا قتل ہو گیا ہے۔ تو اس کا خول ہا بھی دینا پڑیگا اور کفارہ کے طور پر دو ماہ کے روزے بھی رکھنے ہوں گے۔

اور اگر کسی کو عمدہ قتل کیا ہے۔ تو اس کا دنیا میں بھی قصاص ہوگا اور آخرت میں اللہ کے ہاں بھی مؤاخذہ ہوگا۔ (اگر توبہ نہ کی ہو) بھول اور خطا میں یہ فرق ہے۔
بھول کے متعلق حضور علیہ السلام کی حدیث میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ رَفِيعُ عَنِ اُخْطَاۃِ الْخَطَاۃِ وَالْمُتَعَيَّنِ وَمَا اسْتَكْبَرُوْهُ عَلَیْهِ اللّٰهُ تَعَالٰی نے میری امت سے ایسے گناہ کو اٹھا دیا ہے۔ جو بھول، خطا یا جبر کی وجہ سے سرزد ہو۔ ایسے عمل پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو مجبور کر کے کوئی کام کرایا جائے تو وہ اگر ایں ایسا مثلاً کوئی شخص دوسرے کو مجبور کرے کہ شراب پی لو یا فلاں کام کر دو ورنہ تجھے قتل کر دیا جائے گا۔ تو یہ عمل اگر اٹھا ہوگا۔ اور اللہ کے ہاں اس پر کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔

بھول اور
خطا پر مؤاخذہ
نہیں

البتہ دنیا میں ایسے امور کی تلافی کرنا پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھنا بھول جائے، تو جس وقت اس کو یاد آئے اس وقت ادا کرے۔ اگر ایک وقت بھول گیا ہے تو اب بالکل ترک نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعد از وقت بھی ادا کرنا ہوگی۔ اسی طرح روزہ کی حالت میں غلطی سے پانی حلق کے اندر چلا گیا۔ تو اگرچہ عذر اللہ اس کا مؤاخذہ نہیں۔ مگر جو روزہ ضائع ہوا اس کی قضا دینا ہوگی۔ البتہ روزہ میں بھول کر کھانے پینے کی معافی ہے۔ ایسی صورت کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ اللّٰهُ نے اس کو کھلایا پلایا۔ اس کا روزہ مکمل

ہو گیا۔ اسے روزہ دوبارہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر بھول کر بغیر طہارت کے نماز پڑھ لی، تو اسے ٹوٹا ہوا ہوگی۔ اس کی نماز نہیں ہوئی۔

چنانچہ اسی نسیان اور خطا کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دعائیہ کلمات کھائے۔ کہ **دعائیہ کلمات**
 اے میرے بندو! جب بھول جاؤ یا خطا ہو جائے تو مجھ سے ان کلمات کے ساتھ معافی طلب کر لیا کرو **رَبَّنَا اِنَّهُ سَاِخِذْنَا اِنْ نَبِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا اے ہمارے پروردگار**
 اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے تو ہمارا مؤخرہ نہ کر۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ سورۃ بقرہ کے آخر میں جو دعائیں مذکور ہیں۔ جب بندہ ان کو ادا کرے گا ہے۔ تو ہر دعا کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرمائے **لَعَنُوْا قَدْ فَعَلْتُمْ** یعنی اے میرے بندے! میں نے ایا کر دیا، تیری دعا قبول کر لی۔

اس کے بعد دعا کا اگلا حصہ فرمایا **رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْحَابُ**
 ہمارے پروردگار! تو ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال **كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا** جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر بوجھ ڈالا۔ یہاں پر بوجھ سے مراد وہ مشکل احکام ہیں۔ جو پہلی امتوں پر وارد ہوئے۔ بعض مفسرین کو کرام مثال کے طور پر فرماتے ہیں۔ اسرائیلیوں پر پانچ سو سے زیادہ نمازیں فرض تھیں لہذا وہ امت محمدی سے زیادہ مشکل میں تھے۔ بعض امتوں کو ہمیشہ روزے رکھنے کا حکم تھا اور بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ حکم بھی تھا۔ کہ جس کپڑے پر نجاست لگ جاتی تھی وہ دھونے سے پاک نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ قیمتی سے قیمتی کپڑا بھی نجاست والی جگہ سے کاٹ ڈالنا پڑتا تھا۔ اسی طرح بنی اسرائیل حلال جانور کا گوشت تو کھا سکتے تھے مگر اس کی چربی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا وہ گوشت سے چربی کو مشکل علیحدہ کر کے پھر کھاتے تھے **اللہ تعالیٰ**
 نے ان کی توبہ قبول کرنے کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ ایک دوسرے کو قتل کرو۔ ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل قتل ہوئے، تب جا کہ ان کی توبہ قبول ہوئی اپنے مال کا چھوٹا حصہ انہیں بطور زکوٰۃ ادا کرنا پڑتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ جو کوئی آدمی گناہ کا مرتکب ہوتا تھا۔ تو رات کے وقت فرشتے اس کے دروازے

پر کچھ جیتے تھے۔ جس سے اسکی سخت رسوائی ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے بوجھ سابقہ امتوں پر ڈال رکھے تھے جن کے متعلق یہاں پر دعا کی جارہی ہے کہ اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے پہلی امتوں پر ڈالا تھا۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا أَمْثَلَهُ طَاقَتَهُ لَنَا بِهٖ اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھا جسکی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تَحْمِلُ عَلَيْنَا سے شرعی احکام کا بوجھ ہے۔ جس کے متعلق دعا کی گئی ہے کہ ہم پر مشکل احکام نہ ڈال اور لَا تَحْمِلْنَا سے مراد وہ قدرتی آفات و بلیات ہیں جو کسی قوم پر نازل ہو جائیں۔ تو یہاں پر اُن تکوینی مصائب کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ مولا کریم! ہم سے ایسے قدرتی مشکلات کا بوجھ بھی نہ اٹھا کر جس کی ہم طاقت ہی نہیں رکھتے۔ مقصد یہ کہ ہمیں شرعی اور تکوینی ہر دو مشکل امور سے محفوظ رکھے۔

معافی کی درخواست

وَاَعْفُ عَنَّا اے پروردگار! ہم کو معاف فرمائے۔ ہماری خطاؤں سے مرگز فرما۔ وَاعْفُ عَنَّا ہماری گناہوں کو بخش دے۔ عَفْرُ کا معنی ڈھانپ دینا ہوتا ہے یعنی ہماری تمام لغزشوں کو اپنی رحمت سے ڈھانپ دے۔ وَلَا تَحْمِلْنَا ہم پر رحم فرما۔ ہم پر مہربانی فرما اَنْتَ مَوْلَانَا تو ہی ہمارا مولا ہے۔ جیسا کہ قاموس طائے لکھتے ہیں لفظ مولیٰ پچیس معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اس مقام پر مولا کا معنی آقا اور کار گزار ہے۔ یعنی ہمارے کاموں کا بنانے والا اور ہماری سرپرستی کرنے والا تو ہی ہے۔

مولا معبود کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس کا معنی ساتھی، صاحب، رفیق وغیرہ بھی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر مراد ہمارا آقا ہے۔ متولی امور ناچار کاموں کو بنانے والا، ہماری حاجات پروری کرنے والا۔ اے مولا کریم! تو ہی ہے فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ یعنی ہم کو غلبہ عطا فرما۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کافروں پر غلبے کی نعمت بھی عطا فرمائی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اول دین اپنے دین پر

غلبہ اسلام

اگر تم صحیح ایمان پر قائم رہو گے، تو تم ہی غالب آؤ گے۔ خلفائے راشدین کا زمانہ اس غلبے کا بہترین ثبوت ہے۔ صفین کے واقعہ تک مسلمان نصف دنیا پر غالب تھے۔ اور باقی دنیا میں بھی کوئی ایسی طاقت نہیں تھی۔ جو اہل ایمان سے ٹکر لے سکے۔ یہ غلبہ صرف پچاس سال تک قائم رہ سکا۔

غرضیکہ اگر دین ٹٹے دین پر قائم رہیں اور عام لوگ ان کے معاون ہوں، اتفاق سے بچتے رہیں۔ بدعت سے بیزار رہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم ہوں، رٹوت سود اور دیگر حرمت سے بچتے رہیں، تو کسی غیر قوم کو مسلمانوں پر تسلط حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب مسلمانوں میں یہ قابحتیں پیدا ہو جائیں گی، تو دوسری قومیں ان پر مسلط ہو جائیں گی اور یہ مغلوب ہو کر رہ جائیں گے۔ اب دیکھ لیجئے یہ تمام لعینت مسلمانوں میں موجود ہیں۔ حرام خمری عام ہے بدعت کا چرچا ہے۔ بلکہ اس کو عین کار ثواب سمجھ کر اس پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ بدعت کے علاوہ لوگ شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی حکومت نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دیا۔ زبانی جمع خمری ہو رہا ہے۔ عمل صفر کے برابر ہے۔ منافق کی تمام علامتیں مسلمانوں میں موجود ہیں۔ ان حالات میں اسلام کو غلبہ کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور صحیح دین اختیار کر لینی تو فی حق عطا فرمائے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ بقرہ کو فسطاط القرآن فرمایا ہے۔ یعنی یہ سورۃ قرآن پاک کا بڑا خیمہ ہے۔ جس طرح ایک بڑے خیمے میں بہت سے ساز و سامان رکھنے اور رہائش کی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی طرح اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت کبریٰ کے تمام اصول و فرائض بیان کر دیے ہیں۔ اس سورۃ میں دعوت الی التوحید والہدایہ کا بیان ہے۔ قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت بیان کی گئی ہے۔ فرائض خمسہ کے علاوہ جہاد، نظام سلطنت اور بے شمار مثالیں اور حکمت کی باتیں اس سورۃ میں پائی جاتی ہیں، اس لیے اسے فسطاط القرآن کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اس سورۃ کو تمام القرآن یعنی قرآن کی کولن سے تعبیر

کیا گیا ہے۔ جس طرح اونٹ کی کمران سے بلند ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں یہ سورۃ بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کی آخری دو آیتیں حضور علیہ السلام کو معراج کے موقع پر عطا ہوئی تھیں۔ اَمِنْ الرَّسُولِ سے لیکر قَوْمُ الْكَافِرِينَ تک کی آیتیں معراج کا خاص تحفہ ہے۔ پانچ نمازیں بھی معراج کا تحفہ ہے جو حضور امت کے لیے لائے۔ اور تیسرا تحفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر لائے۔ کہ میری امت کا جو شخص خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائے گا، اس کی غلطیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ ان آیات کی اہمیت اسی امر سے واضح ہے کہ ان میں اسلام کے ارکان خمسہ کا بیان ہے۔ جو سب سے اہم چیز ہیں۔ اور پھر اس میں اللہ کی مناجات ہے اور اس سے دعا کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔

فضائل آیات
آخر سورۃ

حضرت شریفین میں آتا ہے۔ کہ جو شخص ان آیات کو رات کے وقت تلاوت کرے گا۔ یہ آیات اس کے لیے ساری رات کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ یا فرمایا سجدہ کے قائم مقام ہوں گی بشرطیکہ انسان فرائض کا پابند ہو اور غلو ص نیت کے ساتھ تلاوت کرے۔ یہ بڑی فضیلت والی آیتیں ہیں۔ انہیں ورد کے طور پر اختیار کر لینا چاہیے ایک روایت میں یوں آتا ہے۔ کہ عرش معلیٰ کے نیچے اللہ تعالیٰ کا ایک خزانہ ہے سورۃ بقرہ کی یہ آخری دو آیتیں اللہ تعالیٰ نے اس خزانہ میں سے نازل فرمائی ہیں۔ ان آیات کی اس قدر فضیلت ہے۔ سبحانک اللہم و بحمدک

احکام حج

مع زیارات

مکتۃ المکرمہ و مدینۃ المنورہ

میرتب

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

ملنے کا پتہ: مکتہ درس القرآن فاروق گنج گوہر انوارہ صفحہ ۱۸ قیمت ۱۷ روپے